رجسٹری نمبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیرِ ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری

و

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

قیمت سالانہ پانچ روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

جامعہ

جلد ۹ | ماہ محرم ۱۳۴۶ھ مطابق جولائی ۱۹۲۷ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

بے خطر بنادیا جائے۔ قربانیاں کرکے اپنے سابق دشمن فرانس اور روس سے اتحاد کیا اور ایسی ترکیبیں کیں کہ گزشتہ جنگ میں دنیا کا بڑا حصہ جرمنی کے خلاف صف آرا تھا اور ساری دنیا نے جرمنوں سے جنگ کرکے انگریزوں کو اس بحری خطرہ سے نجات دلائی!۔

لیکن اسی جنگ کے دوران میں دو حریف اور پیدا ہوگئے یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان۔ جنگ نے ان دونوں ملکوں کی ملی اور بحری قوت کو مراتب بڑھا دیا ہے۔ اور اگر بیڑوں کی تعمیر کا کام اسی رفتار سے ہوتا رہا تو انکے پاس ایسے بیڑے ہوں گے کہ دنیا نے آجتک خیال میں بھی نہ دیکھے ہوں۔ ان دونوں ملکوں کی بحری قوت میں ترقی کا جو حال ہے اس نے انگلستان کی سیاست کو اپنے پرانے معیار قوت بحری سے کبھی کا اتار دیا ہے۔ پہلے یہ اصول تھا کہ برطانوی بیڑا دو سب سے بڑی بحری قوتوں کی مجموعی طاقت سے کم نہ ہونا چاہئے۔ اب معیار یہ رہ گیا ہے کہ اپنا بیڑا کسی دوسرے ملک سے کم نہ ہو۔ لیکن اگر سلطنت کو قایم رکھنا ہے تو اب اس سے نیچے اترنا ممکن نہیں۔

نہیں پہلا مسئلہ تو نسل کا مسئلہ ہے۔ سفید اور پیلی نسلیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ بحرالکاہل کے مغربی ساحل پر (چین و جاپان) پیلی نسل آباد ہے۔ مشرقی اور جنوبی ساحلوں پر سفید۔ مشرق میں ریاستہائے متحدہ اور کناڈا جنوب میں اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ۔ اس مسئلہ میں امریکہ اور ان نوآبادیوں کی انگریزی آبادی بالکل متحد الخیال ہے۔ اگر امریکہ کو یہ منظور نہیں کہ ملک کی سب آبادی۔ کارگذار لیکن کم احتیاج جاپانیوں کا سیلاب برباد کردے تو کینیڈا اور اسٹریلیا بھی اسکے ہمنوا ہیں۔ ان ممالک کو سفید نسل کے قبضہ میں رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ پیلی نسل کو الگ ہی الگ رکھا جائے۔ امریکہ اور برطانوی نوآبادیاں دونوں اس حکم کو اصول موضوعہ کی طرح مانتے ہیں۔ آسٹریلیا اور کناڈا اس معاملہ میں امریکہ کے ایسے ساتھ ہیں کہ اگر بفرض محال انگلستان انکے خلاف ہوجائے تو ان دونوں نوآبادیوں کے سلطنت برطانیہ سے جدا ہوجانیکا خاصہ اندیشہ ہے۔

دوسرا مسئلہ چین کے مستقبل کا ہے۔ یہاں امریکہ اور جاپان ٹکر کھاتے ہیں جاپان کا چھوٹا سا ملک اب اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی نہیں۔ وہ اب کہیں اور جگہ چاہتی ہے اور سب سے قریب چین کا وسیع اور زرخیز ملک ہے۔ ۵-۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان کے بعد کوریا پر قبضہ کرکے اس آرزو نے توسیع کو تسکین

برطانوی سیاست خارجہ

کہتے ہیں کہ سلطنت برطانیہ میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ پھر جتنی یہ سلطنت وسیع ہے اتنا ہی اسکی سیاسی ریشہ دوانیوں کا پھیلاؤ ہے۔ دنیا کا کوئی حصہ نہیں جہاں براہ راست یا بالواسطہ اس سلطنت کے اغراض کا سوال نہ پیدا ہوتا ہو۔ پھر جتنا اس کے اغراض اور اثر کا رقبہ وسیع ہے اسی قدر اس کی سیاست گہری ہے۔ اس لئے برطانوی سلطنت کی سیاست خارجہ پر کوئی تفصیلی بحث ایک مختصر سے مضمون میں کیسے ممکن ہے۔ سطور ذیل کا مقصد بھی یہ نہیں ہے بلکہ صرف اسقدر کہ اس سیاست کے موجودہ مسائل کے نام گنوا دئے جائیں تاکہ پھر ہر مسئلہ پر بعد کو جدا جدا بحث ہوسکے۔

ہر شخص جو سیاست عالم سے کچھ بھی واقف ہے دیکھ سکتا ہے کہ گذشتہ جنگ کے بعد سے برطانوی سیاست خارجہ کا رُخ بالکل پلٹ گیا ہے۔ جنگ سے پہلے اس سیاست کا مرکز براعظم یورپ کی دول عظمیٰ اور برطانیہ کے تعلقات میں مضمر تھا۔ پہلے فرانس سے، پھر فرانس اور روس سے، اسکے بعد جرمنی سے۔ جنگ نے کچھ عرصہ کے لئے تو ان میں دو طاقتوں کو یعنی جرمنی اور روس کو بیکار سا کردیا ہے۔ تیسری طاقت فرانس بیشک آج یورپ میں سب سے قوی فوجی طاقت ہے۔ لیکن برطانیہ کی بحری قوت کا مقابلہ کرنیکے لئے اس کے پاس کافی بیڑہ نہیں۔

برطانیہ کی سلطنت کی اساس اسکی بحری قوت ہے۔ اس کے وجود کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ سلطنت کے حصوں میں جو ایک دوسرے سے بہت دور ہیں ذرائع آمد و رفت قائم رہیں اور صرف جزائر برطانی ہی نہیں بلکہ دوسری "برطانوی قومیں" یعنی نوآبادیاں بھی دشمن کی زد سے محفوظ رہیں۔ اس ساری دنیا میں پھیلی ہوئی سلطنت کے لئے اگر کوئی خطرہ کا باعث ہوسکتا ہے تو وہی جس کے پاس طاقتور بیڑا ہو

ٹرفلگر اور واٹرلو کے معرکوں کے بعد کوئی ایک صدی تک برطانوی بیڑا بلا خوف رقیب دنیا کے سمندروں پر اڑتا رہا۔ اور کہیں بیسویں صدی کے شروع میں جرمنی کے بیڑے نے رقابت کا ڈر پیدا کیا۔ انگلستان نے اس خطرہ کو فوراً پہچانا۔ جرمنی سے اتحاد کی کوشش کی۔ اسکی بحری قوت میں اضافہ کی رفتار پر پابندیاں عائد کرنی چاہیں اور جب دونوں باتیں نہ ہوسکیں تو اپنی ساری سیاست کا مقصد یہ قرار دے دیا کہ اس حریف کو

بے بحر بنا دیا جائے۔ قربانیاں کرکے اپنے سابق دشمن فرانس اور روس سے اتحاد کیا اور ایسی ترکیبیں کیں کہ گزشتہ جنگ میں دنیا کا بڑا حصہ جرمنی کے خلاف صف آرا تھا اور ساری دنیا نے جرمنوں سے جنگ کرکے انگریزوں کو اس بحری خطرہ سے نجات دلائی! -

لیکن اسی جنگ کے دوران میں دو حریف اور پیدا ہوگئے؛ یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان - جنگ نے ان دونوں ملکوں کی مالی اور بحری قوت کو بمراتب بڑھا دیا ہے - اور اگر بیڑوں کی تعمیر کا کام اسی رفتار سے ہوتا رہا تو انکے پاس ایسے بیڑے ہوں گے کہ دنیا نے آجتک خیال میں بھی نہ دیکھے ہوں - ان دونوں ملکوں کی بحری قوت میں ترقی کا جو حال ہے اس نے انگلستان کی سیاست کو اپنے پرانے معیار قوت بحری سے کبھی کا اتار دیا ہے - پہلے یہ اصول تھا کہ برطانوی بیڑا دو سب سے بڑی بحری قوتوں کی مجموعی طاقت سے کم نہ ہونا چاہیے - اب معیار یہ رہ گیا ہے کہ اپنا بیڑا کسی دوسرے ملک سے کم نہ ہو - لیکن اگر سلطنت کو قایم رکھنا ہے تو اب اس سے نیچے اترنا ممکن نہیں -

ہمیں پہلا مسئلہ تو نسل کا مسئلہ ہے - سفید اور پیلی نسلیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں - بحرالکاہل کے مغربی ساحل پر (چین و جاپان) پیلی نسل آباد ہے - مشرقی اور جنوبی ساحلوں پر سفید - مشرق میں ریاستہائے متحدہ اور کناڈا، جنوب میں اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ - اس مسئلہ میں امریکہ اور ان نوآبادیوں کی انگریزی آبادی بالکل متحد الخیال ہے - اگر امریکہ کو یہ منظور نہیں کہ ملک کی سب آبادی - کارگذار لیکن کم احتیاج جاپانیوں کا سیلاب برباد کردے تو کینیڈا اور اسٹریلیا بھی اسکے ہمنوا ہیں - ان ممالک کو سفید نسل کے قبضہ میں رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ پیلی نسل کو الگ ہی الگ رکھا جائے - امریکا اور برطانوی نوآبادیاں دونوں اس حکم کو اصول موضوعہ کی طرح مانتے ہیں - آسٹریلیا اور کناڈا اس معاملہ میں امریکہ کے ایسے ساتھ ہیں کہ اگر بفرض محال انگلستان انکے خلاف ہوجائے تو ان دونوں نوآبادیوں کے سلطنت برطانیہ سے جدا ہوجانیکا خاصہ اندیشہ ہے -

دوسرا مسئلہ چین کے مستقبل کا ہے - یہاں امریکہ اور جاپان ٹکر کھاتے ہیں - جاپان کا چھوٹا سا ملک اب اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی نہیں - وہ اب کہیں اور جگہ چاہتی ہے اور سب سے قریب چین کا وسیع اور زرخیز ملک ہے - ۱۹۰۴-۵ء کی جنگ روس و جاپان کے بعد کوریا پر قبضہ کرکے اس آرزوئے توسیع کو تسکین


کناڈا
ریاستہائے متحدہ امریکہ
بحر
جنوبی امریکہ


بحیرہ بیرنگ
سائبیریا (روس)
پیکنگ
کوریا
جزائر جاپان
جاپان
چین
کینٹن
تبت
جزیرہ ہینن
جزائر لوچو
فارموسا
جزیرہ فلپائن
سیلیبس
بورنیو
نیوگنی
سماٹرا
جاوا
جزائر ہانولولو
الکاہل
آسٹریلیا
تسمانیا
نیوزی لینڈ

دی گئی تھی بسکہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے شروع ہونے پر جاپان نے کیاؤچاؤ لے لیا اور شانٹنگ میں قدم جمائے اور اپنے "۲۱ مطالبات" سے کل چین ہی کو جاپان کی باجگذار ریاست بنانے کی فکر کی تھی لیکن امریکہ اور انگلستان کی مخالفت نے بات نہ بننے دی۔

تیسرا مسئلہ بحرالکاہل میں اقتدار کا مسئلہ ہے۔ ہر چند یہ مسئلہ زیادہ تر جاپان اور امریکہ کا مسئلہ ہے تاہم اس سمندر میں چونکہ کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے سواحل بھی ہیں۔ دوسرے ہندوستان میں اقتدار قائم رکھنے کیلئے بھی اس سمندر میں کافی طاقت ہونا ضروری ہے۔ اس لئے برطانیہ کو بحرالکاہل کے مسئلہ سے بہت تعلق ہے۔ امریکہ کا تعلق چونکہ براعظم ایشیا سے روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے اور جزائر فلپائن اس کی نوآبادی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ بحرالکاہل میں امریکہ کے جہازوں اور کیبل کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ خط استوا کے شمال میں جاپان کو سابق جرمن مقبوضات کا نگران رہنے اور بحری تاروں کے مرکز جاپ کو جاپان کے سپرد ہو جانے سے امریکہ کے اس آمد و رفت کی راہ میں خطرے پیدا ہو گئے ہیں۔

سلطنت برطانیہ کی سیاست خارجہ کا سب سے اہم مسئلہ یہی امریکہ اور جاپان سے تعلق کا مسئلہ ہے۔ اسلحہ اور تیاری جنگ میں امریکہ کا مقابلہ کرنا زیادہ نتیجہ خیز نہیں معلوم ہوتا۔ ایک تو اس سے برطانوی مالیات پر تقریباً ناقابل برداشت بار پڑے گا۔ دوسرے خود امریکہ کے مالی ذرائع آج کم و بیش اتھاہ نظر آتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایسا کیا گیا تو مخالفتیں جو پہلے سے موجود ہیں زیادہ شدید ہو جائیں گی اور باہمی جنگ کا اندیشہ قریب تر ہو جائے گا۔ موجودہ مخالفتیں زیادہ تر معاشی مخالفتیں ہیں۔ دوران جنگ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے صنعت و جہاز سازی، تجارت و جہاز رانی میں حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں اور آج ان میدانوں میں انگلستان کی سب سے قوی حریف ہیں۔ ایک مقروض قوم سے امریکہ آج دنیا کی سب سے بڑی قرض خواہ قوم ہو گئی ہے اور ساری دنیا کی ساہوکاری کے منصب سے انگلستان کو ہٹا رہی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے تیل کے ذخائر کے لئے بھی دونوں قوموں میں خوب زور شور سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ اور تیل کا مسئلہ صرف معاشی نفع نقصان کا مسئلہ نہیں بلکہ جہازوں میں ایندھن کے طور پر تیل زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے تیل کے ذخائر کا ہاتھ میں ہونا بحری قوت کی بقا کی ضمانت ہے۔ عراق کے تیل کے ذخائر کے متعلق یہ اختلاف ظاہر ہوا۔ کیونکہ

سان ریمو کے معاہدہ کی رو سے تو انگلستان کو جب عراق کی نگرانی سپرد کی گئی تو تیل بھی انگلستان کو دیا گیا تھا لیکن امریکہ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی نیز اس کے خلاف بھی جب ہالینڈ کی بڑی تیل کی کمپنی رائل ڈچ "ROYAL DUTCH" کو جو تمام تر انگریزی اثر میں ہے سماترا میں جمبی کے تیل کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اسپر امریکہ نے مطالبہ کیا کہ امریکن مفاد کی حامل اسٹینڈرڈ آئل کمپنی STANDARD OIL Co. کے ساتھ بھی مساوی رعایات ہونی چاہئیں۔ انگلستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات پر اثر ڈالنے والا ایک عنصر آئرلینڈ کا مسئلہ بھی تھا، کیونکہ امریکہ کی آبادی میں معتدبہ عنصر آئرش نسل کے لوگوں کا ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ تقریباً صاف ہو چلا ہے تاہم اب بھی کسی وقت ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں جن سے دونوں قوموں کے تعلق پر اثر پڑے۔ برطانیہ کی سیاست خارجہ کا قریبی مقصد یہ ہے کہ امریکہ سے مخالفت کی باتیں حتی الوسع کم کرے اور باہمی سمجھوتہ سے بحری جنگ کی تیاریوں پر حدود عائد کر کے دوستانہ تعلقات اور پر امن تعاون کی تدابیر نکالی جائیں۔

اس کوشش کی کامیابی میں جاپان اور انگلستان کے تعلقات حائل ہوتے ہیں۔ اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاپان کا دوست رہکر برطانیہ امریکہ کے ساتھ چل سکتا ہے یا نہیں۔ جاپان اور انگلستان میں ۲۰ سال سے اوپر جو دوستانہ معاہدہ رہا ہے اس سے انگلستان کو بہت فائدہ ہوا جنگ عظیم میں جاپان کی قوت برطانیہ کے ایشیائی مقبوضات کے لئے پشت پناہ ثابت ہوئی۔ کیاؤ چاؤ دشمن سے بلا انگریزی قربانیوں کے چھین لیا گیا۔ اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوجیں جاپانی جنگی جہازوں کی پناہ میں میدان جنگ میں پہنچیں لیکن جب اس معاہدہ کی تجدید کا وقت آیا تو امریکہ کی ناپسندیدگی کا اظہار ہونے لگا۔ برطانوی سلطنت کی جو کانفرنس ۱۹۲۱ء میں ہوئی اسمیں معلوم ہوا کہ خود برطانوی نوآبادیوں کے نمائندے بھی اس معاہدہ کے متعلق متفق الخیال نہیں ہیں۔ کنیڈا کے نمائندے نے اپنے ملک کی رائے عامہ کے مطابق تجدید معاہدہ کی مخالفت کی بار بار اسپر بحثیں ہوئیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور بالآخر انگلستان کے ذہین لارڈ چانسلر نے یہ نفیس موشگافی کی کہ معاہدہ میں تجدید کی کوئی ضرورت ہی نہیں وہ یوں ہی چل سکتا ہے۔ لیکن اس سے مسئلہ کا کوئی حل نہ ہوا بلکہ معاہدہ صرف ملتوی ہو گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ معاہدہ کی جو قدر و قیمت انگلستان

کے لئے تھی انہیں تو روسی اور جرمن بیڑہ کی تباہی کے باعث بہت کمی آگئی تھی۔ ادھر نوآبادیاں امریکہ سے اتحاد چاہتی تھیں اور جاپان سے معاہدہ کی تجدید کے سخت خلاف تھیں۔ اب اس معاہدہ کو قائم رکھنے کی خواہش اگر تھی تو جاپان کو۔ اور اس لئے جب سلطنت کی کانفرنس میں معاملہ قطعی طور پر طے نہیں کیا گیا بلکہ یہ قرار پایا کہ معاہدہ ابھی سال بھر تو نہیں چل سکتا ہے تو اسے جاپان نے اپنے فائدہ کی بات سمجھا۔ لیکن انگلستان کا مقصد صاف ظاہر ہو گیا۔ وہ ایک طرف تو جاپان کو بھی بالکل چھوڑنا نہیں چاہتا اور دوسری طرف امریکہ سے قریب ہو کر انگریزی زبان بولنے والی قوموں کا اتحاد قائم کرنا چاہتا ہے۔ ادھر امریکہ کا رخ یورپ کی بہ نسبت ایشیا کی طرف زیادہ ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی جاپان کے اقتدار کو مشرقی ایشیا میں بڑھنے نہیں دینا چاہتا لیکن جنگ کا فی الحال کوئی خواہشمند نہیں۔ جاپان اس لئے نہیں کہ ابھی اپنے کو کمزور پاتا ہے امریکہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ جنگ میں جو حاصل کریگا وہ پرامن ترقی میں بھی حاصل کر سکتا ہے۔ انگلستان اس واسطے نہیں کہ خود اپنی سلطنت کے مسائل اور مشرق قریب اور افریقہ کی پیچیدگیاں اسکے لئے کافی ہیں اور یہ غیر متیقن بات ہے کہ اگر خود امریکہ سے جنگ ہو گئی تو یا اگر امریکہ اور جاپان میں جنگ ہوئی اور امریکہ کی مدد کرنی پڑی تو سلطنت کے لئے کیا خاص فوائد مترتب ہونگے۔ اسی وجہ سے انگلستان میں امریکہ جاپان اور انگلستان کے سہ طرفہ سمجھوتہ کا خیال پیدا ہوا۔ اور رو صدر جمہوریہ امریکہ ہارڈنگ نے واشنگٹن میں ایک مجلس منعقد کی جس میں انگلستان اور جاپان ہی کو نہیں بلکہ چین، فرانس اور اٹلی کو بھی مدعو کیا۔ اول الذکر چار طاقتوں میں معاہدہ جزائر بحر الکاہل کے متعلق معاہدہ ہو گیا یہ انگریزی جاپانی معاہدہ ختم ہو گیا، جاپان کے توسیعی حوصلے دب گئے، اور بحری سمجھوتہ کے ذریعہ بری دل میں اضافہ پر حدود عائد کر دی گئیں واشنگٹن کانفرنس کے نتائج کی تفصیل میں جانا یہاں مقصود نہیں۔ اس سے یہ ضرور ہوا کہ معاملہ کافی دنوں کو ٹل گیا۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ برطانوی سیاست خارجہ کا سب سے اہم کام اب یہی ہے کہ امریکہ سے دوستی کو قائم رکھکر جاپان کو بھی مخالف نہ ہونے دے۔ کام مشکل ہے۔ لیکن برطانوی سیاست کی تاریخ اس قسم کے مشکل کاموں سے خالی نہیں ہے۔ اور اگرچہ برطانوی سیاسین کے لئے اس معاہدہ میں ادھر کھائی ہے اُدھر خندق تاہم انہوں نے اپنے قومی مفاد کے لئے ہمیشہ جس زیرکی کا ثبوت دیا ہے اس سے بعید نہیں کہ اس صورت حال سے بھی فائدہ اٹھالیں۔

جہاں تک یورپ میں برطانوی سیاست کا تعلق ہے فرانس سے تعلقات کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ دونوں قوموں کی دو طویل کشیدگی جو ۱۸۹۸ء میں فشودا کے واقعہ کی شکل میں فرانس کے لئے بڑی ذلت کا سامان مہیا کر چکی تھی۔ ۸ اپریل ۱۹۰۴ء کے معاہدہ مراکو کے بعد سے مخلصانہ دوستی میں بدل گئی تھی۔ یہ ائتلاف جنگ کے دوران میں تو قائم رہا ہی اور آج بھی ضابطہ کے طور پر جاری ہے۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے عہد نامہ وارسائی کے بعد سے اس دوستی کی سخت آزمائشیں ہوئی ہیں۔ براعظم کے تعلقات اور شرق قریب کے مسائل میں دونوں ملکوں میں اغراض کا بہت تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ براعظم میں خصوصاً اس لئے کہ انگلستان تو چاہتا ہے کہ یورپ میں تجارت کو فروغ ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ مفتوح اقوام کی معاشی حالت ٹھیک نہ ہو جائے۔ انگلستان عام معاشی حالت کی اصلاح کو اس سے زیادہ اہم سمجھتا ہے کہ جرمنی سے کچھ رقم بطور تاوان وصول کیجائے۔ لیکن فرانس کو یہ ڈر لگا ہے کہ جرمنی کہیں پھر مضبوط نہ ہو جائے۔ وہ تو جرمنی کو اتنا کمزور کر دینا چاہتا ہے کہ پھر اس سے کسی قسم کا خدشہ باقی نہ رہے۔ اسی وجہ سے اس نے رہائن کے علاقہ کو فرانس میں ہضم کرنے کی ناکام کوشش کی، مغرب کے صنعتی اور کوئلہ والے علاقے جرمن سے علیحدہ کرنے چاہے۔ روس اور جرمنی کے درمیان پولینڈ کو فاصل بنایا جو کم و بیش فرانس کی ایک ماتحت ریاست ہے اور براعظم پر فرانس کی فوجی قوت کا سہارا ہے۔ اسکے علاوہ فرانس یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنی مالیات کو درست کرنیکے لئے جرمنی سے جو کچھ وصول کر سکے۔ تاوان کی شکل میں وصول کرلے۔ جرمنی اور انگلستان کے تعلقات میں جنگ سے پہلے تو برطانوی سیاست کا مقصد وحید سمندر میں جرمنی کے اثر اور اقتدار کو توڑنا تھا۔ چنانچہ جنگ میں شکست کے بعد جرمنی کے پاس جنگی اور تجارتی بیڑہ بس نام ہی کو چھوڑا گیا، نوآبادیاں سب کی سب چھین لی گئیں۔ ائتلافی طاقتوں کے مقبوضات میں جرمنی کی جو املاک تھیں اور جو جو حقوق تھے سب تلف کر دئے گئے نیز تمام جرمن کیبل اسکے قبضہ سے نکال لئے گئے ائتلافی علاقوں سے تمام جرمنوں کو خارج کر دیا گیا۔ جب اتنا مجبور کر لیا اور دل کھول کر نیچا دکھا لیا تو سیاست کا رخ بدلا۔ جرمن سلطنت اور جرمن معیشت کو اور تباہ کرنے میں اب انگلستان کا نقصان ہے۔ انگلستان کبھی یہ نہیں چاہتا کہ براعظم میں کسی ایک طاقت کو ایسا اقتدار حاصل ہو جائے کہ اسکا توازن کسی دوسری طاقت کے ذریعہ نہ ہو سکے اگر جرمنی کے اور حصے بخرے ہوئے اور جرمنی سے اس کے صنعتی علاقے اور اجناس خام کے ذخائر چھینے گئے تو پھر

فرانس کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے مقابلہ کے لئے جرمنی کو کیسے استعمال کیا جا سکیگا؟ جرمن معاشی زندگی کے انحطاط سے خود انگلستان کی معیشت پر بڑا اثر پڑے گا۔ برطانیہ کی سیاست خارجہ ان وجوہ سے اب یہ چاہتی ہے کہ جرمنی کی طاقت میں کوئی مزید کمی نہ واقع ہو اور اسکی معاشی حالت ایسی ہو جائے کہ سلطنت برطانیہ سے تجارتی لین دین ہو سکے۔ البتہ یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ پھر کوئی ایسا موقع نہ دیا جائے کہ جرمنی خطرناک مقابل کی صورت اختیار کر سکے۔

روس اور انگلستان تو دراصل ہمیشہ بڑے دشمن رہے ہیں لیکن انگریزوں کی سیاسی ہنرمندی تھی کہ جنگ عظیم میں روس انگلستان کے دوش بدوش تھا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد بھی انگریزوں نے کرنسکی جمہوریت کو اپنے ساتھ رکھا اور جب کہیں لینن نے بولشوکی جمہوریت قایم کی اسوقت جاکر روس نے انگلستان کا ساتھ چھوڑا۔ اس کے بعد پیہم کوششیں کی گئیں کہ روس میں اندرونی بغاوت کے ذریعہ اس بولشوکی حکومت کو تباہ کیا جائے۔ لیکن یہ سب ناکام رہیں۔ جب بولشوکی حکومت کا استحکام مسلم ہو گیا تو سب سے پہلے انگلستان ہی نے تجارتی تعلقات کی صورت نکالی۔ اس میں شک نہیں کہ چینی اور وسطی ایشیا میں روس کا بڑھتا ہوا اثر برطانوی سیاست کے لئے آنکھ کا کانٹا ہے۔ لیکن جبتک اغراض کی یہ مضمر مخالفت علانیہ نہ ہو جائے برطانوی سیاسی روسی تجارت کے فوائد سے بھی بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ اور اگر روس کو بولشوکی پروپاگنڈا میں مذہبی تبلیغ کا سا شغف نہ ہوتا تو مخالفتوں کے علانیہ اظہار تک یہ تجارتی تعلق اچھی طرح نبھتا۔ اور اہل بصیرت کا خیال ہے کہ پچھلے دنوں روسی تجارتی وفد کے دفتر کی خلاف قانون تلاشی اور انقطاع تعلقات کا بظاہر اہم سیاسی واقعہ جو انگلستان میں پیش آیا اس کی تہ میں زیادہ تر انگلستان کی قدامت پسند حکومت کی یہ خواہش تھی کہ وہ ملک میں اپنی حریف مزدوروں کی حکومت کے آئندہ امکانات کو اس موقع سے فائدہ اٹھاکر کم کر دے۔

مشرق قریب میں انگلستان کو زیادہ تر فرانس سے واسطہ ہے جنگ کے بعد بڑے بڑے علاقے جو پہلے ترکی کے قبضہ میں تھے ان دونوں طاقتوں کے ہاتھ آئے جمعیت الاقوام کے قواعد کی دفعہ ۲۲ کی رو سے یہ طے پایا کہ یہ علاقے جو ترکوں سے علیحدہ کئے گئے ہیں خود مختار ملک ہیں لیکن جبتک یہ اپنی خود مختاری کو قایم

رکھنے کی قابلیت نہ پیدا کرلیں انگلستان یا فرانس انکی نگرانی کریں۔ ان علاقوں کی آبادی کی خواہشات کو بالائے طاق رکھکر ۲۴ اپریل ۱۹۲۰ء کو سان ریمو کے معاہدہ کی رو سے انگلستان اور فرانس نے ان علاقوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ فرانس کو شام ملا۔ انگلستان کو عراق اور فلسطین۔ ان علاقوں میں انگریزی اور فرانسیسی سیاست اب تک ایک دوسرے کی مخالف رہی ہے۔ شام نے فیصل کو نکالا، انگلستان نے اسے عراق کے تخت پر بٹھایا۔ انگریزوں نے یونانی ترکی جنگ میں یونانیوں کا پورا پورا ساتھ دیا فرانس نے اسی زمانہ میں انگورہ کی عہدنامہ میں ترکوں سے اپنے تعلق کو استوار کیا وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی سیاست آئندہ جنگ میں ترکوں کے مخالف جانبکے امکان کو پیش نظر رکھکر ترکوں کی مخالف ہے اور فرانسیسی سیاست کا مقصد ترکوں سے میل رکھنا ہے برطانوی سیاست اس بات کی پوری کوشش کر رہی ہے کہ عربی دنیا ترکوں سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائے عراق میں فیصل کی، حجاز میں شریف حسین کی مدد، اور فلسطین میں صیہونی تحریک کی حمایت اور یہودیوں کی قومی حکومت کے قیام کی تدبیریں سب اسی غرض کے حصول کے ذریعے ہیں۔ عراق کے معاملات میں تو برطانوی نقطۂ نظر سے خاطر خواہ ترقی ہو رہی ہے، لیکن فلسطین میں یہودیوں کے قدم جانے کا مسئلہ مشتبہ ہے پچھلے چند مہینوں سے وہاں آکر بسنے والے یہودی کثرت سے واپس جا رہے ہیں اور صیہونی تحریک کے یوروپی حمایتیوں میں بھی بہت بددلی پھیل رہی ہے۔ اُدھر حجاز میں شریف حسین کو نجدیوں نے نکال باہر کیا ہے بظاہر دونوں باتیں انگریزوں کی مرضی کے خلاف ہیں لیکن میدان سیاست کے یہ شاطر باد مخالف کے ان جھونکوں سے دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ فلسطین میں عربوں کی تالیف قلوب ہو رہی ہے۔ حجاز میں ابن سعود کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا جا رہا ہے نتیجہ ابھی معلوم نہیں لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ کلیٹن صاحب سلطان ابن سعود سے معاہدہ کی گفتگو کر رہے ہیں فلبی صاحب "مسلمان" ہو گئے ہیں، اور انگریزی اخبارات سلطان کے "تدبر" کی تعریفوں سے پر ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی سیاست کے لئے پچھلی قومی تحریک نے بظاہر بہت سی مشکلیں پیدا کر دی تھیں لیکن ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی نے اب ایک عرصہ کے لئے بالکل مطمئن کر دیا ہے۔ لیکن خود ہندوستان آزادی کے علاوہ بیرون ہند ہندوستانیوں کا مسئلہ سلطنت کے ان گھر کے جھگڑوں میں ہے جنکا چکانا ضروری

ہے یعنی جنوبی افریقہ، کینیا، سابق جرمن مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کیساتھ جو سلوک ہوتا ہے اسمیں خاندانی شکوہ شکایتوں کا رفع کرنا۔ اور اجزا سلطنت کے تعلقات میں ہمواری پیدا کرنا۔

مصر کو برطانوی اغراض کے تحفظ کے بعد ہر طرح کی "آزادی" دیدی گئی ہے جس کی حقیقت اور قدر کے مظاہر مصر اور دنیا کو وقتاً فوقتاً دکھا دئے جاتے ہیں تاکہ "لوگ بھول نہ جائیں" بظاہر ہندوستان اور مصر دونوں میں مجلس آئین، و اصلاح و رعایات و حقوق کی مٹھی مگر خواب آور دوا دو یہ کا استعمال ابھی بہت دنوں جاری رہے گا۔

سطور بالا میں نہایت اختصار کے ساتھ ان مسائل کے بس نام لے دئے گئے ہیں جن سے برطانوی سیاست خارجہ دوچار ہے۔ سیاست کے طالبعلم کے لئے انمیں سے ہر مسئلہ بہت غور طلب اور مطالعہ کا محتاج ہی اور امید ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ اپنی سیاسی دلچسپیوں کو روزانہ اخبارات کے "سنسنی خیز" مقالوں سے کچھ آگے بڑھا کر ان مسائل پر بھی ذرا گہری نظر ڈالینگے کہ انمیں سے اکثر دنیا کے مستقبل کے لئے اور خود ہمارے مستقبل کے واسطے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ "جامعہ" کے صفحات میں کبھی کبھی ان مسائل پر تفصیلی بحث ہوا کرے گی۔

عرب فرانسیسی ادبیات میں

(۲)

رولان کا گیت

ناظرین جامعہ کے لئے رولان کے گیت کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے بعض جگہ اصل سے لفظ بلفظ ترجمہ کیا گیا ہے اور بیشتر محض خیالات کو لیکر عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نظم کی اگر ہر تفصیل کو لیا جائے تو بہت طول ہوگا۔ اس کے لئے فرصت کا انتظار ہے

یوسف

شارلیمین کی ذات سے ازمنہ وسطیٰ کی بہت ساری ادبی روایات اور کہانیاں وابستہ ہیں، رولان کا گیت بھی انہیں سے ایک ہے۔ اس گیت میں اگرچہ شارلیمین کی شخصیت رولان کے آگے ماند پڑگئی ہے لیکن رولان کے رتبہ کو اس بات سے چار چاند لگ گئے ہیں کہ وہ شارلیمین کا بھانجہ اسکا درباری اور اس کی فوج کے سرداروں میں سے ایک ہے، اس گیت کے اصل مصنف کا کچھ پتہ نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ گیت شارلیمین کی رونسوال کی شکست کے بعد وجود میں آیا، یہ شکست شارلیمین کو ۷۷۸ء میں باسک قوم کے ہاتھوں پرنیس کے پہاڑی دروں میں اٹھانی پڑی۔ اس شکست میں بعض مشہور سردار مارے گئے تھے ساری قوم میں ایک ہلچل مچ گئی مختلف اوقات میں بھاٹوں نے اس جنگ کے شہداء کے حالات نظم کئے ہوں گے لیکن سب سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ اس پوری نظم میں باسک قوم کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ اندلس کے عربوں کو دشمن قرار دیا گیا ہے۔ اسکی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ عربوں کے خلاف مسیحی دنیا میں عام نا راضگی پھیلی ہوئی تھی۔ بھاٹوں نے اپنی پبلک کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوے سارے واقعہ کو بالکل دوسرا ہی رنگ دے دیا، یا یہ کہ کلیسا نے مسلمانوں کے خلاف تبلیغ کے لیے یہ گیت بنوا کر بھاٹوں کے ذریعہ مشہور کرایا۔ غرضکہ اس باب میں مختلف ادبی نظریے پیش کیے جاسکتے ہیں اور بحث کیجا سکتی ہے، اس گیت کا مصنف کوئی بھی ہو لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں میلوں اور مذہبی تیوہاروں کے موقع پر یہ گیت گایا جاتا تھا اور اس کے بعد سے برابر

ازمنہ وسطیٰ میں یہ گیت نہایت مقبول رہا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ یہی رولان کی کہانی تھوڑے بہت فرق کیساتھ اطالوی اور ہسپانی ادب کے علاوہ جرمن اور ڈچ زبان تک میں موجود ہے۔

اس گیت میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں انہیں اکثر مبالغہ اور غلط بیانی دونوں سے کام لیا گیا ہے اس مبالغہ کی نوعیت بالکل وہی ہے جو مسلمان فسانہ گوؤں نے حضرت خالد اور حضرت حمزہ کے جنگی کارنامے بیان کرنے میں برتی ہے۔ مسلمانوں کے متعلق جو غلط بیانیاں ہیں وہ دو باتوں پر دال ہیں، یا تو جان بوجھکر کلیسا نے انکی اشاعت کی یا یہ کہ بھاٹوں کی معلومات محدود تھیں، انہوں نے جیسا سنا ویسا ہی نظم کر دیا مثلاً مسلمانوں کو اپولو کا پرستار بتانا ایک قابل مضحکہ غلطی ہے۔ اصل میں اس گیت پر تاریخی حیثیت سے تنقید ہی نہ کرنی چاہئے۔ اس گیت کے گانے والوں کو کبھی یہ گمان بھی نہ ہوا ہوگا کہ آئندہ چلکر کوئی انکی روایتوں پر تنقید کرنے بیٹھے گا۔ انہیں تو شاید اسکا بھی یقین ہو کہ کوئی ان گیتوں کو جمع کر کے لکھے گا اور پھر یہ بھی نظر رکھنا چاہئے کہ ازمنہ وسطیٰ کی سوسائٹی اپنی تنقیدی قوت بہت کم استعمال کرتی تھی، سوچنے کا کام ایک مخصوص طبقہ کے ذمہ تھا۔ اس جماعت نے جو کہدیا سب نے امنا صدقنا کر دیا، اگرچہ اس لحاظ سے ازمنہ وسطیٰ کی سوسائٹی اور موجودہ سوسائٹی میں بہت بڑا فرق نہیں، پہلے مذہبی طبقہ عام لوگوں کے لیے سوچنے کا فرض ادا کرتا تھا۔ اب سیاسی جماعتیں بعینہٖ وہی فرض انجام دے رہی ہیں، عام آدمی نہ پہلے سوچتا تھا نہ اب سوچتا ہے لیکن تاہم پھر بھی فرد آج پہلے سے زیادہ آزاد ہے۔

اس گیت کی ابتدیوں ہے "ہمارے پادشاہ شارل اعظم پورے سات برس اندلس میں ٹھہرے یہانتک کہ سمندر کے کنارے تک جتنی زمین تھی ساری فتح کر لی، کوئی قلعہ کوئی شہر، کوئی فصیل رکاوٹ کیلیے باقی نہیں رہی، بس ایک شہر سارا گوس رہ گیا جو پہاڑی پر واقع ہے، پادشاہ مارسل اس گدی پر حکومت کرتا ہے۔ یہ پادشاہ خدا کو نہیں مانتا، یہ محمد کو پوجتا ہے اور اپولو کا پرستار ہے، وہ بھلا ہمارے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکیگا، اسکی قسمت میں خواری لکھی ہے۔"

پادشاہ مارسل کو جب شارلیمن کے اس ارادہ کی خبر ملتی ہے کہ وہ سارا گوس پر حملہ آور ہوگا تو وہ سراسیمہ ہو کر دربار منعقد کرتا ہے۔ سب مشیروں سے رائے لیتا ہے اور بعد میں یہ بات طے پاتی ہے کہ شارلیمن

کو کچھ دے ولاکرنال دنیا اچھا ہے، بلاندکندران[1] اپنی لمبی سفید داڑھی کی قسم کھاکر کہتا ہے کہ "اگر ہم شیر، اونٹ، شکاری کتے اور چار سو خچر سونے چاندی سے لدے ہوئے مع پچاس رتھوں کے آج شارلیمین کے پاس ضمانت کے طور پر بھجوا دیں تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ وہ ہمارے شہر پر حملہ کا ارادہ فسخ کر دیگا۔ اس کے سپاہی ماندہ ہیں۔ اور وہ خود اپنے دیس واپس جانیکا متمنی ہے"۔ بادشاہ مارسیل اپنے خواص میں سے کلارآن والی بالاگوئے، استمارآن[2] ہیریاموں، اور گرلان لمبی ڈاڑھی والے کو بلا بھیجتا ہے تاکہ ان سے آخری مشورہ کرکے کوئی فیصلہ کرے۔

چنانچہ فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ بلاندکندران کی سرکردگی میں شارلیمین کو بہلانے کے لیے وفد بھیجا جائے بادشاہ شارلیمین کوردو فتح کر چکا ہے۔ ایک سبزہ زار میں مع اپنے درباریوں کے فروکش ہے۔ اس شہر کے سارے بت پرستوں[3] نے مسیحی دین قبول کر لیا ہے۔ سپاہی مگن ہیں۔ کوئی شطرنج کھیلتا ہے، کوئی پٹہ بازی میں مشغول ہے۔ بلاندکندران اور اس کے ساتھیوں کو دیکھکر سب کے سب حیران رہ جاتے ہیں۔ وفد کی پیشی ہوتی ہے اور بادشاہ مارسیل کی سب شرطیں شارلیمین کے سامنے پیش کیجاتی ہیں۔

باوجود بلاندکندران کی چکنی چپڑی باتوں کے بادشاہ شارلیمین کو اعتبار نہیں ہوتا لیکن جب اس نے بلاندکندران کی زبان سے یہ سنا کہ بادشاہ مارسیل شاہی خاندان کے شہزادیوں کو اور وہ خود اپنے دو بیٹوں کو کفالت کے طور پر شارلیمین کے حوالے کرنے کو تیار ہیں تو ذرا اس نے اپنا سر جھکایا، داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور آخری جواب دینے سے پہلے اپنے مشیروں کو مشورہ[4] کے لئے طلب کیا۔

---

[1] بلاندکندران بادشاہ مارسیل کے مشیروں میں سب سے زیادہ عاقل اور تجربہ کار ہے، اس گیت میں آخر تک اسکا ذکر ہے اسکی چالیں بڑی کارگر ہوتی ہیں شارلیمین کے پاس جو وفد مارسیل کیطرف سے گیا ہے اسمیں یہی شخص ترجمان اور امیر وفد ہے۔

[2] یہ نام بظاہر عرب نہیں معلوم ہوتے۔ معلوم نہیں انکی کیا اصلیت ہے۔

[3] یعنی مسلمان۔ مسلمانوں کے لیے لفظ Pa... برابر اسی گیت میں استعمال کیا گیا ہے، مذہبی اصطلاح میں اس لفظ کے معنی غیر مسیحی اور بت پرست دونوں ہیں۔

[4] اس گیت سے اس زمانہ کے طرز حکومت پر بہت روشنی پڑتی ہے، شارلیمین کوئی بات بھی بغیر اپنے مشیروں کے مشورہ بغیر نہیں کرتا، دراصل ابتدائی فرانک حکومت نے بہت دنوں تک اپنے اجداد کے جمہوری انسٹیٹیوشن فرانس میں بھی قائم رکھے

میثر سب اپنی اپنی رائے دیتے ہیں، انہیں رولان اور گینیلوں کی شخصیتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ ساری کہانی انہیں دونوں کے کیرکٹروں کا بیان ہے، رولان، جوان ناتجربہ کار اور جنگ کا خواشمند ہے برخلاف اس کے گینیلون تجربہ کار ہے اور صلح کیطرف مائل نظر آتا ہے، رولان نے جب درباریوں کا یہ رنگ دیکھا کہ وہ سب جنگ سے تھک گئے ہیں اور فرانس واپس جانے کیلئے کوئی نہ کوئی عذر ڈھونڈتے ہیں تو کڑک کر یوں مخاطب ہوتا ہے "کیا تم لوگوں نے ماریل کی پرفریب باتوں کا یقین کرلیا۔ کیا سات سال ہم نے مفت میں ان پہاڑوں میں جان کھپائی ہے۔ کیا میں نے نوبل، کومیل، والسترن، بین، بلاگوے اور تودیل عربوں سے بیکار فتح کیے، یہ سب دھوکا ہے دھوکا! ماریل نے زیتون کی شاخیں[۱] دیکر چند آدمی بھجوائے اور تم نے انکی باتوں پر یقین کرلیا، واہ وا واہ وا"

طے یہ پایا کہ ماریل کے پاس بادشاہ شارل اپنے ایلچی بھیجے اور عربوں سے صلح کی چند شرطیں منظور کرائے ایسی حالت میں دشمن کے ملک میں جانا اپنی جان پر کھیلنا تھا چنانچہ بادشاہ شارل کی خدمت کے جوش اور اپنی بہادری کے گھمنڈ پر ضعیف العمر نواب نائم، رولان اور ریمس کے پادری تریان نے باری باری اپنے آپ کو پیش کیا لیکن شارل نے ان تینوں کی تجویزیں منظور نہ کیں، نواب نائم اس کام کے لیے بہت بڈھا تھا، پادری تریان کے مشورہ کی ہروقت اسے ضرورت تھی اور رولان ناتجربہ کار اور سیاسی چالوں سے ناواقف ہونیکی بنا پر اس سفارت کے لیے موزوں نہ تھا۔ بالآخر رولان نے اٹھکر گینیلون[۲] کا نام پیش کیا جو درباریوں میں سب سے زیادہ جنگ ختم کرنیکا حامی اور صلح کرنے کا آرزومند تھا۔ گینیلون دلیں تو اس مصیبت سے نکل چھٹنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ شارل کو رولان کی اس تجویز سے اتفاق ہے تو خواہی نخواہی رضامندی ظاہر کی، اُسے اداس دیکھکر رولان نے اسے جلانیکے لیے ٹھٹھہ مارا، رولان کی اس ہنسی نے زخم پر نمک کا کام

---

[۱] زیتون کی شاخیں صلح کی نشانی سمجھی جاتی ہیں۔

[۲] گینیلون وہی شخص ہے جو آخر میں جاکر اپنے ہم وطنوں کو عربوں کے خلاف اور اپنی ذاتی پرخاش کی بنا پر دغا دے گا برخلاف اس کے رولان شجاعت، جوانمردی اور حب الوطنی کا مجسمہ ہے آجتک فرانسیسی مدارس میں بچوں کو رولان کا گیت پڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے سامنے حب الوطن کا ایک آئڈیل قائم کرسکیں،

کیا۔ چنانچہ اس نقشہ کو گینلوں کبھی نہیں بھولیگا اور اپنی عیاریوں سے ایسی تدبیریں کریگا جو بالآخر رولان کی تباہی کا باعث ہوں گی۔

گینلون نے ہمت کی اور بادشاہ کیطرف یوں مخاطب ہوا، "میں سارا گوس جاؤں گا، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہاں جانا موت کے ہم معنی ہے۔ یہ واضح رہے کہ میری بیوی آپ کی بہن ہے، اس بیوی کے میرا ایک بیٹا ہے جسکا نام آپ جانتے ہیں، بادوان ہے، میں اپنی ساری زمین جائداد اُسے چھوڑے جاتا ہوں۔ میں اپنی آنکھوں سے شاید اب اسے نہ دیکھ سکوں گا، اسے آپ کے سپرد کرتا ہوں"۔ یہ کہکر وہ روانہ ہونا چاہتا تھا کہ بادشاہ نے دستانہ اور سونٹا دینا چاہا لیکن یہ دستانہ گینلون کے ہاتھ سے گر پڑا، دستانہ کا گرنا جسکو فرانسیسیوں میں بڑی منحوس نشانی سمجھی جاتی ہے، سب لوگ کہنے لگے کہ نامعلوم ہم پر کیا مصیبت نازل ہونیوالی ہے۔ گینلون جانتا تھا کہ وہ کیا اور کون سی مصیبت ہے۔ اس نے کہا عنقریب تم سن لوگے یا دیکھ لوگے۔ بالآخر گینلوں اپنی زرہ بہن پہنا کر اور ہتھیار لگا کر عرب ایلچیوں کے ساتھ اندلس کیطرف روانہ ہوتا ہے۔ بلانکندران سے راستہ میں یوں باتیں شروع ہوتی ہیں:۔

بلانکندران۔ تمہارا بادشاہ شارل واقعی عجیب وغریب انسان ہے، اس نے پوے اور سارا کا سارا کالابر فتح کر لئے، صرف یہی نہیں بلکہ سمندر پار انگلستان کے سینٹ پیٹر[1] تک سے خراج وصول کر لیا ہمارے ملک میں کیا دھرا ہے، اُدھر اس نے بیکار رُخ کیا ہے۔

گینلون۔ اسکی مرضی ہی ٹھہری، کوئی اسے روک تھوڑی سکتا ہے۔

بلانکندران۔ فرانسیسی تو بڑی شریف نسل کے لوگ ہیں، تمام کام نوابوں نے خراب کیا ہے۔ یہ ہر وقت بادشاہ کو مشورے دیتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ تم لوگوں کو بڑا ہی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

گینلون۔ جہانتک میں جانتا ہوں ایسا نہیں، اصل میں صرف رولان ہے جو ہم سب کو مصیبت میں ڈلوا کے چھوڑے گا۔ ہر روز وہ موت کے منہ تک جاتا ہے اور بچ جاتا ہے، اسکا گھمنڈ اسے تباہ کر کے چھوڑیگا مرنے بھی وہ کسی طرح تو ہمیں چین ملے۔

---

[1] یہ بھاٹوں کی خود ساختہ تاریخ ہے۔

بلانڈکندران۔ واقعی رولان اس لائق ہے کہ ہر شخص اس سے نفرت کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی ساری قوموں کو نیچا دکھائے اور انکی زمینوں پر قبضہ کرے۔

گینلون۔ یہ تو ہے لیکن فرانسیسی اس سے بڑی محبت کرتے ہیں، وہ کبھی اسے دغا نہ دیں گے۔ وہ ہمیشہ انہیں دولت، گھوڑے، خچر، ہتھیار اور ریشمی چادریں دیتا رہتا ہے، میری سمجھ میں تو اس طرح وہ مشرق تک سارے ملک فتح کر ڈالیگا۔

باتوں باتوں میں گینلون اور بلانڈکندران میں یہ طے پا جاتا ہے کہ رولان کے ہلاک کرنے کی کوئی تدبیر سوچنی چاہیئے۔

گینلون ایلچیوں کے ساتھ مارسیل کے دربار میں پہنچتا ہے، بلانڈکندران اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور اس طرح خطاب کرتا ہے "سلامتی ہو ساتھ نام محمدؐ اور اپولو[1] کے اور محفوظ رکھیں ہمیں ہمارے قوانین، ہم نے آپ کا پیغام شارل کو پہنچا دیا، اس نے ہماری باتیں سنکر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کیطرف اٹھائے اور اپنے خدا کی تعریف کی اور کوئی قطعی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے ایک مشہور مشیر کو آپ سے گفتگو کرنیکے لئے بھیجا ہے، اسکی گفتگو سے آپ کو صلح کی سب شرطیں معلوم ہوجائیں گی

مارسیل۔ اچھا گینلون کو جو کہنا ہے آئے اور کہے،

گینلون پیش کیا جاتا ہے اور یوں مخاطب ہوتا ہے "سلامتی ساتھ نام خدا کے جس کی ہم سب کو پرستش کرنی چاہئے، شارلیمین آپ کے پاس یہ پیغام بھیجتا ہے کہ آپ فوراً مسیحی قانون اپنے یہاں نافذ کرلیں اور نصف اسپین کی آدھی بادشاہت اس کے حوالے کریں اور اگر ان شرطوں پر آپ کو معاہدہ منظور نہیں تو اپنی گرفتاری اور اپنی موت کے لیے تیار رہیے، یہ ایک بے شرمی کی موت ہوگی۔"

بادشاہ مارسیل یہ سنکر غصہ سے کپکپا گیا، اپنی کمان پر تیر چڑھایا اور شست لگا ہی تھا کہ درباریوں

---

[1] ان بھاٹوں کی سمجھ میں سارے غیرمسیحی اپولو کے پجاری ہوتے تھے، مسلمانوں کے لئے انہوں نے یہ تخصیص کی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام اپولو کے ساتھ بڑھا دیتے ہیں تاکہ ان غیرمسیحیوں میں جو مسلمان نہیں ہیں اور انہیں جو مسلمان ہیں تمیز ہوسکے۔

نے روک دیا۔ گینلون نے یہ دیکھکر اپنا ہاتھ اپنی تلوار پر رکھا اور میان سے دو انگل باہر نکال لیا۔ سب چلا اٹھے کہ اس گڑبڑ کو دور کرو۔ سب عرب سرداروں نے بادشاہ کی خوشامد کرکرا کے اسے تخت پر جا بٹھایا۔ گینلون کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑا۔ جب اس نے دیکھا کہ دربار میں خاموشی ہے تو بادشاہ کیطرف بڑھ کے یوں بولا "آپ بیکار غصہ ہوئے شارل بادشاہ فرانس نے یہی شرطیں آپ کے پاس بھجوائی ہیں، وہ آپ کیلئے آدھا اسپین چھوڑے دیتا ہے آدھا وہ اپنے بھانجے رولان کے لئے لینا چاہتا ہے۔ آپ کا سابقہ ایک بڑی ہی مغرور ہیرو سے پڑے گا، اگر آپ اس معاہدہ پر رضامند نہیں ہوتے تو شارل خود سارا گوس کا محاصرہ کرنے آتا ہے، آپ گرفتار کرکے ایکس[1] بھیجے جائیں گے، راستہ کی سواری کے لئے نہ آپ کو گھوڑا دیا جائیگا نہ خچر کسی باربرداری کے جانور پر آپ کو چڑھا دیا جائیگا اور پھر اسکے بعد آپ کے لیے موت کا حکم ہے۔ لیجئے یہ مہر شدہ کاغذات لیجئے، انہیں یہی باتیں لکھی ہیں"

بادشاہ مارسیل اپنے غصہ پر نادم ہوا گینلون کے ہاتھ سے کاغذات لیکر انہیں کھولا، اپنے مشیروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ شارل نے باسان اور بازیل کے قتل کی یاد دہانی کی ہے، ان دونوں کو میں نے پہاڑ آلتوا پر مروا ڈالا تھا، اگر مجھ اپنی جان پیاری ہے تو چاہئے کہ اپنے چچا التعالیف کو بطور کفالت کے اس کے پاس بھیجدوں سوائے اس کے ہمارے تعلقات قائم کرنیکی اور کوئی دوسری صورت نہیں"

اتنا سنکر مارسیل کا بیٹا کچھ عرض کرنے کی اجازت لیکر بادشاہ کی خدمت میں یوں مخاطب ہوتا ہے۔
"گینلون نے جو احمقانہ باتیں کہی ہیں انکے بعد اسے کوئی حق نہیں کہ وہ زندہ رہ سکے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ اسکے ساتھ انصاف کروں"

گینلون نے یہ سنا اور اپنی تلوار میان سے نکال لی اور ایک شاہ بلوط کے پیڑ کے نیچے جاکر کھڑا ہو گیا مارسیل نے جیسے کہ اس نوجوان کی باتوں کو سنا ہی نہیں، اپنے مشیروں کو تخلیہ میں بلایا اور ان سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہئے، بلاند کندران کو سارا حال معلوم تھا ہی اس نے سب باتیں بادشاہ کو بتائیں اور کہا کہ

---

[1] ایکس فرانس کے جنوب مشرق میں ایک شہر ہے عربوں نے ۷۳۱ء میں اسپر قبضہ کر لیا تھا۔ فرانس کی ازمنہ وسطی کی تاریخ میں اپنی علمی اور صنعتی خصوصیتوں کیوجہ سے اس شہر کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

گینلون ہمارے مقصد کے لیے بڑے کام کا آدمی ہے اُس نے مجھسے اس بارہ میں عہد کیا ہے ۔ بلامدکندران

پھر دوسری مرتبہ گینلون کو بادشاہ کی حضوری میں پیش کرتا ہے

مارسیل :"میں نے تمہارے ساتھ بڑی بکی کا برتاؤ روا رکھا میں غصہ میں تمہیں مارنا چاہتا تھا ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل شام سے پہلے پہل اس حرکت کی تلافی کروں گا ۔ مجھے تم سے محبت ہے میری خواہش ہے کہ تم اپنے بادشاہ شارل کا احوال ذرا اپنی زبان سے سناؤ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ بہت ضعیف ہو گیا ہوگا ، اس نے اپنی عمر بسر کر لی ، بھلا اسکی عمر ۲۰۰ سے کم کیا ہو گی ، دیس دیس اسکا بھجانا پڑا ہے ، اس کی ڈھال نے نجانے کتنی زدیں سہی ہیں ، اس کا تو کچھ کہنا ہی نہیں کہ اس نے کتنی دولت حاصل کی اور کتنے تاج والوں کو فقیر کر دیا ۔"

گینلون ۔ جی ہاں ، جو کوئی اسے دیکھتا ہے کہتا ہے کہ واقعی شارل سے بڑھکر کوئی بہادر نہیں ، باوجود بڑھاپے کے اس کی جوانمردی زبان زد عالم ہے ۔ میں اسکے اوصاف بیان کرنے سے قاصر ہوں ۔ اتنی بڑائی اور نیکیوں کے لئے میرے پاس لفظ نہیں ، اس کی ذات سے دنیا میں شرافت کا اظہار ہے ، وہ اپنے باجگذار نوابوں سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ موت کو اس بات پر ترجیح دیگا کہ انکے ساتھ بے عہدی یا بے وفائی کرے

سب درباری ۔ بھلا کوئی بتاؤ تو کہ شارل کا جی ابتک لڑائیوں سے بھرا کیوں نہیں ؟ کیا اس کی کبھی امید ہے ؟

گینلون ۔ کبھی نہیں جب تک اسکا جنگجو بھانجہ رولان زندہ ہے اسوقت تک لڑائیاں جاری رہیں گی آسمان کے گنبد کے تلے رولان اور اولیو[۵] سے جیسا جنگجو شاید ہی کوئی اور ہو ، ان دونوں سے شارل کو بے انتہا محبت ہے ، یہ دونوں شارل کے ۲۰ ہزار ہراول کے افسر ہیں انکے بھروسہ پر شارل دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا

---

[۵] اولیوئے ۔ رولان کے خاص دوستوں اور شارل کے مقربوں میں سے ہے ، اس نوجوان کی موت اس گیت میں بڑے پر درد طریقہ پر بیان کی گئی ہے ، اولیوئے جرمن بہادری کا اعلیٰ نمونہ ہے ، آخری معرکہ میں جب رولان بھی ہمت چھوڑ رہا تھا اسوقت اولیوئے نے رولان کو شرم دلائی ہے ۔ رولان کی نسبت اولیوئے کی بہن آدہ سے ہو چکی تھی چنانچہ اولیوئے کہتا ہے کہ اگر رولان نے ذرا بھی بزدلی کی تو وہ اس لائق نہیں کہ میری بہن کیساتھ ہمبستر ہو سکے گیت کا یہ حصہ جرمن شجاعت کی اعلیٰ مثالوں میں سے سمجھا جاتا ہے ۔

مارسیل ۔ میرے پاس ایسی فوج ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں، میں چار لاکھ سپاہیوں کو ہر وقت تیار کر سکتا ہوں اور چاہوں تو شارل کی فرانسیسی افواج کو شکست دیدوں۔

گینلون ۔ ذرا یہ آسان کام نہیں۔ آپ بے فائدہ اپنے بے گنتی آدمیوں کی جان ضائع کریں گے، اس حماقت کو چھوڑیے عقل کی باتیں کیجئے، شارل کو دھن دولت دیکر واپس کیجئے۔ کفالت کے لیے ۲۰ آدمی دربار سے بھیجیئے تو شاید شارل پیاری فرانس[1] کیطرف واپس چلا جائے، عقب کی فوج چھوڑ جائیگا، اسی رولان اور اولیوئے پر سب سے زیادہ اعتماد ہے، یہ دونوں فوج کے ساتھ رہیں گے، اگر آپ میری سنیں تو ان دونو کو ہلاک کرنیکی تدبیریں نکل سکتی ہیں، شارل کا دل ان دونوں کی موت ناگہانی سے پاش پاش ہو جائے گا اور پھر ہمیشہ کے لئے وہ لڑائی کا خیال چھوڑ دے گا۔

مارسیل ۔ بھلا ایسی کونسی تدبیر ہے

گینلون ۔ مجھے معلوم ہے، تم اپنے ایک لاکھ آدمی رولان اور اولیوے کے خلاف بھیجدو، پہلے وار میں تمہارے آدمی ہار جائیں گے اور انکے بھی لیکن آخر شجاعت کہانتک کام کریگی۔ اُنکے تھکے ماندے آدمی تمہارے حملے کی تاب نہیں لاسکیں گے، رولان اور اولیوئے قتل ہو گئے تو گویا شارل کا سیدھا ہاتھ دھڑ سے کٹ گیا۔ پھر کیا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہیں چھٹی ہو جائیگی۔

مارسیل ۔ اگر اسی تدبیر پر عمل کرنا ہے تو پھر معاہدہ سے کیا فائدہ ؟

گینلون ۔ میں اپنی تلوار مرغلیط کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں ولیوں کی نشانیاں[2] ہیں کہ میں تمہارے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

ان باتوں کے بعد مارسیل نے ایک کتاب منگوائی جو ہاتھی دانت کی چوکی پر رکھی رہتی تھی اس کتاب

---

[1] جرمنوں کو فرانس میں آباد ہوئے دو صدیاں بھی نہیں ہوئیں لیکن فرانس کی سرزمین سے انہیں اتنی محبت ہے کہ گویا وہ اپنے آبائی وطن کو بالکل بھول گئے۔ وطن کا جب ذکر ہوتا ہے تو درباری اور سپاہی پیارا وطن کہکر اپنے جذبات حب الوطنی کا اظہار کرتے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب وطنیت سے دنیا بیگانہ تھی، کلیسا زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھا لیکن شارل کی فوج میں پادری تک بھی مذہبیت کے ساتھ ساتھ وطنیت کا دیوانہ نظر آتا ہے

[2] ازمنہ وسطیٰ میں سردار لوگ اپنی تلوار کی موٹھ میں تعویذ وغیرہ رکھوا لیتے تھے تاکہ جنگ کے وقت انکی غیب سے مدد ہوتی رہے۔

میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قانون لکھا ہوا تھا۔ ایک عرب نے اسپر ہاتھ رکھا اور قسم کھائی کہ اگر عقب میں رولان ہوا تو بچ کر نہیں جا سکیگا۔

گینلون۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

ملکہ براسیموند نے گینلون سے کہا کہ وہ اسکی بیوی کے لئے دو ہار بھجوائیگی جنکی قیمت روما کے سب خزانوں سے زیادہ ہوگی۔ تمہارے بادشاہ نے ایسی چیز کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھی ہوگی، مارسیل نے گینلون کے کندھوں پر ہاتھ رکھکر کہا۔ تم بڑے دانا ہو میں تمہیں مالا مال کئے دیتا ہوں اگر تم رولان کو عقب میں رکھوا دو۔

گینلون ۔ مجھے اب دیر ہو رہی ہے، مجھے روانہ ہو جانا چاہیئے۔

بادشاہ شارل شہر گالن کے قریب ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ گینلون کی واپسی کا اسے سخت انتظار ہے تڑکے ہی گینلون شہر میں پہنچ جاتا ہے، بادشاہ دیرے بستر سے اٹھا صبح کے بھجن سننے سناتے میں اور دیر ہوئی، دروازہ سے جب نکلا تو رولان، اولیوئے اور نواب نائم کے ساتھ گینلون بھی تھا

گینلون۔ حضور والا۔ سلامتی ہو آپ پر میں سارا گوس سے شہر کی کنجیاں لیکر آیا ہوں اور ساتھ ہی مارسیل نے آپ کی خدمت میں ایک بہت بڑا خزانہ اور ۲۰ کفالتی جانیں بھیجی ہیں۔ اگر وہ اپنے چچا الغالیف کو نہ بھیج سکا تو اسمیں اسکا کوئی قصور نہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے ۴ لاکھ مسلح سپاہیوں کو دیکھا جو الغالیف کیساتھ سمندر کی طرف بھاگ گئے ہیں کیونکہ یہ لوگ اس مسیحی قانون کے ماتحت نہیں رہنا چاہتے جسے مارسیل نے قبول کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہت دور سمندر میں نہیں گئے ہوں گے کہ طوفان نے انہیں آلیا ہوگا اور وہ سب ڈوب کر ختم ہو چکے ہونگے۔ آپ یقین کریں کہ ایک مہینہ نہیں گذرنے پائیگا کہ مارسیل خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اسی قانون کو قبول کریگا جو آپ اسے دیں گے۔

شارل۔ تم نے اپنا منصب بہت خوبی سے انجام دیا تمہیں اسکا بدلہ ملیگا، اچھا سب سپاہ کو پیارے فرانس واپس ہونیکی خوشخبری دو۔ (بقیہ حصہ آئندہ)

غزل

(از جناب مولانا سید شرف الدین صاحب یاس و مومن استاد جامعہ ملیہ)

نمودِ گل کی ہے کیا لالہ کس شمار میں ہے   یہ رنگ و بو سب اسی کی عیاں بہار میں ہے
جنوں کے فیض سے رونق عجب بہار میں ہے   کہ جوئے خون بھی رواں دشت و کوہسار میں ہے
مزہ تڑپ میں ہے تسکین اضطراب میں ہے   تری قسم ہے کہ تو بھی دلِ فگار میں ہے
سمائے جاتے ہیں آنکھوں میں تیرے دیوانے   عجیب حسن گریبان تار تار میں ہے
خوشا وہ زیست کہ گذری اسی کے در پہ بسر   خوشا یہ موت کہ اب قبر کوئے یار میں ہے
ہزار کچھ ہو مگر ایک دن ملو گے تم لہ   بندھی ہوئی میری امید انتظار میں ہے
نہ لب پہ شکر و شکایت نہ دل میں یاس و امید   عجیب حال مرا جلوہ گاہِ یار میں ہے
برنگِ گل جسے دیکھو ہے آپ سے باہر   عجیب رنگ جہاں موسمِ بہار میں ہے
نہ مل نہ مل تجھے بدنام ہی کریں گے ہم   وہ تیری ضد ہے تو یہ اپنے اختیار میں ہے
ملا کے خاک میں دیتے ہیں دولتِ جاوید   یہ رسم و راہ عجب عشق کے دیار میں ہے
ہزار حشر اٹھا جی کبھی نہ چھوڑے گا لہ   امید ہے تو بہت دم امیدوار میں ہے
ٹھہرنے دیتی ہے تجھکو کہاں تیری شوخی   قرار ہے تو اسی قلبِ بیقرار میں ہے

وہ اضطراب وہ بیچینیاں نہیں اے یاس
خدا کے فضل سے دل اب تو اختیار میں ہے

لہ عذابِ ہجرِ بتاں سے ملی اماں مومن

تضمین

(از مولنا مومن ٹونکی)

تضمین میں مولنا کو خاص قدرت حاصل ہے جسے نقادان فن نے تسلیم کیا ہے۔ اس وقت حافظ کے دو شعروں پر آپکی تضمین ہدیۂ ناظرین ہے۔ انشاء اللہ ہم پھر کبھی مزید نمونے پیش کر سکینگے۔

(۱)

تُل گیا جور پہ تو میں نے بھی سر ٹیک دیا

چھوڑنا اب نہ خدا کے لئے تسمہ بھی لگا

قہر ڈھا، حشر اٹھا، خوب ستا، خوب جلا

عہد کردی کہ بسوزی ز غم خویشم مرا

ہیچ غم نیست تو می سوز کہ من میسازم

(۲)

نشتر چبھوے دل میں کلیجہ میں برچھیاں

سینہ پہ چڑھ کے حلق پہ خنجر کیا رواں

اب خاک و خوں میں ہم کو ملا کر چلا کہاں

از دامن تو دست نہ دارند عاشقاں

پیراہن صبوری ایشاں دریدہ

آسمانی بجلی

ہر شخص نے بجلی کا طوفان دیکھا ہے جس میں چمک اور گرج دونوں ہوتی ہیں۔ کبھی یہ بارش سے قبل ہوتا ہے اور اکثر اس وقت ہوتا ہے کہ گرد و غبار آسمان پر زیادہ ہو یا آندھی آتی ہو۔ بارش سے قبل کا اکثر خطرناک ہوتا ہے اور بجلی گرنے کے حوادث اکثر ہوتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہو یا ہو چکی ہو تو بھی یہ طوفان دیکھنے میں آتا ہے۔ مگر بجلی گرنے کا حادثہ کم ہوتا ہے۔ ابتدائی قومیں یعنی جنکے دماغی قوا نشو و نما اور تربیت یافتہ نہیں ہوتے۔ ہر مظہر قدرت کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اکثر بجلی کو پوجتے ہیں یہانتک کہ قرون وسطےٰ میں یورپ میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ گرجوں کے اگر گھنٹے بجائے جائیں تو طوفان ٹل جائیگا۔ اور جب طوفان آتا تھا تو گھنٹے بجائے جاتے تھے چنانچہ یورپ کے کسی گاؤں میں اسی طرح طوفان آیا اور تمام گاؤں کے لوگوں نے رسیاں پکڑ کر گرجے کے گھنٹے بجانا شروع کیے۔ اتفاق سے اسی وقت بجلی گرجا پر گری اور یہ سب فنا ہو گئے۔ یہ محض جہالت کا سبب ہے۔ ہندوستان میں بھی بعض لوگ بجلی کے متعلق عجب عجب توہمات رکھتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ سیاہ یا سرخ کپڑے پر بجلی زیادہ گرتی ہے۔ کالے سانپ پر یا دودھ والے جانور پر بجلی گرتی ہے۔ یا اُس شخص پر بجلی گرتی ہے جو اُلٹا پیدا ہوا ہو۔ یا اور اسی طرح کے خرافات خیالات عوام میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون میں ہم سائنٹفک وجہ بجلی کے طوفان کی سمجھائیں گے اور پھر یہ بھی بتائینگے کہ بجائے گھنٹے وغیرہ بجانیکے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے مکان اور جان محفوظ رہ سکیں۔

سب سے پہلے امریکن طبیب بجن فرینکلن نے یہ دریافت کیا کہ مصنوعی بجلی یعنی وہ جو رگڑ سے پیدا ہوتی ہے یا مشین وغیرہ سے تیار ہوتی ہے وہ اور آسمانی بجلی ایک ہی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہ مطیع ہے اور ہم اسے بنا سکتے ہیں اور قابو میں رکھ سکتے اور یہ آسمانی بجلی نہ ہمارے قابو کی ہے اور نہ اس پر ہم نے ابتک اپنا اثر جمایا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی یہ ہم کو ہلاک بھی کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے ایک پتنگ ریشمی کپڑے کی بنائی اور اُسپر ایک تانبے کا تار لگا دیا۔ ایک ڈوری باندھکر اس پتنگ کو آسمان پر چڑہا کر نیچے ایک ریشمی رومال سے اُسے پکڑا اور ڈوری میں ایک کنجی بھی باندہ دی اور جب کنجی کے پاس کوئی ہاتھ لے جاتا تھا تو یہ چنگاریاں

نکلتی تھیں اسی ڈورے سے اُس نے اپنا LEYDEN JAR لیڈنی مرتبان بھر لیا جس سے ثابت ہوا کہ اس بجلی میں جو زمین پر ہے اور اسمیں جو آسمان پر ہے کچھ فرق نہیں ہے۔ یہ نظریہ فرنیکلن نے انیسویں صدی کے ابتدا میں معلوم کر لیا تھا اور اسی بنا پر اُس نے برق ربا LIGHTNING CONDUCTOR بنایا جو مکانوں۔ برجیوں اور مناروں پر لگایا جاتا ہے۔ ایک روسی پروفیسر اسی قسم کا تجربہ کرنے میں ہلاک بھی ہوگیا کیونکہ اُس نے اُس ریشمی رومال کی احتیاط نہیں کی تھی جو فرنیکلن نے اپنے ابتدائی تجربہ میں کی تھی۔

یہ اٹھارہویں صدی ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ بادلوں میں دو قسم کی بجلی ہوتی ہے۔ ایک کا نام مثبت دوسری کا منفی رکھا۔ بطور رسم یہ مان لیا کہ مثبت سے منفی کیطرف بجلی رواں ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جس طرف سے بجلی آتی ہے اسکا نام مثبت رکھا ہے اور جدھر جاتی ہے اسکا نام منفی رکھا ہے۔ مقناطیس کے مانند غیر جنس بجلی ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتی ہے اور ہم جنس سے گریز کرتی ہے۔ یعنی دو تار مثبت کے برابر رکھدیں تو یہ ایک دوسرے کو ڈھکیلینگے اور ان کی بجلیاں آپس میں نہیں ملینگی۔ مگر جب مثبت اور منفی برابر رکھدیے جاویں تو بجلی کی کوشش ہوگی کہ بیچ میں ہوا کو توڑ کر ایک دوسرے سے مل جاویں اور اس میل کے وقت ایک قسم کا شعلہ پیدا ہوتا ہے اور سناٹے کی آواز آتی ہے معمل میں WIHMSHURST مشین ایک عام چیز ہے۔ اسمیں سے کئی کئی انچ لمبا شعلہ نکل سکتا ہے اور شاید ہی دنیا میں کوئی بجلی کا طالبعلم ہو جس نے ناواقفگی میں اس کے تار کا جھٹکا نہ کھایا ہو۔ اس مشین میں کئی ہزار وولٹ[1] پیدا ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ اُس میں رو کم ہوتی ہے اس لئے آدمی نہیں مرتا۔ بادلوں میں بھی یہی دو قسم کی بجلی پائی جاتی ہے جب ایک بادل دوسرے مختلف قسم کی بجلی کے بادل کے قریب آجاتا ہے تو ایک میں سے بجلی دوسرے میں بھر جاتی ہے اور چمک پیدا ہوتی ہے بعض وقت ہم اسکے ساتھ جو سناٹا ہوتا ہے دوری کیوجہ سے اور اُس کے کمزور

---

[1] وولٹ بجلی کا ایک پیمانہ ہے۔ جیسے لیمپ میں چھ وولٹ کی قوت ہوتی ہے پنکھوں اور بجلی کی روشنی میں ۱۱۰ سے ۲۲۰ یا شاذ ۲۵۰ وولٹ ہوتے ہیں جسمیں جھٹکا لگتا ہے۔ اور اگر دیر تک تار جسم سے متصل رہے تو خطرناک ہوتا ہے۔ امریکہ میں بجلی کے ذریعہ ہی قصاص لیا جاتا ہے۔ ایکہزار وولٹ کا محض برائے نام چھو جانا ہی انسان کو عدم آباد پہنچانیکے لئے کافی ہے۔

نکلتی تھیں اسی ڈورے سے اُس نے اپنا LEYDEN JAR لیڈنی مرتبان بھر لیا جس سے ثابت ہوا کہ اس بجلی میں جو زمین پر ہے اور اُسمیں جو آسمان پر ہے کچھ فرق نہیں ہے۔ یہ نظریہ فرنیکلن نے انیسویں صدی کے ابتدا میں معلوم کر لیا تھا اور اسی بنا پر اُس نے برق ربا LIGHTNING CONDUCTOR بنایا جو مکانوں۔ برجیوں اور مناروں پر لگایا جاتا ہے۔ ایک روسی پروفیسر اسی قسم کا تجربہ کرنے میں ہلاک بھی ہوگیا کیونکہ اُس نے اُس یقینی زوال کی احتیاط نہیں کی تھی جو فرنیکلن نے اپنے ابتدائی تجربہ میں کی تھی۔

یہ اٹھارہویں صدی ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ بادلوں میں دو قسم کی بجلی ہوتی ہے۔ ایک کا نام مثبت دوسری کا منفی رکھا۔ بطور رسمّا یہ مان لیا کہ مثبت سے منفی کیطرف بجلی رواں ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جس طرف سے بجلی آتی ہے اُسکا نام مثبت رکھا ہے اور جدھر جاتی ہے اُسکا نام منفی رکھا ہے۔ مقناطیس کے مانند غیر جنس بجلی ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتی ہے اور ہم جنس سے گریز کرتی ہے۔ یعنی دو تار مثبت کے برابر رکھدیں تو یہ ایک دوسرے کو ڈھکیلینگے اور ان کی بجلیاں آپس میں نہیں ملینگی۔ مگر جب مثبت اور منفی برابر رکھدیے جاویں تو بجلی کی کوشش ہوگی کہ بیچ میں ہوا کو توڑ کر ایک دوسرے سے مل جاویں اور اس میل کے وقت ایک قسم کا شعلہ پیدا ہوتا ہے اور سناٹے کی آواز آتی ہے معمل میں WIHMSHURST مشین ایک عام چیز ہے۔ اسمیں سے کئی کئی انچ لمبا شعلہ نکل سکتا ہے اور شاید ہی دنیا میں کوئی بجلی کا طالبعلم ہوگا جس نے نادانستگی میں اس کے تار کا جھٹکا نہ کھایا ہو۔ اس مشین میں کئی ہزار وولٹ[1] پیدا ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ اُس میں رو کم ہوتی ہے اس لئے آدمی نہیں مرتا۔ بادلوں میں بھی یہی دو قسم کی بجلی پائی جاتی ہے جب ایک قسم بادل دوسرے مختلف قسم کی بجلی کے بادل کے قریب آجاتا ہے تو ایک میں سے بجلی دوسرے میں بھر جاتی ہے اور چمک پیدا ہوتی ہے بعض وقت ہم اسکے ساتھ جو سناٹا ہوتا ہے دوری کیوجہ سے اور اُس کے کمزور

---

[1] وولٹ بجلی کا ایک پیمانہ ہے جیسے لیمپ میں چھ وولٹ کی قوت ہوتی ہے پنکھوں اور بجلی کی روشنی میں ۱۱۰ سے ۲۴۰ یا شاذ ۲۵۰ وولٹ ہوتے ہیں اسمیں جھٹکا لگتا ہے۔ اور اگر دیر تک تار جسم سے متصل رہے تو خطرناک ہوتا ہے۔ امریکہ میں بجلی کے ذریعہ ہی قصاص لیا جاتا ہے۔ ایکہزار وولٹ کا محض برائے نام چھو جانا ہی انسان کو عدم آباد بھیجنے کیلئے کافی ہے۔

ہونیکی وجہ سے نہیں سن سکتے۔ اور بعض وقت جب یہ تناؤ زور کا ہو تو گرج ہمکو سنائی دیتی ہے۔ ایسی بجلی جو ایک بادل سے دوسرے بادل میں سرایت کرے اُسے برق خرشف SHEET LIGTNING کہتے ہیں۔

بعض اوقات ایک بادل سے دوسرے بادل اور دوسرے سے تیسرے میں بجلی میں بھرتی چلی جاتی ہے یہانتک کہ اسمیں اسقدر زور ہو جاتا ہے کہ ہوا انہیں روک سکتی اور یہ زمین پر گرنا چاہتی ہے بجلی کی ایک چمک بعض اوقات سکنڈ کے کئی لاکھویں حصہ کے وقفہ کی ہوتی ہے مگر اپنی شدت کی وجہ سے ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ دیر تک چمکتی رہی۔ اسمیں کروڑوں گھوڑوں کی قوت ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ ابتک یہ ہمکو دھوکے دے رہی ہے۔ اور انسان کے قابو میں نہیں آسکی۔ دنیا کی تمام قوتوں کی طرح یہ بھی کم سے کم مزاحمت کا راستہ ڈھونڈتی ہے۔ چنانچہ بلند عمارتیں چمنی۔ منارے۔ برج۔ درخت وغیرہ جو اس کے قریب آگئے انکے ذریعہ سے یہ زمین میں پیوست ہونا چاہتی ہے۔ اور چونکہ ان چیزوں میں کچھ نہ کچھ مزاحمت ہوتی ہے لہذا ان دونو قوتوں میں یعنی بجلی اور شے مذکورہ میں ایک کشمکش ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجلی زیادہ زور اور کڑاکے کے ساتھ گرتی ہے۔ ایسی بجلی کی شکل آپنے دیکھی ہوگی کہ آسمان پر ایک لہریکی سی ہوتی ہے اسے FORKED LIGHTNING یا برق شاخسانہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کو معلوم کرکے فرینکلن نے تجویز کی کہ اگر عمارتوں پر ایسے تار جنمیں مزاحمت کم ہو بلند مقام پر لگا دیں تو وہ بآسانی بجلی کو گذر جانے دینگے اور نہ کشمکش ہوگی نہ کڑاکا ہوگا اور نہ عمارت کا نقصان ہوگا۔ مگر یہاں اس بات کی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے کہ یہ تار زمین میں دور تک گہرا چلا جائے۔ خشک زمین بھی حاجز[1] ہے یعنی بجلی کو روکتی ہے۔ لہذا ایسے تار زمین میں اتنی گہرائی تک لے جائے جاویں جہاں موسم گرما میں بھی نمی آجائے۔ اس تار کو جو اکثر ایک چوڑی پٹی کی شکل میں لگایا جاتا ہے ایک

---

[1] حاجز۔ Insulator اس مضمون لکھتے وقت ہمیشہ انجمن ترقی اردو کی اصطلاحات پیش نظر رکھتا ہوں اور حتی الامکان وہی ترجمہ لیتا ہوں جو انجمن نے شائع کیا ہے۔ جہاں انجمن کا ترجمہ ناکافی ہوتا ہے اُسے ترمیم کر لیتا ہوں اور جہاں ترجمہ نہیں ملتا وہاں خود [illegible] کر لیتا ہوں۔ چنانچہ برق خرشف۔ برق شاخسانہ۔ برق ربا وغیرہ میں نے وضع کئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب بہتر اصطلاح پیش کریں تو میں خوشی سے قبول کرنیکو تیار ہوں۔ بہتر یہ ہو کہ انجمن خود ایسی اصطلاحات جمع کرتی رہے اور موجودہ اصطلاحات جو نظر ثانی کی بیحد محتاج ہیں جب دوسری مرتبہ شائع کرے تو وہ سب ترمیمیں اور اضافہ شائع کر دے۔

تانبے کی چادر یا لوہے کے پائپ سے خوب وصل کرکے اور جہاں دیکر دفن کریں۔ اگر باریک کوئلے پیس کر اس گڑھے میں بھردیں اور اسے پانی سے خوب تر کردیں تو نمی دیر پا رہتی ہے۔ اکثر اس تار کو کنویں میں اتار دیتے ہیں یا پانی کے نل سے ملا دیتے ہیں۔ اس طرح تار کو لگانے سے حفاظت مکمل ہو جاتی ہے۔ اسے اصطلاح میں TO EARTH یا "زمینا" کہتے ہیں ایسے مکانات پر جو ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں۔ یا پہاڑی پر ہوں برق ربا لگانا ضروری ہے۔ شہروں کی ایسی عمارتیں جو متصل چلی آتی ہیں ان پر بجلی گرنیکا اندیشہ اتنا نہیں ہوتا جتنا منتشر عمارتوں پر ہوتا ہے۔ شہر میں بھی ایسی عمارت پر جو دوسری عمارتوں میں سر بر آوردہ ہو برق ربا لگا دینا چاہئے۔ ایسی عمارتیں جیسی مسجدیں جنمیں دو یا زیادہ منارہ ہوتے ہیں اگر سب مناروں پر تار لگا دئیے جاویں تو مناسب ہے۔ مکان میں دہات جہاں لگی ہو خصوصاً مکین کے سائبان انہیں ضرور زمینا چاہئے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ بجلی کم سے کم مزاحمت کے راستہ سے گزرنا چاہتی ہے یعنی وہ موصل میں سے گذرنا پسند کرتی ہے بمقابلہ کسی غیر موصل یا حاجز چیز کے۔ تمام دھاتیں موصل ہوتی ہیں۔ اور اسی لیے دھات کے خصوصاً تانبے کے برق ربا بناتے ہیں[۱]۔ مگر علاوہ دھاتوں کے اور بھی چیزیں ہیں جو موصل۔ مثلاً کاربن اور دھواں۔ جو دھواں چمنی میں سے نکلتا ہے وہ بھی موصل ہے اس لئے بجلی کا جسوقت طوفان آئے تو آتشدان کے پاس نہ بیٹھنا چاہیے۔ بلکہ وسط کمرہ میں ایسے قالین یا دری پر بیٹھنا چاہئے جو سوکھی ہو۔ کیونکہ خشک کپڑا جہاں حاجز ہے وہاں تر کپڑا نہایت عمدہ موصل بن جاتا ہے اور اگر آپ جنگل میں ہوں اور بجلی کا طوفان آجائے یعنی یہ معلوم ہو کہ بالکل سمت الراس پر ہے تو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ بجلی کے گرنیکا امکان آپ پر زیادہ ہے۔ ایسے وقت میں کسی اونچے درخت[۲] کے نیچے پناہ نہ لیں۔ کیونکہ بلند چیز پر بجلی کے گرنیکا احتمال زیادہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض وقت درخت پر بجلی گرے اور اسکے نیچے جو آدمی ہے وہ بوجہ براہ راست اسکی زد میں نہ آئے مگر درخت کے گرنے یا اس کی کسی بھاری شاخ کے گرنے سے آدمی مجروح ہو سکتا ہے۔ ایسے وقت پانی سے

---

[۱] تمام دھاتوں میں سب سے کم مزاحمت چاندی میں پھر تانبے میں ہوتی ہے۔ مگر چاندی چونکہ بہت گراں ہے اور مزاحمت کا فرق کم ہے اس لئے عام طور پر تانبا استعمال ہوتا ہے۔

[۲] حدیث میں بھی منع ہے۔

بھیگنے کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ بلکہ درخت سے ہٹ کر کھلے میدان میں آجانا چاہئے۔ اگر گھنا جنگل ہے تو اونچے درختوں کی پناہ نہ لے۔ بلکہ کسی چھوٹے درخت یا جھاڑی کی آڑ پکڑنا چاہئے۔ اگر بالکل چٹیل میدان ہو تو سواری سے اتر کر اس کے پاس تھوڑے فاصلہ پر لیٹ جانا چاہئے۔ کیونکہ سواری نسبتاً زیادہ بلند ہے اگر کوئی گڑھا مل جائے تو گڑھے میں لیٹنا زیادہ بہتر ہے۔ بیٹھے رہنے میں بھی نسبتاً زیادہ خدشہ ہے گیلے کپڑے حفاظت کا باعث ہو سکتے ہیں کیونکہ سوکھے کپڑے کے مقابلہ میں گیلا کپڑا بہتر موصل ہے۔ اگر کسی پر بجلی گرنے والی ہے تو زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ گیلے کپڑوں میں سے یعنی انسان کی بالائی سطح پر سے گزر جائے۔ اور جسم میں سے ہو کر نہ گذرے۔ اگر کوئی لمبی لکڑی یا برچھا ہو تو اسے گاڑ کر اس سے قدرے فاصلے پر لیٹنا چاہئے۔ اگر لکڑی بالکل خشک ہو تو گیلا کپڑا اس پر لپیٹ دیں کہ زمین تک پہنچ جائے چھتری جس کے ہاتھ میں ہو اسے اسکی احتیاط ضرور رکھنی چاہئے کہ چھتری اور زمین تک صرف وہی ایک واسطہ نہو۔ اگر لوہے کی ڈنڈی ہے تو اسے زمین پر لگا کر اس کے نیچے بیٹھ جانا چاہئے۔ تاکہ اگر بجلی گرے تو تاروں میں اور ڈنڈی میں ہو کر زمین میں چلی جائے۔ یہ سب احتیاطیں صرف چٹیل میدان میں اور اسوقت کرنی ہیں جب یہ دیکھ لے کہ بالکل سر پر بجلی برق شاخسانہ کی صورت میں چمک رہی ہے۔ اگر سر پر برق شرشف چمک رہی ہے تو پھر ان احتیاطوں کی ضرورت نہیں۔ برق شاخسانہ کی علامت یہ ہے کہ اسمیں کڑک ہوتی ہے اور اسکی شکل لہریہ دار ہوتی ہے

برق ربا کے پاس کھڑے ہونے میں تو کچھ اندیشہ نہیں کیونکہ بجلی گرے گی تو سیدھی زمین میں پیوست ہو جائیگی مگر جس وقت بجلی کا طوفان کہیں بھی آرہا ہو تو تار کے کھمبوں سے دور رہنا چاہئے بعض اوقات گائے بھینس ریل کے کنارہ کے تاروں کے پاس مری ہوتی ملی ہیں۔ حالانکہ انکے سر پر طوفان نہیں آیا۔ بلکہ کسی دور مقام پر طوفان آیا۔ تار پر بجلی گری اور چونکہ تار بعض وقت زمینا نہیں ہوتا۔ یعنی لکڑی یا پتھر پر لگا ہوتا ہے یا لوہے کے کھمبے بھی خشک زمین پر ہوتے ہیں اس لئے بجلی بجائے زمین میں جانیکے تار میں پہنچ کر دور دور تک جو اس کے قریب ہوا ہلاک کرتی چلی گئی۔

بعض کا خیال ہے کہ جہاں ایک دفعہ بجلی گر جاتی ہے وہاں بجلی پھر نہیں گرتی۔ حالانکہ تجربہ نے بتایا ہے

کہ جہاں ایک دفعہ بجلی گر چکی ہے وہاں بجلی کے گرنیکا احتمال زیادہ ہے۔ اول تو یہ کہ ضرور اس مقام میں اور بجلی والا بادل میں مزاحمت کم تھی جب ہی بجلی گری۔ دوسرے پے در پے کئی کئی مرتبہ بھی اسوجہ سے گرنیکا امکان ہے کہ جب بجلی گرتی ہے تو آس پاس کی ہوا میں خلا پیدا ہوجاتا ہے اور ہوا کے خلا کی مزاحمت بہت کم ہوتی ہے۔ اسی لئے اسمیں سے بجلی کے گزرنیکا آسان راستہ بن جاتا ہے۔ جہاں بجلی گرتی ہے وہاں بعض وقت تھوڑی دیر تک گندھک کی سی بو آتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ جب بجلی کا شعلہ پیدا ہوتا ہے تو یہ آکسیجن کے اجزا میں تغیر پیدا کرکے تین جوہروں کا ایک سالمہ بنا دیتا ہے۔ اسے اوزون OZON کہتے ہیں۔ یہ دق۔ دمہ اور پھیپھڑے کے مریضوں کے لیے مفید ہے۔ اس گیس اوزون کی بو گندھک کی بو سے مشابہ ہوتی ہے۔ ورنہ بجلی میں گندھک وغیرہ کچھ نہیں۔

بعض وقت لوگ براہ راست بجلی کے صدمہ سے تو نہیں مرتے بلکہ پاس کسی مقام پر بجلی گری اور ہوا میں خلا پیدا ہوا اس خلے میں چاروں طرف سے ہوا بڑی سرعت کیساتھ داخل ہوتی ہے۔ اسکے جھونکے میں آدمی گر جاتا ہے اور اس خوف سے کہ وہ بجلی سے گرا ہے اس کے قلب کی حرکت بند ہوجاتی ہے اور وہ مرجاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جس نے بجلی کا شعلہ یا چمک دیکھ لی وہ کم سے کم اس خاص ضرب سے محفوظ ہے۔ کڑک ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ کڑک چمک کا نتیجہ ہے اور اگر کسی کے پاس روک گھڑی STOP WATCH ہو اور اسے وہ چمک ہوتے ہی چلا دے اور جو وقت کڑک ہو اسے بند کرکے دیکھ لے کہ کتنے سکنڈ میں آواز آئی اور ۱۱۲۰ فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے حساب لگا سکتا ہے کہ بجلی کتنی دور گری ہے۔ جہازی جنگ میں یہ روک گھڑی بھی دشمن کی توپ کا فاصلہ بتاتی ہے یعنی چمک پیدا ہونیکے بعد توپ کی آواز کے وقفہ کو ناپ کر فاصلہ معلوم کرلیتے ہیں۔

اگر کسی بدنصیب پر بجلی گرجائے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ پورے جسم پر گری ہے یعنی جسم کے اندر سے ہوکر گزری ہے تب تو اس کے بچنے کی امید نہیں جسکی علامت یہ ہے کہ جسم کٹ جائیگا یا سیاہ پڑ جائیگا اور درجہ حرارت جسم کا تھوڑی دیر تک بخار کا سا رہے گا۔ مگر صرف قلب کی حرکت بند ہوگئی ہو تو مصنوعی تنفس سے آدمی کے بچنے کی امید ہے۔ مصنوعی طریقہ تنفس کا فوراً شروع کردے اور ڈاکٹر کو فوراً بلالیں۔ مگر جب تک ڈاکٹر نہ آئے

یہ ترکیب[1] کریں۔ ایسے مریض کو پہلے زمین پر اوندھا لٹا دے۔ اُس کے پاس بھیڑ نہ ہونے دے۔ ہوا کھلی ہوتی صاف ہو۔ اگر کپڑے بھیگے ہوں تو ایک آدمی گیلے کپڑے اتار کر سوکھے کپڑے پہنا دے۔ مگر تنفس کے علاج میں دیر نکرے یہ فوراً شروع ہوجانا چاہئے۔ اوندھا اس طرح لٹایا جائے کہ دونوں ہاتھ آگے کیطرف پھیلے ہوں۔ سر ایک جانب کو جھکا ہوا دونوں ہاتھوں کے بیچ میں رہے۔ ایک شخص اُسکی کمر پر اس طرح بیٹھے کہ وہ اُس کی دونوں رانوں کے بیچ میں آجائے مگر اس پر بوجھ نہ ہو۔ اور یہ بیٹھنے والا شخص اُس کی پیٹھ کو اس طرح دونوں ہاتھوں سے سونتے کہ اُس کے پھیپھڑوں پر ایک دفعہ بوجھ ہو کہ وہ دبیں اور اُنمیں کی ہوا خارج ہو۔ اور دوسری دفعہ میں یہ سب بوجھ نیچے کیطرف کمر تک آجائے تاکہ پھیپھڑوں میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے ان میں ہوا بھر جائے۔ یہ عمل منٹ میں پندرہ بیس کی رفتار سے ہوتا رہے۔ کیونکہ انسان اسی قدر سانس ایک منٹ میں لیتا ہے۔ اگر مضروب کی بتیسی بند نہیں ہوئی ہے تو اُس کی زبان کو باہر کھینچ لینا چاہئے۔ کوئی تیز چیز مثلاً برانڈی، قہوہ، یا چائے کوشش کرکے پلا دینا چاہئے۔ مگر یہ چیزیں بہت گرم نہوں۔ اُس کے تمام جسم کو گرم رکھنا چاہئے۔ اگر آکسیجن کے سلنڈر میسر ہوں تو اُن کے ذریعہ سے کسی ڈاکٹر کی رائے سے تنفس پہنچانا بھی مفید ہے۔

ضمناً یہاں یہ بات کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کے بجلی کا تار لگ جائے اور اُسکا ہاتھ نہ کھلتا ہو جو اعصاب کے مفلوج ہوجانیکی وجہ سے نہیں کھلتا۔ اور جسے عوام کہتے ہیں کہ بجلی نے پکڑ لیا تو ایسے وقت جو شخص اُس کے قریب ہو اور مدد دینا چاہتا ہے وہ اُس برق زدہ کو سوکھے کپڑے سے پکڑ کر کھینچے مگر جسم کو ہاتھ نہ لگائے۔ ورنہ خود بھی مبتلا ہوجائیگا۔ یا کسی لکڑی کی ڈنڈی کی چھتری یا لکڑی سے اُسے اپنی طرف کھینچے۔ اگر کچھ نہو تو لات مار کر اُسے دھکا دے (بعد میں چاہے تو معافی مانگ لے) دوپٹہ یا رومال یا رسی ہو تو اُسے پھینک کر اُس کے ذریعہ سے کھینچے۔ لات مارنے میں یہ مصلحت ہے کہ اگر بجلی شخص مذکور میں سے بچانے والے میں سرایت کریگی تو صرف ٹانگوں میں ہی سرایت کرے گی اور چونکہ ٹانگوں میں کوئی عضو رئیس

---

[1] یہ ترکیب تنفس کی پانی میں ڈوبے ہوئے گیس سے مسموم ہوئے، مارگزیدہ۔ یا مکان میں جو بجلی کے تار لگے ہوتے ہیں اُن سے چھو کر بیہوش ہونے والوں پر بھی استعمال کیجا سکتی ہے۔

نہیں ہے اس لئے سوائے ایک جھٹکے کے اندیشہ جان کا نہیں ہے۔ اگر ہاتھ سے کھینچے گا تو اس ہاتھ کے ذریعہ بجلی سرایت کرے گی اور قلب میں سے ہو کر زمین میں سرایت کریگی جس کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اگر کسی کے پاس سوکھی لکڑی کی کلہاڑی ہو تو تار پر ایک ضرب لگا کر کاٹ دے کہ برقی رو قطع ہو جائے مگر یہ دیکھ لے کہ لکڑی سوکھی ہے گیلی لکڑی میں سے بجلی سرایت کر جائیگی۔ ان کے کپڑے پکڑ کر کھینچنے میں صرف ایک ہاتھ استعمال کریں یہ تو ہر برقی انجنیر کو چاہئے کہ ایک ہاتھ ہمیشہ جیب میں رکھے تاکہ اگر بجلی گزرے تو ایک ہاتھ کے ذریعہ سے ٹانگوں میں گزرے۔ مگر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گزرنے میں بیچ میں دل ہوتا جس پر صدمہ کا پہنچنا مہلک ہے۔ ہندوستان میں بعض وقت ٹرام کے تار گر جاتے ہیں اور تار کی زد میں دو دو تین تین آدمی ایک دوسرے کو بچانے کی کوشش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں یہ احتیاطیں مفید ہونگی۔

ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک

انیسویں اور بیسویں صدی میں ایشیائی تاریخ کی امتیازی خصوصیت وہ تمدنی تحریک ہے جو مشرق بعید میں رونما ہوئی یعنی ترکی اور جاپان میں شروع شروع میں مقصد دونوں جگہ ایک ہی تھا لیکن اپنے منازل ارتقا میں اس تحریک نے دونوں ملکوں میں بالکل مختلف حیثیت اختیار کرلی جاپان میں اسکا نتیجہ یورپ کی مادی اور صنعتی تہذیب کو قبول کرنیکی شکل میں نکلا۔ جاپانیوں کو تھوڑے زمانہ میں جو کامیابی نصیب ہوئی اُس کی وجہ اُنکے ذہنی اور جماعتی حالات اُنکا جغرافی موقعہ اور اُن کی مضبوط اور دانشمندانہ سیاست تھی جس نے اس انقلاب کی اندرونی کلفتوں کو نہایت کامیابی سے دفع کیا۔ جاپانی تجارت صنعت، فوج، بیڑہ جو اسکی وجہ سے عالم وجود میں آئے اور وہ تجارتی اور صنعتی ذہنیت جو ان تمام چیزوں کے پیچھے موجود ہے اُس نے یورپ سے خراج تحسین وصول کیا۔ جدید جاپان کی شکل میں مغرب نے خود اپنے چہرہ کا نظارہ کیا۔

ترکی میں اس تحریک نے بالکل دوسری راہ اختیار کی جاپان میں جن داخلی و خارجی اسباب نے سہولتیں پیدا کی تھیں انہوں نے یہاں رکاوٹیں پیدا کیں، ملک کی قومی ترکیب، قوم کی ذہنی حالت کل تمدنی زندگی پر حاوی اور ساری مذہب، بادشاہ کی غلط استعمال ہونے والی قوت اور جغرافی موقعہ کیوجہ سے یورپ کی سیاست یہ سب چیزیں تمدنی زندگی کی تجدید اور تشکیل نو کی راہ میں حائل ہیں اور نہایت صبر اور استقلال سے کام کرنیکے بعد مغلوب ہوسکتی ہیں۔ انکی وجہ سے ترقی کی رفتار یہاں بہت دھیمی رہی اور تحریک کا سارا زور جو در اصل خارجی مقاصد کے لیے تھا اندر کیطرف یعنی ذہنی زندگی پر جا پڑا۔ جاپان میں یورپ کی مادی اور صنعتی تہذیب کو قبول کرنیکی وجہ سے ملک کی معاشی حالت میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا تھا برخلاف اس کے ترکوں کے ہاں ایک ذہنی انقلاب رونما ہوا جس کا نتیجہ ایک نیا تصور کائنات اور

حیات، ایک جدید شاعری (جس نے اس تصور کو پیدا کیا اور آگے بڑھایا) اور ایک نیا ــــ مذہب نکلا ہر چند اس انقلاب کے جیسے مظاہر نشاۃ ثانیہ، تحریک انسانیت اور مذہبی سدھار کی تحریک میں پائے جاتے ہیں لیکن ہمارے صنعتی عہد میں جو قوموں کی قدر کا اندازہ زیادہ تر انکی مادی کامیابیوں سے کرتا ہے اس انقلاب کو کسی نے نہیں سمجھا چنانچہ مغربی ممالک کے دوست اور دشمن دونوں کے لیے جدید ترکی ایک معمہ ہے اہل مغرب کو ترکی میں ایک ایسی دنیا دکھائی دیتی ہے جو ہنوز قرون وسطیٰ کی تاریکی میں مدفون ہے حالانکہ مدت سے یہاں ایک نئی ذہنیت اپنی اشاعت و نفوذ کے لیے مخالف قوتوں کے خلاف زور و شور سے برسر پیکار ہے۔

اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس انقلاب کے رجحانات اور مسائل انکے ارتقاء اور نتائج کو مربوط شکل میں پیش کیا جائے۔ اسمیں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ترکی میں مذکورۂ بالا تصور حیات و کائنات کس طرح پیدا ہوا۔ شاعری نے کس طرح اسکی تخلیق و تشکیل کی اور بالآخر نئی ذہنیت کس طرح پیدا ہوئی جو تمام جماعتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو از سر نو ترتیب دینے اور اسلام کی بے شمار امکانات سے ایک نئے مذہب کی تشکیل کی آرزومند ہے۔

ترکیہ جدید کی اس تمدنی تحریک کا تفصیل کیساتھ بیان دینا گویا تمدنی زندگی کے تمام شعبوں یعنی فنون و علوم، سیاست و آئین، معیشت اور جماعتی و مذہبی زندگی میں اسوقت تک کے کل نتائج کی وضاحت کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بات اس رسالہ کے مقصد اور حدود سے آگے بڑھ جائیگی اس لیے کہ اسمیں ہمارا مقصد انیسویں اور بیسویں صدیوں میں ترکوں کی تمدنی تاریخ لکھنا نہیں ہے بلکہ اس تحریک کے مجموعی رُخ، بنیادی رجحانات اس کے ذہنی اور روحانی مواد و مسائل کا جستہ جستہ بیان کر دینا ہے جو ترکوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کر رہی ہے، اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر مواد کو استعمال کیا گیا ہے۔ زمانی اور تاریخی ترتیب کے بجائے مرتب شکل میں مسئلہ کو پیش کرنا مقصود ہے اسی وجہ سے واقعات کے صحیح تاریخی ربط کو باصراحت پیش نہیں کیا گیا ہے۔ کل مواد کی تقسیم اور اسکے منفرد اجزا کی توضیح بھی یکساں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اہم تمدنی عناصر اور کثیر العواقب واقعات میں زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصف کے قریب رسالہ مذہبی

مسئلہ کے لئے وقف کرنا پڑتا ہے۔ مشرقی انسانوں کی تقدیر زیادہ تر اُنکے مذاہب کی تقدیر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے مسئلہ تمدن یہاں ہمیشہ مذہبی مسئلہ بن جاتا ہے۔ مشرقی انسان جو اپنی ذات اور اُسکی حدود کا بدرجۂ اتم شعور رکھتا ہے۔ اسی شعور حدود کی وجہ سے خراب جاتا ہے کہ یہ اُس کی قوت ارادی کو فنا کرنے کا باعث ہے اُس کی تہذیب باطنی کا کمال اُس کی شخصیت کی کمزوری بن جاتا ہے۔ مشرقی انسان کا سکون اُس کے عمق کا نتیجہ ہی خود اُسکا ارادہ عمل کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ مشرق کی سکون پسندی کا مفہوم یہی ہے، اگر کوئی تخلیقی کام بطور تمدنی عمل کے ہوتا بھی ہے تو ضروری ہے کہ یہ دیوتاؤں کی طرف سے ہو چنانچہ جب سے ترک ایشیا کے تمدنی حلقہ میں داخل ہوئے ہیں اُنکا بھی یہی حال ہے۔ لہذا وہ تمدنی تحریک جس سے ہم یہاں بحث کرنا چاہتے ہیں اپنے فیصلہ کن مدارج میں پہنچکر مذہبی تحریک ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس رسالہ کے تمام توضیحات میں اسلام کو اس درجہ دخل ہے۔

ان توضیحات کی بنیاد کس مواد پر رکھی گئی ہے؟ اس موضوع پر مغرب میں جو تھوڑی بہت کتابیں ہیں ظاہر ہے کہ اُنکو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن اُن کی اتباع کا امکان نہ تھا۔

ترکیہ جدید پر تین قسم کے لوگوں نے کام کیا ہے:۔ (۱) اخباروں کے نامہ نگار، سیاح، قنصل خانوں کے عہدہ دار، سیاسین وغیرہ یعنی وہ لوگ جو اہل علم نہیں ہیں، (۲) مخصوص علوم کے حامل مثلاً مورخ، محققین، معاشی (۳) مغربی مستشرقین، مصنف کتاب کا خیال ہے کہ یہ لوگ جس راہ پر چلے ہیں اُس پر نہ چلنا اس کے لئے جائز ہی نہیں ضروری ہے۔ پہلے گروہ کے نمائندوں سے کوئی علمی بحث کرنا بیکار ہے۔ ہر چند کہ یورپ میں اُنکا غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ شاید مستثنیات کو چھوڑ کر اُنکے متعلق کہا جا سکتا ہو کہ یہ لوگ جو اطلاعات دیتے ہیں وہ خود ثابت کرتی ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ دوسرے گروہ کے علما ممکن ہے کسی اور حیثیت سے مغرب کے لئے مفید کام انجام دیتے ہوں لیکن ترکیہ جدید کے سمجھنے میں اُن سے کوئی مدد نہیں ملی۔ یہ یا تو خالص علمی تحقیقات کرتے ہیں یا یورپی اقوام کے لئے نئے نئے میدان عمل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی صورت میں یہ اپنے موضوع کو تمام و کمال موجودہ یورپ کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، اپنے معیاروں کے مطابق اُس پر کام کرتے ہیں اور تاریخی ہمدردی سے بالکل مبرا ہوتے

ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی کی کل تمدنی زندگی سے ناواقف ہوتے ہیں حالانکہ اس سے واقف ہونیکے بعد ہی اسکے مختلف شعبوں کو سمجھنا ممکن ہے۔ دوسری صورت میں انکا موضوع خود کوئی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا ہے بلکہ تمدن مغربی کے اصول و مقاصد کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے! وراس طرح ان علما کی تحقیق کم و بیش تحقیق نوآبادیات کا رنگ اختیار کرلیتی ہے، اس سے ملک اور اس کے باشندوں کے متعلق معلومات بہم پہنچتی ہے اور اس معلومات کو عملی طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ترکوں کی روح اور عہد حاضر کی ذہنیت سے بہت دور رہتے ہیں۔

مستشرق ظاہر ہے کہ زیادہ تر لسانی دلچسپی رکھتا ہے اور وہ بھی حال کی بہ نسبت ماضی سے زیادہ جہاں تک عام تمدن کا تعلق ہے یہ ابھی تاریخ سے آگے نہیں بڑھے ہیں ہاں پچھلے چند سالوں میں اور جرمنی کے اندر خصوصًا دوران جنگ میں انکی توجہ دور حاضر کے ترکوں کیطرف منعطف ہوئی لیکن اس میدان میں ابھی صحیح سوال قائم کرنیکی ضرورت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک حد تک یہ لوگ بھی دوسرے گروہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مستشرقین میں جو لوگ اسلام کی تحقیق میں مصروف ہیں انہوں نے ترکیہ جدید کی مذہبی تحریک میں بہت کم دلچسپی ظاہر کی ہے (اس سلسلہ میں بس ایک مارٹھ مان کی کتاب جدید عثمانی شاعری کا نام لیا جاسکتا ہے)

رائج الوقت مغربی تصنیفات سے علیحدہ رائے اختیار کرنیکی ایک اور وجہ بھی ہے، مذہب سب چیزوں سے علیحدہ اپنی نشو و نما اور حرکت نہیں رکھتا۔ وہ مطلق خود مختاری جو پہلے اس سے منسوب کیجاتی تھی اب اس سے چھین رہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ مظاہر مذہبی کو بھی تمدنی زندگی اور تمدنی تحریک کی مجموعی حالت کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اگر یہ نقطہ نظر اختیار کرلیا جائے تو ماضی اور حال کے تاریخی مذہب اسلام پر بڑی حد تک وہ حکم نہ لگائے جائیں جو علمائے مغرب کیطرف سے لگائے گئے ہیں وہ تقدیر پرستی جس پر اس قدر طعنے دئے جاتے ہیں۔ اسناد پر یقین، دراجتہاد کا بند ہونا۔ یہ سب چیزیں دراصل ممالک اسلامی کے جماعتی، معاشی اور سیاسی حالات سے مشروط ہیں۔ ماضی اور حال دونوں کے مسائل اسلامی پر مغربی توضیحات میں ارتقا، اور نشو و نما کے لزوم کو بالکل نظر انداز کیا ہے۔ ایک

مدیک ان سب میں اسلام پر غور کرنے کا وہی قدیم کلیسائی پادریوں والا نقطۂ نظر کارفرما ہے جس کو اصولاً دورِ حاضر نے رد کر دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کلیسائی اور عیسائی معذرت و تنقید کی جگہ عیسائی اور یورپی قدرو ںنے لی ہے۔

ایسی حالت میں مصنفِ کتاب نے اپنے کو مجبور پایا کہ وہ براہ راست ترکی ماخذ استعمال کرے اور اس طرح انکو وسیع تر حلقوں کے علم میں لے آئے۔ یہ ترکی ماخذ آخر کیا ہیں؟ چونکہ یہ کتاب پوری تمدنی تحریک کو پیش کرنا چاہتی ہے اس لئے اُس کے لئے ضروری ہے کہ علوم و فنون، آئین و معیشت، جماعتی زندگی، فلسفہ، مذہب، ان تمام شعبوں کے مظاہر کو پیش نظر رکھے۔ لیکن ایک ایسی تمدنی تحریک کے متعلق جو ابھی نشو و نما کے عالم میں ہے اور جس میں تقریباً کوئی چیز بھی ختم اور مکمل نہیں ہوئی ہے یہ کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر قدیم تمدن کی ساخت کی وجہ سے بھی بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ترکی علوم کوئی چیز نہیں۔ اس نام سے جو چیز موسوم کیجاتی ہے وہ تقریباً سب کی سب مغربی درآمد ہے۔ آئینی زندگی میں بڑی مشکل درپیش ہے، جدید حکومت نے نیا قانون بنایا جس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ مغربی قانون سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن مختلف جانب سے اسکی مخالفت ہو رہی ہے۔ قانون اسلامی جو اپنی غیر منضبط صورت میں شہری قانون ہے وہ نئی زندگی کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے اور اسمیں ترمیم ہونی چاہئے۔ معیشت جدید کو بھی نئے وجود میں آنے والے افادہ گاہوں، معاشی سیاست کی کارروائیوں اور جدید معاشی قوانین کی وجہ سے ایک آخری شکل اختیار کرنی ہے۔ جماعتی زندگی میں بھی سب کچھ غیر متعین ہے۔ وہ فلسفہ بھی موجود نہیں جو کل ذہنی زندگی کو پیش کر سکے۔ مذہب بھی اپنی شکلیں بدل رہا ہے۔ اس کتاب کا مقصد جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں یہ نہیں ہے کہ اس تحریک کے تمام نتائج اور اسکی تاریخ بیان کیجائے بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس تحریک اور اس کی وجہ سے جو انقلاب ہوا ہے وہ ہے کیا یعنی اُس کی ذہنی اور روحانی حقیقت، اُسکا رجحان اور اُسکے موجودہ مسائل کیا ہیں، اپنے مقصد کو اس طرح محدود کرنے سے ہمارا کام ایک حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ اس تمدنی تحریک کی وجہ سے جو انقلاب رونما ہوا ہے وہ ایک طرف تو ایک نئے تصور

حیات و کائنات کے وجود میں آنے سے عبارت ہے اور دوسری طرف ایک نئی سیاسی اور معاشی جماعت بندی سے۔

ریاست کی نئی تشکیل کا اظہار نو حکمراں کے فرامین سے ۱۸۷۶ء کے قانون دستور سے اور ریاست کے دوسرے اعمال سے ہوتا ہے نئے نظام معاشی کے نشو ونما کو پہلے تو افراد کے اس معاشی رویہ میں دیکھا جا سکتا ہے جو نئے تصور کائنات نے پیدا کیا ہے یعنی طلب منفعت کی نہایت قوی آرزو میں اور دوسرے نئی حکومت کی مالی اور معاشی سیاست میں پہلی چیز کے لیے تو مصنف نے خود اپنے ملاحظات پر بھروسہ کیا ہے اور شعرا کے کلام کو ماخذ قرار دیا ہے۔ اور دوسرے کیلئے حکومت کے مالی اور معاشی قوانین اور دوسری کارروائیوں کو۔

نئے قانون کے متعلق جو ابھی معرض تدوین میں ہے کوئی جداگانہ بحث نہیں کی گئی ہے نظام جماعت کے متعلق بھی براہ راست ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے لیکن مذہبی مسئلہ کے متعلق کافی کتابیں موجود تھیں اور اپنی اپنی جگہ پر انکا صحیح حوالہ بھی دیدیا گیا ہے۔

جدید تصور حیات و کائنات کے لیے شاعری میں خاص ماخذ ہے اور کہا جا چکا ہے کہ شاعری ہی نے اس نئے تصور کو پیدا کیا اور آگے بڑھایا، اس سے آگے بڑھ کر یہ دعوے کیا جا سکتا ہے کہ دراصل یہ سارا تمدنی انقلاب جدید شاعری ہی کا کرشمہ ہے سب سے پہلے اس میں انقلاب ہوا اور پھر یہ انقلاب تمام تمدنی زندگی پر پھیل گیا۔

پاولزن کا قول ہے کہ قومی زندگی کے بڑے بڑے انقلابات اپنا اعلان احساسِ جمال، اور ذوقِ نظر کے تغیر کی صورت میں کرتے ہیں یہ تغیر ترکی میں اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں محسوس ہونے لگا تھا یعنی اسوقت جبکہ مغربی تمدن کا اثر ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ عاکف پاشا (متوفی ۱۲۶۲ھ) کے ہاں جو جدید شاعری کا پہلا علم بردار ہے اس نئے طرز کی تشکیل ہو چکی تھی۔ عاکف پاشا کسی یورپی زبان سے واقف نہ تھا اور اپنی ساری تعلیم کے لئے خود اپنے وطن کا مرہون منت تھا اس نے ترکی ادب کے جمود اور تعطل کا خاتمہ کرنا چاہا، اس نے ایک نئی زبان میں لکھنا شروع کیا اور ایک حد تک شاعری بھی کی اور اس کے بعد آنے والے زمانہ میں اک نئی ذہنیت کی روشنی اپنا پرتو دکھانے لگی جہاں اب تک موت و آخرت کی قصیدہ خوانی تھی وہاں اب یکایک تازہ و خوش آئند آوازیں قوم کو عمل اور تاثر کی حقیقت آشنا زندگی کی دعوت دینے

تھیں سو یہ بات محض اتفاقی ہی نہ تھی۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ترکی فلسفہ کا کوئی وجود نہیں۔ عربی اسلامی تمدن کا تاریخ میں جو حشر ہوا وہ تمام اسلامی اقوام کے لئے سخت مصیبت ثابت ہوا ہے۔ ان لوگوں نے یونانی فلسفہ کو لے لیا تھا اور اسلام کے اصولوں سے اسکی تطبیق کی کوشش کرتے تھے یا کہیں کہیں تھوڑا بہت خود اس فلسفہ سے بھی شغف رکھتے تھے جو چیز مذہب کے باہر ہوتی وہ مذہب کی دشمن تھی اور اس لئے اہل دین کے نزدیک اُسے وجود کا حق حاصل نہ تھا۔ جو چیزیں اسلام کے موافق ہوتیں وہ پھر فلسفہ نہ تھیں، اس کے بعد ایک زمانہ آیا جس میں وہ لامتناہی ذہنی جنگ کالی شروع ہوئی جو کہیں اب جاکر ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس زمانہ میں فلسفہ بے دینی کا مرادف تھا۔ مدرسوں کے نصاب میں منطق تک کو سمجھا جاتا اور مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور نہایت احتیاط سے اسکی تھوڑی تھوڑی خوراکیں پہنچائی جاتی تھیں لیکن خود اپنے فلسفہ کا نہ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ ہر قسم کی فلسفیانہ فکر معدوم تھی۔ تصوف نے شاعری کو آلۂ کار بنا لیا تھا اور شعر کو علم و عرفان کا ذریعہ مقرر کیا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مشرق میں شاعری ہمیشہ سے ذہنی زندگی کی حامل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر فلسفی ہوتے تھے اور فلسفی شاعری کیا کرتے تھے۔

اسی رجحان کا اثر عثمانی ترکی شاعری پر ہمیشہ رہا ہے اور اب بھی واقع ہے۔ ترکی عثمانی ادب کی تاریخ کے شروع میں ہمیں شاعری میں تعلیمی نظم ہی غالب صنف نظر آتی ہے۔ شروع کے شاعر جان بوجھکر اس لئے شعر کہتے ہیں کہ اپنی قوم کو کچھ سکھائیں۔ ایسی تاریخی حیثیت میں ترکی شاعری کو دور جدید میں ایک تمدنی مشن سپرد کر دیا۔ وہ شاعری جو پہلے رائج الوقت اور رفتہ رفتہ بے جان خیالات کی حامل تھی اُس کے ذمہ اب یہ کام ہوا کہ وہ کل تمدنی زندگی کو ایک نئی شکل دے۔ اُس نے اپنا یہ فرض نہایت کامیابی سے پورا بھی کیا۔ اس طرح ترکی شاعری ترکوں کی ذہنی زندگی کا صحیح آئینہ ہے اور اسی وجہ سے جدید تصور کائنات کی تحقیق کے لئے یہی ایک خاص ماخذ ہے۔ یہ بات جدید شاعری کی فرنگی پسند شاخ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہر چند کہ اُس میں ترکی شاعری کی تاریخی، روایتی، تمدنی مقصد کو اصولاً ترک کر دیا ہے۔

جدید عثمانی ترکی شاعری میں سے میں نے بالالتزام اِن لوگوں کے کلام کو پیش نظر رکھا ہے۔ انہا تو کمال

اور عبد الحق حامد۔ ۲۔ توفیق فکرت۔ ۳۔ ضیا گوک الپ اور محمد امین۔ ۴۔ محمد عاکف ان ناموں کے انتخاب کی وجہ بیان کرنا ہمیں بہت دور پہنچا دے گا۔ اس لیے اگرچہ جی نہیں چاہتا تاہم میں اس سے گریز کرتا ہوں۔ اس کے بجائے میں مختصر طور پر اُس حیثیت کو بیان کئے دیتا ہوں جو ان مصنفوں کو اس نئی تمدنی تحریک میں حاصل ہے جس کے یہ حامل ہیں۔

نامق کمال (۱۸۴۰ – ۱۸۸۸ء) خود ایک حد ہے، یہ خالص اسلامی ترکی تمدن کے اساس پر قائم ہے اور اسے زندہ رہنے کے قابل اور قائم رکھنے کے لائق سمجھتا ہے یہ اسے خوب جانتا ہے اور اسلام کی تاریخی شکل کا منکر ہے۔ اس نئے احساس کی وجہ سے جو اسکے اندر بیدار ہے وہ دور حاضر سے بیزار ہے اس لئے اس کی نظر ایک طرف تو قدیم اور اصلی اسلام پر لگی ہوئی ہے جس کی نئی تفسیر کرنیکی کوشش اُس نے متعدد کتابوں اور مضمونوں میں کی ہے اور دوسری طرف آل عثمان کی قدیم تاریخ پر جسے اُس نے خود کئی جلدوں کی ایک کتاب میں پیش کیا (عثمانلی تاریخی غیر مطبوعہ) اپنی ان ادبی سرگرمیوں میں وہ اپنے جدید تصور کائنات کا بھی اعلان کرتا ہے اور اس طرح عہد قدیم کی حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے، اسلام کا نام لیکر وہ دنیا سے بیزاری دنیا سے نفرت اور کاہلی کے خلاف جہاد کرتا ہے اور لوگوں کو عمل کی اور حیات و کائنات کو قبول کرنیکی دعوت دیتا ہے۔ وہ استبداد کا تباہ کن دشمن ہے اور حریت انسانی کا علمبردار ہے عثمانی وطن کا تصور اسی سب سے بڑے ترک محب وطن کی تخلیق ہے۔ اُسکی ساری زندگی اور اُسکی ساری سرگرمی قوم کے لئے ہے "یہی حکومت قوم کی خدمت کا نام ہے"[۵۱] فنون لطیفہ، زبان سب کچھ اُس کے نزدیک بس اس عظیم الشان مقصد عظیم کے حصول کا ذریعہ ہیں جس کے حصول کی آرزو میں وہ بیتاب ہے "اگر میں اپنی قوم کی اس بہار کو دیکھے بغیر مر جاؤں جس کی امید میں جیتا ہوں تو میرے لوح مزار پر لکھ دینا، "وطن سوگ میں ہے اور میں بھی سوگ میں ہوں"[۵۲] یہ مغرب سے بھی واقف ہیں اور مغرب کی تمدنی ترقیاں یہی نہیں کہ کچھ کچھ اسلام سے مطابق ہو سکتی ہیں بلکہ جہاں تک اسلام انکی اجازت دیتا ہے یہ خود اسلام کی مطمح نظر ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنی زوردار

---

۵۱ منتخبات بدائع ادبیہ مرتبہ بوالقرلوزادہ رضا صفحہ ۹۵

۵۲ ایضاً . . . . صفحہ ۲۲۴

انفعالی تحریروں میں وہ ہمیشہ صرف اسلامی خیالات اور عثمانی روایات کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اپنے تمام خیالات کو اسلامی اصولوں سے اخذ کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے اُسکا مذہب کا تصور خالص اسلامی ہے اور اُسکا تفکر و احساس بھی، اپنے قومی تمدن کے اصول اساسی کے سہارے سے اس انقلابی اور انفعالی شخصیت نے جو غیر معمولی قوت اور مضبوط ارادہ سے متصف تھی اپنی اور اپنے بعد میں آنیوالی نسل پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ کمال کوئی بہت بڑا اہل فن نہ تھا لیکن اُسکا اثر اُس ذہنیت کی وجہ سے تھا جو اُس کے فن میں جاری و ساری تھی نظم میں یہ قدیم استادانہ طرز کا متبع تھا لیکن نثر میں اُس نے ایک نئی زبان پیدا کی اور اسے اپنے نئے خیالات کا حامل بنایا۔ وہ نئی ذہنیت جو انیسویں صدی کے آغاز سے اندر اندر تیار ہو رہی تھی اور جو نامق کمال کی ذات میں آکر ظاہر ہوئی، اُس نے نامق کے معاصر و دوست عبدالحق حامد میں اپنا فنی کمال حاصل کیا، حامد اب تک زندہ ہے اور بعد میں آنیوالی تمام تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے

عبدالحق حامد (سال پیدائش ۱۸۵۱ء) مختلف عناصر کا ایک ترکیبی مجموعہ ہے۔ اس نے اپنے تجربہ زندگی میں اسلام اور ترکوں کے ماضی کو پھر زندہ کیا ہے مستقبل کی تشکیل کی ہے۔ اور ان دونوں کو اپنی ذات میں یکجا کر لیا ہے۔ قدامت اس کی ذات میں آکے اپنی زندگی گزارتی ہے لیکن قدیم نہیں معلوم ہوتی جدت نے اسمیں اپنی تکمیل حاصل کی ہے لیکن جدید نظر نہیں آتی۔ اپنی عظمت اور زور کے باوجود نامق کمال کا کام ایک جزوی کام ہے۔ یہ جزئیات میں بہت زیادہ پھنس جاتا ہے اور جھگڑوں میں اپنے کو کھو دیتا ہے اسکا فن اور اُس کی شاعری زندگی میں جا ملی ہے۔ حامد برخلاف اس کے سرتاپا اہل فن ہے کمال کی بےچینی اور سیماب وشی کا اسمیں کہیں پتہ نہیں۔ وہ ایک پرسکون صاحب فکر اہل فن ہے۔ اسکے ہاں زندگی فن اور شعر میں جا کر مل گئی ہے۔ اس کے لئے اپنا فن زندگی ہی کی ایک شکل ہے بلکہ خود زندگی ہے کمال نے ایک دفعہ اسپر اعتراض کیا کہ تم بزدل ہو تو اُس نے ذیل کے الفاظ میں جواب دیا "آپ مجھپر الزام لگاتے ہیں کہ میں بزدل ہوں۔ نہیں میں بزدل نہیں۔ میں کچھ پرسکون ہوں۔ لیکن میرا سکون مستقل نہیں وقت آئیگا تو آپ دیکھ لینگے کہ مجھ میں غصہ بھی ہے اور گرمی بھی۔ استبداد کے خلاف میں نے جو کچھ کہا ہے

اُٹھا ہیں تو بندش کا پتہ بھی نہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھئے کہ جو راہ آپ نے کھولی ہے اُس پر میں چلونگا یہی میری راہ بھی ہے[1]۔ یہ اپنی تصانیف میں دورِ حاضر سے آگے بڑھ گیا ہے اور انہیں استقلال کی تغیر کرتا ہے۔ حال کی بے چینیوں، مخالفتوں، اور ناکامیوں سے وہ اپنے سکون میں کوئی واقع نہیں ہونے دیتا۔ اپنے فن و شعور میں کسی چیز کو پیدا کرلیتا اُس کے نزدیک اصلی حقیقت ہو۔ حامد ایک دوست یعنی مشہور شاعر اور نظری عالم اس کے نام ایک خط لکھتا ہے جس میں اس بات کی شکایت ہو کہ قوم میں فن اور شعر کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ حامد اس بات سے افسردہ نہیں ہوتا اور جواب میں لکھتا ہے: "تم کہتے ہو کہ یہ قوم فن کی حقیقی ماہیت کو نہیں سمجھی گی، یہ بڑے افسوس کی بات ہے لیکن اس سے ہوتا کیا ہے ہمیں چاہئے کہ قوم کا کچھ خیال نہ کریں اور اپنی راہ چلیں۔ حقیقی فن اس بارہ میں وجود الٰہی کی طرح ہے کہ اُس کے کام اور اثرات تو ظاہر اور آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن وہ خود چھپا ہوا ہے اور آنکھوں سے اوجھل ہے"[2] حامد ترکی اور اسلامی عہد گزشتہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے لیکن اسکی ذات سے نئے تصور کائنات و حیات کی شاعرانہ ترجمانی بھی ہوتی ہے۔

حامد رومانی ہے یعنی اُنیسویں صدی کی مغربی رومانیت کا شاگرد ہے۔ یہ تعلق اُس کے لئے بڑا اہم تعلق ثابت ہوا ہے۔ یہ ترکی تمدنی زندگی کی تشکیل کرنیوالا اپنے فن میں بھی بڑا صناع ہے بلکہ اُس کا سب سے بڑا مجدد، قدیم ترکی شاعری کیطرف اُسکا رویہ وہی رومانی ہے جس طرح مغربی رومانیت نے عہد قدیم سے تعلق توڑا اور پرانے آئین صور کو چھوڑا اسی طرح حامد نے فارسی اور عربی اثر کو ختم کیا جسکی حیثیت ترکی فنون لطیفہ کے لئے وہی تھی جو قدیم یونان و روما کی مغربی فنون کے لئے اُس نے قدیم طرز بیان کی پابندیوں کو چھوڑا اور اس طرح ترکی شاعری کو موت سے نجات دی۔ اُسکی یہ کوشش مطالبہ وقت کی اتنی مطابق تھی اور زمانہ نئی شکلوں کو اس طرح ڈھونڈ رہا تھا کہ حامد جلد کامیاب ہوگیا۔ حامد پر مغربی رومانیت ہی کا ایک اثر نہیں ہے بلکہ اور بہت سی مشابہتیں بتائی جا سکتی ہیں۔ مغربی رومانیت میں جو حیثیت ایک کامل خیالی

---

[1] مکتوبلر۔ جلد ۱ صفحہ ۱۰

[2] مکتوبلر صفحہ ۱۳۹

ومانی روایت کی تھی وہ حامد کے ہاں اندلسی عرب فاتحوں کی ہے۔ وہاں جو حیثیت قرون وسطیٰ کی تھی وہ یہاں سلام اور آل عثمان کے عہد قدیم کی داستانوں میں قومی دلچسپی کے ساتھ جو دلچسپی تھی وہ اس کے ہاں یوں ظاہر ہوئی ہے کہ اس نے سب سے پہلے شاعری میں ترکی قومی بحر کا استعمال کیا۔ رومانیت کے تصورات نے اس پر اپنا اثر ڈالا ہے اور رومانی جوش بھی اس کی شاعری کا ایک جزو ہے۔ اس رومانی اثر نے شاعر پر اور بعد کے حالات پر کیسا ہی مفید اثر ڈالا ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس سے نقصان بھی پہنچا ہے بعض دوسرے عناصر سے مل کر جن کا ذکر یہاں نہیں کیا جا سکتا اس کے جذبات کو مکدر کر دیا ہے اور اس کے تصورِ حیات و کائنات میں الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔

اس کے نزدیک بھی شاعری عظیم الشان قومی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے یہ ضرور ہے کہ بجائے خود فن کی ایک شکل ہونے کی وجہ سے اس کو ایک گونہ خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان اعلیٰ تر مقصد کے لئے اسے بطور ذریعہ استعمال کرنا حامد خوب سمجھتا ہے۔ البتہ اس کے بعد آنیوالے فرنگی دوستوں نے اس معاملہ میں اس سے علیحدگی اختیار کی ہے اور یہ اصول اختیار کیا ہے کہ فن کو فن کی خاطر ہونا چاہئے۔

اس مغرب پسند جماعت کا خاص نمائندہ توفیق فکرت ہے (۱۸۶۸ - ۱۹۱۴ء) فکرت کی ذات ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی یا پیچ کی منزل ہے، وہ قدیم بنیادیں جن پر حامد اور کمال مضبوطی کے ساتھ کھڑے تھے اس کے پیروں تلے متزلزل ہو چلی ہیں۔ قدامت ختم ہو گئی ہے اور فکرت کے ساتھی اس سے اپنا رشتہ کاٹ کر مغربی خیالات کے سیلاب میں آ پھنسے ہیں۔ کمال اس کا دشمن تھا اور حامد جنکے مقابلہ میں اپنی ہستی کو قائم رکھتا تھا۔ فکرت کے ہاں دنیا سے نفرت اور یاس مشرقی پائی جاتی ہے (یہ بدھ کی بڑی عظمت کرتا ہے) اگرچہ اس نے آخر میں انکو مغلوب کر لیا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرقی ذہنیت جس نے کمال اور حامد کی ذات میں ظہور کیا تھا فکرت اور اس کے دوستوں میں آ کر ضائع ہو گئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زمانہ بھی دراصل بحث و نزاع کا زمانہ تھا کیونکہ انکے طرز خیال اور طریقہ احساس کے باوجود یہ جدید ذہنیت انکی نظموں میں برابر جھلکتی ہے اور ہم آگے چلکر کمال

اور حامد کے ساتھ اکثر فکرت کا نام بھی پائینگے۔

ضیا گوک الپ (سال ولادت ۱۸۷۵ء) مغرب پسندی کے خلاف ایک ردعمل ہے یہ ایک متلاشی حق ہے اور اہل نظر، وہ عظیم الشان اتحاد ترکیبی جو حامد کی ذات میں ظاہر ہوا تھا مغرب پسندی کے عہد میں اسمیں انتشار پیدا ہو گیا۔ اس میں جو کچھ قدیم چیزیں تھیں انکو لوگوں نے غلط سمجھکر چھوڑ دیا تھا اور جو کچھ نئی تھیں انکی تکمیل اور انکا حصول ابھی باقی تھا۔ تاریخ کا رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ ضیا نے اس حقیقت کو پہچانا اور کوشش کی کہ ایک نیا اتحاد ترکیبی پیدا کرکے اس ہیجان کو رفع کرے۔ چنانچہ ترکی قومیت کا خیال وجود میں آیا۔ اسکے متعلق ہم آگے چلکر دیکھیں گے کہ عثمانی ترکی زمین پر پہلے سے اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ضیا نے صرف اس کی ترجمانی کی اور اس کا مطمح نظر قائم کیا۔

محمد امین (سال ولادت ۱۸۶۹ء) طبقہ عوام کا ایک مدرس ہے یہ ترکوں کے قدیم کارناموں، اُنکے دُکھ درد اور مصیبتوں اور حسن مستقبل کی یہ امید رکھتے ہیں اُسکا گیت گاتا ہے۔ اس کا اصلی مقصد اپنی قوم کے تمام طبقوں میں روشنی پھیلانا ہے۔ نئے خیالات اس کے پاس نہیں ہیں لیکن یہ اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہے اور اس کے خیالات و خواہشات کی ایک خاص شکل میں ترجمانی کرنا خوب جانتا ہے اس لئے ان خیالات اور خواہشات کا اُس کے ہاں مطالعہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

محمد عاکف (سال ولادت ۱۸۷۲ء) اُن تمام تغیرات کا بہت اچھا نمونہ ہے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ اسکا باپ ایک قدیم طرز کا عالم ہے یعنی عالم دین، باپ نے قدیم طرز پر لڑکے کو تعلیم دی ہے اور عاکف اُسی قدیم ذہنیت اور قدیم تصورات کی دنیا میں رہتا ہے۔ ہر چند اُنکی شکل نئی ہے۔ لیکن اس کی ابتدائی نظموں میں بھی عہد قدیم کی فضا پائی جاتی ہے۔ یہ کمال اور حامد کی بڑی عزت کرتا ہے اور مغربیت کا نہایت شدت کیساتھ مخالف ہے لیکن خود ان ابتدائی نظموں میں ایک اندرونی تغیر کے آثار پائے جاتے ہیں یہ تغیر تھوڑے ہی عرصہ میں پورا ہو جاتا ہے اور عاکف قدیم ترکی ایرانی شاعری اور خصوصاً متصوفانہ شاعری سے بالکل جدا ہو جاتا ہے، مغرب پسندی کیطرف چلا جانا اُس کی کیفیات دماغی کے

اعتبار سے بالکل ناممکن ہے، حامد اور کمال اور سب سے زیادہ مصری محمد عبدہ اور فرید وجدی کے زیر اثر یہ ایک نئی راہ نکالتا ہے اور جدید تصور کائنات وحیات سے آکر یوں ملتا ہے کہ دنیا کو عمل اور عمل کو فرض مانتا ہے۔ اسکی شخصی نشو و نما کے یہ منازل گویا کل ترکی قوم کے ارتقاء کے منازل ہیں اس لئے کہا جاسکتا ہے یہ شخص ترکوں کی نئی دنیا کے لئے ایک کائنات مجمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ضیا اور امین میں آکر شاعری نے پھر اپنا تاریخی تمدنی فرض اختیار کرلیا ہے، عاکف کے ہاں تو یہ چیز خاص طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے "میں اب بھی صوفیوں مثلاً حافظ وغیرہ کے کلام کو نہایت لطف لے لے کر پڑھتا ہوں، لیکن یہ میں جان گیا ہوں کہ ان شاعروں کے خیالات انسان کو مادی زندگی سے دور کرتے ہیں اور اس کے احساس فرض کو تلف کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسے فن کا پھل ہیں جو جمود اور زوال کے بدنصیب عہد میں عالم وجود میں آیا۔ یہ آدمیوں پر مخدر کی طرح، افیون کی طرح اثر کرتے ہیں لیکن انکی تو ہمیں ضرورت نہیں۔ میری نظر تو مجھکو یقین دلاتی ہے کہ ہمیں ایک زندہ صحیح اور ذوق عمل پیدا کرنے والے ادب کی ضرورت[1] ہے۔" یہ ان مغرب پسندوں کی شاعری پر بھی ایسا ہی حکم لگاتا ہے جو فن کی خاطر فن کا خالی اصول دہراتے ہیں۔ عاکف فولکٹ ہم خیال ہے کہ فنون لطیفہ کو اہم اغراض تمدنی کیلئے بطور ذریعہ کے استعمال کیا جاسکتا ہے اور تاریخ تمدن کے نقطۂ نظر سے یہ برکت ثابت ہوتی ہے اسمیں شک نہیں کہ وہ اس خیال میں ذرا مبالغہ سے کام لیتا ہے اور شاعری اسکے منظوم وعظ کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور اسکا شاعرانہ اثر زائل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی مختلف عناصر کو ایک نئی ترکیب دینا چاہتا ہے جو ضیا کی ترکیب سے بہت مختلف ہے۔ یہ اس تحریک کا شاعر ہے جسے ہم نے بعد کو تحریک اصلاح کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ ایک مصلح ہے اور اس قسم کا اخلاقی ناقد جیسے شونگلی۔ یہ شعرا، جو اکثر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں دراصل ایک مسلسل ارتقاء کی کڑیاں ہیں، انکی تصانیف نئی ذہنیت کے مختلف حصوں کی حامل ہیں جن سے آگے چلکر آخری ترکیب ہوگی۔

یہ تمدنی تحریک شروع کب ہوتی ہے؟ میں یہ سوال اس جگہ پیش نہ کرتا اگر اس کا بہت قریبی تعلق

---

[1] یہ عبارت شاعر نے ۱۹۱۹ء میں خود لکھوائی تھی۔

ایک دوسرے سوال سے یعنی اس تحریک کے اسباب کے سوال سے نہ ہوتا۔ اس دوسرے سوال کا جواب لوگ نہایت تیقن کیساتھ یہ دیتے ہیں کہ ساری تحریک کا سبب مغربی تمدن کا اثر ہے اس جواب میں یقیناً کچھ حقیقت ہے لیکن جو شخص ترکوں کی سیاسی نہیں بلکہ ذہنی زندگی سے اچھی طرح واقف ہے اسکو اس جواب سے تشفی نہیں ہو سکتی۔ سلطنت عثمانی کی تاریخ ایک مخصوص تمدن کے پیدا ہونے، پھلنے پھولنے اور زوال پذیر ہوجانیکی تاریخ ہے۔ یہ تیرھویں صدی میں شروع ہوتی ہے اور سولھویں صدی میں کمال کو پہنچتی ہے۔ سترھویں صدی میں زوال شروع ہوتا ہے لیکن ذہنی اعتبار سے وہ زوال اٹھارھویں صدی میں ختم ہوجاتا ہے۔ سیاسی اور معاشی انحطاط تو آجتک جاری ہے لیکن ترک جب انیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں تو ایک نئی ذہنیت کے ابھرتے ہوئے عناصر ساتھ لیکر داخل ہوتے ہیں۔ قدیم ترکی شاعری جس کے لئے اٹھارھویں صدی سب سے زیادہ انحطاط کا زمانہ ہے اس کے تمام امکانات ختم ہو چکے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں ایک جدید شاعری کے ابتدا کے شواہد ملتے ہیں (یعنی عاصم مترجم قاموس متوفی ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء اور عاکف پاشا متوفی ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء کے کلام میں) ذہنی تجدید کی خواہش یہاں پہلے سے موجود ہے پیٹر اعظم اور کاتھرینا ثانی کے زمانہ میں اس کی ترقی اور مختلف جنگ کے میدانوں میں دول یورپ سے مقابلہ میں ترکوں کو مغربی قوموں کی قوت سے آگاہ کیا قبل اس کے کہ وہ انکے تمدن کے متعلق کچھ جانتے اس نئی دنیا کی ضروریات کے لائق ہونیکی خواہش نے ان میں سیاسی تجدید کا عزم پیدا کیا جو اگرچہ موجود تو پہلے سے تھا لیکن جب اپنا سب سے دانشمند اور مضبوط حامی سلیم ثالث (۱۷۸۹ — ۱۸۰۷ء) کی ذات میں نصیب ہوا۔ اب یہ بات بدیہی تھی کہ ترکوں کی نظر یورپین تمدن پر پڑتی۔ اسکے ساتھ ساتھ اور چیزیں بھی محرک ہوئیں۔ ان پر تفصیل سے بحث کئے بغیر میں صرف ان کل اسباب کو میں ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔ ان اسباب کی دو تقسیمیں کی جا سکتی ہیں۔ (ا) داخلی (ب) خارجی۔ داخلی اسباب یہ تھے

(۱) قدیم نظام فوجی کا ٹوٹنا اور سیاسی قوت کا زوال جو اٹھارھویں صدی میں لشکر کی ترتیب نو کا باعث ہوا۔ سلیم ثالث نے اس معاملہ میں بنیادی تغیر کرنا چاہا اور بالآخر اسکی خاطر اپنی جان دی لیکن محمود ثانی نے ۱۸۲۵ء میں لشکر کے قدیم منصب داری نظام کو ختم کرکے قومی لشکر کی بنیاد ڈالی جس نے بعد میں

سلطنت عثمانیہ کے زوال کی ابتدا زمانہ

بلکہ بہت اہم نظام حیثیت اختیار کی۔

(۲) بڑے بڑے علاقوں کا ہاتھ سے نکل جانا جو قدیم سلطنت کے لئے بمنزلہ نوآبادیوں کے تھا اور معاشی زوال۔ ان واقعات کی وجہ سے ایک قومی تجارتی ریاست معاشی کی بنیاد پڑی جس میں نئے لشکر کی ضروریات کو پورا کرنا ایک خاص مقصد تھا

(۳) قدیم نظام ریاست اور عملہ نظم ونسق کا حالات کے اعتبار سے ناموزوں ہونا۔ قدیم ریاست میں جدید سیاسی، معاشی اور تمدنی کاموں کی صلاحیت نہ تھی۔ قدیم فوجی اور انتظامی نظم کو ہٹا دینے کے بعد ضروری تھا کہ سلطنت کو از سر نو منظم کیا جائے اور ایک مرکز پر لایا جائے۔ ان اسباب نے جدید نظام ریاست پیدا کیا۔

(۴) تمدن قدیم کی ان ذہنی بنیادوں کی تباہی جو قدیم معیشت اور ریاست پر قائم تھیں اسکا نتیجہ تعلیمی الجھنوں کی شکل میں نکلا جو روز بروز زیادہ مشکل ہوتی گئیں۔ مدارس، کتب خانے، اوقاف سب پر زوال آیا۔ یا تو معاشی حالات اور پیہم جنگوں کے باعث انکا قائم رکھنا ناممکن ہوگیا یا انمیں وہ پہلی سی قوت جذب باقی نہ رہی۔ قدیم تعلیمی مطمح نظر کی قوت بھی جاتی رہی چنانچہ ریاست نے نئے مدارس کھولے، ایک نئی یونیورسٹی اور ایک اکادمی جنہیں علوم نو کو رواج دیا گیا۔ [۱]

خارجی اسباب یہ تھے:۔

(۱) مغربی سرمایہ داری کی توسیع (۲) ترکی کے خلاف یورپ کی تباہ کن سیاست (۳) مغربی تمدن کا علم اور اسلام اور ترکوں پر یورپی نکتہ چینی۔

مذکورہ بالا دو قسم کے اسباب میں سے کسی ایک کو فیصلہ کن اہمیت دے دینا ٹھیک نہ ہوگا۔ پہلے اسباب کے بغیر دوسرے بے اثر رہتے اور دوسروں کے بغیر پہلوں کی تشریح کم و بیش نہ ہو سکتی۔ ہر جگہ دونوں ہی قسم کے اسباب برسرکار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور بتانا چاہئے کہ اولیت اندرونی اسباب ہی کو حاصل ہے۔

دوسرے واقعات بطور اسباب زوال پیش نظر آسکتے ہیں (مثلاً جنگیں، مختلف اشخاص کا حشر وغیرہ) وہ دراصل مخصوص حالات ہیں جن سے مذکورہ اسباب کے عمل میں روک پیدا ہوئی یا مدد ملی خود انہیں کوئی فیصلہ کن اہمیت حاصل نہیں

آخر میں دو باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ اس کتاب کا موضوع ترکیا اور وہ بھی جدید ترکیہ ہے

---

[۱] عبدالرحمٰن شرف کی کتاب تاریخ دولت عثمانیہ جلد ۲۔ تتمہ۔

اسکو ایک تو قدیم عثمانیوں سے الگ رکھنا چاہئے اور دوسرے اسلام من حیث الکل سے۔ اس معاملہ میں خود اہل علم کے یہاں ایسی گڑبڑ ہے کہ فہم اور علم میں حارج ہوتی اور انہیں گمراہ کرتی ہے۔ ترکیہ جدید پر بحیثیت نئی چیز کے بجائے خود نظر کرنی چاہئے، قدیم ریاست اور قدیم تمدن تو اب ختم ہو چکا۔ جو چیز ہمارے سامنے ہے وہ بن رہی ہے، ابھی کوئی چیز تیار ہو کر ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز ابھی ابتدائی مراحل سے بھی آگے نہیں بڑھی ہے۔ اگر اس سب کو قدیم حالات ہی کا تسلسل سمجھا جائے تو غلطی ہوگی نیز یہ بھی روا نہیں کہ جدید ترکیہ یا خود ترکیہ کو کل اہل اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے (اور پھر ظاہر ہے کہ کل مشرق کے نقطۂ نظر سے تو اور بھی نہیں۔ لیکن افسوس کہ یہ غلطی ایسی جمی ہے کہ کھٹکتی نہیں معلوم ہوتی) مسلم اقوام میں تو جتنے ترک، ایرانی، عرب چوٹی پر ہیں جماعتی و معاشی ساخت فوجی تعلیم، عام تربیت، زمین پر بسنے کے طریقوں، وسائل آمد و رفت، نظام ریاست اور قانون کے اعتبار سے اتنی بھی یکسانیت نہیں ہے جتنی اقوام مغرب میں۔ دوسرے میں پھر ایک مرتبہ ترکوں پر مغربی تمدن کے اثر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ تاریخ تمدن کا ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جو چند جملوں میں حل نہیں کیا جا سکتا جیسا اوپر کہا جا چکا ہے لوگ اس اثر کے اندازے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مغربی خیالات کا اثر ایک طرف تو تعلیم اور حرکت پیدا کرنے کا باعث ہوا لیکن دوسری طرف تباہ کن اور مضر اور یہ مسلم ہے کہ ترکوں میں آج جو ذہنی بے چینی عام ہے وہ بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہے لیکن تحریک تمدن میں ترک بس اس حد تک آگے بڑھے ہیں جہاں تک انہوں نے خود تخلیقی کام کیا ہے۔ جن بڑے آدمیوں نے اس تحریک میں کچھ کام کیا ہے وہ یا تو مغرب سے بالکل متاثر نہیں ہوئے ہیں یا پھر انہوں نے جلدی اپنے کو مغربی اثر سے آزاد کر لیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مغرب پسندی ختم ہو چکی ہے جذبہ قومیت اور اصلاح اسی کا ردعمل ہیں۔ اب تک جو خیالات اور افادہ گاہیں یورپ سے مستعار لی گئی ہیں انہیں آخری چیز نہیں سمجھنا چاہئے۔ انکی حیثیت بس عارضی اور اکثر ناکام کوششوں کی سی ہے۔ اب تک ہر چیز غیر متعین ہے۔

دو گز زمین

(۱)

بڑی بہن اپنی چھوٹی بہن سے ملنے گاؤں آئی۔ بڑی بہن کی شادی شہر میں ایک دکاندار سے ہوئی تھی، چھوٹی کی گاؤں میں ایک کسان سے۔ دونوں بہنیں بیٹھی چائے پی رہی تھیں کہ بڑی نے شہری زندگی کی بڑائیاں شروع کیں۔ کیسے آرام سے رہتے ہیں، کیسے کیسے کپڑے پہنتے ہیں، اُسکے بچوں کے پاس کتنے اچھے اچھے لباس ہیں، تھیٹر جاتے ہیں، سیر گشت رہتی ہے، طرح طرح کی تفریحیں ہیں۔

چھوٹی بہن کو برا لگا اور اس نے دکانداروں کی زندگی کی برائی شروع کی اور کسانوں کی طرفداری کی۔ "میں اپنی زندگی کو تمہاری سے نہ بدلوں گی" وہ بولی "ہم موٹے جھوٹے رہتے ہیں، پر فکر سے تو آزاد ہیں۔ تم لوگ ہم سے بہتر ڈھنگ سے رہتے ہو اور اکثر ضرورت سے زیادہ کما لیتے ہو لیکن یہ بھی تو اکثر ہوتا ہے کہ سب کچھ کھو بیٹھتے ہو۔ کہاوت سنی ہوگی "نفع نقصان جڑواں بھائی ہیں" اکثر ہوتا ہے کہ آج جو مالدار ہے کل بھیک کے ٹکڑوں کو لگ جاتا ہے، ہماری زندگی میں یہ اندیشہ نہیں۔ کسان کی زندگی بہت موٹی نہیں ہوتی مگر لمبی ہوتی ہے۔ ہم مالدار تو کبھی نہ ہونگے لیکن ہمارے پاس کھانے کو ہمیشہ کافی ہوگا۔

بڑی بہن طنزاً بولی "بس؟ ٹھیک، اگر سوروں اور بچھڑوں کی زندگی چاہتی ہو! تم نفاست کے طور طریقوں کو کیا جانو! تمہارے میاں کیسی ہی محنت کریں تمہاری موت بھی ایسی ہی ہوگی جیسی زندگی ہے بس گوبر کے ڈھیر پر۔ اور تمہارے بچوں کی بھی۔

"اسکا کیا؟" چھوٹی بہن نے جواب دیا، "ہاں ہاں ہمارا کام موٹا ہے بھدا ہے مگر یقینی تو ہے ہمیں کسی کے آگے جھکنا تو نہیں پڑتا، اور تمہارے ارد گرد شہروں میں طرح طرح کی رغبتیں ہیں۔ آج ممکن ہے سب ٹھیک ہو مگر کل ممکن ہے شیطان تمہارے میاں کو تاش، شراب عورتوں میں پھانس دے اور بس سب کچھ تباہ ہو جائے۔ کیوں کیا اکثر ایسا ہوتا نہیں؟"

گھر کا مالک پہوم، آتش دان پر پڑا عورتوں کی باتیں سن رہا تھا "بات تو بالکل ٹھیک ہے" اس

نے سوچا: "بچپن سے دھرتی ماتا کو جوتنے میں ایسے لگے رہتے ہیں کہ ہم کسانوں کو وقت ہی نہیں ملتا کہ سر میں کوئی حماقت جگہ پکڑے۔ ساری دقت یہ ہے کہ کافی زمین نہیں۔ اگر بہت سی زمین ہوتی تو میں تو کمبخت شیطان سے بھی نہ ڈرتا۔"

عورتیں چاء پی چکیں۔ تھوڑی دیر کپڑوں کی بابت باتیں ہوئیں۔ پھر چاء کے برتن دھو دھلا کر سونے کو پڑ گئیں لیکن شیطان آتش دان کے پیچھے بیٹھا سب باتیں سن رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ کسان کی بیوی نے اسمیں شیخی پیدا کر دی ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ اگر بہت سی زمین ہو تو شیطان سے بھی نہ ڈروں۔

اچھا اچھا شیطان نے خیال کیا "میرا تیرا مقابلہ ہوگا۔ میں تجھے زمین بھی دونگا اور اس زمین کے ذریعہ تجھے اپنے قابو میں لونگا۔

(۲)

گانوں کے قریب ایک خاتون رہتی تھی۔ ایک چھوٹی سی زمیندارنی جس کی کوئی ۳۰۰ ایکڑ کی جائداد تھی۔ جب تک اس نے ایک بوڑھے سپاہی کو اپنا کارندہ نہیں بنایا تھا جو لوگوں پر آئے دن جرمانے کیا کرتا تھا اس خاتون سے اور کسانوں سے خوب بنتی تھی۔ پہوم لاکھ خیال رکھتا لیکن ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا کبھی کوئی گھوڑا مٹر کے کھیت میں جا نکلا کبھی کوئی گائے خاتون کے باغ میں جا پہنچی کبھی بچھڑے اس کی چراگاہوں میں چلے جاتے اور اسے ہمیشہ جرمانہ دینا ہوتا۔

پہوم ادا تو کر دیتا لیکن گڑگڑایا کرتا۔ اور غصہ میں گھر جاتا اور گھر والوں سے سختی کرتا۔ ساری گرمی پہوم کو اس سپاہی کی وجہ سے بڑی تکلیف رہی۔ اور جب جاڑا آیا اور مویشیوں کو اصطبل میں باندھنا پڑا تو پہوم کو خوشی ہوئی۔ چونکہ باہر نہ چر سکتے تھے اور اس لئے چارہ دینا پڑتا تھا جو اسے اچھا نہ لگتا تھا مگر پھر بھی ہر روز کی فکر تو نہ تھی۔

جاڑے میں خبر اڑی کہ یہ خاتون اپنی زمین بیچتی ہے اور بڑی سڑک والی سرائے کا مالک اس کی بات چیت کر رہا ہے۔ کسانوں نے یہ سنا تو بہت ڈرے۔ انہوں نے سوچا "اگر سرائے والے نے زمین لے لی تو اس کارندہ سے زیادہ جرمانوں کی مصیبت ہوگی۔ اور ہمارا سارا سہارا تو اسی جائداد پر ہے"

کسان گانوں کیطرف سے خاتون کے پاس گئے اور درخواست کی کہ سرائے والے کو زمین نہ دیجئے

ہم لوگ اس سے بہتر قیمت ادا کرینگے۔ خاتون راضی ہو گئی۔ کسانوں نے کوشش کی کہ ساری جائداد گاؤں کے نام سے خرید لیں اور سب کے سب مشترک طور پر اس کے مالک ہوں۔ دو دفعہ اس کام کے لئے ملکر بات چیت ہوئی لیکن معاملے نہ پاسکا۔ شیطان نے انہیں پھوٹ کا بیج بو دیا اور وہ یکرائے نہ ہو سکے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ الگ الگ ہی زمین خرید لیں جتنی جس کو توفیق ہو۔ خاتون جیسے پہلی تجویز پر راضی ہو گئی تھی اس پر بھی راضی ہو گئی۔

ذرا ہی دیر میں پھوم کو خبر لگی کہ اسکا ایک پڑوسی ۵۰ ایکڑ خرید تا ہے اور خاتون نے کہدیا ہے کہ آدھے دام نقد اور آدھے سال بھر بعد۔ پھوم کے دل میں حسد پیدا ہوا۔

"بھلا دیکھو" اس نے سوچا "ساری زمین بکی جاتی ہے۔ اور مجھے کچھ نہ ملیگا" پھر اپنی بیوی سے بات شروع کی "دوسرے لوگ خریدار بنے ہیں" اس نے کہا "اور ہمیں بھی کوئی بیس ایکڑ خریدنے چاہئیں۔ زندگی دوبھر ہوئی جاتی ہے۔ یہ کارندہ تو مارے جرمانوں کے ہمیں کھلے دیتا ہے۔

دونوں نے ملکر غور کیا اور تدبیریں سوچیں کہ کس طرح زمین خریدیں۔ بچا کر سو روبل رکھے تھے۔ ایک بچھیرا بیچا آدھی شہد کی مکھیاں بیچیں۔ ایک بیٹے کو مزدوری پر بھیجا اور پیشگی اجرت لے لی، کچھ ایک بہنوئی سے قرض لیا۔ تو اس طرح جیسے تیسے کر کے آدھی زمین کی قیمت اکٹھا کی۔

یہ کر چکا تو پھوم نے ۴۰ ایکڑ کا ایک کھیت چھانٹا جس میں کچھ پر جنگل تھا اور خاتون کے پاس اسکا معاملہ کرنے گیا۔ معاہدہ ہو گیا۔ پھوم نے ہاتھ ملایا اور کچھ رقم پیشگی ادا کی۔ پھر دونوں شہر گئے اور دستاویزوں پر دستخط ہوئے۔ آدھے دام نقد ادا کر دیئے اور باقی دو سال میں دینے کا اقرار کیا۔

اب پھوم کی اپنی زمین ہو گئی۔ اس نے بیج قرض لیا۔ اور جو زمین خریدی تھی اس میں بویا۔ فصل اچھی ہوئی اور سال کے اندر ہی اندر سے خاتون اور بہنوئی دونوں کا قرض ادا کر دیا۔ اب یہ زمیندار بن گیا۔ اپنی ہی زمین جوتتا بوتا۔ اپنی زمین پر گھاس سکھاتا، اپنی لکڑی کاٹتا، اور مویشیوں کو اپنی چراگاہوں پر چراتا۔ یہ اپنے کھیت جوتنے یا ہرے ہوئے غلہ یا گھاس کی رکھت دیکھنے جاتا تو اسکا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ اس کی زمین پر جو گھاس اُگتی تھی اور جو پھول کھلتے تھے وہ اسے اور سب سے کچھ ہی الگ نظر آتے تھے۔ پہلے جب وہ اس زمین کے پاس سے گذرتا تو یہ زمین بھی ایسی ہی معلوم ہوتی جیسے اور کوئی زمین۔ لیکن اب تو یہ کچھ اور ہی نظر آتی تھی۔

(۳)

چنانچہ بھوم مطمئن تھا اور خوب گذر رہی تھی اگر پڑوس کے کسان اس کے کھیت اور چراگاہوں میں بیجا دخل نہ دیتے اس نے پہلے نرمی سے سمجھایا بجھایا لیکن کسی نے نہ سنی۔ کبھی گاؤں کا چرواہا گائیں اس کے کھیت میں چھوڑ دیتا کبھی رات کی چرائی میں گھوڑے اس کے غلے کے کھیت میں پہنچ جاتے۔ بھوم انہیں بار بار ہانک دیتا اور مالک کو معاف کر دیتا۔ چنانچہ عرصہ تک اس نے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی۔ لیکن آخر نہ رہا گیا اور اس نے ضلع کی عدالت میں رپٹ لکھا ہی دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب اس لئے ہے کہ کسانوں کے پاس زمین نہیں اور وہ کوئی بری نیت سے اسے دکھ نہیں دیتے۔ لیکن پھر سوچا "میں کہاں تک معاف کرتا رہوں؟ یہ تو جو کچھ ہے سب تباہ کر دینگے۔ انہیں سبق دینا چاہئے"

لہذا اب انہیں پھانس ہی دیا۔ ایک سبق دیا پھر دوسرا۔ اور دو تین کسانوں پر جرمانہ ہو گیا۔ تھوڑے دنوں میں بھوم کے پڑوسی اس وجہ سے اس سے جلنے لگے اور کبھی کبھی جان بوجھ کر اپنے مویشی اس کی زمین میں چھوڑ دیتے ایک کسان تو رات کو بھوم کے جنگل میں گھس گیا اور چھال کی خاطر پانچ لیموں کے درخت کاٹ ڈالے۔ ایک دن درختوں کے پاس سے گذرتے ہوئے بھوم نے کچھ سفید سفید پڑا دیکھا۔ قریب گیا تو چھلے ہوئے تنے زمین پر پڑے تھے اور درختوں کے بجائے انکے ٹھونٹ باقی تھے۔ بھوم کو بہت غصہ آیا۔

اگر ایک یہاں کاٹ دیا ہوتا ایک وہاں تو بھی برا تھا" بھوم نے سوچا "پر اس بدمعاش نے تو پورا گچھا کا گچھا کاٹ ڈالا۔ معلوم ہو جاتا کہ کون ہے تو بتلاتا"

بھوم بڑی الجھن میں پڑ گیا کہ آخر کون ہو سکتا ہے۔ آخر کو فیصلہ کیا "ہو نہ ہو سیمن ہوگا۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا" وہ سیمن کے گھر گیا کہ ذرا دیکھے۔ لیکن کچھ نہ دکھائی دیا اور خواہ مخواہ کی تو تو میں میں ہوئی لیکن اسے اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ سیمن ہی کا کام ہے لہذا مقدمہ دائر کر دیا۔ سیمن کی طلبی ہوئی۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی پھر ایک اور دفعہ سماعت ہوئی اور آخر میں سیمن رہا ہوا اس لئے کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہ تھی۔ بھوم کو اور بھی رنج ہوا اور اس نے اپنا غصہ پنچوں اور منصفوں پر نکالا۔

"تم چوروں سے اپنی ہتھیلیاں چکنی کراتے ہو" اس نے کہا "اگر تم لوگ ایماندار ہوتے تو ایک چور کو یوں

نہ چھوٹ جانے دیتے "

الغرض پیوم متعلقوں سے بھی لڑا اور اپنے پڑوسیوں سے بھی سلوگ اس کے گھر میں آگ لگا دینے کی دھمکیاں دینے لگے۔ اور اگرچہ پیوم کے پاس زمین پہلے سے زیادہ تھی لیکن گانوں میں اسکی حالت بدتر ہو گئی۔

اسی زمانہ میں خبر اڑی کہ بہت سے لوگ دوسری جگہ جا کر آباد ہو رہے ہیں "میں کیوں اپنی زمین چھوڑوں" پیوم نے سوچا "کچھ اور گانوں والے چھوڑ جائینگے تو ہمارے لئے کافی جگہ ہو جائیگی۔ میں خود انکی زمین لے لوں گا اور اپنی جائداد ذرا بڑھا لوں گا۔ پھر ذرا آرام سے زندگی کٹیگی۔ ابھی تو اتنی تنگی ہے کہ آرام سے رہنا مشکل ہے"۔

ایک دن پیوم گھر پر بیٹھا تھا کہ ایک کسان گانوں میں سے گذرتے ہوئے اس کے پاس آنکلا۔ اسے اس نے رات کو ٹہرایا اور کھانا کھلایا۔ باتیں ہوئیں تو پیوم نے پوچھا کہ کہاں سے آتے ہو۔ اجنبی نے جواب دیا کہ وہ دولگا سے آتا ہے جہاں وہ کام کیا کرتا تھا۔ بات میں بات نکلی اور اجنبی نے بیان کیا کہ وہاں بہتیرے لوگ جا جا کر بس رہے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ اس گانوں کے کچھ لوگ وہاں جا بسے ہیں۔ یہ لوگ وہاں کے گانوں میں جا کر شریک ہو گئے ہیں اور ہر ایک کو ۲۵-۲۵ ایکڑ زمین ملی ہے۔ زمین ایسی اچھی ہے کہ جو رائی بوئی جاتی ہے وہ گھوڑے کے برابر اونچی ہوتی ہے اور ایسی گھنی کہ ہانس کے پانچ ہاتھ چلاؤ اور گٹھا تیار رہے۔ ایک کسان بس اپنے دو ہاتھ لیکر آیا تھا اور اب اس کے پاس اپنے چھ گھوڑے ہیں اور دو گائیں۔

پیوم کے دل میں آرزو بھڑکی۔ اس نے سوچا "میں کیوں اس تنگ سوراخ میں پڑا تکلیف اٹھاؤں جب دوسری جگہ اتنی اچھی طرح رہنا ممکن ہے۔ میں اپنی زمین اور گھر بیچ کر دام کر لوں اور ان سے وہاں جا کر پھر کام شروع کروں اور ہر چیز نئی لوں۔ یہاں کی بھیڑ بھاڑ میں ہمیشہ تکلیف ہی ہوتی ہے۔ لیکن پہلے خود جا کر سب کچھ معلوم کر آؤں"۔

گرمی کے آتے آتے وہ تیار ہو کر چلا۔ دریائے دولگا میں ایک بھاپ کی کشتی پر بیٹھ کر سمارا پہنچا پھر ۳۰۰ میل پیدل چلا اور اس جگہ پہنچا۔ اجنبی نے جو جو کہا تھا سب ٹھیک نکلا کسانوں کے پاس بہت سی زمین تھی ہر شخص کو گانوں کیطرف سے ۲۵ ایکڑ زمین دی گئی تھی اور جس کے پاس روپیہ ہو وہ ڈیڑھ روپیہ ایکڑ کے حساب سے جتنی زمین چاہتا خرید سکتا تھا۔

سب کچھ پتہ سرا لیکر خزاں ہوتے ہوتے پہوم اپنے گھر آیا اور اپنی تمام چیزیں بیچنا شروع کیں زمین اس نے منافع سے بیچی۔ گھر بیچا۔ مویشی بیچے اور گانوں کی رکنیت سے علیحدہ ہوا۔ بس وہاں بہار تک ٹھہرا اور پھر اپنے گھر کے لوگوں کو لیکر نئی بستی کا رخ کیا۔

(۴)

پہوم اور اس کے گھر کے لوگ جب اپنے نئے وطن میں پہنچے تو ایک بڑے سے گانوں میں شریک ہونے کی درخواست دی۔ پنچوں کی دعوت کی اور ضروری کاغذات حاصل کئے۔ پانچ حصے زمین اس کے اور اس کے بیٹے کے نام لکھی گئی یعنی گانوں کی چراگاہوں کے علاوہ ۱۲۰ ایکڑ زمین (سب ایک جگہ نہیں بلکہ ادھر ادھر مختلف کھیتوں میں) پہوم نے ضروری عمارتیں بنائیں اور مویشی خریدے۔ گانوں کی دی ہوئی زمین ہی پہلے وطن کے مقابلہ میں تگنی تھی اور سب زمین اچھی۔ بانگر۔ اب وہ پہلے سے دو چند بہتر حال میں تھا۔ اس کے پاس وافر زمین تھی اور چراگاہیں اور اب جتنے مویشی چاہتا رکھ سکتا تھا۔

پہلے تو مکان بنانے اور بسنے بسانے کے شغل میں خوب خوش رہا لیکن جب خوب رہ بس لیا تو سوچنے لگا کہ یہ زمین بھی کافی نہیں پہلے سال اس نے گانوں کی زمین پر گیہوں بوئے اور فصل اچھی ہوئی چاہتا تھا کہ گیہوں ہی بوئے جائے لیکن اس کے لئے زمین کافی نہ تھی کیونکہ جس پر پہلے بویا تھا اس پر بو نہ سکتا تھا۔ اس علاقہ میں گیہوں یا تو نئی زمین پر بویا جاتا ہے یا ان کھیتوں پر جو کچھ عرصہ خالی پڑے رہے ہوں۔ دو ایک سال گیہوں بویا جاتا ہے۔ اور پھر انہیں چھوڑ دیتے ہیں جب تک خوب لمبی لمبی گھاس کھڑی ہو جائے۔ بہت سے لوگ ایسی ہی زمین چاہتے تھے اور یہ کافی نہ تھی۔ اس لئے جھگڑتے تھے۔ جو لوگ اچھے حال میں تھے وہ تو یہ زمین گیہوں بونے کے لئے چاہتے تھے اور جو برے حالوں تھے وہ اس لئے کہ دوسروں کو اٹھا دیں اور لگان ادا کرنے کے لئے اس طرح روپیہ کرلیں۔ پہوم اور گیہوں بونا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک کاروباری سے سال بھر کے لئے زمین لی۔ بہت سا گیہوں بویا اور خوب فصل ہوئی۔ لیکن زمین گانوں سے دور بہت تھی اور غلہ کو دس میل گاڑیوں میں لاد کر لانا پڑا۔ تھوڑے دن بعد پہوم نے دیکھا کہ بہت سے کسان کاروباری علیحدہ علیحدہ قطعوں پر بسے ہوتے ہیں اور خوب مالدار ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اگر میں بھی کوئی معافی

زمین خریدلوں اور اس پر گھر بنالوں تو پھر اور ہی بات ہو جائیگی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور ایک جگہ"

معافی زمین خریدنے کا خیال اسے بار بار آیا۔ کہیں تین سال تک یہ وہی کئے گیا۔ کرایہ پر زمین لیتا اور گیہوں بوتا۔ موسم اچھا رہا اور فصلیں عمدہ رہیں اور اس نے کچھ رقم بچا لی۔ اسی طرح مزہ سے رہ سکتا تھا لیکن ہر سال دوسروں کی زمین لینے سے اور اس کے لئے بھاگ بھاگ کرنے سے اکتا گیا۔ جہاں کہیں اچھی زمین ہوتی کسان دوڑ پڑتے اور سب زمین اٹھ جاتی اور تیزی نہ کرو تو کچھ بھی ہاتھ نہ آتی۔ تیسرے سال ایسا ہوا کہ اس نے اور ایک کاروباری نے مل کر کسانوں سے کچھ زمین چراگاہ کے طور پر لی۔ اور انہوں نے اس پر ہل بھی چلا دیا تھا کہ کچھ جھگڑا ہوا۔ کسانوں نے عدالت میں کارروائی کی فیصلہ انکے خلاف ہوا اور اس طرح ساری محنت اکارت گئی۔

"اگر یہ میری اپنی زمین ہوتی" پھوم نے سوچا "تو میں خود مختار ہوتا اور یہ سب بدمزگی نہ ہوتی"

پھوم اب زمین خریدنے کی فکر کرنے لگا۔ ایک کسان ملا جس نے ۱۳۰۰ ایکڑ زمین خریدی تھی لیکن اب کچھ پریشانی میں تھا۔ اس لئے سستے داموں اسے بیچتا تھا۔ پھوم نے بھاؤ تاؤ کیا اور معاملہ ۱۵۰۰ روبل پر چکا۔ کچھ نقد کچھ بعد کو۔ سارا معاملہ طے ہوا ہی چاہتا تھا کہ ایک دن ایک راہگیر کاروباری پھوم کے یہاں اپنے گھوڑوں کے لئے چارہ لینے ٹھہرا۔ پھوم کے ساتھ چاء پی اور باتیں ہوئیں۔ کاروباری نے باتوں میں کہا کہ وہ ابھی بشکیروں کے علاقہ سے آرہا ہے اور وہاں ۱۳۰۰۰ ایکڑ زمین ایک ہزار روبل میں خرید کر آیا ہے۔ پھوم نے اور پوچھا گچھا تو تاجر نے جواب دیا: "بس ضرورت اس کی ہے کہ سرداروں سے دوستی پیدا کر لو میں نے کوئی سو روبل کے چوغے اور قالین دئے اور ایک بکس چائے کا۔ اور جو شراب پیتے تھے انہیں شراب پلائی۔ اور بیس آنے ایکڑ سے بھی کم میں زمین لے لی" اس نے پھوم کو دستاویز دکھائی اور کہا کہ "زمین دریا کے کنارے کے قریب ہے اور ساری کی ساری نئی زمین ہے"

پھوم نے بار بار سوال کر ڈالے اور تاجر نے کہا "وہاں اتنی زمین ہے کہ سال بھر چلو تو نہ طے کر سکو اور سب کی سب بشکیروں کی ہے۔ یہ سب بھیڑوں کی طرح بھولے ہیں اور زمین قریب قریب مفت ہی مل جاتی ہے"

"ٹھیک ہی" پہوم نے خیال کیا "اپنے ایکہزار روبل سے میں صرف ۔۔ ۱۳ ایکڑ زمین کیوں خریدوں اور قرضہ اوپر سے اپنے سر لوں ۔ اگر یہی روپیہ لیکر وہاں چلا جاؤں تو اس سے دس گنی زمین ملجائے "!

(۵)

پہوم نے وہاں کے راستہ کے متعلق سوالات کئے جب تاجر چلا گیا تو اس نے خود روانگی کی تیاری شروع کی ۔ بیوی کو تو گھر بار دیکھنے کے لئے چھوڑا ، ایک آدمی ساتھ لیا اور نکل کھڑا ہوا ۔ راہ میں ایک شہر میں ٹھہرے ، چار کا ایک گٹھا خریدا ، اور جیسا کہ تاجر نے کہا تھا ، کچھ شراب اور دوسرے تحفے تحائف ۔ چلتے چلتے ۔۔ ۳۰۰ میل سے زائد نکل گئے اور کہیں ساتویں دن اس جگہ پہنچے جہاں بشکیروں نے خیمے لگائے تھے تاجر نے جو جو کہا تھا سب ہو بہو سچ نکلا ۔ یہ لوگ دریا کے کنارے میدان میں نمدے سے ڈھکے ہوئے خیموں میں رہتے تھے ۔ نہ زمین جوتتے نہ روٹی کھاتے ۔ انکے مویشی اور گھوڑے میدان میں چرتے بچھیرے خیموں کے پیچھے بند جاتے اور گھوڑیاں دن میں دو مرتبہ انکے پاس لیجائی جاتیں ۔ گھوڑیوں کا دودھ دوہا جاتا اور اس سے پنیر بنتا ۔ یہ پنیر عورتیں بنایا کرتی تھیں ، مرد چھاچھ اور چائے پیتے ، گوشت کھاتے اور بانسری بجاتے ۔ اس کے علاوہ اور کوئی فکر نہ تھی ۔ سب کے سب نہایت مضبوط تھے اور خوش و خرم اور گرمی بھر کا دھیان بھی کسی کو نہ آتا تھا سب جاہل تھے ۔ روسی کوئی نہیں جانتا تھا ۔ لیکن سب طبیعت کے نہایت اچھے تھے ۔

پہوم کو جو دیکھا تو سب خیموں سے نکل آئے اور اسکے چاروں طرف جمع ہوگئے ۔ ایک ترجمان ڈھونڈا گیا ۔ اور پہوم نے بتلایا کہ زمین کے لئے آیا ہے ۔ بشکیر بہت خوش ہوئے ۔ پہوم کو سب اچھے خیمہ میں لے گئے اور وہاں پر تکیوں پر ایک قالین پر بٹھایا گیا اور اس کے گرد خود بیٹھے ۔ اسے چاء اور چھاچھ دی ۔ ایک بھیڑ ذبح کرائی ۔ اور اس کے لئے گوشت تیار کرایا ۔ پہوم نے اپنی گاڑی میں سے تحائف نکالے اور بشکیروں کو دئیے اور چاء بھی تقسیم کی ۔ پھر کیا تھا بشکیر پھولے نہ سماتے تھے ۔ آپس میں خوب باتیں کرنے لگے اور پھر ترجمان سے کہا کہ ترجمہ کرے ۔

ترجمان نے کہا " یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ سے بہت خوش ہیں ۔ ہماری رسم ہے کہ اپنے مہمان کو خوش کرنیکے لئے سب کچھ کرتے ہیں ۔ اور اسکے تحائف کا بدل کرتے ہیں ۔ تم نے ہمیں تحفے دئیے اب کہو کہ ہماری

چیزوں میں تمہیں کونسی سب سے زیادہ پسند ہے تاکہ ہم وہ تمہیں دیں"

"مجھے تو یہاں جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے" پہوم نے کہا" وہ تمہاری زمین ہے۔ ہمارے یہاں زمین پر بہت آبادی ہے اور زمین کا زور ختم ہو چکا ہے۔ لیکن تمہارے پاس بہت زمین ہے اور اچھی میں نے ایسی زمین کبھی نہیں دیکھی"

ترجمان نے ترجمہ کیا بشکیروں نے تھوڑی دیر آپس میں بات چیت کی۔ پہوم کچھ نہ سمجھا کہ کیا کہتے ہیں لیکن یہ ضرور دیکھتا تھا کہ سب بہت خوش ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں چلا رہے ہیں۔ پھر سب چپ ہو گئے اور پہوم کی طرف دیکھنے لگے۔ ترجمان نے کہا" یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپکے تحائف کے بدلے میں یہ جتنی زمین آپ چاہیں خوشی سے آپ کو دینگے تم بس انگلی سے بتا دو اور زمین تمہاری ہو جائیگی"

بشکیروں نے پھر گفتگو شروع کی اور کچھ جھگڑنے لگے۔ پہوم نے پوچھا کہ کاہے پر جھگڑتے ہو تو ترجمان نے کہا کہ بعض کا خیال ہے کہ سردار سے پوچھ لینا چاہئے اور اسکی غیر حاضری میں زمین کے متعلق کچھ کرنا ٹھیک نہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اسکی واپسی کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(٦)

بشکیر جھگڑ ہی رہے تھے کہ ایک آدمی بڑی سی لومڑی کی کھال کی ٹوپی پہنے پہنچا۔ سب چپ ہو گئے اور تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ ترجمان نے بتایا کہ یہی ہمارا سردار ہے۔

پہوم فوراً بہترین چوغہ اور ڈھائی سیر چائے نکالکر لایا اور سردار کی خدمت میں پیش کیں۔ سردار نے تحفہ قبول کیا اور جاکر مسند پر بیٹھ گیا۔ بشکیروں نے اس سے کچھ کہا سنا۔ تھوڑی دیر تک تو سردار سنتا رہا پھر سر سے اشارہ کیا کہ چپ ہو جاؤ اور خود پہوم سے روسی میں یوں مخاطب ہوا۔

"اچھا ٹھیک ہی جو زمین چاہو چن لو۔ ہمارے پاس بہت ہے"

"جتنی چاہوں اتنی کیسے مل سکتی ہے؟" پہوم نے سوچا" معاملہ پکا کرنیکے لئے دستاویز چاہئے نہیں تو آج کہدینگے کہ تمہاری ہے اور پھر ممکن ہے چھین لیں"

پھر اونچی آواز سے کہا" آپ کی عنایت کا شکریہ۔ آپکے پاس بہت زمین ہے اور مجھے تھوڑی سی

درکار ہے۔ لیکن میں ذرا یہ بات پکی کرلینی چاہتا ہوں کہ میرا ٹکڑا کونسا ہے۔ کیا یہ ناپ کر میرے حوالہ نہیں کیا جاسکتا۔ موت زلیست خدا کے ہاتھ ہے۔ تم بھلے لوگ تو مجھے زمین دیتے ہو لیکن تمہاری اولاد کیا ٹھیک ہے مجھ سے چھین لے۔

"ٹھیک کہتے ہو سردار نے کہا" ہم زمین تمہارے حوالہ کردینگے"

"میں نے سنا ہے کہ ایک تاجر یہاں آیا تھا۔ اور آپ لوگوں نے اُسے کچھ زمین دی اور دستاویز لکھی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں"

سردار سمجھ گیا "اچھا" اس نے جواب دیا "یہ تو بہت آسان بات ہے۔ ہمارا منشی ہے ہم تمہارے ساتھ شہر چلیں گے اور دستاویز پر باضابطہ مہر ہو جائے گی"

"اور قیمت کیا ہوگی؟" پھوم نے پوچھا۔

"ہمارے دام ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ دن بھر کے ایکہزار روبل"

پھوم کی سمجھ میں نہ آیا "دن بھر؟ یہ کونسا ناپ ہے؟ کتنے ایکڑ ہونگے؟"

"ہمیں اسکا حساب لگانا نہیں آتا۔ ہم تو دن کے حساب سے بیچتے ہیں۔ دن بھر میں جتنی زمین کے گرد چل لو وہ تمہاری اور دام ایکہزار روبل"

پھوم کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا "مگر دن بھر میں تو آدمی ایک بہت بڑے ٹکڑے کے چاروں طرف جاسکتا ہے"

سردار ہنسا "وہ سب تمہاری ہوگئی" اس نے کہا "لیکن ایک شرط ہے۔ اگر تم اسی دن اس جگہ نہ لوٹ آئے جہاں سے چلے تھے تو روپیہ ضبط"

"لیکن جہاں جہاں جاؤنگا اُسپر نشان کیسے کروں گا؟"

"کیوں۔ تم کو اُس جگہ چلیں۔ ہم ٹھہر جائینگے تم ایک پھاوڑا لیکر چل کھڑے ہونا۔ جہاں ضروری سمجھو نشان کردینا۔ ہر موڑ پر گڑھا کھود کر اوپر مٹی لوٹ دینا پھر بعد کو ہل لیکر ایک گڑھے سے دوسرے گڑھے تک جانا۔ جتنا بڑا چکر چاہو لگالو لیکن سورج ڈوبنے سے پہلے جہاں سے چلے تھے وہاں پہنچ جانا

جتنی زمین گھیر آؤ گے سب تمہاری۔"

پہوم بہت ہی خوش ہوا طے ہوا کہ کل صبح ہی چلیں گے۔ تھوڑی بات چیت ہوئی۔ کچھ چا پی تھوڑا سا گوشت کھلا۔ پھر چا۔ آئی۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ پہوم کو سونے کے لیے پروں کا بستر ملا بشکیر ادہر اُدہر چلے گئے اور وعدہ کر گئے صبح ہوتے ہوتے جمع ہو جائیں گے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے سوار ہو کر مقررہ جگہ کو چلیں گے۔

(۷)

پہوم پروں کے بستر پر لیٹا تو مگر نیند رات بھر نہ آئی۔ ساری رات وہی زمین کا دھیان رہا۔ "کتنا بڑا قطعہ گھیروں گا" اس نے سوچا "میں تو دن میں آسانی سے ۳۰ میل چل لیتا ہوں۔ دن تو آج کل بڑا ہوتا ہے۔ ۳۰ میل کے چکر میں کتنی کچھ زمین نہ آ جائیگی۔ خراب خراب بیچ ڈالوں گا یا کسانوں کو اٹھا دوں گا۔ لیکن اچھی اچھی خود رکھوں گا اور اس پر اپنی کھیتی کروں گا۔ دو جوڑی بیل خرید وں گا۔ دو مزدور اور رکھوں گا کوئی ڈیڑھ سو ایکڑ میں جوتوں گا اور باقی پر مویشیوں کی چراگاہ بنا دوں گا۔

پہوم رات بھر پڑا جاگا کیا اور بس صبح ہوتے ہوتے ذرا آنکھ لگ گئی۔ آنکھیں مندی ہی تھیں کہ ایک خواب دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اسی خیمہ میں پڑا ہے اور باہر کوئی کھل کھل کر رہا ہے۔ سوچا کون ہے اٹھا، باہر گیا اور دیکھا کہ بشکیروں کا سردار خیمہ کے باہر بیٹھا ہے اور اپنی کوکھ پکڑے ہنسی کے مارے لوٹا جاتا ہے۔ سردار کے پاس جا کر پہوم نے پوچھا کاہے پر ہنستے ہو؟ تو دیکھتا کیا ہے کہ وہ سردار نہیں ہے بلکہ وہ تاجر ہے جو کچھ دن ہوئے اس کے یہاں ٹہرا تھا اور اس زمین کا قصہ سنایا تھا۔ پہوم پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ کیا بہت دن سے یہاں ہو؟"، کہ دیکھتا کیا ہے کہ وہ تاجر نہیں بلکہ وہ کسان ہے جو بہت دنوں ہوئے وولگا سے پہوم کے پرانے وطن میں آیا تھا۔ پھر دیکھا کہ وہ کسان بھی نہیں بلکہ خود شیطان ہے جس کے کھر ہیں اور سینگ۔ وہی بیٹھا کھل کھل کر رہا ہے اور اس کے سامنے ایک آدمی چت پڑا ہے، ننگے پانوں بس ایک کرتہ اور پاجامہ بدن پر ہے۔ پہوم نے خواب ہی میں اس آدمی کو غور سے دیکھکر پہچاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ یہ مردہ ہے اور خود وہی ہے! خوف سے گھبرا کر اسکی آنکھ کھل گئی۔

"آدمی بھی کیا کیا خواب دیکھتا ہے" اس نے سوچا۔ ادہر ادہر دیکھا تو دروازہ میں سے دکھائی دیا کہ دن نکل رہا ہے۔ "وقت ہوگیا ہے۔ انہیں اٹھانا چاہئے۔ اب تو روانگی کا وقت ہے"

وہ اٹھا، اپنے آدمی کو جو گاڑی میں پڑا سو رہا تھا۔ اٹھایا۔ اس سے کہا کہ زین کسے اور خود بشکیر دل کو بلانے نکلا۔ "میدان میں چل کر زمین ناپنے کا وقت ہوگیا ہے" اس نے کہا۔

بشکیر اٹھے اور جمع ہوگئے۔ سردار بھی آیا۔ بھاچھ پینی شروع کی۔ پھوم کو جا پیش کی لیکن یہ تو ٹھہرنا ہی نہ چاہتا تھا۔

"چلنا ہے تو بس چلو۔ وقت ہوگیا ہے" اس نے کہا۔

(۸)

بشکیر تیار ہوگئے اور سب چل کھڑے ہوئے۔ کچھ گھوڑوں پر کچھ گاڑیوں میں۔ پھوم خود اپنی گاڑی میں اپنے آدمی کو ساتھ لیکر اور ایک پھاوڑہ رکھکر چلا۔ میدان میں پہنچے تو صبح کی لالی دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ سب ایک ٹیلے پر چڑھ گئے (جسے بشکیر شکھان کہتے ہیں) اور سب اپنے گھوڑوں اور گاڑیوں سے اتر کر ایک جگہ جمع ہوگئے۔ سردار پھوم کیطرف بڑھا اور اپنا ہاتھ میدان کی طرف اٹھا کر کہنے لگا۔

"دیکھو جہاں تک تمہاری نظر جاتی ہے سب ہمارا ہے۔ اسکا جونسا حصہ چاہو لے سکتے ہو۔

پھوم کی آنکھیں خوشی سے نم ہوگئیں۔ ساری نئی زمین تھی۔ سب چورس جیسے ہاتھ کی ہتیلی۔ ایسی سیاہ جیسی کالی خشخاش اور جہاں کھڈ تھے انمیں طرح طرح کی چھاتی چھاتی گھاس۔

سردار نے اپنی کھال کی ٹوپی اتار کر زمین پر رکھدی اور کہا "یہ نشان ہے یہاں سے چلو اور یہیں لوٹ آؤ جتنی زمین کے گرد چلوگے سب تمہاری ہے"

پھوم نے روپیہ نکالکر ٹوپی پر رکھا۔ پھر اپنا کوٹ اتارا اور بس بے آستینوں کی صدری پہنے رہا۔ اپنی پیٹی کھولکر پیٹ کے نیچے خوب کسی اور پانی کی ایک کپی پیٹی میں باندھی۔ ذرا بوٹ کسے اور آدمی سے پھاوڑا لیکر چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔ ذرا دیر سوچا کہ کدھر جائے۔ ہر طرف کو جی للچاتا تھا۔

"کیا پروا ہے" اس نے آخر میں فیصلہ کیا "میں نکلتے ہوئے سورج کیطرف جاؤں گا۔"

"وقت ہاتھ سے نہ دینا چاہئے" اس نے دل میں سوچا "اور ٹھنڈے ٹھنڈے میں چلنا بھی آسان ہے"۔ سورج کی کرنیں شکل ہی سے اوپر نکلی تھیں کہ پھوم اپنا پھاوڑا کندھے پر رکھ میدان میں اتر پڑا۔ اور

چل کھڑا ہوا۔ نہ بہت آہستہ نہ بہت تیز۔ کوئی ہزار گز جاکر رکا اور ایک گڈھا کرکے مٹی کے تودے ایک پر ایک رکھ دیئے تاکہ جگہ دکھائی دے سکے۔ پھر آگے بڑھا اور جب بدن ذرا کھل گیا تو اس نے قدم بڑھائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گڈہا اور کھودا۔

پھوم نے مڑکر دیکھا۔ ٹیلہ سورج کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسپر جو لوگ تھے وہ بھی اور گاڑی کے چکتے ہوئے پہیئے بھی۔ اندازہ سے پھوم سمجھا کہ کوئی تین میل چلا ہوں گا۔ اب ذرا گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے صدری اتار کر کندھے پر ڈال لی اور چلا۔ اب خوب گرمی ہوگئی تھی۔ اس نے سورج کی طرف دیکھا۔ ناشتہ کا وقت آچکا تھا۔

اس نے اپنے سے کہا، "پہلا پہر ہوچکا۔ لیکن دن میں چار پہر ہوتے ہیں اور ابھی تو بہت سویرا ہے لوٹنا نہ چاہیئے۔ لیکن ذرا جوتے اتار لوں"

اس نے بیٹھکر جوتے کھولے، پیٹی میں کھونس لئے۔ اور آگے چلا۔ اب چلنے میں آسانی ہوگئی تھی "تین میل اور چلوں گا،، اس نے سوچا اور پھر بائیں کو مڑ جاؤں گا۔ یہ جگہ تو اچھی ہے کہ اسے چھوڑتے جی دکھتا ہے۔ جتنے آگے بڑھو اچھی ہی اچھی زمین آتی جاتی ہے،،

تھوڑی دیر تو سیدھا چلا اور مڑ کر دیکھا تو ٹیلا مشکل سے دکھائی دیتا تھا اور اسپر جو لوگ تھے وہ کالے چیونٹے لگتے تھے۔ اور سورج میں کچھ چیز چم چم کرتی دکھائی دیتی تھی۔

"او ہو" پھوم نے خیال کیا میں اس طرف تو کافی دور نکل آیا۔ اب مڑنا چاہیئے اور پسینے پسینے بھی ہو رہا ہوں۔ پیاس بھی سخت لگی ہے"

وہ رکا۔ ایک بڑا سا گڈہا کھودا اور اسپر مٹی کا ایک ڈھیر بنایا۔ اپنی کپی کھولی اور کچھ پیکر ٹھیک الٹے ہاتھ کو ہولیا۔ چلتا گیا چلتا گیا۔ گھاس اونچی تھی اور گرمی سخت تھی۔ پھوم تھکنے لگا۔ سورج کی طرف دیکھا تو دوپہر ہوچکی تھی۔ اس نے سوچا، اب ذرا آرام کرلینا چاہیئے" بیٹھکر اس نے تھوڑی روٹی کھائی، پانی پیا لیکن لیٹا نہیں کہ کہیں سو نہ جائے۔ تھوڑی دیر سستا کر پھر چلا۔ پہلے تو آسانی کے ساتھ کیونکہ کھانا کھا کر ذرا بدن میں دم آگیا تھا۔ لیکن گرمی بہت بڑھ گئی تھی اور اسے نیند آنے لگی لیکن وہ چلے ہی گیا۔ یہ سوچکر کہ تکلیف گھنٹہ

بھر کی ہے۔ زندگی ساری عمر گذارنی ہے۔"

اس طرف بھی وہ خوب دور نکل گیا۔ اور بائیں کو مڑنے ہی کو تھا کہ ایک ترکھڈ دکھائی دیا۔" اسے چھوڑنا تو بہت برا ہے" اس نے سوچا" اسمیں سن خوب ہوگا۔ اس لئے اس کھڈ کے گرد بھی گیا اور اس کے دوسری طرف جاکر پہلے ایک گڑھا کھودا پھر بائیں کو مڑا۔ ٹیلہ کیطرف دیکھا۔ لیکن گرمی سی ہوا کچھ مکدر سی ہوگئی تھی اور اسمیں تھرتھراہٹ سی معلوم ہوتی تھی۔ ٹیلے کے آدمی اب مشکل سے دکھائی دیتے تھے۔

"اوہو" پھوم نے سوچا میں نے ادھر دور دور لے لیا۔ اس طرف ذرا کم کرنا چاہئے" اور وہ تیسری طرف تیز تیز قدم اٹھا کر چلا۔ سورج کو دیکھا تو وہ کوئی آدھا۔ اتر چکا تھا اور اس نے اپنے مربع کی تیسری طرف دو میل بھی طے نہ کئے تھے۔ اور یہ منزل مقصود سے کوئی دس میل تھا۔

"نہیں" اس نے سوچا" اگرچہ زمین کا ایک کونا کٹ جائیگا لیکن مجھے اب سیدھا لوٹنا چاہئے۔ کہیں بہت دور نہ نکل جاؤں۔ اور یوں اب بہت سی زمین مل ہی چکی ہے" چنانچہ پھوم نے جلدی جلدی ایک گڑھا کیا اور سیدھے ٹیلہ کا رُخ کیا

(۹)

پھوم سیدھا ٹیلہ کیطرف چلا۔ مگر اب پاؤں مشکل سے اٹھتے تھے۔ گرمی نے اسے بھگت لیا تھا۔ اس کے ننگے پاؤں سب کٹ کر زخمی ہوگئے تھے اور اب ساتھ نہ دیتے تھے۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا لیکن اگر سورج ڈوبتے ڈوبتے واپس پہنچنا تھا تو یہ ممکن نہ تھا۔ سورج تو کسی کا انتظار نہیں کرتا اور برابر اترا چلا جا رہا تھا۔

"یا اللہ" اس نے خیال کیا" کہیں بہت سا لینے میں غلطی تو نہیں کی؟ اگر دیر ہوگئی تو؟" اس نے ٹیلہ کی طرف دیکھا اور سورج کیطرف۔ ابھی منزل مقصود سے بہت دور تھا اور سورج کنارے سے آن لگا تھا۔ پھوم بڑھا چلا۔ چلنے میں بڑی مشکل تھی۔ لیکن قدم بڑھا بڑھا کر ہی رکھتا گیا۔ بہت کوشش کی مگر منزل دور تھی۔ دوڑنا شروع کیا۔ کوٹ پھینکا۔ جوتے پھینکے۔ ٹوپی سب پھینکی اور صرف پھاوڑا رہنے دیا جس پر یہ سہارا لے لیتا تھا "اب میں کیا کروں" اس نے پھر سوچا" میں نے بہت کی ہوس کی اور سارا کام بگاڑ لیا۔ اب سورج ڈوبنے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا"

اس خوف سے سانس اور بھی پھول گیا۔ وہ دوڑے گیا۔ اسکا گیلا کرتہ اور پاجامہ بدن سے چپٹ گیا تھا اور زبان بھی کانٹے سے تھے۔ سینہ ایسے چل رہا تھا جیسے لوہار کی دھونکنی۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ہتوڑا اور پانوں ایسے ساتھ چھوڑے دیتے تھے جیسے اس کے ہوں ہی نہیں۔ پھوم کے دل پر یہ ڈر چھا گیا کہیں مر نہ جائے۔

موت کا ڈر تھا مگر یہ رکا نہیں۔ "اتنی دور دوڑ کر اگر اب رکا تو سب مجھے بیوقوف بنائینگے" اس نے سوچا۔ وہ دوڑے گیا بشکیر اسکی طرف دیکھکر چلا رہے تھے انکی آوازیں سنیں اور ان سے ذرا اسکا دل بڑھا۔ اپنی آخری قوت جمع کرکے یہ دوڑتا رہا۔

سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ اور گرد کی چادر میں لپٹ کر بڑا اور خون کی طرح لال معلوم ہوتا تھا، ہاں بس اب ڈوبنا ہی چاہتا تھا۔ سورج بہت نیچے آگیا تھا لیکن یہ بھی اپنی منزل کے قریب ہی آن لگا تھا۔ پھوم کو ٹیلہ پر وہ ہاتھ جو اسکی ہمت بڑھانیکے لئے لوگ ہلا رہے تھے۔ اسے دکھائی دیتے تھے۔ اسے زمین پر چمڑے کی ٹوپی بھی نظر آتی تھی اور اسپر جو روپیہ رکھا تھا اور سردار جو زمین پر اپنی کوکھ پکڑے بیٹھا تھا پھوم کو اپنا خواب یاد آگیا۔

"زمین تو بہت ہی" اس نے خیال کیا، "لیکن خدا مجھے اس پر زندہ بھی رہنے دیگا! میں نے تو اپنی زندگی کھودی زندگی کھودی! میں کبھی اس جگہ نہ پہنچونگا"

پھوم نے سورج کی طرف دیکھا جو زمین تک پہنچ گیا تھا۔ اسکا ایک حصہ تو غائب ہو چکا تھا۔ جو کچھ سکت باقی تھی اس سے کام لیکر یہ پھر آگے کو جھپٹا۔ اوپر کا دھڑ اتنا آگے کو جھکا دیا کہ اس کے پانوں اتنے آگے نہ بڑھ سکے اور یہ گر گیا۔ ٹیلہ تک پہنچا ہے کہ اندھیرا ہو گیا تھا اوپر نگاہ اٹھائی تو سورج چھپ چکا تھا۔ وہ چلایا "میری ساری محنت اکارت ہوئی" اور رکنا ہی چاہتا تھا کہ بشکیروں کے چلانیکی آواز سنی اور اسے خیال آیا کہ اسے نیچے سے سورج ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن اوپر ٹیلہ والوں کو ابھی دکھائی دیتا ہوگا۔ خوب گہرا سانس لیکر یہ ٹیلہ کے اوپر چڑھا۔ وہاں ابھی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اوپر چڑھکر اس نے ٹوپی دیکھی۔ اس کے سامنے سردار بیٹھا کوکھ پکڑے ہنس رہا تھا۔ پھوم کو پھر اپنا خواب یاد آیا۔ اور اس نے ایک چیخ ماری۔ پیروں نے ساتھ چھوڑ دیا وہ آگے کو گرا اور ہاتھ سے ٹوپی کو چھو لیا۔

"خوب آدمی ہے" سردار بولا "اس نے بہت سی زمین حاصل کی"

پھوم کا نوکر دوڑ کر آگے آیا اور اسے اٹھانے لگا تو دیکھا کہ منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ پھوم مر چکا تھا۔

بشکیروں نے اظہار افسوس کے طور پر زبان سے تہ تہ تہ تہ کیا۔

نوکر نے پھاوڑا اٹھا کر پھوم کے لئے قبر کھود دی اور اسے دفن کر دیا۔ چوٹی سے ایڑی تک بس اسے دو گز زمین کی ضرورت تھی ا۔

اقتباسات

انجمن اقوام اور مدارس برطانیہ یہ خبر دلچسپی سے پڑھی جائیگی کہ انگلستان میں اساتذہ کی مختلف جماعتوں اور لیگ آف نیشنس یونین کی جانب سے ایک یادداشت بعنوان "مدارس برطانیہ و امن عالم" بورڈ آف ایجوکیشن میں برائے غور پیش کی گئی ہے۔ اس کے پیش کرنیکی غرض یہ ہے کہ جو سفارش کچھ عرصہ قبل انجمن اقوام کی سب کمیٹی نے برطانوی مدارس میں انجمن اور اسکے اغراض و مقاصد کی تعلیم کی بابتہ کی ہے اس کی تائید کیجائے۔ اس تعلیم کے لئے جو دلائل پیش کئے اور جو طریقے بتائے گئے وہ قابل ذکر ہیں۔

یادداشت میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہئے کہ تعلیم کے دوسرے مقاصد بھی اس سے پورے ہوں چنانچہ یہ ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ نصاب تعلیم کے مضامین میں زیادہ نظم و ربط پیدا کیا جاسکے۔ اور سب کے سب ایک ہی وسیع مقصد" (یعنی انسانیت) کے تحت میں آسکیں جس پر طلبہ کے کیرکٹر کی مضبوطی کا انحصار ہے کیونکہ بین الاقوامی اشتراک عمل کے واقعات اگر ایک طرف تاریخ جدید کا تتمہ ہیں تو دوسری طرف جغرافیہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان تمام مضامین سے تعلق رکھتے ہیں جو مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اور جن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی عالمگیر پہلو بھی رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ بنی نوع انسان کی اصل ایک ہی ہے۔

پھر مذکور ہے "اس علم میں عملی فوائد بھی ہیں، کیونکہ بین الاقوامی رشتہ کا مستقبل دنیائے جدید کے ہر طالب علم سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جب تک کہ قانون کا نظام (Rule of Law) جس کے ہم اپنے ملکوں میں عادی ہو گئے ہیں، سارے جہان میں نہ قائم ہو جائے۔ انسان کے بہترین کارنامے اور اس کی بلند ترین کوششیں رائگاں جاسکتی ہیں۔ اور اسکی زندگی پھر بے قدر اور بے مقصد ہو جائیگی لیکن سارے جہان میں قانون کا نظام حکومتیں تنہا قائم نہیں کرسکتیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس ملک اور دوسرے جمہوریت پسند ملکوں کی رائے عامہ سارے جہان میں قانون کے نظام قائم ہونیکی ضرورت کو سمجھے اور اپنی م

" وہ علم جس سے یہ نتائج مترتب ہوں شہریوں، انکے ملکوں، اور ساری دنیا کے لئے عملی فوائد

رکھتا ہے۔ علاوہ بریں ملک کے کسی باشندے سے مسائل خارجہ کی نسبت نہ تو کسی معقول غور وفکر کی توقع کیجا سکتی ہے نہ عمل کی، اگر وہ اس امر کی نسبت کچھ بھی علم نہیں رکھتا کہ گزشتہ ایک سو سال سے اقوام عالم کا مفاد کس طرح ایک دوسرے سے وابستہ رہا ہے۔ حالات کا صحیح اندازہ کئے بغیر کچھ کرنا یا سوچنا اکثر مشکلات کا باعث ہوتا ہے اور آجکل کے بچے خود تہذیب ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، اگر دنیائے جدید کی نسبت اسی غلط فہمی میں رہ کر بڑے ہوئے کہ یہ انکے آبا و اجداد کی، یا آزاد حکومتوں کے درمیان بین الاقوامی " نزاع " "بدنظمی" کی یا ان کتب تواریخ دنیا ہے جنکا خاتمہ ۱۹۱۴ء پر ہوتا ہے "

اس کے بعد یہ کام ایسے اساتذہ کے سپرد کرنے پر زور دیا گیا ہے جو انجمن اقوام اور اسکے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ تاریخ اور جغرافیہ کو خاص طور پر وہ مضمون قرار دیا گیا ہے جس کے ضمن میں یہ تعلیم دیجائے۔ کیونکہ "انگلستان اور اسکاٹلینڈ کی تاریخ کو دنیا کی تاریخ سے ربط دیکر پڑھنے ہی سے انگریزی بچے انجمن اقوام کی قدر جان سکیں گے۔ کہ یہ پھل نخل زمانہ میں لگ کر پک چکا ہے" اور "دنیا کے مختلف ممالک و قوموں کے حالات، انکے اقتصادی مفاد کی باہم وابستگی، مغربی یورپ کے غیر مسلح خطوں و نیز افریقہ و شرق وسطےٰ کے ممالک محروسہ کے نقشوں" سے واقفیت ہی انکی نظروں میں وسعت پیدا کر سکتی ہے۔

" انجمن کے اغراض و مقاصد کی تعلیم کے لئے جن علوم کا جاننا ضروری ہے ان میں صرف تاریخ و جغرافیہ ہی نہیں بلکہ جیسا کہا جا چکا ہے، وہ تمام علوم ہیں جو مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ ہماری نسل کی طرح زبان بھی غیر ملکی عناصر پر مشتمل ہے۔ سائنس اپنی اصل میں بین الاقوامی ہے۔ اور اسی طرح سے فنون لطیفہ و فن تعمیر وغیرہ بھی یورپین طرز کی مختلف انواع ہیں۔ یہ تمام باتیں طالب علموں کے ذہنوں میں ڈالی جائیں۔

"یہ سب کچھ تعلیم کے ذہنی پہلو سے متعلق تھا۔ اسکول میں بچوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنا عموماً ناپسند کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ صرف نئے علم سے جب تک جذبات و مقاصد میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی نہ پیدا ہو۔ بین الاقوامی اشتراک عمل کو دنیا کے کاروبار میں اصول کار نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ احساس بھی پیدا کرنا چاہئے کہ انسان سارے عالم کا شہری ہے۔ پریسیڈنٹ ولسن نے ایک بار کہا تھا کہ " وہ زمانہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہے جب لوگ انسانیت سے غداری کرنا ویسا ہی شرمناک سمجھیں گے جیسا آج کل وطن

"غداری کہا جاتا ہے "کسی انگریز، یا برطانوی، یا برطانوی دولت متحدہ اقوام (جو خود انجمن اقوام کا ایک نمونہ ہے) سے شہرت کے لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں نہ مفاد انسانی کی روز افزوں وسعت پذیری کے ساتھ ساتھ موجودہ حب الوطنی بھی وسیع تر وفاداری کے جذبات میں تبدیل ہوتی جائے۔ یہاں تک کہ اس دن بدن قریب آنے والی دنیا میں کل کے ساتھ غداری اجزا کے ساتھ (مشمول وطن خود) غداری جائے۔

"اس وسیع تر وفاداری کے پیدا ہونے سے موجودہ جذبات میں جو تبدیلی ہو اس کے ساتھ ساتھ مقصد میں بھی تبدیلی درکار ہے یعنی ایک ایسی خواہش کا پیدا ہونا جو دنیا کا خیال سب سے اول رکھے۔"

دنیا کی اقتصادی کانفرنس جنگ عظیم کے بعد دنیا کی اقتصادی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے باعث ملکوں کو جو مالی نقصانات ہوئے اُنکی تلافی کے لئے انہیں ایسی صورتیں اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا جو خواہ وقتی اعتبار سے ضروری ہی ہوں آگے چلکر بہت مضر ثابت ہوئیں اور ان کے مجموعی اثر سے دنیا کی اقتصادی زندگی میں بہت ابتری پھیل گئی اس کے لئے انجمن اقوام کیطرف سے متعدد کانفرنسیں منعقد ہوئیں اُن کی تجاویز سے تھوڑی بہت حالتوں کے سدھرنے میں امداد ہوئی لیکن پھر بھی اصلاح کی ضرورت بہت کچھ باقی ہے۔ چنانچہ اسی لئے امسال پھر جمعیت اقوام کے زیر اہتمام جنیوا میں ایک کانفرنس اسی غرض سے منعقد ہوئی ہے کہ بین الاقوامی اقتصادی مسائل پر غور کرے۔ اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ پچاس ملکوں کے بھیجے ہوئے اراکین پر مشتمل تھی اور ایک سال سے اس کے ایجنڈے کی تیاری اور اسمیں پیش ہونے والے مسائل پر غور وخوض ومطالعہ ہوتا رہا۔ ظاہر ہے کہ اس بین الاقوامی کانفرنس کے محققانہ فیصلے دنیا کی آئندہ اقتصادی حالت پر کتنا اثر ڈالنے والے ثابت ہونگے۔

کانفرنس کی رپورٹ کا مرکزی مبحث یہ ہے کہ ان موانعات کو کم کیا جائے جو ایک ملک دوسرے ملک سے آئی ہوئی اشیا کی فروخت پر (ٹیکسوں وغیرہ کی صورت میں) عائد کرتا ہے اسمیں شبہ نہیں کہ آزاد تجارت کا اصول کانفرنس میں خارج از بحث تھا، کیونکہ یہ کانفرنس مختلف ملکوں اور ہر نقطۂ نظر کی نمائندہ تھی۔ مگر سب کے سب اس پر ضرور متفق تھے کہ زیادہ سے زیادہ تجارتی آزادی دیجائے۔

چنانچہ رپورٹ میں مذکور ہے کہ غیر ملکی اشیا تجارت پر ٹیکس لگانے کا جو دستور جنگ کے بعد سے

قائم ہوگیا ہے۔اس کی اگرچہ بعض نہایت ہی شدید صورتیں اب نسبتاً کم ہوگئی ہیں۔تاہم اب بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔اس کے لئے چار خاص خاص وجوہ جو بتائے گئے ہیں یہ ہیں۔

۱۔ غیر ملکی اشیا پر بڑے ٹیکس لگانا، جو آئے دن بدلتے بھی رہتے ہیں، پیدائش اور تجارت کو بہت نقصان پہنچائے گا۔

۲۔ تجارت میں آسانیاں بہم پہنچانے سے دنیا کی اقتصادی حالت بہت کچھ سدھر سکے گی۔

۳۔ اگرچہ غیر ملکی اشیاء پر ٹیکس لگانے کا حق ہر آزاد ملک کو ہے، مگر پھر بھی یہ کسی ملک کا خالص نجی معاملہ نہیں ہے

۴۔ جن وجوہ کی بنا پر غیر ملکی اشیا کی تجارت میں رکاوٹیں پیدا کردی گئی ہیں انہیں سے بہتیرے اب باقی نہیں ہیں اور جو باقی ہیں وہ برابر کم ہو رہے ہیں۔

خاتمہ رپورٹ کا پانچ تجاویز پر ہوتا ہے۔انہیں سے دو قابل ذکر ہیں۔ایک میں تو بہت سے ملکوں کے بھیجے ہوتے نمائندوں کی شرکت کو بین الاقوامی اشتراک عمل کے لئے شگون نیک خیال کیا گیا ہے۔اور دوسرے میں اس بات کی ضرورت بتائی گئی ہے کہ دنیا کے ممالک حتی الامکان ایسے طرز عمل سے احتراز کریں جن سے اقتصادی دشواریاں پیدا ہوں۔کیونکہ یہی مشکلات جنگوں کی محرک ہوتی ہیں۔

(ع۔ق۔ج)

تنقید و تبصرہ

القاسم | دار العلوم دیوبند کا ماہوار دینی و علمی رسالہ۔ زیر ادارت مولنا حبیب الرحمن صاحب

یہ رسالہ دار العلوم دیوبند کے آرگن کی حیثیت رکھتا ہے، اور ایک عرصہ سے جاری ہے۔ مذہبی رنگ غالب ہے۔ اسکے مضامین اکثر قدیم "مذہبیت" اور جدید "عقلیت" کی رزم گاہ ہوتے ہیں جس میں آخر الذکر کو ہمیشہ "تسلیم و درکف دشمن" ہونے کا گلہ رہتا ہے۔ تاہم مضامین بیشتر سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ استقلال کے ساتھ جاری ہے اور اپنا ایک مخصوص انداز و معیار رکھتا ہے۔ جو لوگ غور و خوض کے بعد لکھے ہوئے مذہبی مضامین، نئے خیالات کے غلبہ کے خلاف پرانے خیالات کی مضطربانہ جد و جہد، فقہی نکات و لطائف، اور دار العلوم دیوبند کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس رسالہ کو مفید پائیں گے کاغذ کتابت، طباعت عمدہ۔ حجم ۶۴ صفحے چندہ سالانہ دو روپے آٹھ آنے مع محصولڈاک قیمت فی پرچہ ۴ر

دفتر القاسم دار العلوم دیوبند سے مل سکتا ہے۔

تجلی | سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ۔ زیر ادارت محمد سردار علی صاحب

پیش نظر نمبر کاغذ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ لیکن حجم ایک سہ ماہی رسالہ ہونیکی حیثیت سے کم ہے یعنی صرف ۸۰ صفحے بشاید سہولت یا چندہ کم رکھنے کی غرض سے۔ مضامین دلچسپ اور پراز معلومات ہیں۔ مگر سہ ماہی رسالہ کے لئے جیسے بلند پایہ تحقیقی مضامین ہونے چاہئیں، نہیں ہیں لیکن ہندوستان کے عام رسالوں کے معیار، اور مضامین کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کی امید رکھنا بھی عبث ہے۔ اگر رسالہ کا موجودہ معیار ہی قایم رکھا گیا تو غنیمت ہی۔ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ ہمت افزائی کے قابل ہے۔

عام قیمت سالانہ (عا) ششماہی (عہ) فی پرچہ (۱۲ر) گورنمنٹ سے صر سالانہ
منیجر رسالہ "تجلی"، کتب خانہ مسجد چوک۔ حیدر آباد سے طلب کیجئے۔

کیف | صحیفہ علمی و ادبی زیر ادارت جناب رفیعی اجمیری"۔ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$

یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جو اجمیر سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اگر صرف حسن ظاہری و باطنی ہی کو ہلاکو کے پہنچنے کا ذریعہ سمجھا جائے تو پہلی ہی نظر میں خیال گزرتا ہے کہ اس رسالہ کی مدت حیات بہت کم ہے۔ سرورق خاصہ خوشنما ہے۔ مگر اندر کا حصہ بلحاظ مضامین، کاغذ، کتابت، طباعت کے بہت ہی قابل اصلاح ہے اگر دوسرے نمبروں میں بھی یہی شان قائم رہی تو ہم سمجھیں گے کہ یا تو اس رسالہ کو اشاعت کی پروا نہیں ہے۔ یا عام مذاق سے سوء ظن رکھتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اس کی کمیوں کو پورا کر کے اس کو ایک بلند پایہ علمی و ادبی رسالہ بنایا جائیگا۔ حجم ۸۰ صفحے۔ چندہ سالانہ (للعہ) ششماہی (عہ۲) قیمت فی پرچہ (۱۲ر)۔ نمونہ مفت ملنے کا پتہ: منیجر دفتر کیف حویلی پیرزادگان۔ اجمیر شریف

(ع۔ ق۔ ج)

دنیائے افسانہ | مصنفہ محمد عبد القادر صاحب سروری۔ تقطیع $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ حجم ۲۱۰ صفحات قیمت عہ۲ ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی حیدر آباد، دکن

اس کتاب میں ادب اُردو کے اُس خاص شعبہ سے بحث کی گئی ہے جس کو افسانہ کے وسیع مفہوم سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اُردو ادب کی کم مائگی کو دیکھتے ہوئے سروری صاحب کی یہ مفید کوشش یقیناً قابل داد ہے جو "دُنیائے افسانہ" کی صورت میں پیش کی گئی ہے اور جو پہلی سائنٹفک تصنیف ہے جس میں افسانوی ادب کے تمام متعلقات پر تفصیلی اور محققانہ انداز کی بحث پائی جاتی ہے۔

افسانہ کی جملہ جزئیات، اُنکی اہمیت، ضرورت، ابتدا، ارتقا مختلف اقسام و فن پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترتیب بھی خاصی ہے بعض ابواب مثلاً "ناول کا موضوع"، "ناول نگاروں کے فرائض" "فورٹ ولیم کالج کی کوششیں" وغیرہ مصنف کے ذوق اور التزام مطالعہ و کاوش کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہم مصنف کی اس رائے سے متفق ہیں کہ آجکل اُردو زبان میں جو حد درجہ عریاں تحریریں "ادیب لطیف" کے نام سے شائع ہو رہی ہیں وہ سخت نکتہ چینی کے قابل ہیں۔

کتاب بحیثیت مجموعی مفید اور دلچسپ ہے، زبان سلیس و شستہ ہے کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جو زیادہ قابل اعتنا نہیں۔

کتابت و طباعت میں حیدرآباد کے اب عام مطابع نے بھی خاصی ترقی کرلی ہے۔ پہلی نظر میں یہ کتاب علیگڈھ کی مطبوعہ معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال ہماری رائے میں مصنف، طابع و ناشر سب قابل داد اور مستحق حوصلہ افزائی ہیں۔

الہلال شائقین علم و ادب کے شدید و مسلسل انتظار کے بعد مولنا ابوالکلام آزاد کا مشہور و معروف ہفتہ وار مصور رسالہ اب تیسری بار پھر جاری ہوا ہے۔ مسلمانان ہند کی تاریخ بیداری اور زبان اُردو کی تاریخ صحافت میں الہلال کے پہلے اور دوسرے دور کو نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ اس عرصہ میں اُردو نے کافی ترقی کرلی ہے اور بے شمار رسالے و اخبارات نکلنے لگے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ الہلال اپنے اس تیسرے دور میں بھی سب سے بلند پایہ سب سے مفید اور اُردو میں بے نظیر پرچہ ہے۔ اب تک ۶ نمبر نکل چکے ہیں ہر ایک اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اپنے سابقہ دوروں کی مبارک یاد تازہ کرتا ہے۔ سرورق کی سادہ دلکشی لیتھو کے حصہ میں حسین کتابت اور پاکیزہ طباعت کا کلکتہ جیسی جگہ میں انتظام کرلینا مولنا ہی کا حصہ کہا جاسکتا ہے آپ کا حصہ علاوہ اپنی دیگر خصوصیات اور حسن آفرینیوں کے بہت سی تصاویر سے مزین ہوتا ہے، غرضکہ شروع سے آخر تک ہر صفحہ حسن اہتمام و صحت ذوق کا قابل قدر نمونہ ہے۔

الہلال کی ممتاز خصوصیات اُس کا حشو و زوائد سے پاک ہونا ہے۔ اپنے معنوی محاسن کے اعتبار سے بھی مروجہ رسائل و اخبارات کے لئے اب بھی پہلے دوروں کی طرح قابل تقلید نمونہ ہے۔

"آثار عتیقہ"، "مذاکر علمیہ"، "بصائر و حکم" وغیرہ عنوانات مستقل ہیں اور اُنکے تحت نہایت گراں پایہ اور بیحد مفید مضامین برابر آرہے ہیں۔ آخرالذکر میں "انسانیت موت کے دروازہ پر" اور "مشاہیر عالم اپنے اوقات وفات میں" کے زیر عنوان حضرت علی اور حضرت امام حسین علیہم السلام کا واقعہ شہادت پوری تفصیل کیساتھ بڑے ہی عبرت آموز طریقہ پر جاری ہے اور یہ عنوان خصوصیت سے نہایت مفید ہوگا جس کی ترتیب میں مخصوص کاوش و محنت کو دخل ہے۔ "بریدفرنگ" میں مغربی ممالک سے آنے ہوئی تنقید،

اور قیمتی معلومات سے پر مکاتیب کا سلسلہ بھی بہت مفید و کارآمد ہے۔

اتبک جو افسانے بھی نکل چکے ہیں جن میں ایک کا مغربی اور دوسرے کا مشرقی اسلامی تاریخ سے تعلق ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بیحد مفید و بلند پایہ ہیں اور ضرورت ہے کہ اردو میں اس قسم کی چیزیں پیدا کیجائیں۔ کیا اردو میں "ادب لطیف" کا غلط مفہوم سمجھنے والا گروہ اس قسم کے فسانوں پر توجہ کریگا؟

ہم مولٰنا کے اس اصول کو بھی صحیح سمجھتے ہیں کہ۔

بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

بہر حال ادبیات اردو کے آشنا تفنن طبع و تفریحی مضامین کے شائق علمی و مذہبی بلند پایہ مقالات کے متلاشی اور عام پبلک سب کے لئے الہلال حقیقتہً نہایت مفید و قابل قدر ہے جسمیں بہت کافی مواد ہوتا ہے ۳۰×۲۰/۸ سائز کے ۲۴ صفحات اور بہترین کاغذ وغیرہ کو دیکھتے ہوئے چندہ سالانہ ۱۲ع معہ محصولڈاک کچھ بھی زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ کم ہے۔

ملنے کا پتہ منیجر الہلال ۱۱/ بالی گنج سرکلر روڈ کلکتہ (۱۔۱۔م)

شذرات

لیگ آف نیشنس (انجمن اقوام) کا قیام جنگ عظیم کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اتحاد عالم کا تخیل شاید اس قدر جلد نہ فروغ پاتا، اگر جنگ کے تباہ کن نتائج اس سے ایک عام بیزاری نہ پیدا کر دیتے۔ اس میں شک نہیں ۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کا طرز عمل ابھی تک نہیں بدلا ہے۔ کمزور ملکوں پر دراز دستیاں اسی طرح جاری ہیں، رنگ اور قوم کے امتیاز میں وہی شدت ہے، آپس کی چشمک اسی طرح قایم ہے، تخفیف سامان حرب کا مسئلہ بیطرح ناقابل حل ہے لیکن اس سے انجمن پر کوئی الزام نہیں آتا اسکے رفیع تخیل پر عمل کرنیکے لئے دنیا ابھی تیار نہیں ہے، اور عرصہ تک نہوگی۔ تاہم اسکا وجود اس گری ہوئی حالت میں بھی کہ جب اس کی کارروائیوں میں قیام امن کی مخلصانہ کوششوں کے بلند آہنگ دعووں کے باوجود اس کے اراکین کی خودغرضیاں صاف جھلکتی ہیں فائدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ یہ بلا واسطہ یا بالواسطہ انسانوں کا ذہن ان امکانات کیطرف منتقل کرتی رہیگی جو دنیا کے اتحاد اور اسکے نتائج میں مضمر ہیں۔ اور جو باتیں آج ناممکن ہیں انکے آئندہ ممکن بنانے کے لئے پیہم تبلیغ ہوتی رہے گی۔

چنانچہ یہ خبر دلچسپی سے پڑھی جائیگی کہ انگلستان میں انجمن اقوام ہی کی تحریک سے اساتذہ کی مختلف جماعتوں اور لیگ آف نیشنس یونین کی جانب سے ایک یادداشت اس تجویز کی تائید میں پیش کی گئی ہے کہ انجمن اقوام اور اسکے اغراض و مقاصد سے متعلق ضروری معلومات مدرسوں کے نصاب تعلیم میں داخل کر لیجائیں تاکہ مدرسہ چھوڑنے سے قبل طلبہ انجمن سے بخوبی آشنا ہو جائیں اور اس کے اغراض و مقاصد سے ہمدردی رکھیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان نہایت دلفریب تجویزوں سے نہیں ہے جو محض دلچسپی کے لئے پیش کیجاتی ہیں اور جن پر عمل نہ کرنے کے بہت سے وجوہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اس میں ایک معقول اور قابل عمل اسکیم ہے جس پر بڑی حد تک عملدرآمد بھی ہو چکا ہے۔

اس تحریک کے پیش کرنیوالے مستحق تحسین ہیں۔ انہوں نے بہت صحیح طریقہ اختیار کیا ہے۔ انجمن اقوام کے مشن کی تبلیغ کا تعلیمگاہ ہی وہ مقام ہے جہاں خیالات و تصورات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور زندگی کا لائحہ عمل بنتا ہے۔ ملک کے نوجوان یہاں سے جو زندگی کی نظری تعلیم حاصل کرکے جاتے ہیں وہی انکے آئندہ طرز عمل کی رہنما بنتی ہے۔ اس صورت میں اگر انکی تعلیم کا ایک حصہ عام اخوت و اتحاد کے سبق پر مشتمل ہو جو انجمن کا مقصد وحید ہے، تو اس سے بہت ہی مفید نتائج مترتب ہونگے۔

اگرچہ ہمیں اسمیں کلام ہے کہ صرف نظری تعلیم کافی ہوگی کیونکہ دنیا نصیحتوں سے نہیں سیکھتی، تجربہ سے سیکھتی ہے۔ اور جب تک منفرد رہنے کے فوائد ہر ملک کے لئے متحد رہنے کے فوائد سے واقعتہً کم نہ ہوجائینگے اُسوقت تک اتحاد عالم کی اسکیم محض ہوا میں رہے گی۔ تاہم تعلیم سے اتنا تو ضرور ممکن ہے کہ آنے والی نسلیں بنی نوع انسان کو زیادہ محبت کے ساتھ اور اُنکے مصائب و تکالیف کو زیادہ ہمدردی کے ساتھ دیکھنے کیطرف مائل ہونگی

ہندوستان کے لئے بھی ایک ایسی تعلیمی پالیسی درکار ہے جو، اتحاد عالم تو بعد کی چیز ہے، ملک میں وطنیت کے تخیل کو ترقی دے اور ان دو بڑے بڑے فرقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرے جن کے تعلقات کی کشیدگی ملک کو ہر قسم کی ترقی سے روکتی ہے۔ اگر آپ غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ اس کشیدگی کا سبب ملک کی ناقص تعلیمی پالیسی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بدقسمت ملک جہاں چار سے لیکر سبھا اور لیگ تک "ہندو" اور "مسلم" ہے۔ ایک بڑی تعداد تعلیمگاہوں کی بھی انہیں فرقہ وارانہ اوصاف سے متصف رکھتا ہے، جہاں "ہندو" اور "مسلم" نقطہ نظر سے بچوں کی تربیت و تعلیم ہوتی ہے۔ اور مشترک مدارس میں بھی انکے دستور العمل میں وطنی خیال کے لئے کہیں جگہ نہیں ہے۔ چنانچہ ان درسگاہوں کے سندیافتہ نوجوان کوئی مشترک نصب العین نہیں رکھتے، اور اپنے اپنے فرقوں کے مستقبل کو ایک دوسرے سے آزاد و غیر متعلق سمجھتے ہیں۔

تعجب ہے ان "ماہرین" تعلیم پر جو ملک کی تعلیم کو وطنی نقطہ نظر سے دینا ضروری نہیں سمجھتے اور خاموش ہیں اور افسوس ہے ان "رہنمایان" قوم پر جو تعلیمگاہوں کو چھوڑ کر محض اخباروں کو قومی پروپگنڈے کا ذریعہ بناتے

ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ عام پبلک اپنے تخیلات کی قدر عمر کا بڑا حصہ غلامی اور غیر ذمہ داری کی حالت میں گزارنے کے بعد مشکل پہچان سکتی ہے، اور اگر یہ ہو بھی گیا تو انہیں عملی جامہ پہنانے کیلئے اپنے اندر کیرکٹر نہیں پیدا کر سکتی۔

اگر ملک میں صحیح وطنیت کا بیج بونا اور اس کے اندر آزادی و ذمہ داری کا جذبہ پیدا کرنا ہے تو تعلیمگاہوں کی اصلاح سب پر مقدم ہے، کہ یہاں تخیل اور کیرکٹر دونوں کی تعمیر ممکن ہے تعلیمگاہوں کی جگہ اخبارات کو ذریعہ بنانے والے چشمۂ آب کو چھوڑ کر سراب کے پیچھے دوڑتے اور قومیت کی بنیاد مضبوط چٹان کے بجائے ہوا پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔

رائل کمیشن عنقریب اپنی تحقیقات شروع کرنے والا ہے ضروری ہے کہ شہادتوں میں مسئلہ تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دی جائے قانون اصلاحات کے ذریعہ جو چند "نیشن بلڈنگ" (قومیت کی تعمیر کرنے والے) محکمے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آئے انمیں ایک محکمہ تعلیم بھی ہے۔ اصلاحات کی دوسری قسط سے ہندوستانیوں کے عام اختیارات انتظامی میں خواہ جس حد تک بھی توسیع ہو۔ محکمہ تعلیم پر زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنے کے لئے متفقہ مطالبہ کرنا چاہئے، تاکہ ملک میں ایک ایسی تعلیمی پالیسی پر عمل کرنے کا موقع ملے جس سے واقعی طور پر "قومیت کی تعمیر" ہو۔ اگر حکومت اس مطالبہ کو نامنظور کرے، اور یہ بہت زیادہ خلاف توقع بھی نہیں ہے، تو ملک میں پرائیویٹ قومی اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے کی زبردست تحریک پھیلانی چاہئے۔ یہ ایک ایسا نقطہ ہے جس پر موالاتی اور ترک موالاتی، سوراجی اور مشروط تعاونی خلافتی اور ہندو سبھائی، کانگریسی اور مسلم لیگ والے سب کے سب متفق ہو سکتے ہیں، اگر انکے دل میں قوم کا سچا درد اور اس کی خدمت کا صحیح جذبہ موجود ہے ایسے چند تعلیمی اداروں کا کامیابی سے چلا لینا بھی ملک کے مستقبل پر عظیم الشان اثر ڈالے گا۔

کیا وہ لوگ جنہیں "اکابرین قوم" کے نام سے پکارا جاتا ہے، گئو رکھشا اور باجے کے انسداد کی کوششوں سے اتنا وقت بچا سکیں گے کہ انسان کی حفاظت اور اسکی عزت نفس کے قائم رکھنے کے لئے بھی کچھ کر سکیں؟۔ اگر ایسا ممکن ہوا تو جہاں انانیت، شہرت پسندی، تنگ نظری اور خدمت قوم کے

ضائع کردئے جانے والے موقعوں کی داستانوں سے دفتر کے دفتر سیاہ ہونگے۔ وہاں انکے نامہ اعمال کے چند صفحے اس عمل نیک کے بیان سے بھی روشن ہونگے۔ اور شاید یہ انکی نجات کا سبب بنے۔

دنیا کی اقتصادی کانفرنس کا منعقد کرانا جمعیت اقوام کے لئے باعث فخر و مباہات ثابت ہوگا۔ کانفرنس کے مجمل حالات کا اقتباس پچھلے صفحوں پر ہدیہ ناظرین کیا جاچکا ہے۔ یہاں چند سطور میں اس پر مزید روشنی ڈالنی مناسب ہوگی۔ اپنی نوعیت میں یہ پہلی کانفرنس نہیں ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کی اقتصادی حالت میں جوابتری پھیلی ہے، اس کی درستی کے لئے متعدد بین الاقوامی کانفرنسیں ہوچکی ہیں لیکن ابتداءً ان میں زیادہ تر ایسی تھیں جن کی غرض صرف وقتی مشکلات کو دور کرنے پر غور و خوض کرنا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں پہلی بار برسلز میں ایک بین الاقوامی اجتماع اس لئے ہوا کہ مستقل اقتصادی دشواریوں پر غور کرے۔ مگر اسمیں شریک ہونیوالی قوموں کے خیالات اور حکمت عملی کے اختلاف نے اس اجتماع کو زیادہ کامیاب ہونے نہیں دیا۔ اور ایک دوسرے اجتماع کی ضرورت باقی رہی۔

چنانچہ وہ ضرورت اس سال پوری کی گئی۔ یہ کانفرنس ایسے اراکین پر مشتمل تھی جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک سے آئے ہوئے تھے۔ اور اگرچہ نمائندوں کی حیثیت نہ رکھتے تھے مگر اپنی ملکی حکومتوں کے نامزد کردہ ضرور تھے۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے سب کے سب اپنے وقت کے متبحر عالم ہیں اور اقتصادیات عالم پر نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے کمال بصیرت رکھتے ہیں۔ انکی تجاویز محققانہ ہونیکے علاوہ ملکوں کی حکومتوں کے نزدیک قابل اعتنا ہونیکا بھی امکان رکھتی ہیں۔ کیونکہ کانفرنس کے تمام اراکین حکومت کے با اثر لوگ ہیں۔

کانفرنس کی بین الاقوامی اور اس کے اراکین کی نیم سرکاری حیثیت، انکا تبحر، اور سب سے بڑھ کر، اتفاق اور اشتراک عمل کیطرف رجحان، جو کانفرنس کے متفقہ فیصلوں سے صاف ظاہر ہے، امید افزا

چیزیں ہیں ہم امید کرتے ہیں کہ کانفرنس نے دنیا کی اقتصادی حالت کے تدارک کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت اہم اور قابل قدر ثابت ہوگا۔

ترکی جدید کے متعلق ہمارا مبلغ علم بیشتر وہ معلومات ہیں جو اخباروں کے ذریعہ ہمیں ملتی رہتی ہیں۔ یہ اطلاعات کبھی کبھی غلط صورت میں، اور عموماً غلط اہمیت کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔ پھر کسی مخصوص طرزِ عمل کے سمجھنے اور اس پر رائے زنی کرنے کے لئے صورت حالات سے بےخبری اس پر مستزاد۔ علاوہ برایں جن بظاہر غیر معمولی واقعات کی خبریں ہم تک پہنچتی ہیں، وہ بالکل منفرد اور ایک دوسرے سے مختلف و آزاد ہوتے ہیں، اور اس تحریک کا مکمل تصور نہیں پیش کرتے جو ان کی تہ میں کام کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے ترکی کی جدید تمدنی تحریک ہمارے لئے ایک رازِ سربستہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور ہم اس کے موافق یا مخالف کوئی صحیح رائے قائم کرکے آئے دن رونما ہونے والی "بدعاتِ شنیعہ" کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنے کے بجائے ہر ایک پر الگ الگ نظر ڈالکر کبھی حیرت کرتے ہیں کبھی غصہ۔

جب تک ہماری معلومات کا ماخذ ترکی تصانیف براہ راست نہ ہوں، ہماری ناواقفیت اور غلط فہمی کا ازالہ محال ہے۔ کیونکہ ترکوں کے خیالات و نقطہ نظر کے سمجھنے اور اس تمدنی تحریک کے رجحانات و خصائص اور اسباب و علل کا صحیح حال جاننے کے لئے جو انہیں ایک زندگی کی طرف لیجا رہے ہیں بہترین ذریعہ خود ترک ہی ہوسکتے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس مقصد کے لئے مفید اور پر از معلومات تصانیف ترکی زبان سے اردو میں منتقل کرائی جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا اور بالواسطہ ذرائع پر ہی قناعت کی گئی تو حقیقی ترکی ہمیشہ تاریکی میں رہیگی اور اس کے کارناموں کے اعتراف اور اس کی دشواریوں سے ہمدردی کی جگہ ہمارے دل میں اس سے بیجا عداوت و نفرت پیدا ہوگی

خوش قسمتی سے اس معاملہ میں سبقت کا موقع جامعہ کو حاصل ہوا ہے۔ امید ہے کہ ہم ناظرین

کی ضیافت طبع کے لئے ترکی کی جدید تمدنی تحریک پر مسلسل مضامین نکال سکیں گے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی بعنوان "ترکیۂ جدید میں تمدنی تحریک" اس نمبر میں ہدیہ ناظرین ہے۔ یہ ڈاکٹر احمد محی الدین کی کتاب "ترکیہ جدیدمیں تمدنی تحریک" کے دیباچہ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے جرمن زبان میں تصنیف کی ہے۔ ڈاکٹر موصوف ایک ترک ہیں جو لائپزک یونیورسٹی میں ترکی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں اور جو مضامین آئندہ نکلیں گے وہ بھی اسی کتاب کے ابواب کا ملخص یا ترجمہ ہونگے۔ ختم ہونے پر شاید انہیں علیحدہ ایک کتاب کی صورت میں بھی شائع کیا جا سکے مگر یہ موقوف ہے مساعدت حالات پر۔

آج کل اسکولوں اور کالجوں میں موسیقی کی تعلیم پر بڑا زور دیا جا رہا ہے۔ ماہرین تعلیم کے نزدیک موسیقی نہ صرف جذبات سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ اس کا اثر جسم و دماغ دونوں پر پڑتا ہے۔ حال میں سلطنت برطانیہ کی تعلیمی کانفرنس نے بھی اس مسئلہ پر غور کیا۔ سر ایچ ہیڈو نے جنہوں نے کانفرنس میں اسے پیش کیا، بتایا کہ گزشتہ چند سال سے ماہرین تعلیم موسیقی کیطرف بہت متوجہ ہو رہے ہیں، اور اس کو طالب علموں کی ذہنی تربیت کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ سر ہیڈو نے خود بھی اس سے اتفاق ظاہر کیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں موسیقی کی زبان کیا بلحاظ حسن و کیا بلحاظ پیچیدگی عبارت و دقت معنی وہی مرتبہ رکھتی ہے جو شیکسپیر اور بیکن کی زبانوں کا ہے، اور انہیں کی طرح سیکھی جانے کی مستحق ہے۔

یورپ کی دیکھا دیکھی ہندوستان کے مدارس میں بھی موسیقی کو رواج دینے کی تحریک عام ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں ہمارے علما کس حد تک اس کی تائید کرینگے۔ مخالفت تو شاید بہت ہوتی اور اب بھی ہوگی مگر یورپ سے اٹھی ہوئی دوسری نئی تحریکوں کے مقابلہ میں اس کے لئے آسانیاں زیادہ ہیں۔ کیونکہ ایک طبقہ نے موسیقی کو "روح" کے لئے مفید پاکر پہلے ہی سے سند جواز دے رکھی ہے!

یکم اگست سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے۔ اِکی چھٹیوں میں وفود نہیں بھیجے

گئے مگر امید ہے کہ امسال طلبہ کی تعداد اور زیادہ ہو گی شکر ہے کہ جامعہ سے جو سوءِ ظن ہو گیا تھا، آہستہ آہستہ دور ہو رہا ہے۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ درسگاہ کسی انقلابی تحریک کے ماتحت نہیں قائم کی گئی ہے بلکہ ایک خاص تعلیمی نصب العین رکھتی ہے اسکا مقصد صرف اسقدر ہے کہ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے اندر کیرکٹر اور دینی و ملی فرض کا احساس بھی پیدا کرے۔ ادھر چل کے مدرسہ جامعہ نے دوسرے مدارس کے مقابلہ میں جو امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر مقامی حضرات نے اب اس کی طرف توجہ شروع کر دی ہے، اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے یہاں بھیج رہے ہیں۔ انشاء اللہ یہی خدمت ہی جامعہ کا اشتہار ثابت ہو گی تاہم بیرونی حضرات کو جامعہ اور اس کے اغراض و مقاصد سے واقف کرنے کیلئے اخبارات و رسائل میں مضامین لکھنے ضروری ہیں۔ اس فرض سے اہل قلم ہمدردان جامعہ نے پوری طرح سبکدوشی حاصل نہیں کی ہے۔ تاہم حیدر آباد سے ملک کے اکثر معتدد اخبارات نے جامعہ پر ہمدردانہ مضامین لکھنے شروع کر دئے ہیں جامعہ انکے اس احسان کی بیحد ممنون ہے۔

کاش اس کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا کہ قوم نے جامعہ کی مالی امداد کیطرف بھی ہاتھ بڑھایا۔ مگر پھر اظہار افسوس اور شکایت کے لئے کیا رہ جاتا؟ ہمارے شاعروں نے "عشاق" کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ خواہ افراد کے حسب حال نہ ہو، اکثر "قومی" اداروں کے حسب حال ضرور ہے جنہیں ہمیشہ قوم کی بے تو جہی کا گلہ رہتا ہے، اور جو بیشمار تمناؤں کے ساتھ صرف "وعدوں" کی آس پر گزارہ کرتے ہیں!

رسالہ جامعہ چار سال سے ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اپنے سنجیدہ و بلند پایہ علمی و ادبی مضامین کی بدولت ملک کے بہترین صحائف میں جگہ پا چکا ہے۔ خوش قسمتی سے اُس کو ایسے مواقع بھی حاصل ہیں کہ سیاسیات حاضرہ و علوم جدیدہ سے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کر سکے۔ ان سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، اور آٹھویں جلد کے مضامین کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ چھ ماہ کی قلیل مدت میں عام واقفیت کے لئے کتنا مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔

اس طرح جامعہ ایک بہت بڑی تعلیمی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی علمی و سرکاری

زبان انگریزی ہونے کی وجہ سے سیاسیات حاضرہ و علوم جدیدہ سے متعلق اچھے مضامین اسی زبان میں سمجھتے ہیں۔ اُردو داں پبلک ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اُردو کے جو رسالے آج کل جاری ہیں، اور جن کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ نئے مسائل اور نئی باتوں سے پبلک کو آگاہ کریں انہیں سے کم اپنے فرض کو محسوس کرتے اور کمتر ادا کر سکتے ہیں۔ رسالہ جامعہ کی کوششیں بہت زیادہ ہمت افزائی کے قابل ہیں

ہمیں اس کی قوی امید ہے کہ جامعہ کا مستقبل اُس کے ماضی سے بہتر ہوگا۔ لیکن اس کے لئے صرف ہماری مساعی کافی نہیں ہوں گی۔ بہت کچھ ہمدردان جامعہ کی امداد پر بھی منحصر ہے۔ اسی کی توقع پر ہم نے اپنی طرف سے بسم اللہ کر دی ہے۔ صفحات کے زیادہ کرنے کی تو فی الحال استطاعت نہیں ہے، مگر قلم باریک کر دیا گیا ہے جس سے مواد پہلے کی بہ نسبت ڈیوڑھا آ یا ہے۔ انشاء اللہ یہی خط قائم رکھا جائے گا۔ کاغذ بھی پہلے سے اچھا لگایا گیا ہے مگر اسکی اور دوسری پیش نظر تبدیلیوں کو مستقل طور سے عمل میں لانے کے لئے ہمیں آپ کی ہمت افزائی کا انتظار رہے

رسالہ کی سب سے بڑی مشکل اشاعت کی کمی ہے۔ اگر آپ خریداروں کے مہیا کرنے میں تھوڑی سی بھی تکلیف گوارا فرمائیں تو یہ بہت بڑی امداد ہوگی۔ آپ کے لئے چند خریدار بنانے مشکل نہیں مگر اس سے رسالہ کی مشکل حل ہو جائیگی۔ یہ رسالہ علمی خدمت کے لئے اپنی سچی و مخلصانہ کوششوں کا آپ سے یہی معاوضہ چاہتا ہے۔ آپ کی ہمدردی سے توقع ہے کہ حتی الامکان اس امداد سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سے

زیر نگرانی محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

باہتمام سید کرامت اللہ پرنٹر و پبلشر شائع ہوا

کتبہ ایس ایم نصیر

فہرست مضمون نگاران رسالہ جامعہ

جلد ہشتم از جنوری تا جون ۱۹۲۷ء

فہرست مضامین

جامعہ

جلد ۹ | ماہ صفر ۱۳۴۶ھ مطابق اگست ۱۹۲۷ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

روشنی کی رفتار

جب لفظ رفتار ہمارے کانوں میں پڑتا ہے تو ہم اُسکے معنی اُسوقت تک نہیں سمجھ سکتے جبتک ایک فاصلہ اور زمانہ کا تصور ذہن میں نہ ہو یعنی رفتار کے معنی یہ ہونگے کہ ایک جسم ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک مقررہ وقت میں پہنچا جب ہم ساٹھ میل فی گھنٹہ کہتے ہیں تو ذہن میں یہ بات فوراً آجاتی ہے کہ متحرک چیز ایک گھنٹے میں ساٹھ میل گئی ہے یا ایک منٹ میں ایک میل یا ایک سکنڈ میں ۸۸ فٹ مسافت طے کیگئی۔ یہ اُن چیزوں کی مسافت کا حال ہے جنہیں ہم اچھی طرح دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ یہ رفتار ہماری سمجھ میں بآسانی آجاتی ہے۔ اور جس کی سمجھ میں نہ آئے وہ ریل میں بیٹھکر تجربہ کرسکتا ہے۔ ایک رفتار آواز کی ہے۔ اگرچہ آواز میں بظاہر جسم نہیں مگر اس کی رفتار بھی ہم بغیر کسی آلے کے معلوم کرسکتے ہیں۔ مثلاً ہم نے ایک توپ کو چلتے ہوئے دیکھا جس وقت اُسپر بتی لگائی گئی ایک شعلہ پیدا ہوا اور دھماکا ہوا۔ اگر ہم دس میل کے فاصلہ پر کھڑے ہوں اور ہمارے پاس روک گھڑی[1] ہو تو ہم دیکھیں گے کہ شعلہ پیدا ہونے سے آواز کے پہنچنے تک ۴۸ سکنڈ لگ گئے۔ تو معلوم ہوا کہ آواز کی رفتار تقریباً گیارہ سو بیس فیٹ فی سکنڈ ہے۔ یہ تجربات ایسے ہیں جنہیں ہم روز کرسکتے ہیں۔ مگر یہ تجربات اس وجہ سے آسان ہیں کہ یہ رفتاریں کچھ زیادہ نہیں ہیں چند میل فی سکنڈ بھی ہم ناپ سکتے ہیں مگر روشنی کی رفتار ایک سکنڈ میں چند سو میل نہیں ہے بلکہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ایک سکنڈ ناپیں یہ خط استوا کے گرد سات چکر لگا کر آسکتی ہے۔ یعنی زمین کا قطر جو خط استوا پر سب سے زیادہ یعنی ۲۶ ہزار میل کا ہے اُس کے ایک سکنڈ میں پورے سات چکر لگا سکتی ہے۔ اس سے آپ کو روشنی کی سبک رفتاری کا پتہ لگیگا۔

سورج جو ستاروں میں سب سے نزدیک تر اور چھوٹا ستارہ (ثابت) ہے اُسکا فاصلہ نو کروڑ

---

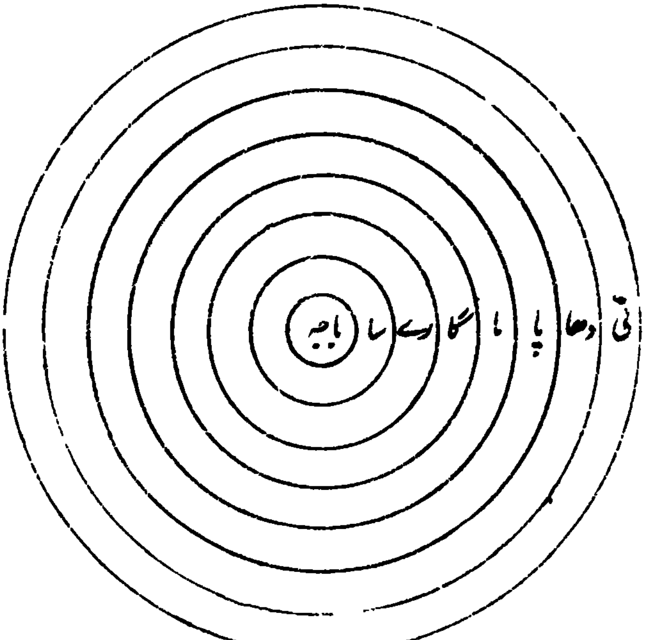
[1] روک گھڑی معمل Laboratry میں عام طور سے استعمال کیجاتی ہے اسمیں ایک سوئی ایسی ہوتی ہے جسے جب چاہیں چلا دیا اور جب چاہیں روک دیں اس سے سکنڈ کی کسر تک کا دقیقہ معلوم ہوجاتا ہے۔ انگریزی میں اسے StopWatch کہتے ہیں

لاکھ میل ہو وہاں سے یہ روشنی منٹ میں یہاں تک آتی ہے بعض ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی دو ہزار برس میں یہاں پہنچتی ہے۔ ان اعداد سے آپ انکی بُعد مسافت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دو ہزار برس کے معنی یہ ہیں کہ جو روشنی اس وقت ہم ان ستاروں کی دیکھ رہے ہیں وہ وہ روشنی ہے جو آج سے دو ہزار سال قبل وہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ اگر وہاں کوئی مہذب مخلوق ہے اور انکے پاس کوئی بڑی دوربین ایسی ہے جس سے وہ زمین کے حالات دیکھ سکتے ہیں تو اس وقت وہ دیکھیں گے کہ ابھی حضرت عیسیٰ نہیں پیدا ہوئے۔ بلکہ ہندوستان میں بدھ درخت کے نیچے گیان دھیان میں مصروف ہیں۔ اور اگر ہم ذرا اس طرف آجاویں یعنی ایسی جگہ جہاں زمین کی روشنی کو پہنچنے میں تقریباً انیس سو برس لگتے ہیں تو وہاں سے زمین پر ہم کیا دیکھیں گے کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب دی جا رہی ہے۔ اگر اسی روشنی کے راستہ پر ہم اس ستارہ سے زمین کیطرف چلے آویں تو کیا دیکھتے ہیں گے کہ عرب میں ظہور قدسی ہوا ہے۔ اور تاریخ کو ہم اس طرح بآسانی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہانتک کہ جیسے جیسے ہم زمین کی طرف اترتے جائیں گے ہم زمانہ حال کے واقعات کے قریب آئیں گے اور جیسے جیسے دور ہوتے جائیں گے ہم کو تاریخ قدیم زندہ نظر آئے گی۔

روشنی کی تیز رفتاری اس بیان کو سمجھنے میں پھر سدِ راہ ہوگی۔ ایک دفعہ پھر آواز کی رفتار کیطرف متوجہ ہو جائیے۔ اس کی رفتار گیارہ سو بیس فیٹ فی سکنڈ ہے۔ آپنے دس میل کے فاصلہ پر توپ کی چمک دیکھی تو اس کے دھماکے کی آواز آپ کو ۴۷ سکنڈ میں آئیگی۔ اگر آپ چمک دیکھتے ہی مخالف سمت میں آواز ہی کی رفتار سے روانہ ہوئے تو آپ کو کبھی یہ آواز نہیں سنائی دیگی۔ فرض کیجئے کہ بجائے توپ کے یہاں باجہ بج رہا ہے اور اس میں سے مسلسل یہ سُر نکل رہے ہیں۔

سا - رے - گا - ما - پا - دھا - نی

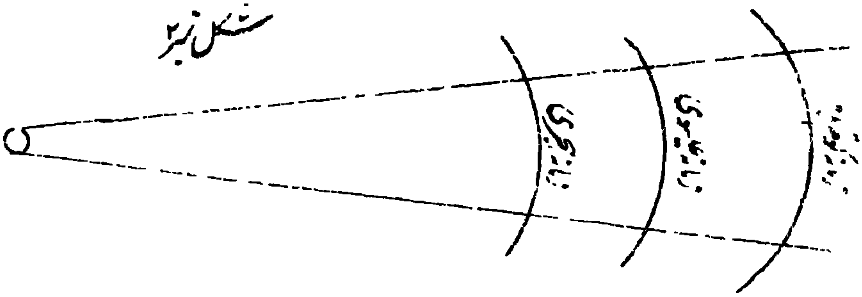
جیسا کہ قاعدہ ہے یہ سُر فضا میں ایک حلقہ کی شکل میں پھیلتے ہیں۔ دیکھو شکل نمبر ۱
ہر حلقہ کو ہم نے ایک مخصوص سُر کے واسطے مقرر کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اول سُر یعنی سا بجایا گیا وہ حلقہ کے آخر سرے پر پہنچ جائیگا جب نی بجیگا۔ فرض کیجئے ان سات سروں کو ۴۷ سکنڈ میں بجایا گیا اور ایک دفعہ بجا کر باجہ بند کر دیا۔ پہلا سُر اس وقت جبکہ آخری سُر ۴۷ سکنڈ کے بعد بجا ہے دس میل پہنچ چکا تھا۔ یعنی جس وقت یہاں



"نی" بجکر باجہ بند ہوا ہے تو اُس وقت ہم نے دس میل کے فاصلہ پر "سا" سنا ہے۔ اگرچہ باجہ بند ہو چکا ہے مگر ہم اُسی ترتیب سے باجہ سن رہے ہیں۔ یہانتک کہ پہلا سُر "سا" سننے کے ۱۰ سکنڈ گزرنے پر ہمیں "نی" سنکر باجہ کے بند ہونیکا علم ہوگا اگر ہم سات آدمی حلقہ میں کھڑے کردیں اور ایک وقت واحد میں یہ پوچھیں کہ وہ کیا سن رہے ہیں تو سب مختلف سُروں کو بتائیں گے۔ کیونکہ پہلے حلقہ والا اگر "سا" سُن رہا ہے تو دوسرے والا "رے" اور تیسرے والا "گا" وعلیٰ ہذا اور جو بالکل باجے کے پاس ہے اُسے "نی" سُنائی دے رہا ہے اور جہاں ابھی آواز نہیں پہنچی ہے یعنی جو گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے وہ کہیگا کہ ابھی باجہ کہاں بج رہا ہے جو وہ کچھ سنے۔ اب فرض کیجئے آپ "نی" سُنکر گیارہ سو بیس فیٹ فی سکنڈ کی رفتار سے زیادہ تیز یعنی بارہ سو فیٹ فی سکنڈ کی رفتار سے آگے بڑھ گئے تو یہی آوازیں آپ کو پھر سنائی دیں گی۔ مگر اب انکی ترتیب اُلٹی ہوگی "نی دھا پا ما گا رے سا"۔ کیونکہ آخری سُر کو آپ پہلے سن لیں گے اور اول سُر کو بعد میں سنیں گے۔ کیونکہ آپ اب ان سروں کا تعاقب کر رہے ہیں جس طرح ایک شخص ٹرین کو پکڑنے دوڑے تو پہلے بریک ملیگا اور آخر میں انجن۔ روشنی بھی اسی طرح چاروں طرف پھیلتی ہے۔ اب زمین اور اس ستارے کو لیجئے جہاں سے روشنی یہاںتک دو ہزار سال میں پہنچتی ہے۔ اس فاصلہ کو ہیئت میں دو ہزار سال روشنی کہا جاتا ہے۔ اس

ے ظاہر ہے کہ جو روشنی زمین سے آج وہاں پہنچ رہی ہے وہ یہاں سے دو ہزار سال قبل رواں ہوئی تھی
نی طرح جس طرح یا جہ بند ہونیکے ، ۲ سکنڈ بعد ساتھا سر پہلی دفعہ دس میل کے فاصلہ پر سنا گیا اسی طرح جو
وشنی دو ہزار سال قبل وہاں سے روانہ ہوئی تھی آج زمین پر پہنچی ہے اب ہم اس فاصلہ کو اسی طرح مختلف
فاصلوں میں تقسیم کر لیں جس طرح آواز کے حلقوں کو کیا تھا۔ تو ہم دیکھیں گے کہ اس تارہ پر بیٹھنے والا جو ہماری

شکل نمبر ۲



زمین کی سیر کر رہا ہے وہ تو یہاں گوتم بدھ کو گیا کے درخت کے نیچے دیکھ رہا ہے۔ مگر جو شخص پہلے حلقہ میں ہے
حضرت عیسیٰ کے صلیب کے واقعات کو دیکھیگا۔ اور جو خوش نصیب ۱۰ پدم میل پر ہے وہ حضور انور صلعم اور
حضرت ابوبکر صدیق رضی کے ہمراہ غار ثور سے نکلکر مدینہ کیطرف جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح جو شخص ہم سے
کھرب میل کے فاصلہ پر ہوگا وہ ہمارے ہاں ۱۹۲۶ء کے واقعات دیکھ رہا ہے۔ جب وہ آفتاب کے پاس
جائیگا تو صرف آٹھ منٹ پہلے کے واقعات دیکھ رہا ہوگا۔ اب تصور کیجئے کہ آپ اس تارہ سے فضا میں
دو لاکھ میل فی سکنڈ کی رفتار سے زمین سے پرے روانہ ہوئے۔ تو اب آپ کو سب واقعات اُلٹے نظر آئیں
گے یعنی آپ گوتم بدھ کو دیکھیں گے کہ انکی ارتھی جل رہی ہے۔ اور پھر انکی لاش لوگ الٹے پاؤں گھر کو لیجا رہے

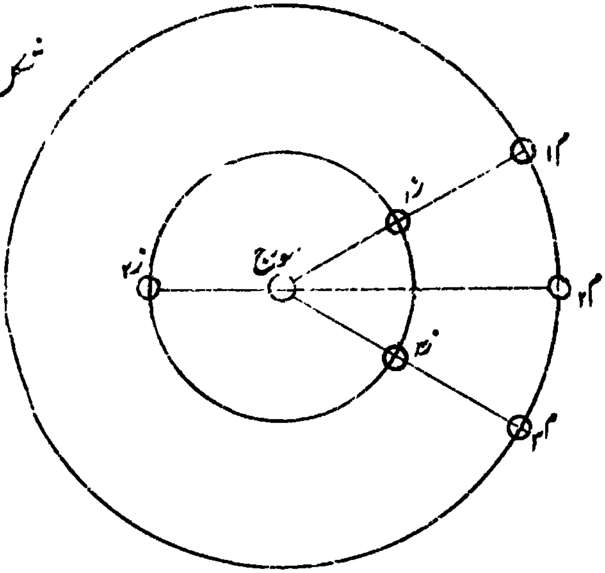
نوٹ:۔ روشنی سال ،، Light Year ایک ایسی اکائی ہے جو ہیئت میں علی العموم استعمال ہوتی ہے۔ اسے بمنزلہ میل
کے سمجھنا چاہیے یعنی وہ فاصلہ جسے روشنی ایک سال میں طے کر سکے وہ "روشنی سال" کہلاتا ہے۔ ایک سکنڈ میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار
میل روشنی کی رفتار ہے۔ ایک سال میں حساب لگا لیجئے کتنے سکنڈ ہوتے ہیں۔ ان سکنڈوں کو ایک لاکھ ۸۶ ہزار
سے ضرب دے کر معلوم کر لیجئے کہ ایک روشنی کا سال تقریباً ۶۰ کھرب میل کا ہوتا ہے۔

ہیں پھر لاش بستر مرگ پر پڑی ہے، اور اب وہ چل پھر رہے ہیں۔ اور اب راجہ کے بیٹے ہو گئے۔ پھر وہ بچہ ہو گئے۔ پھر پیدا ہوئے۔ وغیرہ۔ یہ سب واقعات آپ اس طرح دیکھینگے جس طرح کسی سینما کی فلم کو الٹا دکھا دیا جائے جو واقعات اول ہوئے ہیں وہ آخر میں دکھائے جاویں۔ اگر ہم یکایک وہاں پہنچ جاویں تو ہم تمام دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کس قدر عمدگی اور آسانی سے کر سکیں گے۔ نہایت صحیح تاریخ عالم اور تمام مذاہب کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ اور جو کمزوریاں اور حشو و زوائد مذاہب میں داخل ہو گئے ہیں وہ سب صاف ہو سکتے ہیں۔ آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت میں روشنی کی رفتار سے اور خصوصاً اس عجیب کیفیت سے کہ اگر روشنی کی رفتار سے تیز فضا میں سفر کیا جائے تو ہم الٹے واقعات دیکھیں گے۔ بڑی مدد لی ہے (انشاء اللہ آئندہ کبھی ہم مفصل بحث اس موضوع پر کرینگے۔ آئن شٹائن کے نظریہ کے شائع ہونیکے بعد ایک برلن میں فلم دکھائی گئی جس میں ایک پروفیسر نے ایک ایسی فرضی مشین ایجاد کی جو روشنی سے تیز فضائے عالم میں سفر کر سکتی تھی اُس پر بیٹھکر اس کے واقعات دکھائے گئے جنہیں زمین کے سب واقعات اسی طرح سے اُلٹے نظر آتے رہے ہیں۔ ناظرین غالباً اسے سمجھ گئے ہوں گے۔

اب ہم ناظرین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس رفتار کو یعنی ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سکنڈ کو کس طرح دریافت کیا گیا۔ افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے گلیلو کے زمانہ تک یہی خیال چلا آرہا تھا کہ روشنی ایک جسمی چیز اور اسکی رفتار نہیں ہے بلکہ آناً فاناً یہ آجاتی ہے۔ مگر گلیلو نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ اس کی رفتار معلوم کیجائے۔ چنانچہ اس نے دو آدمیوں کو دو لیمپ دیکر تھوڑے فاصلہ پر کھڑا کیا۔ ایک نے لیمپ کو ڈھانپ لیا دوسرے نے دیکھتے ہی دوسرے لیمپ کو ڈھانپ دیا۔ پہلے شخص کے لیمپ کے ڈھانپنے کے وقت سے دوسرے شخص کے لیمپ ڈھانپنے کے درمیان میں جس قدر وقفہ ہوا وہ اُنکے فاصلوں کے دوگنے فاصلہ کے برابر روشنی کی رفتار سمجھی گئی۔ مگر ظاہر ہے کہ اسمیں غلطی کا بہت بڑا احتمال تھا۔ اور روشنی ایسی تیز رفتار چیز ایسے بھدے تجربہ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اُسکے بعد انیسویں صدی میں دو طرح سے تجربات کئے گئے سب سے پہلے ریومر Römer نے سیارہ Jupiter مشتری کے گہن سے صحیح اندازہ لگایا کہ روشنی کی رفتار کتنی ہے۔ سورج کے گرد نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر تقریباً دائرہ کی شکل میں زمین گھوم رہی ہے اور

مشتری کا مدار Orbit سورج سے ۴۸ کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور زمین کے مدار سے ۳۹ کروڑ میل کے فاصلہ پر گھوم رہی ہے۔ مشتری کے پانچ توابع[۵۰] یا اقمار Satellite ہیں۔ جو ۱۰ گھنٹے ۵۰ منٹ سے لیکر ۱۶ دن ۱۶ گھنٹے ۳۲ منٹ ۱۱ سکنڈ میں اپنا دور مشتری کے گرد ختم کرلیتے ہیں۔ انکی حرکت دوری کے وقت کا تعین اس سہل راستہ سے معلوم ہوسکتا ہے جو اس خط میں واقع ہو جس کا مرکز سورج اور نقطہ مشتری ہے۔ دیکھو شکل ذیل

شکل ۳



ہر چاند چونکہ مشتری کے سطح مدار کے متوازی گھومتا ہے لہذا ہر چاند کو ہر چکر میں ایک دفعہ گہن لگتا ہے خود مشتری کا سال ۱۱،۸۶ سال کے برابر ہوتا ہے یعنی زمین جس طرح ۳۶۵ دن میں ایک پورا چکر آفتاب کے گرد لگالیتی ہے۔ اسی طرح مشتری اپنے مدار کے لمبے ہونیکی وجہ سے اور اپنی چال کے سست ہونیکی وجہ سے تقریباً پونے بارہ سال میں ایک دورہ لگاتی ہے۔ ایک وقت میں زمین اور مشتری کا قران Conjunction ہوتا ہے۔ فرض کیجئے مشتری کے ایک چاند کو اس وقت گہن لگا جبکہ زمین اور مشتری مقارنہ قران

۵۰۔ توابع یا اقمار ان چھوٹے سیاروں کو کہتے ہیں جو کسی سیارے کے گرد گھومتے ہیں اور ستارہ ثابت کے گرد سیارہ چکر لگاتا ہے جسطرح زمین کے گرد چاند چکر لگاتا ہے۔ یہ سیارہ نہیں ہے بلکہ قمر یا تابع کہلاتا ہے اور زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے واسطے سیارہ کہتے ہیں

میں تھے اور یہ قمر غائب ہوگیا۔ اگر روشنی ایک دم یہاں آجاتی یعنی اُس کی رفتار لامتناہی ہوتی اور دوسرے دور فاصلہ سے بھی ایک چشم زدن میں آجاتی تو گہن کا وقت اور گہن کے دکھائی دینے کا وقت ایک ہوتا مگر وہ روشنی جو مشتری کے چاند سے چلی اُسے م، ز، فاصلہ طے کرنا ہے۔ اگر حرف ف، روشنی کی رفتار میل فی سکنڈ ہے تو ظاہر ہے کہ اُس روشنی کو زمین تک آنے میں م، ز، / ف سکنڈ لگیں گے۔ اگر ن، مشتری کے راستہ کا نصف دائرہ یعنی س م، اور ن۲ زمین کے راستہ کے نصف دائرہ کے یعنی س ز، کے برابر ہے تو یہ مساوات م، ز، = ن، ـ ن۲ یعنی روشنی کو زمین تک آنے میں (ن، ـ ن۲) / ف سکنڈ لگیں گے یعنی گہن کے لگنے کے (ن، ـ ن۲) / ف سکنڈ کے بعد ہم کو گہن نظر آئے گا۔

زمین ایک سال میں ۳۶۰ درجہ اپنے مدار کے طے کرتی ہے اور مشتری ۱۱٫۸۶ برس میں یہی تین سو ساٹھ درجے طے کرتی ہے۔ جب مشتری ۱۶٫۵ درجے طے کرتی ہے تو اسے ۰٫۵۴۵ سال لگتا ہے۔ مگر اس عرصہ میں زمین ۱۹۶ درجے طے کرکے بالکل مقابلہ میں آجاتی ہے یعنی اگر ایک خط مستقیم م۲ سے کھینچا جائے تو اس کو کاٹتا ہوا ز۲ تک پہنچ جائیگا اسے اصطلاح ہیئت میں مقابلہ Opposition کہتے ہیں۔ جب زمین مقابل آجائے اور پھر قمر کا خسوف ہو تو ہم دیکھیں گے کہ روشنی اُس مدت میں نہیں آتی جتنی مدت میں پہلے جبکہ قِران میں تھے آئی تھی بلکہ اب اُسے چونکہ فاصلہ زیادہ طے کرنا ہے یعنی م۲ ز۲ کا فاصلہ طے کرنا ہے یعنی اب روشنی کو ن، + ن۲ فاصلہ طے کرنا ہے اور اب جو وقت لگیگا وہ (ن، + ن۲) / ف سکنڈ کے برابر ہوگا۔ زمین کے مدار کا قطر تقریباً ۱۸ کرور ۶۰ لاکھ میل کا ہے اور پہلے خسوف کی نسبت جب زمین اور مشتری مقابل ہوتے ہیں روشنی ½ ۱۶ منٹ دیر میں پہنچتی ہے تو معلوم ہوا کہ روشنی کی رفتار یعنی ف = ۱۸۶۰۰۰۰۰۰ / (۱۶٫۵ × ۶۰) = ۱۸۸۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے۔

---

[۵۱] انحراف نور۔ وہ کیفیت ہے جس میں ایک ستارہ جہاں اعتدال ربیعی[۵۲] میں نظر آتا ہے اعتدال خریفی

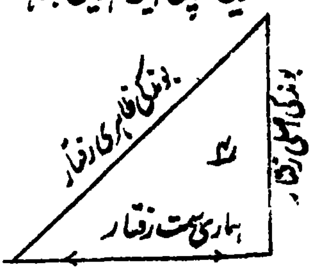
Abevration of Light ۵۱

۵۲ اعتدال ربیعی اور اعتدال خریفی ہیئت کی اصطلاح میں اُس وقت کو کہتے ہیں جبکہ زمین کے ہر حصہ میں دن اور رات برابر ہوجاتے ہیں یہ سال میں دو دفعہ ۲۱ مارچ اور ۲۲ ستمبر کو ہوتے ہیں۔

میں وہاں نظر نہیں آتا یعنی اصول ریاضی وہیئت سے جہاں اُسکی جگہ کی تعین کی جاتی ہے وہاں سے وہ ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اعتدال ربیعی میں زمین کی حرکت اُس سمت کے بالکل مخالف ہوتی ہے جس میں اُسکی حرکت اعتدال خریفی میں ہوتی ہے یعنی سورج کے اپنے مدار پر وہ ان دونوں اعتدالین پر جب آتی ہے تو لنسبتہٗ انکی حرکتوں کی سمت مختلف ہوتی ہے۔ اس مشاہدہ سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ کہ زمین کی رفتار کا تعلق کچھ اس انحراف نور سے ضرور ہے اور ایک ہی ستارہ کو جب مختلف اعتدالین سے دیکھا جائے تو چونکہ مختلف مقامات پر نظر آتا ہے۔ اس لئے سمت سے بھی تعلق ہے۔ (دیکھو شکل نمبر ۵)

ہم اس نظریہ کو ذیل کی تمثیلات اور شکلوں سے واضح کرتے ہیں اور پھر بتائینگے کہ کس طرح انحراف نور سے روشنی کی رفتار کو معلوم کیا۔

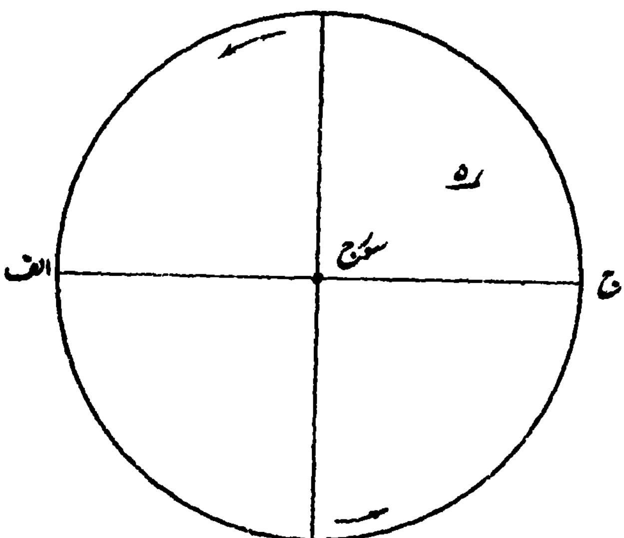
فرض کیجئے بارش بالکل سیدھی ہو رہی ہے یعنی ہوا بالکل نہیں ہے اور بوندیں عمودی شکل میں زمین پر گر رہی ہیں۔ اگر ہم بارش میں کھڑے ہوں تو ہم دیکھینگے کہ بوندیں ہمارے سر پر برس رہی ہیں۔ اگر ہم کسی ایک سمت میں چلنے لگیں تو اب ہم دیکھیں گے کہ بارش سامنے سے ہو رہی ہے اور بوندیں ہم کو ترچھی پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جیسے جیسے ہم اپنی رفتار کو بڑھائینگے بوندوں کا ترچھاپن زیادہ ہوتا جائے گا چھتری بعض وقت بالکل منہ کے سامنے کرنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بوندیں تو خود بذاتہ خواہ کسی رفتار سے گریں ترچھی نہیں ہوتیں بلکہ ہماری رفتار کی نسبت سے وہ ترچھی ہوتی جاتی ہیں۔ اگر ہم بوند کی رفتار اور اپنی رفتار کی نسبت سے خط کھینچکر ایک مثلث بنالیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ زاویہ جو بوند کے اصلی راستہ اور ظاہری راستہ کے خطوط سے ہماری رفتار کی نسبت سے گھٹتا بڑھتا ہے۔ اس زاویہ کا نام ک رکھا ہے۔ علم مثلث کی رو سے مماس ک[1] = ہماری رفتار / بوند کی رفتار۔



[1] Tangent = مماس۔ میں کوشش تو ہمیشہ کرتا ہوں کہ عام فہم زبان میں مضمون لکھوں مگر جہاں ریاضی کے اصول کے بغیر چارہ نہیں وہاں مجبوراً لکھنا پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی بہت سے امور کو میں خود حل کر کے آسان ترین

اور یہ نسبت مستقل ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک ستارہ سے اسی طرح روشنی آرہی ہے۔ اور بجائے بادل کے کہ ستارہ ہے۔ اور بجائے بوند کے روشنی آرہی ہے۔ اور بجائے ہمارے چلنے کے زمین تقریباً ۱۸ میل فی سکنڈ کی رفتار سے اُس طرف جاری ہے تو ہم مساوات بالا سے ہر نسبت کو معلوم کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہم کو اس طرح روشنی اور اپنی رفتار کا احساس نہیں ہوتا جس طرح بارش میں ہو رہا تھا مگر یہاں ہم دوربینوں اور دیگر آلات فلکی کی مدد سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ ستارہ جس جگہ دکھائی دینا چاہئے وہاں نہیں نظر آتا۔ اور یہ ستارہ بھی ہماری زمین کے مدار کی سمت اور رفتار کی نسبت سے اپنی جگہ آسمان پر بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔



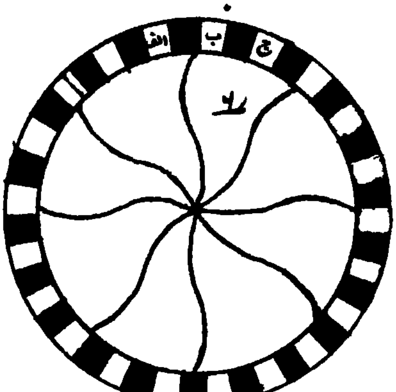


ستارہ کی اصلی جگہ تو وہ ہے جو اوپر کی شکل میں ب ہے۔ مگر جب زمین الف پر ہوتی ہے تو ستارہ

ضد لیتہ؟ ہم مرہ ہم لکھتا ہوں جو ناظرین ریاضی نہ جانتے ہوں وہ بغیر سمجھے بوجھے ایمان لے آویں تو مناسب ہے۔

بجائے اپنی اصلی جگہ کے اُ پر نظر آتا ہے۔ اور جب زمین ب پر آجاتی ہے تو ستارہ ب پر نظر آتا ہے وعلی ہٰذا وہ کبھی اپنی اصلی جگہ نظر نہیں آتا۔ اگر فضائے عالم میں ہم کو محسوس ہو سکتا کہ ہم اپنے مدار پر ۱۸ میل فی سکنڈ کی رفتار سے چل رہے ہیں تو ہم کو روشنی بھی اسی طرح ترچھی آتی ہوئی نظر آتی جس طرح بارش ترچھی برستی ہوئی نظر آتی مگر ہمکو چونکہ اپنی اصلی رفتار کا جس سے زمین اپنے مدار پر آفتاب کے گرد گھومتی ہے احساس نہیں ہوتا اس لئے ہم کو صرف ستارہ اصلی جگہ سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ رفتاروں کی نسبت سے اگر ہم عمود اور قاعدہ بنائیں تو ہمکو معلوم ہو جائے گا کہ جو زاویہ بنتا ہے وہ تقریباً ۲۰ ثانیہ کا ہوتا ہے جس کی قیمت ہمیں معلوم ہے۔ لہٰذا اس اصول سے روشنی کی رفتار جو معلوم کی وہ ایک لاکھ ۸۵ ہزار میل فی سکنڈ ہوئی۔ جو پہلی رقم سے دو ہزار کم تھی۔ چونکہ یہ سب مشاہدات کی بنا پر تخمینہ لگایا گیا تھا۔ اب یہ کوشش کی گئی کہ کسی طرح تجربہ سے اسے براہ راست ناپا جائے۔

اس کے لئے جو سب سے پہلی اور ناکام کوشش گلیلو نے کی تھی۔ اس سے یہ خیال ہوا کہ روشنی کو اسی طرح ناپ سکتے ہیں کہ اسکے راستہ کا کھلنا اور بند کرنا فوراً ہو سکے اور میکانکی اختیار میں ہو۔ اور کرتی نتیجہ ہو کہ ایک مقررہ فاصلہ پر جب روشنی چلی جائے اور وہاں سے عکسی آئینہ پر لگ کر واپس آئے تو یہ راستہ اُسکا بند ہو جائے۔ چنانچہ فرزوے نے سب سے پہلے یہ کوشش کی اسکا اصول یہ تھا کہ روشنی کے منبع سے ایک شعاع کو لیکر کچھ فاصلہ پر ڈالا۔ جہاں ایک عکسی شیشہ نے اس شعاع کو واپس کر دیا۔ اب اس شعاع



کو اس فاصلہ کا دوہرا راستہ طے کرنا پڑا۔ جب یہ شعاع منبع سے نکلی تھی تو اس کے راستہ میں ایک تیز حرکت کرنیوالا دانت دار پہیہ تھا۔ دیکھو شکل ۱۶ اور اس پہیہ کے ایک دانت میں سے یہ روشنی کی شعاع گزری تھی۔ اگر پہیہ ساکن ہو تو یہ روشنی کی شعاع واپس آکر بھی اسی دانت میں سے آجائیگی مگر اس پہیہ کو اس سرعت سے حرکت دی گئی کہ روشنی کو اس نے

Fizeau

کے خلو کے دانت کا ٹھوس حصہ ملتا تھا جس سے وہ نظر نہیں آتی تھی مثلاً پہیہ کے دانت الف میں سے گزر کر شعاع نکلی۔ اگر یہ ساکن ہو تو ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔ روشنی کو آنے جانے میں تقریباً ۱/۹۹۹۰۰ سکنڈ لگتے ہیں مگر ایک دانت کے خلو کو جو پون ملی میٹر سے بھی کم ہے۔ اور جس کی رفتار نو سو چکر فی سکنڈ ہے۔ اُسے یہ راستہ عبور کرنے میں روشنی کی واپسی سے بھی کم یعنی ۱/۱۳۲۰۰۰ سکنڈ لگیگا۔ مگر چونکہ یہ بہت تیزی سے حرکت کر رہا ہے اس لئے اُس کی واپسی تک ٹھوس دانت سامنے آگیا۔ اب یہ شعاع نہیں نظر آئے گی۔ اسی طرح اس کی رفتار کو اگر دو گنا کر دیا جائے تو اب اس کی واپسی پر ٹھوس دانت نہیں ہوگا بلکہ خلا ہوگا اور یہ روشنی ہم کو نظر آجائیگی اسی طرح اگر رفتار کو تگنا کر دیا جائے تو الف سے نکلکر شعاع جب واپس آئیگی تو ٹھوس دانت جو الف اور ب کے درمیان ہے نکل چکا ہوگا اور خود ب خالی دانت بھی گزر گیا ہوگا۔ اور اُس کی جگہ ٹھوس دانت ب ج کے درمیان کا آجائیگا اور وہ پھر اس شعاع کو روک لیگا۔ یہ پھر نظر نہیں آئیگی۔ وقس علی ہذا (دیکھو شکل نمبر ۲) اس تجربہ کے بعد اور پہیے بھی بنائے گئے ایک پہیہ جس کا ۴۵ ملی میٹر کا قطر تھا اور ۶۰۰ دانت تھے اُنہیں ایک لاکھ ۸۰ ہزار دانت فی سکنڈ روشنی کے سامنے آتے تھے۔ اصلی تجربہ میں پہیہ کی رفتار بہت ہی کم تھی۔

اس سلسلہ میں بہت سے لوگ ہیں جن کے طریقہ تجربہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس سے طوالت ہوگی اور اس وقت ہم نے صرف تین طریقوں سے بحث کی ہے۔ اب آخری اعداد ہم بتاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ایسی سریع السیر چیز کی رفتار کو اس طرح ناپ لیا گیا ہے کہ صرف بیس میل زیادہ سے زیادہ کمی بیشی کا احتمال ہے یعنی غلطی ہزار اور سیکڑہ کے اعداد میں یقیناً نہیں ہے بلکہ صرف بیس میل فی سکنڈ تک ہو۔

پیرس کے تجربہ نے تین لاکھ چار سو کلو میٹر فی سکنڈ رفتار کو قائم کیا۔

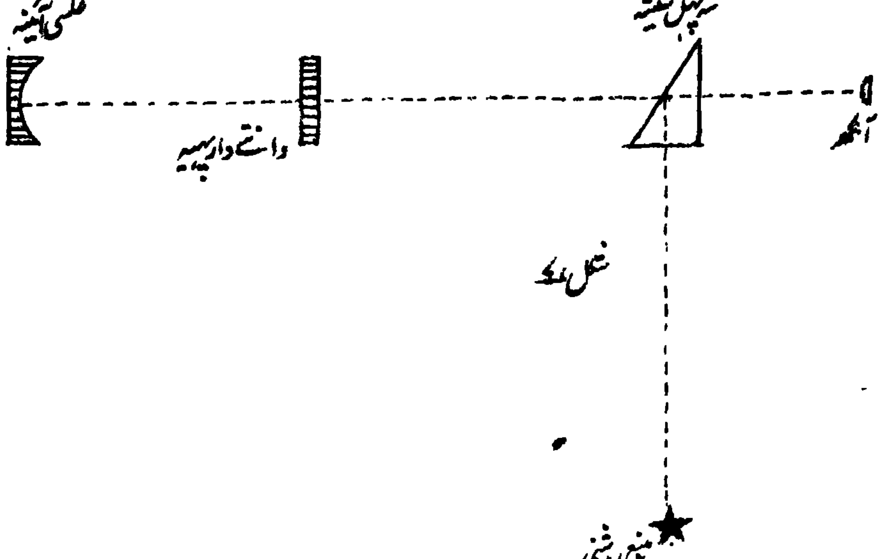
مک اور فورس نے بہتر آلات سے ناپ کر تین لاکھ ایک ہزار ۳ سو ۸۰ کلو میٹر مقرر کیا۔ فوکا نے بجائے پہیہ کے ایک متحرک عکسی آئینہ سے ناپا تو دو لاکھ اٹھانوے ہزار کلو میٹر مقرر کیا۔ مگر آخری اعداد جو زیادہ صحیح ہیں اور جنکی بعض بجلی کے آلات کے ذریعہ سے بھی تصیح کر لی گئی ہے یہ ہیں۔

میلوں میں ۲۹۹۸۲۰

کلو میٹر میں ۲۹۹۹۱۰

یک دانت میں سے نکلنے تو دیا مگر جب یہ واپس آئی تو دانت ہل چکا تھا اور بجائے خلو کے ٹھوس پہیہ سامنے آگیا تھا اگر روشنی کی رفتار اتنا ہی تیز ہوتی یعنی تمام فضا میں سے ہوکر یہ آناً فاناً آجاتی تو پہیہ کو خواہ کتنی ہی تیز حرکت دیجاتی تو بھی یہ اُسی خالی دانت میں سے واپس آجاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

اسی اصول کو مدنظر رکھکر فزو نے تجربہ کیا۔ اُس کے بعد کورنو Cornu فوکا Foucault وغیرہ نے آلات میں ترمیم کرکے زیادہ صحت کے ساتھ روشنی کی رفتار کو نا پا۔ مگر اصول تقریباً وہی تھا



شکل

پیرس کی رصدگاہ میں جو تجربہ کیا گیا تو اُس میں دانت والے پہیہ سے عکسی شیشہ جہاں سے روشنی واپس آتی ہے ۲۲۹۱۰ میٹر[سلہ] (چودہ میل تقریباً) کے فاصلہ پر تھا۔ اور پہیہ میں ڈیڑہ سو دانت تھے۔ پہیہ کا قطرہ ۳ ملی میٹر تھا۔ اور تقریباً ۹ سو چکر فی سکنڈ کی رفتار سے گھوم سکتا تھا۔ اس رفتار سے ۱۳۵۰۰۰ دانت فی سکنڈ گزرتے تھے۔ اور چونکہ ایک دانت کی چوڑائی پون ملی میٹر سے بھی کچھ کم ہوتی تھی۔ اس لئے روشنی ایک دانت کے بیچ میں سے گزر کر جب ۲۸ میل طے کرکے واپس آتی تھی تو اُسے واپسی پر بجائے دانت

سلہ ایک میٹر ایک گز اور ۳۷ء۳ انچ کے برابر ہوتا ہے۔ کلو میٹر ہزار میٹر کا ہوتا ہے جو تقریباً ۶۲ء میل کے برابر ہوتا ہے۔

ان اعداد میں زیادہ سے زیادہ تیس کلو میٹر فی سکنڈ کی غلطی کا احتمال ہے جو ایسے بڑے اعداد میں ضرور نظرانداز کرنیکے قابل ہے۔ اگر ان تعداد کو میلوں میں منتقل کرلیں تو ۳۱ ۹ ۸ ۵ ۰ ۸ ۱ میل فی سکنڈ ہے مگر علی العموم جبتک کہ خاص طور سے بہت ہی صحت سے ناپنا منظور نہو ایک لاکھ ۸۶ ہزار کی رقم ہی یاد رکھئے اور یہ معمولی حساب کے لئے کافی ہے۔ روشنی۔ حرارت اور بجلی کی رفتار ایک ہی ہے جس طرح آواز کا واسطہ (Medium) ہوا ہے اُسی طرح ہوا روشنی اور حرارت کا واسطہ ایتھر کے ذریعہ ہے، جو تمام فضائے عالم میں ہر جگہ بھرا ہوا ہے۔ جس طرح بغیر ہوا کے آواز کا سننا ناممکن ہے اُسی طرح اگر ایتھر نہو تو نہ بجلی کی چمک نظر آئے نہ آفتاب کی روشنی نہ اسکی حرارت اور لاسلکی کے آلات سب بیکار ہوجائیں اور خبر رسانی وغیرہ سب ناممکن ہو۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوا کہ ایتھر کے ذریعہ جو قوتیں منتقل ہوتی ہیں ان کی رفتار وہی ہے جو روشنی کی ہے۔

عرب فرانسیسی ادبیات میں

رولان کا گیت

(۲)

شارل راتوں رات فرانس کیطرف روانہ ہوجاتا ہے، سیزر کے قریب پہنچکر فوج نے پڑاؤ ڈال دیا سب لوگ تھکے ماندے تھے سو گئے۔ شارل بھی سوگیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ گینلون اُسے پکڑکے زور سے ہلا رہا ہے اور پھر اس کے بعد دیکھتا ہے کہ ایکس پہنچکر ایک ریچھ نے اس کے سیدھے ہاتھ میں کاٹ کھایا، پھر ایک تیندوا اس پر حملہ کرتا ہے، پھر ایک خرگوش چھلانگیں مارتا آتا ہے اور ریچھ کا سیدھا کان نوچ لیجاتا ہے، شارل کے اس خواب کی کوئی تعبیر سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے دن شارل نے سرداروں سے پوچھا کہ عقب میں کسے رکھنا چاہئے۔ جس طرح لڑائی میں ہراول کی فوج اہمیت رکھتی ہے ویسے ہی واپسی پر عقب کی فوج اہمیت رکھتی ہے۔ دشمن سے اگرچہ صلح ہوگئی ہے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری چیز ہے۔ تنگ و تاریک دروں سے گزرنا خطروں سے خالی نہیں۔ گینلون۔ شارل کی تقریر سن کے جھٹ سے بول اٹھا کہ اس کے لئے رولان سے زیادہ کوئی دوسرا موزوں نہیں، رولان بہادری میں آپ اپنی نظیر ہے اور بہت سی لڑائیوں کا اسے تجربہ بھی ہے۔ پھر شارل نے پوچھا کہ ہراول پر کون رہے؟ گینلون نے اوجیے والئ ڈنمارک کا نام پیش کیا۔

شارل نے گینلون کی دونوں تجویزیں منظور کرلیں، رولان خوش ہے، اسے اپنی جان خطروں میں ڈالنے میں مزا آتا ہے۔ اس نے سب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جب تک میری تلوار سلامت ہے اُس وقت تک خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی، ہمارے آدمی گھوڑے، ٹٹو اور سب سامان صحیح سلامت فرانس پہنچ جائیگا، اس کے بعد گینلون سے مخاطب ہوکے کہا کہ "تم نے جس لئے میرا نام پیش کیا ہے مجھے معلوم ہے، تم سمجھے تھے کہ تمہاری طرح میرے ہاتھ سے بھی دستانہ گرجائے گا۔ پھر شارل کے پاس جاکر

یہ کہنے لگا "مجھے اپنی کمان بطور نشانی مرحمت کیجئے، دنیا میں کوئی طاقت نہیں جو اسے میرے ہاتھ سے چھین سکے جب تک جان میں جان باقی ہے اس کی بے عزتی نہیں ہونے دوں گا۔

شارل۔ پیارے بھتیجے! میں اپنی آدھی فوج بھیج دیتا ہوں، یہ تمہاری سلامتی کے لئے ہے۔

رولان۔ اتنی فوج کا کیا کروں گا۔ خدا مجھے اس دنیا میں اور آخرت میں ذلت دے اگر میں اپنے بزرگوں کے نام پر آنچ آنے دوں، بیس ہزار بہادر فرانسیسی میرے لئے بہت کافی ہیں۔ آپ بے کھٹکے رہئے جب تک میں زندہ ہوں آپ کو کس بات کا غم ہو سکتا ہے۔

رولان اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے، اولیوئے اور اسکے دوسرے ساتھی عہد کرتے ہیں کہ چاہے کچھ ہی ہو لیکن کبھی ایک دوسرے کو دغا نہیں دیں گے، رولان گوتیئے والئی ہم کو بیس بہادر ساتھ کرکے پہاڑی دروں کی نگہبانی کے لئے بھیجتا ہے،

شارل کی باقی فوج فرانس واپس جا رہی ہے۔ سب لوگ دشوار گزار گھاٹیوں اور دروں کو خوشی خوشی طے کر رہے ہیں۔ گاسکون کی سرسبز شاداب زمین دیکھ کے سب کو اپنی اپنی موروثی جاگیریں یاد آگئیں۔ سب کو اپنی بیبیاں اور اپنی بیٹیاں یاد آنے لگیں۔ سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ڈبڈبانے لگے۔ شارل کی طبیعت گری جا رہی ہے، وہ بہت رنجیدہ ہے۔ اسے اپنے بھتیجے رولان کو عقب میں چھوڑنے کا بہت رنج ہے۔ وہ بہ مشکل اپنے آنسو روک سکتا ہے۔ اس حالت میں دیکھکر نواب نائم نے پوچھا۔

نائم۔ آپ کی طبیعت کیا کچھ ناساز ہے۔

شارل۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو، جو مجھ سے سوال کرے گا مجھے ناخوش کرے گا، لیکن میں اپنا دکھ چھپا بھی نہیں

---

(۱) عین لڑائی کی حالت میں جب رولان کے دوست اولیوئے نے کہا کہ دیکھو گنیلون نے ہمیں دغا دی تو رولان کو اپنے ایک عزیز کے متعلق یہ رائے سن کے بہت ناگوار معلوم ہوا حالانکہ یہاں وہ خود گنیلون کی نیت پر شبہ کرتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ گیت بھاٹوں کے حافظوں میں صدیوں محفوظ رہا۔ حافظہ چاہے کتنا قوی ہو لیکن انسانی حافظہ ہے یہ اختلاف بیانی قابل معافی ہے۔

سکتا ہوں، گینلون کے ہاتھوں فرانس تباہ ہوگیا۔ آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ گینلون میری تلوار توڑ رہا ہے، بتاؤ اس کی تاویل اس کے سوا اور کیا ہے کہ میرے بھتیجے رولان پر جسے میں تنگ و تاریک پہاڑی دروں میں چھوڑ آیا ہوں، کوئی مصیبت آنیوالی ہے۔ رولان کے بعد اس کی جگہ کون پر کریگا

ادھر آکی فوجیں فرانس واپس جا رہی ہیں ادھر اسپین میں بالکل دوسرا ہی نقشہ جم رہا ہے، گینلون کی خوب آؤ بھگت ہو رہی ہے، سونا چاندی، ریشم کے کپڑے، گھوڑے خچر، اونٹ اور شیر تحفوں کے طور پر اسے دئے جا رہے ہیں۔ مارسیل نے اسپین کے سارے صوبہ داروں کو اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ طلب کیا ہے، سار اگوس کے مقام پر چار لاکھ آدمی جمع ہیں سب سے اونچے مینار پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بت نصب کیا گیا ہے اور ہر ایک اس کی پرستش کرتا ہے اور نیاز میں مانگتا ہے بسب عہد کر کے گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں، اور فرانسیسیوں کے مقابلہ کو نکلتے ہیں مارسیل کا بھتیجا ایک خچر پر سوار ہے، چلتے وقت بادشاہ مارسل کی خدمت میں یوں عرض کرتا ہے۔

"میں نے بہت دنوں سے آپ کی خدمت کی ہے، اسکا بدلہ مجھے سوائے تکلیف کے اب تک اور کچھ نہیں ملا کتنی لڑائیاں میں نے جیتیں لیکن کوئی انعام واکرام نہیں۔ اب اس دفعہ رولان پہلا وار کرنے کے بدلے میں مجھے کہیں جاگیر عطا کیجئے۔ اگر رولان کے اپنی تلوار سے دو ٹکڑے نہ کردوں تو نام نہیں! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میری مدد کریں تو اسپین کے پھاٹکوں سے فرانسیسیوں کو باہر نکال دونگا۔ شارل تھک ہار کے فرانس واپس چلا جائے گا۔ اور پھر ہمیں ہمیشہ کے لئے لڑائی جھگڑے سے چھٹی ہو جائے گی۔

بادشاہ مارسل اپنے بھتیجے کو دستانہ دیتا ہے، وہ دستانہ لیکر یوں مخاطب ہوتا ہے۔

"جناب والا! آپنے جو چیز مجھے عنایت کی ہے وہ انمول ہے۔ اب اپنے سرداروں میں سے بارہ چنے ہوئے میرے حوالہ کیجئے تا کہ شارل کے بارہ نوابوں(۱) کے مقابلہ میں انہیں لیجاؤں"

مارسل کا بھائی۔ بھتیجے میں تیرے ساتھ چلتا ہوں، شارل کے عقب کی فوج کو مار لینا کونسی بڑی بات

(۱) Barons

ہے جو میں کہتا ہوں کر چھوڑوں گا۔

دوسری طرف سے ملک بربر کا بادشاہ کورسالی آتا ہے، ان سے بھی نوابوں کی طرح دون کی لینی شروع کی "ہم لوگ فرانسیسیوں کو ضرور شکست دینگے، ساری دنیا کا سونا بھی ہمیں ہمارے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتا۔

مالپرس والئی برگیان اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑائے لا رہا ہے، مارسل کے پاس آ کے ایک دم سے گھوڑا روک کے یوں کہتا ہے "اگر رولان میرے ہتے چڑھا تو ابھی طرح مزہ چکھاؤں گا۔

بالاگوے کا امیر بھی پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت خوش رو آدمی ہے، اپنے گھوڑے جب کاٹھی کس کے تن کر بیٹھتا ہے تو اس کے چہرے سے عجب وقار اور دبدبہ ٹپکتا ہے۔ اسکی سورمائی کے دور دور چرچے ہیں۔ اچھے اچھے اسکا لوہا مانے ہوئے ہیں، اگر یہ ہمارا ہم مذہب ہوتا تو کیا اچھا ہوتا۔[1] یہ نوجوان بادشاہ مارسل کے قریب پہنچکر یوں مخاطب ہوتا ہے۔

"میں اپنی جان پر کھیل کے رونسیو[2] جاتا ہوں، اگر رولان اور اولیوئے کو پالیا تو بس دونوں نہیں، فرانسیسیوں کے لئے یہ ماتم اور بےعزتی کا دن ہوگا، بادشاہ شارل اب بڈھا ہوا، اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا ہے، اس لڑائی کے بعد ہمت چھوڑ دیگا اور تھک کر اسپین ہمارے لئے چھوڑ جائے گا۔"

نوجوان کی یہ باتیں سن کے بادشاہ مارسل نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔

والئی مورین شیخی خورہ ہے۔ سارے اسپین میں اس سے بڑھکے کوئی عیار نہیں، بادشاہ مارسل کی خدمت میں یوں عرض کرتا ہے۔

"رونسیو میں میں اپنا دستانہ لئے ہوئے بیس ہزار کی سرداری کروں گا، اگر کہیں رولان

(۱) مسیحی بھائی کی یہ طفلانہ خواہش بالکل ویسی ہے جیسے ہمارے ہندوستان کے بعض مسلمان مہاتما گاندھی کی تعریف کرتے کرتے یہ کہنے لگتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان ہوتے تو کیا اچھا ہوتا۔

(۲) یہ وہ جگہ ہے جہاں معرکہ کارزار گرم ہوگا، فرانس اور اسپین کی سرحد پر کوہ پرنیس کے دروں میں اس مقام کی یادگار اب تک موجود ہے، سنا ہے بعض چٹانوں پر تلوار کی کاٹ کے نشان موجود ہیں جنہیں رولان کی تلوار دُرینڈال کے کاٹ بتایا جاتا ہے، اسمیں واقعیت سے زیادہ افسانہ سازی معلوم ہوتی ہے۔

سے آمنا سامنا ہو گیا تو اس کے تکے بوٹی کر ڈالوں گا، قسم کھا کے کہتا ہوں کہ شارل اپنی اس شکست کا عمر بھر نوحہ کرتا رہے گا۔"

اتنے میں ترجیس والی تارتیلوس آن پہنچتا ہے، یہ عیسائیوں کی جان کا بڑا دشمن ہے۔ مارسیل سے یوں کہتا ہے: "ہمیں دنیا میں کسی بات کا ڈر نہیں ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ مقابلہ روما کے سینٹ پیٹر کے زیادہ عزیز ہیں، اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خادم ہیں تو میدان ہمارے ہی ہاتھ رہے گا۔ رونسیو دین میں رولاں کے مقابلہ پہ جاؤں گا۔ اسے موت سے بچانیوالی کوئی چیز نہیں، میری تلوار دیکھئے کیسی اچھی اور بڑی ہے۔ دروندال[1] کے خلاف اسے عنقریب آزمانا ہے، بہت جلدی سب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں کون بھاری رہا، اگر فرانسیسی ہم سے ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔ بڈھے شارل کی قسمت میں اب بے عزتی اور رسوائی معلوم ہوتی ہے کبھی تاج پہن کے اب وہ نہیں نکلے گا۔"

اس کے بعد اسکریز والی والیسترن[2] مارسیل کی طرف آتا ہے یہ خالص عرب ہے، والترن اس کی جاگیر ہے۔ یوں عرض کرتا ہے۔

"میں رولاں کے گھمنڈ کو نیچا دکھانے آیا ہوں، اگر وہ میرے مقابلہ میں آیا تو اپنا سر دھڑ پر سلامت نہیں لیجائے گا۔ اولیوے جسے اپنی سرداری کا غرہ ہے، اس کی بھی خیریت نہیں۔ اس شکست کے بعد فرانس عبائیں بھائیں بولنے لگے گا، شارل کا کوئی باجگذار بھی نہیں رہے گا۔

بادشاہ مارسیل استرگان اور استرامارز کو دیکھ کے انکی طرف دستانے بڑھاتا ہے اور ان سے

---

(۱) دروندال رولان کی تلوار کا نام ہے۔

(۲) ناموں کا پتہ لگانا بڑا دشوار ہے، مسلمانوں کے جو نام اس گیت میں مذکور ہیں کبھی سننے میں نہیں آئے یا تو یہ ہوا ہے کہ تلفظ بگڑتے بگڑتے بالکل مسخ ہو گیا ہے یا یہ کہ یہ اصل نام نہیں اور خود بھاٹوں کی تصنیف ہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے ناموں سے اسپین اٹلی کے قریب کے ممالک اکثر آشنا تھے اس لئے گیتوں میں اس بات کا ضرور التزام کیا گیا ہوگا کہ مسلمانوں کے نام اصلی رکھے جائیں بعد میں تلفظ کی خرابی سے وہ کچھ کے کچھ ہو گئے ہونگے۔ شہروں کے ناموں کا بھی یہی حال ہے، جن شہروں کے ناموں کا ذکر ہے آج وہ نہیں ملتے۔

(۳) یورپ میں ازمنہ وسطیٰ کی سورمائی کی کہانیوں میں دستانہ کو وہی اہمیت ہے جو ہندوستانی کہانیوں میں بیڑا اٹھانیکو۔

کہتا ہے کہ تم میرے ان دوستانوں کی عزت آبرو بچانے میں کوئی کوتاہی نہ کرنا۔

الترگان اور استرا مارز۔ ہم آپ کا حکم بجا لانے کو ہر وقت تیار ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ رولان اور اولیوئے دونوں کو قتل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔ ہماری تلواریں بڑی لمبی اور دھاردار ہیں ہم انہیں گرم گرم خون سے لال کرینگے۔ فرانیسی ہلاک ہوں گے۔ شارل روتا رہ جائیگا ہم اسے پکڑ کے آپ کے حوالہ کر دیں گے۔

مرگارزوالی سیوئی دوڑا ہوا آتا ہے۔ اس کی جاگیر کی حد کزارین سے جا کے ملتی ہے۔ یہ آدمی بڑا بانکا ہے۔ اس کی طرحداری ایسی ہے کہ ساری عورتیں اس کے لئے سر دھنتی ہیں۔ ایسی کوئی السنی نہیں جو اسے دیکھ کے مسکرا نہ دیتی ہو۔ یہ سوار بھی بڑا اچھا ہے، بادشاہ کی خدمت میں یوں عرض کرتا ہے "کوئی ڈر کی بات نہیں۔ رونسیووین رولان کو میں اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں گا۔ رولان اور اولیوے دونوں میرے ہاتھ سے بچ کے کہاں جا سکتے ہیں۔ شارل کے بارہوں نوابوں کی موت بھی میرے ہی ہاتھ پر لکھی ہے، میری تلوار ملاحظہ ہو! اسکی مٹھیا سونے کی ہے، پرم کے امیر نے مجھے یہ تحفہ کے طور پر دی تھی۔ اسے فرانسیسیوں کے خون میں رنگین کروں گا۔ سال ختم ہونے سے پہلے پہلے فرانس پر ہمارا قبضہ ہو جائیگا۔ اور سینٹ ڈینس[1] کی منڈی میں ہم جا کر اپنے بچھونے بچھائینگے۔

دوسری طرف سے شیرنیل والی مونیگر آتا ہے۔ یہ جس ملک کا رہنے والا ہے، کہتے ہیں وہاں سورج کی روشنی ہوتی ہے نہ گیہوں اگتے ہیں نہ مینہ برستا ہے، اوس تک نہیں گرتی۔ کوئی پتھر نہیں جو کالا نہ ہو بعض کا تو خیال ہے کہ شیطان یہ رہے ہے، یہ بھی مارسیل کے سامنے یوں ڈینگ مارتا ہے مجھے جھوٹا کہئے گا اگر رولان کو نہ ماروں۔ اس کی دروندال کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دوں تو نام نہیں

---

(۱) سینٹ ڈینس شہنشاہ ڈیسیس کے عہد میں گول فرانک کو عیسائی بنانے کی غرض سے فرانس آئے تھے یہاں یہ شہید ہوئے چنانچہ انکی یادگار میں پیرس کا ایک بڑا پھاٹک پورٹ ڈینس آجتک موجود ہے، سینٹ ڈینس پیرس کے قریب آج کل ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں سینٹ ڈینس کا مزار تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں غالباً اس جگہ کو آجکل سے زیادہ اہمیت ہو۔ سینٹ ڈینس کی شہادت کی یاد میں ۹ اکتوبر کو تیوہار منایا جاتا ہے۔

بارہوں جاگیردار بادشاہ مارتل کے قریب جمع ہوگئے انکے ساتھ ایک لاکھ آدمی ہیں جو لڑائی کے لئے بیتاب ہیں، انہیں جلدی ہے کہ اپنی تلواروں کو فرانسیسیوں کے خون میں نہلائیں۔ سب تین تین زرہیں پہنے ہیں، سروں پر لوہے کے خود ہیں، دنیا کی فولادی تلواریں ہیں، سب کے پاس مضبوط ڈھالیں ہیں اور والانسی نیزے ہیں انکے جھنڈے بعض سفید ہیں اور بعض لال، سب نے اپنے تو نخچر چھوڑ دئے ہیں اور تیز گھوڑوں پہ سوار ہوکے قطار بندی میں مصروف ہیں۔ مطلع صاف ہے سورج کی روشنی میں انکے اسلحہ چمک رہے ہیں، ہزار نرسنگھے بج رہے، فرانسیسی اس شور کو سن کر گھبرا جاتے ہیں اور آپس میں یوں گفتگو کرتے ہیں

اولیوئے۔ دوستو! معلوم ہوتا ہے عرب تیار ہوکے ہم سے لڑنے آرہے ہیں، عنقریب ہمیں شاید ان سے دوچار ہونا پڑے۔

رولان۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، ہمیں اپنے بادشاہ کی عزت کی خاطر بس یہیں رک جانا اور عربوں کا کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اپنے آقا کے لئے ہمیں ہر مصیبت برداشت کرنا چاہئے، گرمی سردی کی تکلیف ہیچ ہے، اپنی کھالیں اور اپنے رویں قربان کرنے میں کوئی دریغ نہیں (۱) ہم میں ہر ایک اپنی اپنی مردانگی کے جوہر دکھائیگا اور ہمارے بعد کوئی ہمارے لئے بے عزتی کے گیت نہیں گائیگا (۲)، عرب گمراہی میں ہیں اور ہم سچائی پر ہیں یقین کر دیں کبھی کوئی بزدلی کی مثال اپنے دوستوں کو نہ دوں گا

اولیوئے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھکر ادھر ادھر نظر دوڑاتا ہے، اس نے عربوں کو آتے دیکھا اور رولان کو بلاکے یوں کہا۔

اولیوئے۔ دیکھو۔ اسپین کی سرحد سے زرہیں اور خود لاکھوں کی تعداد میں چمکتے نظر آرہے ہیں معلوم

---

(۱) رولان کی یہ تقریر ازمنہ وسطیٰ کے فیوڈل آئیڈیل کو ظاہر کرتی ہے، باجگذار اپنی ہر چیز یہانتک کہ جان اور مذہب تک اپنے "لارڈ" کی خاطر قربان کرنے کو آمادہ رہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ باجگذار مع اپنی تمام رعیت کے اپنے فیوڈل لارڈ کا مذہب قبول کر لیتا تھا۔ خصوصاً کیتھولک پروٹسٹنٹ جھگڑوں کے زمانہ میں تو یہ حق قانوناً تسلیم کر لیا گیا تھا۔

(۲) رولان کے نزدیک اس سے بڑھکے اور کوئی بے عزتی ممکن نہیں کہ مرنیکے بعد لوگ بے عزتی کے گیت گائیں جس طرح آجکل رائے عامہ کا اظہار اخبارات کے ذریعہ سے ہوتا ہے اسی طرح ازمنہ وسطیٰ میں معلوم ہوتا ہے گیت بنانا پروپیگنڈے کا بہترین طریقہ تھا اور ساتھ ہی کسی کو ابدی نیک نامی دینے کا سب سے زیادہ کارگر ذریعہ بھی یہی تھا۔

ہوتا ہے گینلون دغا باز نے ہمیں مصیبت میں ڈلوانے کا پورا سامان کر دیا ہے، شاید اس نے ہم دونوں کا نام اسی لئے عقب میں رہنے کو پیش کیا تھا۔

رولان۔ کہا تو کہا، اب ایسی بات کبھی مت کہنا، میرے عزیز گینلون کے متعلق ایک لفظ میرے سامنے منہ سے نہ نکالنا۔

اولیوئے دوسرے ساتھیوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے

"کبھی کسی انسان نے اتنا بڑا ہجم غفیر نہ دیکھا ہوگا۔ وہ ایک لاکھ سے کم کیا ہوں گے؟ اگر لڑائی ہوئی تو یہ یاد رکھو دنیا میں ایسی لڑائی کبھی نہیں ہوئی ہوگی۔ دوستو! خدا ہمیں استقلال دے آخر وقت تک ہم اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے۔

سب ملکر۔ مردود ہے وہ جو پیٹھ دکھائے، ہم اس وقت تک دغا نہیں دیں گے۔ جب تک جان میں جان باقی ہے۔

اولیوئے۔ دشمن قوی ہے، ہم تھوڑے ہیں، دوست رولان! اپنا نرسنگھا بجاؤ تاکہ شارل کو ہمارے خطرہ کی خبر ہو جائے، وہ ابھی ہم سے بہت دور نہیں پہنچا ہوگا۔

رولان میں پاگل تھوڑا ہی ہوں جو ایسا کروں، پیارے فرانس میں کیا میں اپنا نام ڈبانا تھوڑا ہی چاہتا ہوں لڑائی کے وقت دیکھنا، اپنی دروندال کے ایسے ہاتھ نکالوں گا۔ کہ اسکا سارا پھل سونے کی مٹھیا تک خون میں شرابور ہو جائیگا۔ ہمارے دشمنوں کی بدبختی انہیں ہمارے مقابلہ پر لا رہی ہے۔ میں قسمیہ کہتا ہوں ان سب کی موت انہیں یہاں لائی ہے۔

اولیوئے۔ دیکھو میری سن لو اب بھی نرسنگھا بجاؤ تاکہ شارل ہماری مدد کو کچھ فوج بھیجدے۔

رولان۔ میرے خدا کو یہ بات پسند نہیں آئیگی کہ میں اپنے بزرگوں کے نام پر دھبہ لگاؤں اور فرانس کی بے آبروئی کا ذریعہ بنوں۔ مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ کوئی آدمی یہ کہہ سکے کہ ہم نے عربوں سے ڈر کے نرسنگھا بجایا۔

اولیوئے۔ میں نے اپنی آنکھ سے عربوں کی فوج دیکھی ہے، ساری وادیاں، چوٹیاں اور میدان ان سے

پٹے پڑے ہیں، ہماری فوج انکے مقابلہ میں کچھ نہیں لیکن میں بزدل نہیں ہوں، انہیں دیکھ کے میرا جوش اور بڑھ رہا ہے، یہ بات نہ خدا کو نہ اسکے فرشتوں کو پسند آئیگی کہ میری وجہ سے فرانس کی بدنامی ہو میں مرنے کو بے عزتی پر ترجیح دیتا ہوں لیکن دیکھو رولان! اب وہ ہمارے قریب آتے جارہے ہیں۔ تم آخر اپنا نرسنگھا بجانے پر تیار نہوئے، اگر شارل آجاتا تو کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ دریا کے کنارے پھاٹکوں کی طرف ذرا اپنی فوج کو دیکھو اور انکی فوج کو دیکھو سچ کہتا ہوں قابل رحم حالت ہے آج جو فوج شارل کے عقب کی فوج کہلاتی ہے، افسوس کہ کل وہ باقی نہیں رہے گی۔

۔ رولان کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، نفرین ہے اس دل پر جو ہمت سے خالی ہے ہم استقلال سے لڑیں گے اور جیتیں گے۔

رولان جوش میں تیندوے کی طرح بپھر پڑتا ہے، جوش میں آکر اپنے ساتھیوں کے روبرو یوں تقریر کرتا ہے۔

" دوستو! ہمارے بادشاہ نے ہمیں جن کے عقب کی فوج میں بھیجا ہے، شارل کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم میں سے کوئی بزدل نہیں، ہمیں اپنے آقا (سینیر) کی خاطر سب مصیبتیں جھیلنی پڑینگی اور اپنا خون اور گوشت ضائع کرنا پڑے گا۔ عربوں کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے جوہر دکھاؤ۔ میں اپنی پیاری درنڈال کے ہاتھ دکھاؤں گا۔ اگر میں مرگیا تو لوگ میری تلوار کو دیکھ کے کہیں گے کہ ہاں! یہ بادشاہ شارل کے ایک شریف باجگذار کی تلوار ہے

مہا پادری تراپان ایک ٹیلے پر چڑھ کر یوں وعظ کرتا ہے۔

" اپنے آقا کے لئے ہمیں اپنی جانوں سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔ مسیحی دین کے قیام کے لئے ہر قربانی ہیچ ہے، عربوں کے فوجی دل تم دیکھ رہے ہو، لڑائی ضرور ہوگی، دو ہتی تلواریں چلاؤ اور خدا سے رحم کی درخواست کرو، تمہاری روحوں کی سلامتی اور تمہارے گناہوں کی معافی کی میں بھی دعا کروں گا، یاد رکھو۔ اگر مرو گے تو شہید ہوگے جنت میں سب سے اونچی جگہیں تمہیں ملیں گی۔
سب فرانسیسی گھوڑوں سے اتر کے سجدہ کرتے ہیں(۱) اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔

رولاں نے ٹیلے پر چڑھ کے عربوں کی فوج کو دیکھا تو دنگ رہ گیا، اولیوے سے آکر کہنے لگا۔ واقعی تم نے ٹھیک کہا تھا گینلون نے سونے چاندی کے عوض ہماری جانیں بادشاہ مارسل کے ہاتھوں بیچی ہیں لیکن یہ سودا ایسا سہل نہیں، جب وقت تک ہمارے ہاتھوں میں تلواریں ہیں اُس وقت ہم دشمن کو پاس پھٹکنے نہیں دینگے۔ پھر جوش میں آکر سب ساتھیوں کی ہمت افزائی ان لفظوں میں کرتا ہے "اگر خدا نے چاہا تو شام سے پہلے پہلے ہم عربوں سے اتنا مال غنیمت چھین لیں گے کہ فرانس کے کسی بادشاہ نے بھی کبھی نہ دیکھا ہوگا"۔

اولیوے۔ میرا دل بات کرنے کو نہیں چاہتا۔ تم نے آخر میری ایک نہ مانی اور وہی کیا جو تمہارے من میں آئی۔ تم نے نرسنگھا نہ بجایا۔ شارل کو ہماری اس حالت کی بالکل خبر نہیں، اُسکا اسمیں کوئی قصور نہیں ہمارے ساتھیوں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ وہ دیکھو! وہ آن پہنچے! چلو! چلو! بڑھو! مارو! میں خدا کا واسطہ دیکے کہتا ہوں کہ وار کا بدلہ وار سے دو"۔

گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی، مارسیل کا بھتیجا ایلرودتھ فرانسیسیوں کو گالیاں دیتا ہوا گھوڑا بڑھائے چلا آتا تھا کہ رولاں نے روکا اور بڑھ کے اس زور کا وار کیا کہ اسکی ڈھال اور زرہ دونوں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، اپنی تلوار کے پھل کو ایلرودتھ کی چھاتی کے خون سے رنگین کر لیا۔ اور اپنے ساتھیوں سے چلا کے کہا کہ دیکھو! پہلا وار کیسا بھرپور کیا ہے، ایرلوتھ کی لاش دھڑاک سے زمین پر گر پڑتی ہے رولاں پھر چلاتا ہے کہ دیکھو! "حق ہماری طرف ہے، دشمنوں کی طرف جھوٹ ہے"۔

بادشاہ مارسیل کا بھائی فالسارون نکل کے باہر آتا ہے اور اپنے بھتیجے کو زمین پر گرتا دیکھ کے بدلہ لینے کو آگے بڑھتا ہے، فرانسیسی فوج کے ایک سردار نے ایسی تلوار ماری کہ اسکا سر تن سے الگ جا پڑا، ملک بربر کا بادشاہ کورسابالی اپنے ساتھیوں کی بہت ہمت افزائی کر رہا ہے، پادری تربان کو اس بربری بادشاہ سے جانی دشمنی ہے، اس نے بڑھ کے اسکا خاتمہ کر دیا۔

---

(۱) سجدہ سے میری مراد پروسٹریشن (Prostration) ہے یعنی گھٹنے کو زمین پر ٹیک کر گردن جھکا کے تین دفعہ اپنی چھاتی اور ماتھے پر صلیب کا نشان بنانا۔

رولان اپنے نیزہ سے پندرہ عرب سردار مار چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بس نیزہ کا دستہ رہ گیا ہے۔ اب وہ اپنی تلوار درونڈال میان سے باہر نکالتا ہے اور شیرنیل کیطرف بڑھتا ہے، ایسا وار کرتا ہے کہ شیرنیل کے بھیجے کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں، آنکھوں تک چہرہ کٹ جاتا ہے، دوسرا وار زرہ کے بڑی پر کرتا تھا کہ وہ بھی گھوڑے پر سے گرگیا، لاش کو دیکھ کے رولان نے کہا۔

"غلام زادو! تم نے کیوں اپنے آپ کو بدبختی کے راستہ پر ڈالا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری کوئی مدد نہ کرینگا۔ بھلا تم جیسے بھگوڑے ہم سے لڑنے آئے ہو" اسی طرح رولان ہر طرف مارتا دھاڑتا پھرتا ہے جدھر نکل جاتا ہے صفیں کی صفیں الٹ دیتا ہے!

اولیوئے تماشہ تھوڑا ہی دیکھ رہا ہے وہ بھی اپنے کام میں مشغول ہے، اس کی تلوار کا دستہ ٹوٹ گیا ہے، ابھی ابھی اس نے ترجیزا ورا سترگور کو قتل کیا ہے، رولان اس سے کہتا ہے "یار کیا کر رہے ہو تمہاری تلوار جس کا نام آٹنکلر تھا کیا ہوئی، اس کی مٹھیا سونے کی اور قبضہ بلور کا تھا"

اولیوئے۔ .. اتنا استعمال کرنا پڑا کہ ختم ہوگئی۔

نواب گیران نے اپنے مشہور گھوڑے سوریل کی باگیں چھوڑ دی ہیں، عربوں کی صفیں الٹا پلٹا پڑ رہا ہے، دو برچھوں کو دشمنوں کے پیٹوں میں توڑ چکا ہے اور انہیں دوزخ پہنچا چکا ہے۔ رولان نے دور سے دیکھا اور اولیوئے کو پکار کے کہا "دیکھو! نواب گیران آج ہاتھ دکھا رہا ہے، واہ، واہ کیا وار کیا ہے اسے ہاتھ کہتے ہیں"

لڑائی گھمسان کی ہو رہی ہے دونوں طرف سے جانیں ضائع ہو رہی ہیں، بہت سے فرانسیسی مر گئے، یہ اب کبھی اپنی ماؤں، بیبیوں اور بیٹیوں کو نہ دیکھ سکیں گے، گینلون نے کیسی دغا دی۔

پہاڑوں کے دوسری طرف فرانس کی سرزمین میں آندھی بادل کا ایک طوفان اٹھا ہے کہ خدا کی پناہ! زمین بھی ہل رہی ہے، بہت سے تو کہہ رہے ہیں کہ شاید قیامت آنیوالی ہے، دنیا ختم ہو رہی ہے انہیں معلوم نہیں یہ سب عناصر فطرت رولان کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔

دشمن ایک لاکھ میں سے صرف دو ہزار رہ گئے ہیں، اتنے میں بادشاہ مارسل اپنی خاص فوج لیکر

مدد کو پہنچ جاتا ہے، اس کی فوج کے ۲۰ دستے ہیں" یہ دیکھ کے رولان اپنے ساتھیوں کو یوں مخاطب کرتا ہے " دوستو اور ساتھیو! گینلون نے ہماری سب کی موت کا پورا سامان کر دیا ہے، دغا چھپی تھوڑی رہے گی، شارل ضرور اسکا بدلا لیگا، اب ہمیں چاہئے جان توڑ کے لڑیں، میں اپنی دروندال کے ہاتھ نکالتا ہوں، ہم نے اتنی لڑائیاں جیتیں ہیں۔ اب کہیں ایسا نہو کہ بھاٹ ہماری بدنامی کے گیت فرانس میں گائیں۔

مارسیل کی فوج سے ایک عرب باہر نکلتا ہے، اسکا نام اَبسم ہے، ساری فوج میں اسکی عیاری مشہور ہے، نہ یہ خدا سے ڈرتا ہے اور نہ کنواری کے بیٹے کو مانتا ہے، وہ کالا بھجنگ ہے، قتل و غارت میں اسے مزہ آتا ہے، لڑائی کو، ساری دنیا کے سونے پر ترجیح دیتا ہے کبھی کسی نے اسے ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا، لیکن یہ بڑا بہادر ہے، اسی وجہ سے بادشاہ مارسیل اس سے بڑی محبت کرتا ہے، تریان (پادری) نے دور ہی سے دیکھ کے کہدیا تھا کہ یہ آدمی بڑا سخت مرتد معلوم ہوتا ہے، اسے میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔ تریان کا گھوڑا تیزی میں بے مثل ہے، اس کا نام گروسائی ہے، ڈنمارک کے بادشاہ کو قتل کر کے اس نے اس پر قبضہ کیا تھا، اس گھوڑے کی ٹانگیں ستی ہوئی رانیں اور پیٹھے چوڑے سینے، کوکیں نکلی ہوئی ہیں، دم سفید ایال پیلی اور کان چھوٹے ہیں، گھوڑ دوڑ میں کوئی گھوڑا اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا،

پادری تریان نے اس پھرتی سے ابسم پر حملہ کیا کہ وہ دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا، ابسم کی ڈھال پکھراج اور نیلم اور لالوں سے جڑی ہوئی تھی، ایک شیطان نے وال بتیا کے مقام پر اس ڈھال کو

---

(۱) گیت میں بجائے دیو کے ہر جگہ شیطان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جرمنوں نے عیسائیت قبول کر کے اپنی ماتھالوجی بھی بدل دی ہے چنانچہ وہ اپنی کہانیوں میں سامی مائتھالوجی کے Semantic استعمال کرتے ہیں، حالانکہ مشرق میں ایرانیوں اور ہندوستانیوں نے سامی مذہب قبول کیا اور سامی مائتھالوجی کے الفاظ مثلاً جنات وغیرہ بھی اپنے یہاں رائج کر لئے لیکن انکی مائتھالوجی کا بنیادی تخیل آرین ہی رہا، چنانچہ ایران اور ہندوستان کی ساری کہانیوں سے یہ بات آشکار ہے، الف لیلہ جو ایرانی اثر میں لکھی گئی ہے اسی بات کی تصدیق کرتی ہے۔

یرگلاف کے نذر کیا تھا اور امیر نے اسم کو تحفہ کے طور پر بھیجا تھا، اسم پہلے وار میں ختم نہیں ہوا دوسری دفعہ تریان نے نیزہ اسکے پیٹ سے آر پار کر دیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔

مارسیل کی تازہ کمک سے فرانسیسیوں کے پیر اکھڑنے لگے، رولان اور اولیوے برابر ہمت افزائی کر رہے ہیں اور چلا چلا کے کہہ رہے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس دن کے بعد ہم نہیں رہیں گے لیکن ہمارا نام ہمیشہ رہیگا۔ جنت کے دروازے ہمارے لئے کھلے ہوئے ہیں وہاں ہم معصوموں کی قربت کی لذت پائینگے

رولان نے اپنے مشہور شہ سوار انجلیئے اور سامسون کو زمین پر گرتے دیکھکر اولیوے سے کہا کہ "دیکھو کیسے کیسے بہادر آج خاک میں مل رہے ہیں، بھلا اب فرانس کو ایسے آدمی کہاں ملیں گے

اولیوے۔ خدا ہمیں انکا بدلہ لینے کی توفیق عطا کرے،

رولان۔ پیارا فرانس اجڑ جائے گا۔ اب بتاؤ کیا کریں؟۔

اولیوے۔ میری سمجھ کچھ کام نہیں کرتی، مجھے موت اس بات سے پسند ہے کہ میرے بعد لوگ میرا نام بے غرتی کے ساتھ لیں۔

رولان۔ کہو تو نرسنگھا بجادوں، شارل شاید ہماری مدد کو آجائے۔

اولیوے۔ ایسا کروگے تو اپنے بزرگوں کے نام کو بٹہ لگاؤگے اور انکے ناموں پر ہمیشہ بدنامی کا داغ رہیگا۔ جب میں نے تم سے کہا تھا تو تم نے نرسنگھا کیوں نہیں بجایا، میں اب ہرگز اس بات کیلئے اپنی رضامندی دینے کو تیار نہیں۔ اب اگر تم نرسنگھا بجاؤگے تو بہادری میں شمار نہ ہوگا اگر شارل ہمارے ساتھ پہلے سے ہوتا تو اور بات تھی، اب تم ایسا کروگے تو یاد رکھو میں اپنی داڑھی کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تم میری بہن اوڈ کے پہلوؤں میں کبھی نہیں لیٹ سکوگے۔

رولان۔ بھائی غصہ کیوں ہوتے ہو؟

اولیوے۔ یہ سب تمہارا قصور ہے، دانشمندانہ بہادری اور حماقت دو علیحدہ باتیں ہیں، احتیاط تہوّر سے زیادہ ضروری ہے، فرانسیسیوں نے تمہاری حماقت سے جانیں ضائع کیں اب کبھی ہم شارل کی خدمت نہ کر سکینگے اگر تم نے پہلے ہی میری بات مان لی ہوتی تو اسوقت شارل ہمارے ساتھ ہوتا اور ہم لڑائی جیت لیتے۔

ترکیۂ جدید میں تمدنی تحریک

(۲)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس نئی تحریک سے جو انقلاب پیدا ہوا وہ ایک تو ایک نئے تصور حیات و کائنات کی شکل میں اور دوسری طرف ایک جدید سیاسی و معاشی تنظیم کی صورت میں رونما ہوا۔ اگر نئی دنیا کے مظاہر تکوین پر سلسلہ وار نظر ڈالی جائے تو یہ جدید تصور کائنات و حیات مندرجۂ ذیل واقعات میں نظر آئیگا۔

۱۔ انسان اور اُس کی عقل کی قدر۔ ۲۔ زندگی اور دنیا کی طرف انسان کا رویہ۔ ۳۔ فرد اور جماعت کا تصور اور جدید ریاست اور نئی معیشت کے مظاہر میں ایک نئی سیاسی و معاشی تنظیم۔

انسان اور اُس کی عقل

قدیم ترکوں کا تصور کائنات، اسلامی تصور تھا، لیکن عثمانی ترکوں نے جب اسلام کو قبول کیا ہے تو یہ کافی تاریخی نشو و نما پا چکا تھا اور اپنی اصلی ہیئت سے بہت کچھ ہٹ چکا تھا۔ اصل اسلام میں انسان کو کائنات میں سب سے بلند جگہ دی گئی تھی لیکن تاریخی نشو و نما کے دوران میں انسان کی یہ شاہانہ شوکت مدہم پڑ چکی تھی قرآن میں دو بلند اور ابھارنے والے مقامات ہیں جہاں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم کے سامنے بہ حیثیت خلیفۂ الٰہی سر بسجدہ ہوں اور ایک دوسرے مقام پر ہے کہ آدم ہی کو علم اسما عطا ہوا اور یہی اسما علم ارضی کی نشانیاں اور علامتیں ہیں۔ اسی قسم کے مقامات قرآن میں متعدد ہیں۔ میں یہاں بس ایک اور مقام کا ذکر کروں جسے آج کل بہت نقل کیا جاتا ہے اور جیسا کہ ہم آگے چلکر دیکھیں گے محمد عاکف نے اپنی معروف نظم "انسان" میں اسے استعمال کیا ہے یعنی وہ مقام جہاں انسان کو بشارت دی گئی کہ خدا نے ارض و سما کی تمام چیزیں اس کی باجگذار بنائی ہیں۔

قدیم اسلام میں انسان کو کائنات میں جو تفوق دیا گیا تھا اور عالم کی جو حکمرانی عطا ہوئی تھی اسے تاریخی اسلام نے یا تو بھلا دیا یا اس کی غلط توجیہیں کیں۔ قرآن کے تصور کائنات میں انسان کو جو بلند مرتبہ دیا گیا ہے

اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا اس کی تشکیل میں جماعتی اور سیاسی عناصر کا اثر ہے یا وہ نبی اسلام کے احساس جماعتی کا نتیجہ ہے لیکن اسمیں شک نہیں کہ بعد کو چلکر اس پر سیاسی و جماعتی حالات نے اثر ڈالا، اسمیں کمی کی اور بالآخر اسے بالکل مٹا ہی دیا۔ ایک طرف اسلامی ممالک کی جابرانہ حکومت تھی جس نے انسان کو اتفاقات اور بادشاہوں کے مزاج و وہم کے لئے کھلونا بنا دیا اور سیاسی و معاشی انحصار کا دائمی عذاب اس کے سر ڈالدیا تھا دوسری طرف تمدن و تہذیب کے انحطاط نے اسے قدرت کی بے رحم طاقتوں کا دست نگر کردیا تھا۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی نہ تھیں کہ عظمت بشری کا قرآنی تخیل اسمیں قائم رہ سکتا ہاں خود ان نئے حالات میں قیام کی صلاحیت تھی۔ قدیم دنیا میں جبتک یہ قوت باقی تھی کہ اپنے اثر کو قائم رکھ سکے اس وقت تک افراد کے لئے سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ رضا و تسلیم کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلے چلیں، لیکن جب پھر وقت آیا تو انسانیت نے اپنا حق حاصل کرنیکی کوشش کی۔ عثمانی سلطنت کے سیاسی انقلابات، مغربی تمدن سے تعلق اور یورپی انسانیت سے واقفیت ان سب چیزوں نے ملکر ایسی مدد کی کہ مدت کا دبا ہوا مواد پھوٹ پڑا۔

لیکن اس نئے تصور کائنات کی بنیاد خالص اسلامی تھی اور یہ قرآن کے صفحات میں اپنی ترجمانی اور اپنی تصدیق کا متلاشی تھا۔ چنانچہ قرآن کے وہ مقامات اب یاد آنے لگے جنکا ذکر اوپر ہوا ہے نئی شاعری خطابت، وعظ، مدرسوں کی کتابیں سب کی سب اسی نئے تصور سے پر ہیں۔ میں یہاں صرف دو مثالیں کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک توفیق فکرت کی نظم "آسمان سے زمین تک" ہے جس میں وہ انسان کے تمدنی فتوحات کی قصیدہ خوانی کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ تو تو بجائے خود ایک عالم ہے۔ فتوحات اور حسن کی دنیا۔ اے حیات، اے روح عالم، اس کی عزت و عظمت کر و۔ انسان کی عزت و عظمت تمہارا فرض ہو کہ اس کی عزت کر و۔ یہی خیر و شر کا خالق ہے۔ یہی خالق امکان!"

دوسرے محمد عاکف کی نظم "انسان"

"انسان اپنی قدر نہیں پہچانتا۔ وہ تو فرشتوں تک سے بلند تر ہے۔ اس کے سینہ میں علم نہاں ہیں

اس کے قلب پر وجود باری اپنا پرتو ڈالتا ہے جسمانی حیثیت سے دیکھو تو ایک ادنیٰ چیز ہے لیکن کارسازی الٰہی کا مقصود یہی ہے اور اسی لئے ابدی ہے اور بے قیود۔ قدرت اس کی خادمہ ہے، عالم اشیاء اس کا باجگزار ہے۔ دنیا اس کی مرضی اور اس کے آئین کی فرمانبردار ہے۔ یہ کائنات کا تاج ہے،،

انسان کی اس قدر کے ساتھ ساتھ اس کی عقل کی قدر بھی بڑھی ہے بلکہ اسی میں وہ بھی شامل ہے قرآن کے تصور میں انسان بھی دیگر مخلوق کی طرح ایک وجود ہے۔ جو چیز اسے ان پر فضل کرتی ہے اور کائنات سر تاج اور خالق و مخلوق کی حد فاصل بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں عقل اور ذہن ہے۔ انسانیت عقلیت کا نام ہے۔ انسان عقل ہے۔ اسلام جب انسان کو مخاطب کرتا ہے تو ایک قوت خیال اور عقل سے متصف ہستی کی طرح۔ قرآن اسے فکر و تدبر کی ہدایت کرتا ہے۔ قرآن اور رسول اللہ دونوں انسان میں عقل و فکر کے یقین کو پہلے سے فرض کرتے ہیں (دیکھو احمد حمدی کی کتاب "دینی درسلر")

عقل کی حقارت کا جذبہ تاریخی اسلام میں متصوفین کے یہاں پیدا ہوا۔ انہوں نے شریعت کی رسمی پابندیوں اور متکلمین کی عقلیت کے خلاف علم بلند کیا ادھر دوسرے حلقوں میں عقل سے مراد یہ صلاحیت نہ رہی جس کا مطالبہ قرآن اور رسول نے کیا تھا کہ ہمیشہ از سر نو تخلیقی طور پر ایمان و عقیدہ کو تازہ رکھا جائے بلکہ اسے فرائض انسانی کی وجہ بنا کر چھوڑ دیا گیا۔ حکم اب یہ تھا کہ متکلمین کے ذہنی کارناموں پر انسان کو عقیدہ رکھنا چاہیئے چونکہ یہ عقل رکھتا ہے۔ اس کے فرائض متعین تھے اور ان کا پورا کرنا اس کے لئے ضروری تھا اور یہ بھی اس لئے کہ یہ عقل رکھتا ہے۔ ایمان کا اصلی اور ابتدائی اختیار جبر میں تبدیل ہوگیا۔ اب جو دوبارہ انسانیت کا انکشاف ہوا اور اس نے اپنے حقوق از سر نو حاصل کئے تو عقل کے بھی دن پھرے چنانچہ اس نئی تمدنی تحریک میں شروع سے آخر تک ایک عقلی رو دکھائی دیتی ہے۔ اور جب مغرب سے تعلق پیدا ہوا تو۔ ترکوں کو زمانہ روشنخیالی کے فلسفہ نے اپنی طرف کھینچا بلکہ عقل کی پرستاری یہاں تک ہوئی کہ مذہب کی مخالفت شروع ہوگئی لیکن اس کا جواب علماء نے یہ ظاہر کرکے دیا کہ اسلام میں عقل کا کس قدر بلند درجہ ہے۔ اس ضمن میں بھی میں فکرت اور عاکف کی نظموں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ فکرت نے تو اپنی ایک نظم میں عقل پر ایمان رکھنے کو اساس ایمان قرار دیدیا ہے۔

انسان اور کائنات

انسان میں اپنی خودی کا یہ شعور ساتھ ہی ساتھ دنیا میں اس کی حیثیت کا احساس بھی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن عہد ماضی نے دنیا کی طرف جو رویہ اختیار کر رکھا تھا اس کی وجہ سے آج تک اپنے اس دوگونہ احساس پر ذہنی اور روحانی پابندیاں عاید پاتے ہیں، اس نئے احساس نفس کے ساتھ رہبانیت، زندگی سے انکار اور بےعملی کیونکر نبھ سکتی ہے کہ یہ تو ذوق عمل سے از سرتا پا پُر ہے۔

قرآن اور ابتدائی اسلام کے تصور کے مطابق تو دنیا اور آخرت کے تخیل میں نہایت مناسب توازن تھا۔ اسمیں صرف رہبانیت یا زندگی یا دنیا سے انکار کی کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ ذرا ان اقوال کو پڑھئے "کہ خدا نے تجھکو جو کچھ دیا ہے اسمیں آخرت کو ڈھونڈھ لیکن اس دنیا میں اپنے حصہ کو نہ بھول" "تم میں سے سب سے بہتر وہ نہیں ہے جو اپنی دنیا کو اپنی آخرت کی خاطر یا اپنی آخرت کو اپنی دنیا کی خاطر چھوڑ دے۔ بلکہ افضل وہ ہے جو دونوں کو ملا سکے کیونکہ دنیا آخرت کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور آدمی پر محض بوجھ نہیں" "دنیا کے لیے کام کرو، اس طرح کہ گویا ہمیشہ زندہ رہوگے اور آخرت کے لئے کام کرو اس طرح کہ گویا کل مر جاؤگے" یہ زندگی کو قبول کرنے والا ولولۂ عمل اسوقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ جماعتی معاشی اور سیاسی حالات دنیا میں انسان کی فضیلت کی تصدیق کرتے ہیں اور اسکے ذوق عمل کے لئے کھلا میدان دیتے ہیں اور خصوصاً جب تک کہ انسان ایمان سے لبریز اعمال کے جوش میں اپنی ہستی کو بھلائے رہتا ہے۔ ایسے زمانوں میں دنیا اور زندگی کی حیثیت مصائب کی سی نہیں ہوتی لیکن جب سیدھے سادے ایمان کا عہد شباب گذر گیا، ذہنی اور مادی ترقی رک گئی، اور عام تہذیب و تمدن کا زوال اپنے تمام نتائج کے ساتھ رونما ہونے لگا تو احساس زندگی میں بھی تغیر پیدا ہوا جس نے بدھمت، عیسائیت، اور نوفلاطونی فلسفہ کی صورت میں اپنے اظہار کی شکلیں نکالیں۔ عربی اسلامی سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ اسلامی دنیا کی توحید عقائد و شریعت بکھر گئی، مذہبی فرقے اور فقہی مذاہب پیدا ہوگئے۔ غرض ہر طرف تباہی و انتشار کی شکلیں دکھائی دینے لگیں، آزاد اسلامی حکومت کی شکل بدل کر اب استبداد قائم ہوا اور جبر و قوت کی حکومت چاروں طرف قائم ہوگئی، ان سب چیزوں نے وہ زمین تیار کی جس میں ایک منفی اور مجہول تصور کائنات کا پودا سر ابھار کر جڑ پکڑے۔

ترک جب میدان میں آئے، اور یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کو انہوں نے پھر قائم کیا تو یہ حالات تاریخی حقائق بن چکے تھے اور کم سے کم عملی دنیا میں ان سے دوچار ہونا لازمی تھا۔ شروع شروع میں تو اس نوجوان اور حقیقت پسند قوم کے جذبۂ حیات اور ذوقِ عمل نے ان چیزوں کو دبا یا لیکن آگے چلکر یہاں بھی وہی صورت حال پیدا ہوگئی یعنی زندگی سے نفرت دنیا کی حقارت اور تقدیر پرستی نے یہاں بھی فرمانروائی شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں نئی تمدنی تحریک نے پھر انقلاب پیدا کیا ہے جو نہایت شدید اثبات زندگی اس دنیا کے تخیل اور ارتقا کے تصور کی شکل میں رونما ہو رہا ہے۔

اثبات زندگی کے اس جذبہ کا سب سے پہلا قوی اظہار نامق کمال کی تصانیف میں ملتا ہے اپنے مشہور مضمون "سعی" میں اور بے شمار دوسرے مواقع پر اُس نے اس ناپائدار اور فانی دنیا کی حقارت کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ عبد الحمید نے اپنی تصانیف اور اپنی شخصیت میں اس نئے تصور کائنات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ مثال کے طور پر میں اُسکی نظم "بر واعظہ بر موعظہ" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے مطالب کی نوجوان شعراء نے تقریباً حرف بحرف نقل کی ہے حتی کہ توفیق فکرت کے کلام میں بھی جس کو پاس متشرب سمجھا جاتا ہے اس ذہنی انقلاب کا اظہار موجود ہے۔ ضیا کوک الپ کے ہاں تو یہ چیز بالکل ہی بدیہی ہے اور یہی حال ایمن کا ہے جس نے اس خیال کو متعدد نظموں میں ظاہر کیا ہے، وہ اپنی ایک نظم "اُس دن" میں اُس مبارک گیت گاتا ہے جب اُس کی قوی امیدیں بر آئیں گی۔ وہ دن جب "انسان خنداں ہوگا، زمین خنداں ہوگی، آسمان و سمندر خنداں ہوں گے" اور اسکا ہر قومی بھائی پکار اٹھے گا "میں دنیا سے محبت کرتا ہوں۔ میں زندگی سے محبت کرتا ہوں"۔ عاکف نے اسی مضمون کو خالص اسلامی رنگ کی نظموں میں نہایت دلفریب الفاظ سے ادا کیا ہے میں اس موقعہ پر اسکی کتاب "صفحات" کے چوتھے حصے اور پانچویں حصے کی پانچویں اور چھٹی نظم کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔

اثبات عالم کے ساتھ دنیا داری کا تصور بھی ملا ہوا ہے۔ کچھ تو اس کی آمیزش غیر شعوری طور پر جذبات کے ساتھ ہے اور کچھ شعوری اور واضح الفاظ میں اس کا اظہار ہو چکا ہے، جیسا کہ متذکرہ بالا نظموں سے ظاہر ہوتا ہے، عاکف تک اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اور "صفحات" کے پانچویں حصہ کی چھٹی نظم میں یہ

خیال اُس کے یہاں بھی قوت کے ساتھ موجود ہے۔ امین کی نظم "ایک نوجوان کے نام" اس سلسلہ میں بہت قابل لحاظ ہے۔ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے "قدرت کی عظمت کو پہچان اور عرصہ عالم کو تنگ نہ بتلا، اپنی محبوب کے لئے یہیں ایک گھونسلا بنالے اور فرشتوں کی طلب نہ کر، تو بطن زمین کی اولاد ہے اسے نہ بھول" سلیمان نظیف نے جو ملاحظات حب وطن کے موضوع پر کئے ہیں اُن میں بھی اس مضمون کے مقامات ملتے ہیں تاہم اب تک دنیا داری کے اس تخیل کو مکمل شکل میں نشو ونما نصیب نہیں ہوئی اور اس کے اسباب ہر شخص خود آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اس انقلاب ذہنی کا تیسرا عنصر یعنی ارتقاء کا تصور اسلام اور ترکوں کے تصور کائنات میں بالکل نئی چیز ہے۔ پرانے خیال کے مطابق خدا کی مخلوق دنیا پوری اور مکمل ہے، جدید معنوں میں ترقی کا وہاں امکان نہیں ہے۔ یہاں ترقی صرف یہ ہے کہ وہ اعلیٰ مدارج پھر سے حاصل کرلئے جائیں جنہیں افراد اور ریاستیں وغیرہ عہد ماضی میں حاصل کر چکی ہیں۔ چیزیں وجود میں آتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں اور یہی دنیا کی زندگی کا وہ دائرہ ہے جو قدیم ریاضی وحکمت اور کلاسکی تصور عالم کے مطابق ہے لیکن دنیا کی تعبیر نو نے ان خیالات کو بھی پامال کر دیا ہے اور یہ اس طرح کہ زندگی کی پرانی شکلوں کا وجود ختم ہو گیا اور لوگ ماضی کی پابندیوں کو چھوڑ چکے۔ اس صورت حال نے ایسی موافق فضا پیدا کردی کہ مغرب کے تصور ارتقاء کو نہایت جوش کے ساتھ شرف قبولیت بخشا گیا۔ چنانچہ آج ترکوں کی تمام ذہنی زندگی اس تصور کے زیر اثر ہے حتیٰ کہ مذہبی تصانیف میں بھی اس کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا گیا ہے۔ شعراء میں سے صرف دو کی مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ فکرت اور عاکف۔ فکرت نے تو اپنے کلام میں مسئلہ ارتقا کو مذہبی حیثیت دیدی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "قدرت میں سلسلہ ارتقا دائمی ہے اور اس تکمیل کا عقیدہ توریت، انجیل اور قرآن سب سے میرے اندر پیدا ہوتا ہے۔ عاکف کی مذکورہ بالا نظم "انسان" ذہن بشری کی آرزوئے ترقی وارتقا کا سب سے دلفریب اظہار ہے لیکن فکرت کے ہاں ارتقاء ساری دنیا کا قانون ہے اور عاکف نے اپنی نظم "انسان" میں اسے صرف بنی نوع آدم کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور یہ بات عاکف کی خصوصیات میں ہے کیونکہ وہ اس نظم میں تعلیم قرآن

سے وابستہ رہکر قدرت کو اغراض انسانی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات تبلا دینی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص ان مصنفوں کی تصانیف کو پڑھے تو اس پر یہ اثر ہونا لازمی ہے کہ زندگی اور دنیا کا جو نیا تصور ہم نے اوپر بیان کیا ہے، ان کے جذبات و خیالات من و عن اسکے پابند نہیں ہیں اور سب سے زیادہ یہ بات فکرت و عاکف کے ہاں ملیگی۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ تغیر ابھی بالکل نیا ہے اور عہد ماضی سے تمام رشتے ابتک نہیں کٹے ہیں بلکہ عاکف کا معاملہ تو یوں ہے کہ اثر و مقبولیت حاصل ہونے کے بعد یہ قدامت پسندی پر غالب آیا ہے اور نئے تصورات کا حامل بنا ہے اسی وجہ سے اسکی شاعری کے ایک حصہ میں تمام و کمال عہد ماضی کی ذہنیت پائی جاتی ہے فکرت کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے یہ اصل میں مغرب پرست ہے اور اسی وجہ سے اس کے تصور عالم میں اسقدر پیچیدگیاں ہیں۔ ان باتوں کی طرف اشارہ اس لئے کیا گیا ہے کہ انہیں نظرانداز کر کے ان شعرا کے ساتھ ادبی انصاف نہیں کیا جاسکتا

ذوق عمل

ذہنیت کے جس تغیر کا ذکر ہم پچھلے دو عنوانات کے تحت میں کر چکے ہیں وہ صرف قدیم ذہنیت ہی کا مخالف نہیں بلکہ اس کے نتائج خصوصاً تقدیر پرستی کا بھی دشمن ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اسلام تقدیر پرستی کا مذہب ہے تو اسمیں بس اسی قدر حقیقت ہوگی جتنی اس قول میں کہ اسلام محض عمل اور قانون کا مذہب ہے اس تقدیر پرستی کی جڑیں بھی جو قوت ارادی کو مجروح کر کے بے عملی پیدا کر دیتی ہے، اسلامی اور ترکی دور ماضی کے سیاسی، معاشی اور جماعتی حالات اور تمام تمدنی کیفیات میں ملتی ہیں۔

"ہر چند رواقی علم الاخلاق کے اصول نیک اعمال کا مطالبہ کرتے ہیں تاہم انکی ساری افتاد ایسی ہے کہ آخر میں آ کر تان اسی پر ٹوٹتی ہے کہ دنیا کی عام رفتار کے دور میں آدمی بلا شرط اپنے کو تسلیم و رضا کا خوگر بنالے . . . . ایک ایسے زمانہ میں جبکہ قوموں کی سیاسی آزادی تقدونی اور اسکے بعد رومی حکومت کے ہاتھوں خون ہو رہی تھی بلکہ خود رومی فاتح سلطنت کے استبداد کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ جبکہ جبر و قوت ایک زندہ دیو کیطرح ہر قابل ذکر خود مختار ہستی کو نیست و نابود کئے دے رہی تھی

ایسے زمانہ میں ہر اُس شخص کے لئے جس نے اپنا مقصد شخصی اور انفرادی فلاح سے کچھ بھی بلند تر رکھا ہو سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ وہ دنیا کے چلتے ہوئے کاروبار میں تقدیر پرست تسلیم کی خو ڈالے کہ اس پر ایک یا بہت سی قومیں بھی کوئی قابل ذکر اثر ڈالتی نظر نہ آتی تھیں۔ مذہب رواقی نے اگر تقدیر پرستی کو ایک عقیدہ بنا دیا تو بس اپنے عہد کے اسی رجحان کی پابندی کی " سٹلر (Zeller) کے یہ الفاظ جو اُس نے رواقی مذہب کے متعلق لکھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بالکل تاریخ اسلام کو پیش نظر رکھ کر تحریر کئے گئے۔ اس قول کی صحت کو تسلیم کرنیکے لئے بس اتنا ضروری ہے کہ آدمی اسلامی ممالک میں خود موجودہ حالات کو پیش نظر کرلے۔ افراد کی سیاسی آزادی اُن سے نہیں چھینی گئی تھی بلکہ انکا سارا مادی اور ذہنی وجود اتفاقات کے بننے بگڑنے، حکمرانوں اور بالادستوں کے چشم کرم اور عنایت پر منحصر تھا اور پھر خود یہ حضرات بالادست ان افراد کی نظروں میں تقدیر کے کھلونوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔ ہر شخص کے لئے ایک نہایت تنگ اور غیر متیقن دائرہ زندگی تھا جس میں وہ مقید ہوتا اور کبھی کبھی تو یہ بھی نصیب نہ ہوتا تھا کُل تمدن کی حالت ہی ایسی تھی کہ آزاد اور غیر محدود ذوق عمل کے لئے کوئی میدان کار نہ تھا، پھر کیسی حماقت ہوگی کہ ایسے ناموافق حالات میں ذوق عمل اور کام کرنے کی خوشی اور خواہش پیدا ہو، یہ ضرور ہے کہ اسلامی تقدیر پرستی کے اسباب محض ان ہی حالات کو قرار دینا بہت یکطرفہ بات ہوگی اور تاریخی اعتبار سے مادہ پرستی کے مرادف۔ اور دوسرے مذاہب کی طرح اسلام نے بھی اپنے پیروؤں کو خدا پر بھروسہ کرنے اور رضائے الٰہی میں اپنی مرضی کو مٹا دینے کی تعلیم دی ہے۔ لیکن مذکورہ بالا حالات میں یہ بات کہ اور تمام اخلاقی، اور مذہبی مطالبات تو بھلا دئے گئے اور یہی اپنے ارادہ کو فنا کر دینے کی تعلیم پیش پیش ہوگئی۔ یہ البتہ انہی حالات کا نتیجہ ہے۔ نئی تمدنی تحریک نے یہاں انقلاب ہی پیدا نہیں کیا بلکہ عہد ماضی کے اس باب کو یک قلم بند کر دیا۔ قدیم استبدادی حکومت تباہ کر دی گئی اور سیاسی آزادی از سر نو قائم ہوئی۔ اس سلسلہ میں بھی مغربی تمدن کے تعلق نے بہت سے نئے خیالات اور بہت سی قوتیں مستعار دیں۔

لوگ اب ترکوں اور اسلام کے پرانے زمانوں کو یاد کرنے لگے یعنی اُس عہد ماضی کو جو ولولہ انگیز واقعات سے پر ہے۔ اب اسلام کے وہ اصول بھی سامنے آنے لگے جن میں عمل کا مطالبہ ہے، ذہنی سیاسی

اور جامعی شرطیں جب اس طرح پوری ہوگئیں تو اس نئے تصور حیات وکائنات کا اخلاقی نتیجہ بھی لازمی طور پر نکلا گیا ان میں ذوق عمل نے اب بطور ذہنی تصور کے بھی جڑ پکڑ لی۔ لوگوں کی سمجھ میں اب یہ آیا کہ انسان کو فطرت پر جو فضیلت عطا کی گئی ہے اُس پر اُس کو اترانا نہ چاہیئے، نہ اسکی وجہ سے دنیا سے نفرت کرنی چاہیئے، فطرت پر اُس کی حکومت کا جو ذکر ہے وہ ابھی موجود نہیں ہے بلکہ وجود میں لائی جانی چاہیئے کیونکہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔

اس سلسلہ میں بھی ترکی شاعری نے اپنے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور اُسکو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے تقدیر پرستی اور غلط معنوں میں خدا پر بھروسہ کرنے کی مخالفت کو اپنا سب سے پہلا مقصد قرار دیا اور دوسرا مقصد مایوسی اور کاہلی کے خلاف جہاد۔ یہاں بھی ہمیں سرشکر دہی نامق کمال دکھائی دیتا ہے، وہ مضبوط ارادوں والا عالی آدمی جس نے اپنے خیالات کی تمام قوت اس کاہلی اور خدا پر اس غلط بھروسہ کے خلاف صرف کردی اور محنت وعمل کے پیغام کی تبلیغ کی۔ حامد، فکرت، امین اور عہد جدید کے تقریباً سب شعرا نے اُس کی پیروی کی۔ لیکن اس ضمن میں شاعری کا سب سے عظیم الشان کارنامہ عاکف کا ہے ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں اور اُس کے وجوہ بھی بتلا چکے ہیں کہ عاکف کی مثال ہماری تحریک کے لئے نمونہ ہے۔ اسی وجہ سے میں یہاں اُسکی نظموں کے متعلق تھوڑی تفصیل دیتا ہوں: "صفحات" کے پہلے باب میں تو ہم عاکف کو اس حال میں پاتے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات سے اور اپنے قدیم ذہنی ماحول سے برسرپیکار ہے۔ اس حصہ کی نظموں پر علیحدہ علیحدہ تاریخیں نہیں پڑی ہیں اس لئے صحیح طور پر یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ اُسکے خیالات میں کیسے کیسے نشو ونما ہوئی ہے اور کب کب تغیرات لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ پہلا باب دو عالموں کے تصادم کا منظر پیش کرتا ہے، اس کی پانچویں نظم "قدم نہ رکے" اس عاکف کو ظاہر کرتی ہے جو باقی چار حصوں میں ہمارے سامنے آتا ہے، وہ آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کے شور وغوغا کو سنتا ہے اور اپنی قوم کو اسکی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے "انسانیت" فوج فوج مستقبل کے مملکت میں داخل ہو رہی ہے جو انسانیت کی اس متبرک دھارے سے وابستہ نہ ہوگا وہ کھویا جائیگا۔" "ماضی کی یاد میں نہ الجھو، یہ نہایت تکلیف دہ جھاڑ جھنکر ہیں، آگے بڑھو، مستقبل تمام خطروں سے آزاد ہے اور اُس کی زمین کیسی مقدس

ہے اور کیسی پاک ہے" تماشا گاہ ہستی کو دیکھو اسکا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں ..... اس محنت وسعی دوام اور اس لامتناہی ترقی سے کوئی مفر نہیں، زمین کام کر رہی ہے، آسمان کام کر رہے ہیں، اگر تجھکو شرم نہیں آتی تو یونہی بیٹھا رہ" اس سلسلہ میں عاکف کو ایک نیا علم حاصل ہوا جس کو اُس نے بعد میں ترقی دی ہے۔ وہ سر تا پا مسلمان ہے اُسکا ایمان نہایت مضبوط اور پختہ ہے اور اُس کے عقیدہ میں ایک عجیب سادگی اور صفائی ہے لیکن اس پر بھی اسلامی دنیا کے مصائب اور ترکوں کے تکلیف دہ حالات کا اثر ہے اور باوجود اپنے عقیدہ کے یہ محسوس کرتا ہے کہ خدا نے اور اسکی اسلامی دنیا کو خدا نے چھوڑ دیا ہے اس تکلیف دہ خیال سے اس کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کا علاج یہ اس علم میں ڈھونڈتا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے یعنی تیسرے باب کی پہلی نظم میں محنت وسعی کا نیا قانون پیش کرتا ہے۔ نظم کے شروع میں تو تسلیم اور رضائے الٰہی پر قناعت کے جذبات کا اظہار رہے لیکن آگے چلکر یہ ایک اسلامی اور ترکی دنیا کے تکلیف دہ حالات کا ذکر کرتا ہے اور خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ تیری مدد کہاں ہے۔ اس پر اس کو یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں جنہیں سنکر یہ خاموش ہو جاتا ہے "اے نادان! خاموش دنیا کی گردش کبھی نہیں رکتی تو کیا سمجھتا ہے کہ کیا قوانین عالم شکوہ اور شکایت سے معطل ہو سکتے ہیں؟ مدد چاہتا ہے تو اپنے آپ سے مدد طلب کر، جا اور خود اپنی کوشش سے ظلم اور ناانصافی کو دور کر اور دیکھ دنیا کس قدر عزت کے ساتھ اس قانون سعی کی اطاعت کرتی ہے"

عاکف کے خیالات یہیں نہیں رک جاتے بلکہ "صفحات" کے چوتھے باب میں جہاں اُسکا تخیل انتہائی مدارج پر پہنچ گیا ہے وہ دنیا کا ایک تصور سعی و عمل کی صورت میں پیش کرتا ہے اور محنت کی فرضیت کو ثابت کرتا ہے۔ اس بات میں اُس نے اس دنیا کو عجیب نرالے انداز سے پیش کیا ہے ہر چیز مصروف عمل ہے، دنیا، زمان و مکان، یہ سب کیا ہیں۔ سعی و عمل ہے۔ عدم کا خود وجود نہیں عمل ہے۔ عاکف کمزوروں کی بے عمل شکوہ و شکایت سے بیزار ہے، اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان ہے "کیا تجھے یہی توقع تھی؟" اور جو رسالہ سبیل الرشاد میں" شائع ہوئی ہے۔ وہ اس شکوہ شکایت کو بہت کچھ برا بھلا کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ رونے پیٹنے سے کچھ حاصل نہیں، عمل کر و عمل۔

عنفوانِ شباب کی مجموعی نفسی سیرت

یہ مضمون اصل میں پروفسر اڈورڈ اشپرانگر استاد فلسفہ و تعلیمات جامعہ برلن کی معرکہ آرا کتاب Psychologie des Jugendalters کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ ہو رہا ہے اور اس سال کے آخر تک انشاء اللہ اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ کی طرف سے شائع ہو جائے گا۔

اگر ہم لفظ "سیرت" سے "سانچے میں ڈھلی ہوئی نفسی زندگی" مراد لیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عنفوان شباب کی مجموعی سیرت یہ ہے کہ انسان کوئی سیرت نہ رکھتا ہو۔ واقعی عمر کے اس حصہ میں اور تمام حصوں سے زیادہ ایک عمل تغیر، ایک زمانۂ انقلاب کی شان پائی جاتی ہے جس میں کسی مستقل "حالت" کا تعین نہیں ہو سکتا۔ اگر نفسی پہلو سے دیکھا جائے تو یہ عمل۔ کم سے کم موجودہ زمانہ میں جتنا ہم سمجھتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ طویل ہے سال و ماہ کی کوئی تعداد جس کا عام اطلاق ہو سکے نہیں بتائی جا سکتی۔ البتہ ایک مثال قائم کرنیکے لئے ہم شمال جرمنی کے بڑے شہروں کی تعلیم یافتہ آبادی میں ارتقائے نفسی کا زمانہ لڑکیوں کے لئے[1] ۱۲ سے لیکر ۱۹ برس کی عمر تک اور لڑکوں کے لئے[2] ۱۴ سے لیکر ۲۲ برس کی عمر تک مقرر کرتے ہیں۔

چونکہ ہم نفسی زندگی کے جزدیات کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ اس بات پر مجبور ہیں کہ انہیں "کُل" کی نسبت سے دیکھیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم ابتدا ہی میں عہد شباب کے مجموعی سیرت کو بیان کر دیں۔ اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ ہم نظام نفسی میں اُس نقطہ کو تلاش کریں جہاں سے عہد شباب کی واردات اور اعمال کی خصوصیات دیکھی اور سمجھی جا سکیں۔ اس غرض کے لئے یہ مفید ہوگا کہ ہم ابتدا میں عہد طفلی کے مجموعی طرز زندگی اور عنفوان شباب کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دیں۔

البتہ جہاں ہم چاہتے ہیں کہ بچہ کی مجموعی طرز زندگی کو معروف سمجھ کر نظر انداز کر جائیں۔ وہاں موجودہ

---

(۱) ہندوستان میں ۱۲ سے ۱۸ برس تک سمجھنا چاہیئے۔

(۲) ہندوستان میں ۱۳ سے ۲۱ برس تک سمجھنا چاہیئے۔

علم النفس ہماری بالکل مدد نہیں کرتا واقعہ یہ ہے کہ یہ موضوع اُس سے بھی زیادہ غیر معروف ہے جس سے ہم اس کتاب میں بحث کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہمیں چاہئے کہ چند سرسری طور پر کھینچے ہوئے خطوط میں نفسیات طفلی کا ایک خاکہ پیش کر دیں۔

ہمیں رفتہ رفتہ بچہ کے تصور، خیال، احساس اور ارادہ کے متعلق جزوی معلومات بڑھانے سے اس وقت تک بہت کم فائدہ ہوتا ہے جب تک ان مظاہر پر زندہ اور نامی کُل یعنی بچہ کی مجموعی زندگی کی نسبت سے غور نہ کر لیا گیا ہو۔ لیکن معدودے چند مضامین سے قطع نظر کر کے آج کل کی نفسیات طفلی میں یہ انداز خیال مفقود ہے۔ چونکہ بچے کے اندرونی ترکیب نفسی پر نظر ڈالنا ہمارے لئے بہت دشوار ہے اس لئے ہم محض اُسی پہلو کا ذکر کریں گے جو سب سے زیادہ نمایاں ہے یعنی بچہ کا تعلق اُس چیز سے جسے وہ واقعہ سمجھتا ہے بخلاف نظریہ علم کے نفسیات کے ہر شعبے میں یہ اصول موضوعہ ہونا چاہئے کہ نفس مدرک کے لئے "واقعیت" ہمیشہ ایک نہیں ہوتی۔ بلکہ اسمیں ہر شخص کے نظام نفسی کے مطابق اور اسکے ارتقاء ذہنی کے مدارج کی لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس اصول کو تسلیم کرنا چاہئے کہ بچہ ہماری دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں رہتا ہے۔

ہم پر یہ امر اس وقت بہت واضح ہو جاتا ہے جب ہم عہد طفلی کے وسطی حصہ یعنی اندازاً تین برس سے سات برس تک کی عمر کو پیش نظر رکھیں۔ ہم کہا کرتے ہیں کہ انسانی نشو و نما کے اس درجہ (بچپن) کی خصوصیت ایک خاص طور پر پُرجوش تخیل ہے جو اپنے ماحول کی ہر ایک چیز میں ڈوب جاتا ہے اور اُسے انسانوں کی طرح ذی روح سمجھتا ہے۔ یہ نفسی تصویر اس لئے غلط ہے کہ لفظ تخیل ہمارے لئے ایک خاص معنی رکھتا ہے جو بچے کے نفسی تجربے میں موجود نہیں ہوتے یعنی تخیل کا "واقعہ" سے مختلف ہونا اسکا خواب آسا ہونا اور قابل اعتماد نہ ہونا۔ لیکن بچہ کی زندگی میں جسے ہم غلطی سے تخیل کی زندگی کہتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہی ہے کہ اسمیں یہ تفریق نہیں ہوتی۔ جو ہمیں تخیل معلوم ہوتا ہے وہ بچہ کے لئے "واقعہ" کی قدر رکھتا ہے اور اسکے لئے اُسی قدر اہم ہے جتنی ہمارے لئے ہماری "واقعیت" ہے (جس کے جانچنے کی متعدد اور مختلف معیار ہیں اور جس کے ادراک میں ہم ایک حد تک من مانے اصولوں سے کام لیتے ہیں)

جہاں بچہ کے لئے تخیل اور واقعہ کا وہ فرق مفقود ہے جسے ہم اپنی دنیا سے بچہ کی نفسی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ناگزیر طور پر محسوس کرتے ہیں وہاں بچہ کے تخیل کو ہم بڑوں کے "دوئی آسا" تخیل کے مقابلہ میں "وحدت آسا" تخیل یا بھولے تخیل کے مقابلہ میں جذبات پرست تخیل کہہ سکتے ہیں اُس زمانہ میں جس کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں بچہ کی ساری باطنی زندگی ہنوز اپنے ماحول کے اشخاص اور اشیاء میں جو اس کے پیش نظر ہوتے ہیں محو ہوتی ہے وہ ابتک اپنے آپ کو شعوری حیثیت سے اُنکے مقابلہ میں بطور ایک مستقل ہستی کے نہیں رکھتا۔ خواہ اس میں اُسے ساعت بہ ساعت ذلت نفس کا غم برداشت کرنا پڑے۔ لیکن یہ غم ہنوز غم "روزگار" نہیں ہے۔ اپنی نفسی دنیا، دوسروں کی نفسی دنیا، اور غیر ذی روح دنیا ابھی تک ایک دوسرے سے جدا نہیں۔

لیکن یہ الفاظ بچہ کی خصوصیت کو پوری صحت کیسا تھ ادا نہیں کرتے۔ انمیں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے تاکہ جو سب سے اہم پہلو ہے وہ اچھی طرح نمایاں ہو جائے۔ ورنہ حقیقت میں بچہ کی زندگی ایسی وحدت آسا نہیں کہ وہ اپنے ماحول کے اُس حصہ میں جو اُس کے لئے اہم ہے بالکل ہی گم ہو جائے۔ بچہ کو بھی ابتدا سے ایک تضاد کا احساس ہوتا ہے یعنی اُس تضاد کا جو اس کے بھولے، ہر شے کو جاندار سمجھنے والے جبلی تخیل میں اور عالم کے نام نہاد "واقعی" حالات میں یا اُسکی دنیا میں اور بڑوں کی دنیا کے قواعد و قوانین میں ہوتا ہے جو طرح طرح سے اس کی زندگی میں دخل دیا کرتے ہیں اور یہ بھی صحیح نہیں کہ بچہ کو اس دوسری دنیا کے احساس سے محض تکلیف یا نفرت ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ اس دنیا کیطرف بڑھتا ہے اور روز بروز اُس سے قریب ہوتا جاتا ہے مختصر یہ کہ اس احساس تضاد کو جسے ہم دل میں رکھتے ہوئے بچوں کی دنیا کی سیر کرتے ہیں اور جو جذبات پرست ہونیکے سبب سے ہمیں اُن کی نفسی کیفیات کا صحیح اندازہ نہیں ہونے دیتا ملتی جلتی ایک چیز خود بچہ کے دل میں بھی ہوتی ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ بچہ کو اس تضاد کا احساس دوسرے پہلو سے ہوتا ہے اور وہ رومانی جذبات کے ماتحت ماضی کی یاد میں سر نہیں دھنتا بلکہ نئی چیزوں کے دریافت کرنیکے شوق میں مستقبل کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ بھی فطرتی بات۔ اگر میں اپنے مکان میں کھڑا ہو کر کھڑکی کے اُس طرف ہمسایہ کے وسیع باغ کو دیکھوں تو ظاہر ہے کہ

ہیں اُس کی املاک کو کسی اور نظر سے دیکھوں گا اور اگر وہ میرے غریب خانہ کی طرف جھانکے تو اُس کی کچھ اور نظر ہوگی۔

ہم جب بچوں کی دنیا کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو جلد وہ حد آجاتی ہے جس کے آگے اُن کا حال ہم سے بالکل مختلف ہوتا ہے اُنکی ذہنی کیفیت ہم "سمجھ" تو سکتے ہیں لیکن خود ہمارے قلب میں وہ کیفیت موجود نہیں ہوتی۔ اس رنگ میں بالکل ڈوب جانا ہمارے لئے ناممکن ہے کیونکہ بقول ہولڈرلین[1] کے ہمارے نفس میں ضرورت سے زیادہ پختگی آگئی ہے۔

اگر ہم اس مسئلہ پر مزید بحث کرتے تو مندرجہ بالا حدود کے اندر اس بات کی تحقیق ضروری تھی کہ بچہ موجودات کا ادراک کرتے وقت آس پاس کی چیزوں میں سے (جسے سائنس ہر مدرک کے لئے یکساں بنانے کی کوشش کرتی ہے) کن چیزوں کو چنتا ہے۔ ہر ماحول اس طرح کے انتخاب سے بنتا ہے جو قدر کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ بچہ کی دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں اور اہمیت رکھتی ہیں جو ہمارے نزدیک معدوم یا فضول ہیں۔ اسی طرح بچہ کی نظر میں بہت سی ایسی چیزیں معدوم ہیں جن کا ہمارے خیال میں اُسے صریحاً ادراک ہوتا ہے۔ مگر ہمیں نفسیات طفلی کی تفصیلی بحث کرنے کا حق نہیں۔ ہم صرف چند باتوں کا ذکر کرینگے جو خاص طور پر اہم ہیں۔

موجودات کی اُن "عام صورتوں"[2] سے جو کانٹ کے خیال میں ہر مدرک کے لئے "مظاہر" کے ادراک کی بنیاد ہیں یعنی زمان و مکان سے بچہ کے تعلقات ویسے نہیں ہوتے جیسے ہمارے بلکہ بالکل مختلف قسم کے ہوتے ہیں ہمیں نہیں معلوم کہ اُسکے تصور میں مکان نامحدود ہوتا ہے یا نہیں لیکن اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ بچہ بھولے بھالے جنگلی لوگوں سے بھی بڑھکر اس کا قائل ہے کہ مکان کی دو فضائیں ہوتی ہیں ایک تو وہ جانی بوجھی مرکزی فضا جو خود اُس کے گرد ہوتی ہے اور جس کی اشیاء میں شبہ کی گنجائش نہیں اور دوسرا وہ عظیم الشان کرہ

---

(۱) جرمنی کا ایک مشہور رومانی شاعر

(۲) صورت علیاتی اصطلاح ہے۔ جو چیزیں خارج میں موجود ہیں اُنکا حس علم یا ادراک کا مادہ کہلاتا ہے اور جو تصرف مدرکہ کا ذہن اس حس میں کرتا ہے اُسے صورت کہتے ہیں۔

جس میں تخیل حسب دلخواہ اشیاء کا وجود فرض کرلیتا ہے۔ بچہ اُس مرکزی فضا کی بڑی گہری چھان بین کرتا ہے اس فضا کا چپہ چپہ دیکھا بھالا ہوتا ہے اور بچہ کے نفس سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ عمر بھر میں کسی مکان کی اتنی گہری واقفیت نہیں ہوتی جتنی بچپن میں اپنے گھر کے ایک ایک کونے سے ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بچپن میں بار بار تبدیل مکان کرنے سے نفسی نشو و نما قبل از وقت ہو جاتی ہے لیکن گہری نہیں بلکہ سطحی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے بچہ کو جلد جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے میں زندگی کے ضروری اور مضبوط رشتے وقت سے پہلے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس سے کچھ مختلف اور کچھ مشابہ بچہ میں زمانہ کا احساس ہوتا ہے۔ اُس کے ذہن میں زمانہ کا تصور اب تک یہ نہیں ہوتا کہ وہ خود اُسکے نفس اور موجودات کی مربوط اور ناگزیر حرکت کا نام ہے جو ایک خط مستقیم میں واقع ہوتی ہے جس میں سے ایک نقطہ بھی گذرنے کے بعد لوٹ کر نہیں آتا اور جو (کم سے کم ذی روح مخلوق کے لئے) ایکدن دفعتہً ٹوٹ کر عرصہ ظلمات میں غائب ہو جائے گا۔ بلکہ وہ زمانہ کو لمحات کی ایک غیر مربوط اور نامحدود ڈنوائی[۱] سمجھتا ہے جن میں سے ہر ایک کا وہ اس قدر گہرا مزہ لیتا ہے کہ اُس کے گزرنے اور پھر لوٹ کر آنے کا احساس تقریباً بالکل جاتا رہتا ہے۔ اگر دفعتہً زمانہ کا احساس بچہ کے دل میں بدل جائے تو یہی ایک مافوق الطبیعی واردات[۲] اس بات کی علامت ہو سکتی ہے کہ بچپن کا زمانہ ختم ہو چکا اور نفس بیدار ہو گیا۔ کیونکہ جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھنا اکثر اس طرح واقع ہوتا ہے جیسے دفعتہً زمین پھٹ جائے اور اوپر کی تہ ہٹ کر نیچے سے زیادہ گہری تہ نمودار ہو جائے۔ اسکی سب سے موثر مثال ہمیں اڈولف اسٹار کی "نوجوانی کی یاد" میں ملتی ہے۔ اُس کی ماں کی موت اُس کے غنچہ نفس کی گریبان چاکی کی محرک ہوئی۔ "وہ چیزیں جنہیں وہ پہلے صدہا مرتبہ دیکھ چکا تھا اب اسے اور ہی رنگ میں نظر آئیں اگرچہ خود اُن میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا" لوگوں کو سنکر تعجب ہوگا کہ میرے دل میں کبھی یہ خیال نہیں گذرا تھا کہ ہمارے ماں باپ بھی مرجایا کرتے ہیں۔ اب دفعتہً میرے دل میں یہ خیال اور اسی کے ساتھ دنیا کی سب

---

(۱) یکے بعد دیگرے ہونا۔

(۲) یہاں بطور فلسفیانہ اصطلاح کے واردات قلب کی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جرمن لفظ Erlebnis کا ترجمہ ہے

چیزوں کے فانی ہونے کا احساس پیدا ہو گیا۔ اُسی وقت سے میرے قلب پر جس چیز کا ہجوم تھا اُسے خوف اور دہشت نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ کوئی اور ہی رُوح فرسا کیفیت تھی جسے میں آج تک پوری طرح دل سے دور نہیں کر سکا ہوں۔ یہ کیفیت پہلی بار اُس موقعہ پر ظاہر ہوئی جب ہم لوگ والدہ کے انتقال کے کئی مہینہ بعد دوبارہ سیر کرنے . . . جا رہے تھے جس کی مجھے بہت آرزو تھی جب ہم ایک ناشپاتی کے بڑے درخت کے قریب سے گزر رہے تھے جہاں سے ہماری منزلِ مقصود آدھی دور رہ گئی تھی دفعتہً میرے دل سے یہ صدا آئی "آج شام کو تو واپسی میں اسی درخت کے پاس سے گزرے گا اور اُس وقت ساری خوشی ختم ہو چکی ہوگی" میرے دل سے زمانہ کے نامحدود ہونے کا احساس جاتا رہا تھا جس پر بچپن اور نوجوانی کا انحصار ہے۔ میری نوجوانی ختم ہو چکی تھی، صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اُس کا بچپن ختم ہو چکا تھا اور نفسی نقطہ نظر سے اب اُس نے نوجوانی کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ اُس کے احساس میں اب بھولا پن نہیں رہا تھا اُس کے نفس میں وہ جذبات پرستی پیدا ہو گئی تھی جس کی ماہیت پر ہم اس کتاب میں غور کرنا چاہتے ہیں۔

جس طرح زمان و مکان کے طول سے کہیں زیادہ بچہ کو اُن کی گہرائی اور نامحدود ہونے کا احساس ہوتا ہے اُسی طرح اس کی نظر میں جو تصویر دنیا و مافیہا کی ہوتی ہے وہ نوجوانوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ قوانین فطرت سے اُسے ابھی اتنی بھی واقفیت نہیں جتنی عوام کو تجربہ کے ذریعہ ہو جاتی ہے۔ خود اپنی اور دوسروں کی طاقت کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک بار ۶ سال کی عمر میں سنجیدگی سے یہ قصد کیا تھا کہ جب ہم لوگ حسبِ معمول آئندہ گرمیوں میں بحیرہ بالٹک کے ساحل پر جائیں گے تو میں ریت کا جہاز قد آدم بناؤں گا جس میں بیچ بیچ کے کمرے اور زینے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک یاد ہے مجھے اس ارادہ کے پورا نہ ہو سکنے کا کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا، علاوہ اس کے بچوں کو اپنے آس پاس کے لوگوں کی نفسی زندگی کے اُس پہلو کے سوا جو خصوصیت کیساتھ اُنکی ننھی سی جان کی طرف (جو گویا دنیا کا مرکز ہے) مائل ہو کسی اور پہلو سے مطلق سروکار نہیں ہوتا۔ وہ سیدھا سادھا فلسفہ جذبات اور وہ محرکات جن سے بچہ اپنا کام چلا لیتا ہے۔ شارلوٹے بوہلر کی کتاب "کہانیاں اور بچہ کا تخیل" میں بیان کئے گئے ہیں۔ خود اپنے نفس کے متعلق بچہ اس سے بھی کم غور کرتا ہے بجز اس صورت کے کہ تصوف کے احول نے اس پر خاص کر کے یہ اثر ڈالا ہو

یا تربیت کے ذریعہ قبل از وقت مصنوعی طریقہ سے وہ غور و فکر پر مجبور کیا گیا ہو۔

ہم نے اب تک بالقصد بچپن کے وسطی حصہ کی نفسی زندگی کا ذکر کیا ہے تاکہ نوجوانی سے زیادہ گہرا تقابل ہو سکے لیکن عمر کے ان دونوں حصوں کے درمیان تخمیناً ۸ سے بارہ برس کی عمر تک ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے جس کی بنیادی خصوصیات بالکل مختلف ہوتی ہیں اور جس کے متعلق نفسیات کی تحقیق اب تک تقریباً صفر ہے۔ ذرا ایک لڑکے کی زندگی پر غور کیجئے۔ اس عمر کی خصوصیت عموماً ایک طرح کی طفلانہ واقعیت پسندی ہے جس کا رجحان خارجی دنیا کیطرف ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد جسمانی زندگی کا ایک قوی احساس ہے۔ طفلانہ زندگی کی جو ضروریات ہیں اُن سے اس عمر میں نظام نفسی بہت بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس سے اعتماد اور یقین پیدا ہوتا ہے۔ جو برابر آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے علاوہ اسکے لڑکوں میں اتنی فاضل قوت بچ رہتی ہے کہ اُسکا طرح طرح کی شرارتوں کی صورت میں ظاہر ہونا ضروری ہے بخلاف نوجوان کے جو ہمیشہ حیص بیص میں رہتا ہے لڑکا اپنے آپ پر اعتماد رکھتا ہے اور غیروں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کے ادراک عالم میں اشیا کو ذی روح سمجھنے کا عنصر بہت کم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حد تک اس چیز میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اصلی معنی میں تخیل ہے۔ یعنی واقعی اشیا کو حسب دلخواہ کسی رنگ میں رنگ دینا۔ یہ تخیل اب بے جان چیزوں (کھلونوں) میں مشغول رہنے کے مقابلہ میں ہم سن لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان نئے کھیلوں میں جو واقعیت پسندی لڑکے دکھاتے ہیں اُسکا اظہار اس طرح کے فقروں سے ہوتا ہے "واہ۔ یہ کھیل کہیں ایسے کھیلا جاتا ہے" یعنی اب تخیل خود ساختہ قاعدوں کا زیادہ پابند ہو جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے توجہ زیادہ تر خارجی چیزوں کی طرف ہوتی ہے۔ خارجی عالم کے متعلق بچہ اب جان بوجھ کر سوال کرتا ہے اور ہر بات کا کھوج لگاتا ہے اس عمر کی ایک اور خصوصیت صنعتی دلچسپی کا بیدار ہونا ہے۔ وہ بچے بھی جن میں اسکی صلاحیت نہیں ہوتی اس عمر میں کاغذ کی ناؤ اور ریت کے مکان بنایا کرتے ہیں۔ انسان اپنی نشو و نما کی اس منزل میں واقعیت پسند ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک واقعیت صرف اُن چیزوں تک محدود ہے جو اُس کی طفلانہ دنیا میں موجود ہیں یا اُس سے واسطہ رکھتی ہیں۔ اب گویا بچپن اپنی "پختگی" کو پہنچ گیا ہے۔ جہاں تک موجودہ زندگی کا تعلق ہے تمام قوتوں میں صحیح توازن قائم ہو گیا ہے۔

اس امن وسکون کی زندگی میں نوجوانی کا عہد اس قدر شدید انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ لوگوں نے اسے دوبارہ پیدا ہونا کہا ہے اور بجا کہا ہے۔ اس کایا پلٹ کا دفعتہً واقع ہونا یا آہستہ آہستہ رونما ہونا ہر فرد کی مخصوص نفسی کیفیت پر موقوف ہے۔ پہلی صورت میں بھی ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس انقلاب سے پہلے ایک زمانہ ایسا گزرتا ہے جس میں بغیر ہمارے محسوس کئے طبیعت اس کے لئے تیاری کرتی ہے اور اس میں تو ذرا بھی شبہ نہیں کہ خواہ دل کی گہرائی میں اتر جانے والی واردات قلب اس انقلاب میں محرک یا مد قوت کا کام دے خواہ تربیت کے اثر سے یہ عرصہ تک روکا جا سکے ہر صورت میں یہ عمل اندر سے یعنی خود نفس کی نشو و نما سے ظہور میں آتا ہے۔ اسے ہم کسی بیرونی چیز کا اثر نہیں سمجھ سکتے۔ اس کی شدت میں مختلف صورتوں میں فرق ہوتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ کسی صحیح دل و دماغ کے انسان میں یہ چیز بالکل ہی واقع نہ ہو۔ ہم یہاں ان مصلحتوں کی بنا پر جن کا ذکر باب اول میں ہو چکا ہے اس کے عضویاتی(1) پہلو کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں۔ ہماری غرض صرف یہ ہے کہ اس نفسی تغیر ترکیب(2) کو سمجھنے کی کوشش کریں جو یہاں رونما ہوتا ہے۔

تجربہ کار نفسی (ماہران نفسیات) اس تغیر کو ایسی خفیف سی علامتوں سے پہچان لیتے ہیں جو بظاہر دور از کار معلوم ہوتی ہیں بلا اس کے کہ وہ لڑکے کی نفسی کیفیت اور اس کے مرکزاً انقلاب پر علمی نظام کو تحت غور کریں۔ مجھ سے ایک لڑکی بارہ برس کی عمر سے خط و کتابت کرتی تھی۔ سترہ برس کی عمر تک اس کے خطوط میں نفسی بیداری کا شائبہ بھی نہیں تھا جسمانی اعتبار سے وہ چودھویں ہی سال میں نوجوانی کی حد میں قدم رکھ چکی تھی نفسی تغیر کی پہلی علامت سترہ برس کی عمر میں اس کے دو جملوں میں نظر آئی جو اس نے طالب علموں کی ایک دعوت کا محض ایک سرسری ذکر کرتے ہوئے لکھے تھے۔ دعوت کے بعد رات بھر ناچ ہوتا رہا اور صبح تڑکے دو دو آدمی ایک ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو چلے "چاروں طرف بالکل سناٹا تھا۔ ہم سب پر سکوت طاری تھا"۔ بچے کے کانوں تک سناٹے کی آواز نہیں پہنچا کرتی۔

---

(1) physiological

(2) ترکیب یہاں جرمن لفظ ([illegible]) کا ترجمہ ہے۔ اس کے معنی ہیں نفسی زندگی کا وہ شعبہ یا پہلو جو "انتشار" رکھتا ہو۔

اب ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ نئے نظامِ نفسی کی اہم ترین علامات کو معلوم کریں ایسی علامتیں تین ہیں۔

(۱) نفس کا انکشاف اور احساس۔

(۲) آہستہ آہستہ زندگی کا دستور العمل مرتب ہونا

(۳) زندگی کے مختلف شعبوں سے گہرا تعلق پیدا ہونا۔

ان میں سے پہلی بات وہ بنیادی، مافوق الطبیعی احساس ہے جو انسان کو اُس وقت ہوتا ہے جب وہ ایک جداگانہ فرد بنتا ہے۔ دوسری اس احساس کو عملی زندگی سے وابستہ کرنے کی مرادف ہے اور تیسری کے ماتحت وہ تمام کوششیں آتی ہیں جو انسان زندگی کے مختلف پہلوؤں کا محرم ہونے کی کرتا ہے یہ ابتدا میں ایک دوسرے سے بالکل بے ربط ہوتی ہیں، لیکن بہترین صورتوں میں شخصی قوت تشکیل ان میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کر دیتی ہے۔ ان تینوں باتوں کی میں مزید توضیح کرنا چاہتا ہوں۔

ہم نے نوجوانی کے آغاز کی پہلی علامت جداگانہ فرد ہونے کے احساس کو قرار دیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ پہلے نفس کا احساس کبھی ہوتا ہی نہ تھا(۱)۔ بچہ بھی خودی رکھتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ ایسی بدیہی چیز ہے کہ اس کا موجود نہ ہونا یا تسلیم نہ کیا جانا اس کے قیاس ہی میں نہیں آسکتا اور اسی لئے اُسے اس کا (گہرا) شعور بھی نہیں ہوتا۔ ہم سب بچوں کی دل خوش کن لاشعوری انانیت سے واقف ہیں، لیکن نوجوانی کی علامات کا جو پہلا عنوان ہم نے قرار دیا ہے اُس کے معنی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ

---

(۱) نفسیات کو چاہئے کہ شعور کے مختلف مدارج کے بارے میں زیادہ چھان بین کرے۔ ایک تو سادہ شعور ہوتا ہے جو احساس اور فعل کا جولانگاہ ہونے پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کے بعد اُس شعور کا درجہ ہے جو ان چیزوں پر دھیان بھی دیتا ہے (تفکر کا پہلا درجہ) سب سے بلند وہ شعور ہے جو نفسی کیفیات کو معانی کی تحت میں لاتا ہے اور شعور کا علم بن جاتا ہے۔ (تفکر کا دوسرا درجہ) مثلاً فرض کیجئے ایک شخص جو پہاڑ پر چڑھتا ہے کوہستانی دنیا کو محض محسوس کرتا ہے۔ اب ممکن ہے کہ اُسے احساس کا بھی احساس ہو اور اس سے اُس کا لطف دوبالا ہو جائے یا اُس پر حسرت و ملال طاری ہو جائے پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس احساس پر تبصرہ کرے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ بچہ شعور کی پہلی منزل میں ہوتا ہے اور جب وہ نوجوانی کی حد میں قدم رکھتا ہے تو دوسری منزل تفکر کا پہلا درجہ شروع ہوتا ہے۔

اس تغیر کے ساتھ ہی بچہ کو اپنی ذات کا علم اس طرح ہوتا ہے جیسے ولہیلم مائسٹر کو اپنے زمانہ تربیت کے ختم ہونیکے بعد یا اس سے بھی بڑھ کر اپنے زمانہ سیاحت کے اختتام پر حاصل ہوا تھا۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ نوجوانی کی حد میں داخل ہونے پر نئی بات یہ ہوتی ہے کہ بچہ کی نظر اندر کیطرف پھر جاتی ہے یعنی تفکر کا آغاز ہوتا ہے۔ مدرک اپنے آپ کو بجائے خود ایک دنیا سمجھنے لگتا ہے جو ہمیشہ کے لئے ایک جزیرے کی طرح عالم خارجی کی تمام موجودات سے خواہ وہ انسان ہوں یا اشیا جدا ہو جاتی ہے اور اسی لئے اُسے بعید تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔

زیادہ صحیح الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ نفس یا خودی جس کی طرف بچہ کی نظر پھرتی ہے ابھی تک موجود نہیں ہوتی یا کم سے کم نظر نہیں آتی۔ بجائے اس کے ابتدا میں ایک طرح کا داخلی تلون ظاہر ہوتا ہے جس کے سبب سے انسان اپنی نفسی کیفیت پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس غور و فکر سے چند مخصوص مظاہر پیدا ہوتے ہیں جو غالباً سب نوجوانوں میں نظر آتے ہیں۔

ان میں سے پہلی چیز کو مینڈوس نے اپنی کتاب "نوجوان کا نفس" میں بجا طور پر طبیعت کا نراج کہا ہے۔ اسٹینلے ہال نے بھی نوجوانوں کے نفس کے تلون کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ایک ہی شخص اپنے نفس میں متضاد کیفیات پاتا ہے جن میں سمندر کی موجوں کی سی پستی اور بلندی ہوتی رہتی ہے کبھی وہ انتہائی چستی دکھاتا ہے، اور ورزش یا کھیل میں دنیا بھر کے استادوں کو مات کرتا ہے اور کبھی اس قدر کاہل ہو جاتا ہے کہ ہاتھ پیر ہلانا بھی اُس پر بار ہوتا ہے۔ کبھی وہ جوش مسرت سے کھلا ہوا پھول ہے اور کبھی ملال و افسردگی سے مرجھائی ہوئی کلی۔ اُس کی دلفریب شوخی اور حد سے بڑھا ہوا شرمیلا پن ایک ہی بات کے دو پہلو ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ اپنے نفس کے اہم ترین اعمال کو وہ دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اس میں کبھی ایثار کی شان نظر آتی ہے، کبھی خود غرضی کی کبھی شرافت کی، کبھی کمینہ پن کی، کبھی جذبہ انس کی، کبھی تنہائی پسندی کی، کبھی تقلید کی اور کبھی حریت پرستی کی، کبھی قوت عمل کی اور کبھی خاموش تفکر کی۔

---

(۱) اسٹینلے ہال Adolescence ۲ جلد مطبوعہ نیویارک ولندن ۱۹۱۱ء جلد دوم صفحہ ۵۷ تا ۸۸

مختصر یہ کہ جس قدر شدت سے عنفوان شباب کا طوفان برپا ہوا اسی قدر اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس عمر میں نفس میں ہر چیز کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ خیر یہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ یہ بہت گہرا ما فوق الطبیعی مسئلہ ہے مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس طرح ڈانواں ڈول رہنے سے خود ہمارے نوجوان کی جان عذاب میں ہوتی ہے شاذ و نادر ہی یہ سننے میں آتا ہے کہ کسی کو شباب کے آغاز میں مسرت نصیب ہوئی ہو باوجودیکہ اس زمانہ میں کبھی ایسے لمحات بھی گذرتے ہیں جب نفس انتہائی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ لیکن جب ہم اس واردات کو جو قلب پر گذرتی ہے نفسیات کی خردبین سے دیکھتے ہیں اور اس کے "منشاء" کی جستجو کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ عزیز نفس کے ارتقا میں کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ فطرت یہاں ہونے والے انسان کو انتخاب کا موقعہ دیتی ہے۔ وہ خود اپنے اوپر ہر طرح کا تجربہ کرتی ہے تاکہ آخر میں صرف ایک طرز زندگی کو جو سب سے زیادہ موزوں ہو اختیار کر لے۔ نفسیات ارتقا کے دوسرے شعبوں میں بھی اس سے ملتے جلتے مظاہر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ بچہ موضوع الفاظ ادا کرنے سے پہلے جو غوں غاں کرتا ہے اس کا یہ مقصد ہے کہ ہر طرح کی آوازیں کا جن میں سے بعض کا ادا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے ایک ذخیرہ جمع ہو جائے تاکہ اس میں سے حسب ضرورت انتخاب کیا جا سکے۔ اسی طرح قوت ارادی کے ارتقا کی سب سے پہلی منزل وہ ہوتی ہے جس میں ارادہ کسی خاص مقصد سے نہیں کیا جاتا بلکہ محض اپنی نئی قوت یعنی اثبات خودی کی مشق کے لئے۔ اسی طرح کھیل میں مختلف حالتوں اور طرز ہائے عمل کا تجربہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ عنفوان شباب کا طوفان محض کھیل نہیں ہے۔ بلکہ بڑی سنجیدہ چیز ہے یہاں فطرت انسان کی عین ذات کو سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے۔ جو عمل وہ پہلے کھیل کے ساتھ کرتی تھی وہ اب واقعی زندگی کے ساتھ کرتی ہے

مناسب ہوگا کہ یہاں ہم بطور جملہ معترضہ کے ایک تعلیمی نکتہ بیان کر دیں۔ ہمارا نوجوان ان اندرونی انقلابات میں اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتا۔ اسی لئے اسے اس زمانہ میں سمجھے جانے کی خواہش انتہا سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی اسے سمجھ لے تو محض یہ سمجھ لینا بہترین ذریعہ تعلیم ہے۔ کیونکہ اس سے نفسی رجحانات کی بے شمار متضاد صورتوں میں سے بعض کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ان کی تائید کی جاتی ہے اور ان کے نشو و نما کی کوشش کی جاتی ہے اگر اس سمجھنے میں نفس کی پست تر صلاحیتوں پر زور دیا جائے تو نوجوان قعر مذلت میں گر جاتے ہیں لیکن اگر

نفس کے فطری جذبہ ترقی کی پرداخت کیجائے تو وہ اوجِ شرف پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں تعلیم و تربیت کا بہترین طریقہ سمجھنا اور ابھارنا ہے۔ سقراط نے اپنے مخصوص انداز میں اسکی تدبیریں بتائی ہیں۔

نفس کی حالتوں اور کیفیتوں کے اس دائمی تغیر میں بعض رجحانات زیادہ نمایاں ہیں اور سب نوجوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان سب کا تعلق اُس چیز سے ہے جسے ہم نے نفس کا اکتشاف کہا ہے۔ ان سب احساسات میں خودی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ بچہ میں بھی موجود تھے مگر لاشعوری حیثیت سے اب ایک نئے جذبۂ خودی کا دورہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ نفس اور غیر نفس کے درمیان ایک بہت بڑا خلیج حائل ہو گیا ہے، نہ صرف اشیاء بلکہ انسان ہم سے بہت دور اور بالکل بیگانہ ہیں اور انسان تمام عالم میں بالکل یکہ و تنہا ہے۔ اس طرح وہ ذہنی "ہبوط"* واقع ہوتا ہے جو مُدرِک اور مُدرَک کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ مُدرِک اب بجائے خود ایک دنیا بن جاتا ہے: "ہمارے اندر بھی ایک کائنات ہے"۔ اب اپنے نفس کا احساس شروع ہو جاتا ہے۔ اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بشمار مختلف صورتوں میں اپنی ذات پر غور کرتا ہے۔ ان میں سب سے پست وہ سطحی اُدھیڑپن ہے جس میں انسان محض اپنے نفس کے بے مقصد جذبات کو گھنگھولتا ہے، اور سب سے بلند فلسفیانہ تفکر ہے۔ اس عمر میں ایک حالت ایسی بھی ہوتی ہے جب انسان سوچا کرتا ہے مگر اُس کے ذہن میں خیالات نہیں ہوتے۔ گاڈ فرِڈ کیلر نے اس قسم کی دوراز کار غور و فکر کا نقشہ اپنے ناول Der grüne Heinrich میں کھینچا ہے۔ صناعوں کے جلسہ دعوت کے بعد بہت دن تک وہ سیڑھیوں کے پاس بیٹھا رہتا ہے اور بے فائدہ سیڑھیوں پر چاقو سے نشان کیا کرتا ہے لیکن یہ حالت کبھی زیادہ گہرا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور انسان نشاۂ تخلیق کے اہم ترین مسئلہ پر غور کرنے لگتا ہے "میں دنیا میں کیوں ہوں؟ سب چیزیں معدوم کیوں نہیں ہیں؟" بچہ پوچھتا ہے "میں جب تک پیدا نہیں ہوا تھا تو کہاں تھا اور کیا تھا؟" مگر نوجوان یہ پوچھتا ہے "میرے ہونے کا سبب کیا ہے؟ میری قدر کیا ہے؟" اس مافوق الطبیعی جنگ سے انسان جس کشمکش و پیچ میں پڑ جاتا ہے اور

---

* جرمن لفظ Sündenfall کا ترجمہ ہے جس سے مراد ہے حضرت آدم کا بہشت سے نکالا جانا۔ یہاں مطلب ہے انسان کے نفس میں دوئی کا پیدا ہونا۔

اس سے جو خالص مافوق الطبیعی (کچھ ضروری نہیں کہ وہ اخلاقی ہو) عالم بیزاری پیدا ہوتی ہے اُس کا نتیجہ انتہائی صورتوں میں خودکشی ہونا بھی ممکن ہے۔ لوگ اکثر ان واقعات کا سبب خارجی چیزوں کو قرار دیتے ہیں جو نوجوان کے نقطہ نظر سے بالکل سطحی ہوتی ہیں اور جن کا اُس پر کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا لیکن عام طور پر اس تفکر سے جو ہمارے نوجوان اسرار نفس کے متعلق کرتے ہیں اس سے کم مہلک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ روزنامچے لکھے جاتے ہیں۔ خط وکتابت کیجاتی ہے۔ مگر اس کا مقصد تبادلہ خیالات نہیں ہوتا بلکہ خط بھیجنے اور خط پانے دونوں میں ہمارا نوجوان اپنی ذات کا عکس ڈالنا اور دیکھنا چاہتا ہے۔ غزلیں اس لئے لکھی جاتی ہیں کہ دل کے جذبات کا بخار نکلے۔ دوستی سے اس عمر میں خود اپنے نفس کے مشاہدہ کا کام لیا جاتا ہے لیکن قدرتی طور پر انسان ان چیزوں کو تخیل کی عینک سے دیکھتا ہے جس سے اپنے نفس کی تمام کیفیتیں بہت دلفریب اور بہت اہم نظر آتی ہیں۔ اس بات کا ثبوت کہ اس عمر میں انسان اپنے آپ کو بالکل نیا پاتا ہے یہ ہے کہ لڑکیاں خود اپنے نام بدل دیا کرتی ہیں، ہیلینا ہیلا بن جاتی ہے۔ اینا انیتا ہو جاتی ہے اور ریزے اپنے آپکو کم سے کم لیزا کہنے لگتی ہے۔ بالوں کو روز نئے نئے طرز سے باندھنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ انسان اس زمانہ میں گویا ہر وقت آئینہ کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ وہ ہر چیز کیطرف جو نفس کے لئے آئینہ کا کام دے سکے دوڑتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس طرح بھی ظاہر ہو سکتی ہیں کہ شہوت جنسی کا خیال تک دل میں نہ ہو۔ انکی صورت یہ ہوتی ہے جیسے کسی روشنی کے مرکز سے شعاعیں نکل رہی ہیں لیکن مرکز ایک جگہ قائم نہیں ہے، ابھی تک وہ جاگتی ہوئی خودی نمودار نہیں ہوتی جس کے ہمرکاب اثبات نفس، عشق، اور شہوت جنسی کا ہونا لازمی ہے۔ ہمارا نوجوان ایک طلسم تخیل میں ٹٹول ٹٹول کر چلتا ہے جس میں ابتک کھیل کا رنگ باقی ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دنیا اور زندگی کے دائمی قوانین کی ایک خفیف سی جھلک ضرور نظر آنے لگتی ہے

اب آپ داخلی زندگی کے اس عجیب وغریب تضاد پر غور کیجئے۔ ایک طرف انسان اپنے آپ سے بھاگتا ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی نفسی کیفیت میں دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً سیاحت کا شوق جو ہمیشہ سے نوجوانوں کے دل میں ہے یہ اُس اندرونی بےچینی کا اظہار ہے جس میں انسان گھر سے جو گویا اس کے پرانے نفس کا ایک ٹکڑا ہے، بیزار ہو کر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ ایسی بےخودی

ڈھونڈھتا ہے جو بےچینی کی حد تک پہنچ جائے۔ نئے نئے خارجی حیات (واردات) کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اسی کے ساتھ خاموشی اور جمعیت خاطر بھی چاہتا ہے۔ عنفوانِ شباب میں بہت سی باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بیہوشی کی کیفیت پیدا کریں یا کم سے کم جوشِ شباب کی گرمی کو کسی حد تک ٹھنڈا کریں۔ اس جوش میں نشہ کی دونوں کیفیتیں موجود ہوتی ہیں صوفیوں کے "حال" کی خودنمائی بھی اور خودفراموشی بھی۔ زندگی کے اس طوفان خیز زمانہ میں انسان مضطربانہ کوشش کرتا ہے کہ تھک کر شل ہو جائے اور پھر خود یہ تھکن وجہ سکون بن جاتی ہے بخلاف اس کے بعض نوجوان تصنیف و تالیف کی خاموش زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اپنے جوشِ اضطراب سے "نجات پانیکے لئے" روزنامچہ یا اشعار میں ظاہر کرتے ہیں نفسی کیفیت کا اظہار جب کوئی معنوی صورت اختیار کرے تو اُس سے دونوں باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے آپ کو پالینا بھی اور اپنے آپ سے نجات پانا بھی۔ نوجوانوں کو جو محبت اپنے روزنامچہ سے ہوتی ہے اُسکا سبب یہ ہے کہ وہ اس کے راحت والم کا رازدار ہوتا ہے اس کا درد دل سنتا ہے اور اُسے کھل کر بات کرنیکا ایسا موقع دیتا ہے کہ خاموشی کے لمحوں میں نوجوان کا رازدار دل جو کلی کی طرح سربستہ تھا پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے۔ یقیناً یہ روزنامچے نفسیات شباب کے ماخذ کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اُتنے اہم ہرگز نہیں جتنا شارلوٹے بوہلر انہیں سمجھتی ہیں کیونکہ عالمِ ذہنی کو سمجھنا تو درکنار ہمارا نوجوان اب تک خود اپنی نفسی زندگی کا ترتیب اور ربط کے ساتھ مشاہدہ نہیں کر سکتا بلکہ عموماً حیرت کے ساتھ اور کبھی کبھی تو نفرت آمیز تحیر کے ساتھ اُس پر نظر ڈالتا ہے۔ یہ گویا تشکیل سیرت کی پہلی کوششیں ہیں۔ ابھی احساسِ نفس کی پراسرار کیفیتیں اور جذبات بہت دور ہیں۔ اس عمر میں جو کوششیں اپنے نفس کا مشاہدہ کرنیکی ہوتی ہیں انہیں دوسروں سے مانگی ہوئی عینک سے کام لینا پڑتا ہے۔

نفس کی بیداری نہ صرف مشاہدۂ نفس کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ زودحسی کی شکل میں بھی جو اس بات کی علامت ہے کہ احساسِ خودی بہت بڑھا ہوا ہے اور ابھی اسے ٹھیس سے بچانیکی بہت ضرورت ہے۔ دوسروں پر خصوصاً پختہ عمر کے لوگوں پر فرض ہے کہ نوجوان کے دل کی کھلتی ہوئی کلی کو نہ چھیڑیں کیونکہ وہ اتنی نازک ہوتی ہے کہ اُسے اپنے آپ سے صدمہ پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔ اس عمر میں جس میں انسان

طفلی و شباب کی سرحد پر ہوتا ہے لازمی طور پر نفس کی مجموعی حالت بہت تغیر پذیر ہوتی ہے انسان محض ظاہری حیثیت سے یا محض نام کے لئے آدھا بچہ اور آدھا جوان نہیں ہوتا بلکہ اس عمر کے آغاز میں واقعی بعض اوقات وہ بالکل بچہ ہوتا ہے اور بعض اوقات اندرونی زندگی کے اعتبار سے اُس میں پختگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ لیکن آس پاس کے لوگ اس کا بہت کم لحاظ کرتے ہیں اس عمر میں نوجوان کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ اُسے لوگ پورا انسان نہیں سمجھتے اگر اُس کی زود حسی یوں نہ مجروح کیجائے تو اُس سے تعلقات قائم کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جائے۔ محض اتنی بات سے اُس کی تربیت بہت اچھی طرح ہو سکتی ہے کہ اُس سے روزمرہ کی زندگی میں وہی برتاؤ کیا جائے اور وہی توقعات کی جائیں جو پختہ عمر لوگوں سے ہوتی ہیں۔ کم سے کم نوجوان لڑکیوں کے بارے میں تو یہ بات حرف بحرف صحیح ہے۔ بخلاف اس کے اگر نوجوان کی یہ فطری خواہش کہ انہیں لوگ مانیں اور انکی بات چلے، پوری نہ ہو تو وہ "ترک تعلق" کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ ایسی زندگی اختیار کرتے ہیں جو بڑی حد تک بڑوں کے معیار کی پابند نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو خودساختہ پیمانوں سے ناپتی ہے۔ بڑے شہروں میں گنڈوں یا شہدوں کے جو جتھے نظر آتے ہیں انکے قیام کی محرک محض بدمعاشی نہیں ہے بلکہ اس میں یہ خواہش بھی شامل ہے کہ لوگ انکی عزت کریں بلکہ اکثر اوقات لوگ اپنی اس آرزو کے خاک میں ملجانے سے کہ اُنکے ساتھ محبت اور اُنکی ہدایت کیجائے۔ حالت یاس میں ان جتھوں میں شامل ہو جاتے ہیں

مشاہدہ نفس اور زودحسی کے بعد خودمختاری کی اٹھتی ہوئی امنگ اس بات کی علامت ہے کہ نفس کی گہرائی میں ایک نئی خودی نمودار ہو گئی ہے اس لئے اس عمر میں آزادی کی کوششیں، سرکشی یا بُرائی پر نہیں بلکہ ایک فطری ضرورت پر مبنی ہیں۔ ہمارا نوجوان اب اپنے لئے مقاصد قرار دینا شروع کرتا ہے جو ابتدا میں محض تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نوجوان اکثر خواہ مخواہ انتہائی تیزی سے منزلوں پیدل چلتے ہیں جس کی غرض صرف اس بات کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کتنی دور چل سکتے ہیں۔ ابتدا میں انکی غرض مناظر قدرت کا لطف اٹھانا بالکل نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو محض ضمنی طور پر۔ انکی یہ امنگ خواہ جسمانی ورزش کی شکل اختیار کرے خواہ نادر چیزوں کے جمع کرنے کی خواہ مضامین لکھنے کی، خواہ آرا چلانے یا لکڑی کاٹنے کی نفسیات کے نقطہ نظر سے سب کا مقصد ایک ہی ہے۔ کیونکہ ان سب باتوں میں اہم ترین عنصر یہ ہے کہ آدمی کے پاس

غزل

(از سید عنایت علی صاحب آغاز برہانپوری تلمیذ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مدظلہ جانشین امیر مینائی)

خواب کیسا اور کیا تعبیر خواب زندگی ۔۔۔ کھول آنکھیں دیکھ غافل تو کتاب زندگی
ہے حقیقت کے جو چہرے پر نقاب زندگی ۔۔۔ رہ نہیں سکتا ہمیشہ یوں حجاب زندگی
کیوں نہ ہستی میں عدم سے آئے ہر اک تشنہ لب ۔۔۔ کھینچتی ہے دور سے موج سراب زندگی
یہ جہاں تو نالہ طاری ہو گیا اس پر سکوت ۔۔۔ نغمہ زن تار نفس سے ہے رباب زندگی
مست ہیں یاران عدم کہتے نہیں تو کیا ہوا ۔۔۔ ایک اک کو امیں ہے ذوق شراب زندگی
ہر عمل تیرا گنا جائے گا تیرے سامنے ۔۔۔ روز محشر کو سمجھ روز حساب زندگی
خود فراموشی کی ہے تصویر سر سے پانوں تک ۔۔۔ کس قدر بہکا ہے تو پی کر شراب زندگی
خیمۂ تن گر کے رہ جائے گا اک دن خاک پر ۔۔۔ موت آکر توڑ دے گی جب طناب زندگی
یاد ہے مجھکو وہ رونق اور وہ صبح ازل ۔۔۔ جلوہ گر جب ہو رہا تھا آفتاب زندگی
یہ سمجھ جس روز پامال قضا ہونا پڑا ۔۔۔ پھر کہاں تو اور کہاں یہ آب و تاب زندگی

گردش ایام کو آغاز کیا سمجھا ہے تو
الٹے جاتے ہیں یہ اوراق کتاب زندگی

محمد یحییٰ تنہا

کوہ نینی تال

کبھی کوئی نہ عمر بھر اگر گیا پہاڑ پر
تو اُس نے اس جہاں میں کیا ہی کیا ہے آنکر

ہوا وہاں کی سرد ہے، یہ کب غبار و گرد ہے
ہر ایک چیز فرد ہے، عجب بہار ہے اُدھر

اُٹھو اُٹھو کہ وقت ہے، ابھی تو ریل کا بہت
چلو چلو کہ لطف ہے، ہوئے ہم آج ہم سفر

یہ سانپ کی طرح سے ریل، جو کھا رہی ہے بل اب
وہ چوٹیاں پہاڑ کی، جو آ رہی ہیں اب نظر

سماں یہ دیکھ کر ہوا عجیب دل پہ کچھ اثر
کہ روح وجد میں ہے، تن بدن کی کچھ نہیں خبر

لباس سبز زیب تن، پہاڑ ہے کہ ہے چمن
جدھر اٹھائیے نظر، اُدھر شجر ہے یا حجر

پہاڑ کے درخت کی تناوری و دلکشی
سہی قدان باغ بھی، ہوں شرمسار دیکھ کر

گلوں کی وادیوں میں بو، مہک رہی ہے چار سو
کہ جس کو سونگھ کر عجب اٹھائیے لطف سر بسر

ڈھلک رہے ہیں پے بہ پے بنے تھے سنگ راہ جو
رواں دواں ہے آب جو، اسی کا ہے یہ شور و شر

وہ ابر جو بلند تھا زمین سے ہزار گز
گلے ملا وہ راہ میں مگر ملا بچشم تر

کھلی جگہ میں اُس نے کیا ہو جیسے شب کو نم
بڑھے ہم اس سے ریل کے جب تو ہم بھی تھے تر بتر

وہ دل فریب تال بھی نظر کے سامنے ہے اب
کہ زورقوں میں نازنیں اِدھر اُدھر ہیں جلوہ گر

بتان شوخ و شنگ خود چلا رہی ہیں ڈونگیاں
نزاکت بدن یہ ہیں یہ جرأتیں کہ الحذر

درخت بید جا بجا کھڑے ہیں بر کنار کچھ
وہ رنگ آب نیلگوں مگر انہیں ہے کیا خطر

رواں دواں وہ زورقیں کبھی جو دوڑ دیکھیے
نہیں بیان میں لطف وہ جو دیکھتی ہے خود نظر

کسی سڑک پہ شام کو جو گھومنے کو جائیے
خموشی مہیب سے ڈریں گے آپ بھی مگر

وہ نازنین یورپی کتاب ہاتھ میں لیے
مطالعہ میں غرق ہے، اُسے نہیں ہے کچھ خطر

اور اُس پہ اور یہ ستم کہ بیٹھنے کے واسطے
نشست بھی تلاش کی تو اک بلند ڈھال پر

وہ تال کے شمال میں جگہ ہے کیا ہی دلکشا — کہ کھیلتے ہیں سب وہاں اُدھر اُدھر سے آن کر
وہ رقص ہے کہ بال ہے عجیب سب کا حال ہے — ذرا اُمنگ کے دیکھیے جو رہ گزر سے ہو گزر
سنا تھا جس کو کان سے وہ آنکھ سے بھی دیکھیے — وہ بیخودی وہ سرخوشی اٹھا کے دیکھیے نظر
گمان ہے ہر چراغ پر ستارگان چرخ کا — جگہ جگہ وہ روشنی غروب آفتاب پر
جگا رہا ہے نغمۂ طیور کو وہ اب ہمیں — صدائے ساز خوشنوا ہوئی ہے مخبر سحر
ادا فریضۂ سحر کرو تو سیر کو چلیں — بہار صبح خوب ہے صدائے ساز خوب تر
ہوائے سرد کی لپک گلوں کی جس میں ہو مہک — نشاط روح کے لئے عجیب چیز ہے مگر
ہر ایک چیز معتدل خوشی کا ہے سبب یہاں — وگرنہ انبساط بھی بجائے خود ہو پر خطر
یہی ہوائے سرد جب یہاں پہ برف بار ہو — تو باد زمہریر کا ہر ایک شے میں ہو اثر
یہاں کی یہ بہار بھی خزاں سے جائیگی بدل — کہ برف کے سوا یہاں پڑے گا اور کیا نظر

شادی کا پیغام

(آ۔ پے۔ چیخوف)

(۱)

(چوبوکوف اور لوموف۔ لوموف بہت بھڑکیلے کپڑے پہنے ہے۔

چوبوکوف۔ (آگے بڑھ کے ملتا ہے) ارے پیارے تم کہاں سے! تم نے بھی مجھے کیا فرحت وغیرہ بخشی! (ہاتھ ملاتے ہیں) مگر تم بھی کیا آسمان پر سے پھاند پڑے! کہو کیا حال ہے؟

لوموف۔ شکریہ۔ اور جناب کا مزاج شریف؟

چوبوکوف۔ ہم بھی اپنے چھوٹے پیمانہ پر چل رہے ہیں۔ تمہاری دعا سے۔ آؤ بیٹھو۔۔۔ ہاں دیکھو ہمسایوں وغیرہ کو بھول جانا اچھی بات نہیں ہے۔۔۔ لیکن تم آخر اس قدر بن ٹھن کے کیوں آئے ہو۔ کیا کہیں شادی بیاہ میں جانے کا ارادہ ہے؟

لوموف۔ جی نہیں۔ میں تو صرف آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

چوبوکوف۔ لیکن یہ بھڑک دار اچکن کیسی۔ تم کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ آج عید ہے۔

لوموف۔ دیکھئے تو اصل بات یہ ہے (اس کا ہاتھ پکڑ کر) میں آپ کی خدمت میں ایک بڑی گذارش لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کچھ دن ہوئے مجھے آپ سے مدد مانگنے کا فخر حاصل ہوا تھا۔۔۔ اور آپ سے ہمیشہ کہنا چاہئے۔۔۔ لیکن میں گھبرایا جاتا ہوں۔۔۔ مجھے ذرا پانی پی لینے دیجئے (پانی پیتا ہے)

چوبوکوف۔ (الگ) روپیہ مانگنے آیا ہے۔۔۔ نہیں دونگا (لوموف سے مخاطب ہو کر) لیکن بتاؤ تو بات کیا ہے؟

لوموف۔ دیکھئے نہ۔۔۔ میرے بھی ہوش حواس اڑے جاتے ہیں۔۔۔ کیا حالت بن گئی ہے۔۔۔ لیکن یہ معاملہ ایسا ہے جس میں صرف آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔۔۔ اگرچہ کہنا چاہئے کہ میں نے اپنے

آپ کو کسی طرح سے اس کے قابل نہیں ثابت کیا ہے ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ اور مجھے کسی طرح سے اسکا حق نہیں۔

چوبوکوف۔ ہاں ہاں۔ مگر بھائی بات کو اسقدر طول کیوں دیتے ہو؟ بس ایکبار کہدو۔ ہاں!

لوموف۔ جی ہاں۔ فوراً۔ ایک منٹ میں ۔ ۔ ۔ بات یہ ہے کہ میں آپ کی صاحبزادی کو پیغام دینے حاضر ہوا ہوں ۔ ۔

چوبوکوف۔ ہاں بھائی پھر سے کہو۔ مجھے یقین نہیں آتا!

لوموف۔ میں نے اسکی جرات کی ہے کہ ۔ ۔ ۔

چوبوکوف (بات کاٹ کر) بھئی واہ! تم نے بھی میرے دل و چہرہ کو بہت خوش کیا ۔ ۔ ۔ (اُس سے گلے ملتا ہے) میں تو بہت دنوں سے یہی چاہتا تھا ۔ ۔ ۔ میری ہمیشہ سے یہی خواہش تھی ۔ ۔ ۔ (چند آنسو اُسکے گالوں پر نظر آتے ہیں) اور مجھے تم سے اپنے لڑکے کے برابر محبت رہی ہے ۔ ۔ ۔ خدا تم کو ہر طرح کی مسرت و غیرہ بخشے یہی میری دعا ہے ۔ ۔ ۔ ارے میں یہ کیا کھڑا بک بک کر رہا ہوں میرے ہوش اُڑ گئے ۔ ۔ ۔ میں بھی کیا خبطی ہوں ۔ ۔ ۔ میں ابھی اندر جا کر اُن کو بھیجتا ہوں۔

لوموف (بہت موثر ہو کر) کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ اس فقیر کو کرم کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ کیا مجھے کسی قسم کی امید ہو سکتی ہے؟

چوبوکوف۔ واہ۔ ایسے حسین اور پھر پوچھتے ہو کہ وہ راضی ہونگی یا نہیں۔ وہ تو خود تم پر عاشق ہو جائینگی میں ابھی انھیں بھیجتا ہوں۔ (باہر جاتا ہے)

(۲)

لوموف (تنہا اکیلا) سردی ہے۔ نہیں اس طرح تھرا رہا ہوں جیسے معلوم ہوتا ہے امتحان کے لئے جا رہا ہوں سب سے ضروری یہ ہے کہ معاملہ طے ہو جائے۔ اگر میں اب بھی سوچتا رہوں، ارادہ نہ کرسکوں باتیں بہت کروں یا کسی پری سے عشق عاشقی کے انتظار میں بیٹھا رہوں تو کبھی شادی نہ ہوگی کیسی سردی ہے (نام) گھر کا انتظام اچھا کرسکتی ہے، بدصورت نہیں ہے تعلیم یافتہ ہے ۔ ۔ ۔ اور مجھے کیا چاہئے؟ لیکن گھبراہٹ مجھ پر ایسی سوار ہے کہ کانوں سے سنائی نہیں دیتا (پانی پیتا ہے) اور شادی نہ کرنا یہ بھی ناممکن ہے۔ اول تو میں ۳۵ برس کا ہو گیا ہوں، اور یہ عمر کتنا چاہئے بہت خطرناک ہے، دوسرے یہ کہ مجھے

باقاعدہ خوشگوار زندگی بسر کرنا چاہئے . . . میرا دل کمزور ہے، ہمیشہ اختلاج ہوتا رہتا ہے، میں ضعیف ہوگیا ہوں اور ہر بات پر گھبرا جاتا ہوں۔ اس وقت میرے ہونٹ تھرا رہے ہیں اور سیدھی کنپٹی کی رگ پھڑک رہی ہے لیکن سب سے بری حالت میری سوتے وقت ہوتی ہے۔ پلنگ پر لیٹتے ہی آنکھ لگی کہ ایکبارگی کوئی بائیں طرف جا تو بھونک دیتا ہے اور میں سڑیوں کی طرح ادھر اُدھر بھاگا پھرتا ہوں۔ طبیعت ٹھیک ہوئی پھر لیٹا کہ وہی درد پھر اُٹھتا ہے . . . اور یہی رات کو کوئی بیس مرتبہ ہوتا ہے۔

(۳)

نتالیہ۔ ارے یہ آپ ہیں۔ اور وہاں انہوں نے اندر جاکر کہا کہ جاؤ سوداگر مال خریدنے آیا ہے۔ سلام عرض ہے

لوموف۔ تسلیم۔ بندگی۔

نتالیہ۔ معاف کیجئے گا میرے کپڑے ایسے نہیں کہ ایک عزیز مہمان کے سامنے جاؤں۔ اسوقت دال آئی ہے اُسے صاف کر رہی ہوں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ اتنے دنوں تک تشریف کیوں نہیں لائے۔ کھڑے کیوں ہیں، تشریف رکھئے (بیٹھ جاتے ہیں) کہئے کچھ پیش کروں۔ آپ ناشتہ کر چکے؟

لوموف۔ تسلیم میں ابھی کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔

نتالیہ۔ سگریٹ پیجئے گا۔ یہ لیجئے دیا سلائی ہے۔ آج تو موسم اچھا ہے، لیکن کل ایسا پانی برسا کہ سنتے ہیں سب کسان کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لیکن یہ کیا ہے۔ آپ تو بہت بڑھیا اچکن پہنے ہیں۔ کیا کہیں تماشا دیکھنے جا رہے ہیں؟ آپ کی صحت مگر آجکل کچھ اچھی ہوگئی ہے۔ مگر پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ اس قدر بن ٹھن کے کیوں نکلے ہیں؟

لوموف۔ (گھبرا کر) دیکھئے نا بیگم صاحبہ! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے اور میں التجا کرتا ہوں کہ آپ میری بات بغور سنیں . . . جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو تعجب ہوگا، یہاں تک کہ آپ خفا ہوجائیں گی . . مگر میں (الگ) اُف کتنی سردی ہے!

نتالیہ۔ آخر کیا بات ہے (خاموشی) جی؟

لوموف۔ میں کوشش کروں گا کہ چند الفاظ میں اپنا مطلب ادا کردوں۔ میری بچپن سے آپ کے خاندان

سے واقفیت ہے۔ میرے چچا اور چچی سے آپ کے والد اور والدہ کی بڑی دوستی تھی۔ اور اس کے علاوہ جیسا کہ آپ خود جانتی ہیں، میرا چڑیا باغ آپ کے ڈھاک کے جنگل سے بالکل ملا ہوا ہے

نتالیہ۔ معاف کیجئے گا قطع کلام کر رہی ہوں، آپ نے کہا "چڑیا باغ میرا ہے" کیا وہ باغ آپ کا ہے؟

لوموف۔ جی ہاں میرا ہے

نتالیہ۔ یہ دیکھئے۔ چڑیا باغ تو ہمارا ہے۔ آپ کا کہاں سے ہو گیا۔

لوموف۔ جی نہیں بیگم صاحب وہ میرا ہے۔

نتالیہ۔ یہ تو میرے لئے ایک نئی بات ہے۔ وہ آپ کا کیسے ہو گیا۔ وہ تو ہمارا تھا۔

لوموف۔ جی نہیں آپ کا خیال غلط ہے۔ وہ میرا ہے۔

نتالیہ۔ ذرا سوچئے تو وہ آپ کا کب سے ہو گیا۔

لوموف۔ "کب سے" کیا؟ مجھے جہاں تک یاد ہے وہ تو ہمیشہ سے میرا تھا۔

نتالیہ۔ معاف کیجئے۔

لوموف۔ یہ تو کاغذات سے صاف ظاہر ہوتا ہے میری چچی کی دادی نے آپ کی پھپھی کے دادا کے کسانوں کو یہ باغ دے دیا تھا، اس لئے کہ انہوں نے میری چچی کی دادی کے لئے اینٹیں جلائی تھیں۔ ان کسانوں نے ۴۰ برس تک اس باغ پر قبضہ رکھا لیکن جب . . .

نتالیہ۔ واقعات بالکل اور ہیں۔ آپ نے جو فرمایا یہ بالکل صحیح نہیں۔ ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے اس باغ کو اپنا سمجھتے آئے ہیں آخر بحث کرنے کی کیا بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

لوموف۔ میں آپ کو کاغذات دکھا دوں گا۔

نتالیہ۔ واہ۔ واہ ہم تیس برس سے ایک باغ کو اپنا سمجھ رہے ہیں۔ اب یکبارگی ہم سے کہا جاتا ہے کہ وہ باغ ہمارا نہیں۔ مجھے یہ باغ بالکل عزیز نہیں، لیکن مجھے اس ناانصافی پر غصہ آتا ہے۔

لوموف۔ خدا کے لئے میری بات تو سنئے جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، میری چچی کی دادی کے لئے آپ کی پھپھی کے دادا کے کسانوں نے اینٹیں جلائی تھیں اس کے بدلے میں چچی کے دادا نے . . .

نتالیہ۔ چچی پھپھی دادا دادی یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ باغ میرا ہے اور بس۔
لوموف۔ میرا ہے!
نتالیہ۔ ہمارا ہے! چاہے دو دن تک ثبوت دیتے رہیں، چاہے آپ پچاس اچکنیں پہن کر آئیں باغ ہمارا ہے ہمارا ہے۔ میں نہ آپ کی چیز لینا چاہتی ہوں نہ اپنی مفت میں دینا چاہتی ہوں اور یوں جیسا آپ چاہیں۔
لوموف۔ مجھے باغ کی ضرورت نہیں، میں تو صرف اصولاً بحث کر رہا تھا۔ مگر آپ چاہیں تو اُسے میں آپ کے نذر کر سکتا ہوں۔
نتالیہ۔ میں خود اُسے دے سکتی ہوں، وہ تو میرا ہے۔ مگر آپ بھی خوب ہیں۔ مجھے میری چیز دے رہے ہیں یہ تو اخلاق کے خلاف ہے، بلکہ بے تمیزی ہے
لوموف۔ یعنی آپ مجھے ایک بے ایمان سمجھی ہیں جو آپ کی چیز دبا بیٹھا ہے۔ بیگم صاحبہ میں نے آجتک کبھی بے ایمانی نہیں کی ہے، اور کسی کی کیا جرأت ہے کہ وہ مجھ پر اس کا الزام لگائے (پانی) چڑیا باغ میرا ہے!
نتالیہ۔ جھوٹ ہے باغ میرا ہے!
لوموف۔ میرا ہے!
نتالیہ۔ جھوٹ ہے۔ میں آج ہی اسے ثابت کر دونگی ابھی آدمیوں کو بھیج کر اُسے کٹوا ڈالوں گی۔
لوموف۔ اور میں اُن سب کی گردن کٹوا ڈالوں گا
نتالیہ۔ آپ کی کیا حقیقت ہے؟
لوموف۔ (دل پر ہاتھ) چڑیا باغ سمجھیں آپ! میرا ہے!
نتالیہ۔ آپ اپنے گھر پر چاہے جتنا چلاتے ہوں یہاں مہربانی فرما کر آدمیوں کی طرح سے بات کیجئے۔
لوموف۔ اگر مجھے اسقدر اختلاج نہ ہوتا تو میں آپ کو دکھا دیتا (چلاکر) چڑیا باغ میرا ہے!
نتالیہ۔ میرا ہے!

لوموف۔ میرا ہے!

نتالیہ۔ میرا ہے!

(۴)

چوبوکوف۔ یہ آخر کیا ہے؟ آپ لوگ کیوں چلا رہے ہیں۔

نتالیہ۔ بھئی ان صاحب کو بتا دو کہ چراگاہ کس کا ہے ہمارا ہے یا انکا۔

چوبوکوف۔ ہمارا ہے بھائی وہ تو۔

لوموف۔ جی نہیں آپ تو صرف مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں اور میرا مذاق اڑاتے ہیں، اچھے ہمسائے اس طرح سے پیش نہیں آتے۔ آپ ہمسایہ نہیں ڈاکو ہیں۔

چوبوکوف۔ جی آپ نے کیا فرمایا؟

نتالیہ۔ چراگاہ ہمارا ہے۔ میں کبھی اُسے دینے پر راضی نہ ہوں گی!

لوموف۔ یہ تو ہم کچہری میں دیکھ لیں گے۔

چوبوکوف۔ اچھا! مجھے اب معلوم ہوا۔ آپ مقدمہ بازی کے لئے ایک بہانہ نکالنا چاہتے تھے۔ کیا فسادی طبیعت ہے! مگر تمہارا تو سارا خاندان ہی فسادیوں اور لفنگوں سے بھرا ہے

لوموف۔ جناب میرے خاندان کو برا نہ کہئے۔ ہمارا خاندان بہت شریف ہے۔۔۔ کم از کم ہمارے یہاں کوئی ایسا تو نہیں نکلا جو آپکے دادا کی طرح علاقہ کورٹ کرا کے جیل خانہ میں بیٹھا ہو۔

چوبوکوف۔ مگر تمہارے یہاں تو سب پاگل تھے

نتالیہ۔ سب سب سب!

چوبوکوف۔ تمہارا دادا شرابی تھا اور تمہاری چچی ایک بڑھئی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

لوموف۔ آپ کی ماں کبڑی تھیں (دل پر ہاتھ) ہائے۔۔۔ پانی!

تمہارا باپ بیٹھو تھا۔ جواری تھا۔

نتالیہ۔ اور تمہاری چچی جیسی فسادن کبھی ہوئی ہی نہیں۔

لوموف۔ بائیں پیر سو گیا... آپ لوگ فسادی ہیں... ٹھگ ہیں... ہائے (دل پر ہاتھ) اور انتخابات کے زمانہ میں... میری ٹوپی کہاں ہے

نتالیہ۔ کمینہ، بے ایمان، ذلیل!

لوموف۔ (دل۔ ٹانگ۔ ٹوپی)

چوبوکوف۔ نکل جا میرے گھر سے اور پھر کبھی آیا تو خیر نہیں!

لوموف باہر بھاگ جاتا ہے

(۵)

چوبوکوف۔ اور دیکھو تو اس بدمعاش کی جرأت۔ تمہارے یہاں شادی کا پیغام لے کر آیا تھا!

نتالیہ۔ کیا پیغام؟

چوبوکوف۔ تمہارا داماد بننا چاہتا ہے۔

نتالیہ۔ اچھا! تم نے یہ پہلے سے کیوں نہیں کہا؟

چوبوکوف۔ بیخ کا کباب کہیں کا۔ اطلس کی اچکن پہنکر آیا تھا

نتالیہ۔ (حسرت سے) پیغام لایا تھا! بلاؤ! واپس بلاؤ!

چوبوکوف۔ کسے

نتالیہ۔ بلاؤ! واپس بلاؤ۔

چوبوکوف (ہچکچا کر) خدا ان عورتوں سے بچائے۔

(۶)

لوموف۔ میرا دل بہت دھڑک رہا ہے۔ ٹانگ بالکل سن ہو گئی۔ پٹھہ میں جیسے کوئی چھری بھونک رہا ہو۔

نتالیہ۔ معاف کیجیے گا ہماری گفتگو ذرا گرم ہو گئی تھی... اب مجھے خیال آتا ہے... چراگاہ واقعی آپ کا ہے...

لوموف۔ سینہ میں درد ہو رہا ہے کنپٹی پھٹی جاتی ہے...

نتالیہ۔ باغ باغ آپ ہی کا ہے۔ ۔ تشریف رکھئے ہم غلطی پر تھے۔ ۔ ۔

لوموف۔ میں تو صرف اصولاً ۔ ۔ ۔ مجھے باغ عزیز نہیں۔ صرف اصول۔

نتالیہ۔ جی ہاں بالکل بجا ہے۔ ۔ آئیے اب کسی اور چیز پر گفتگو کریں۔ ۔ ۔

لوموف۔ میرے پاس تو کاغذات موجود ہیں۔ میری چچی کی دادی نے آپ کی پھپھی کے والد کے کسانوں کو۔ ۔ ۔

نتالیہ۔ جی ہاں، جی ہاں ۔ ۔ ۔ اب آپ شکار کھیلنے کب جائیں گے؟

لوموف۔ شکار کھیلنے کیا جاؤں ۔ ۔ میرا کتا سٹو تو مر گیا!

نتالیہ۔ کیا افسوس کی بات ہے۔ ۔ ۔ کیسے؟

لوموف۔ معلوم نہیں (ٹھنڈی سانس) کیا لاجواب کتا تھا۔ قیمت کو الگ چھوڑئے۔ ۔ میں نے ۱۲۵ روپیہ کو خریدا تھا ۔ ۔ ۔ مگر کتا ۔ ۔ ۔

نتالیہ۔ آپ نے قیمت تو بہت دی تھی۔ ۔ ۔ دیکھئے ہم نے اپنے کتے کرن کو ۸۰ روپے میں خریدا اور وہ آپ کے سٹو سے کہیں اچھا ہے۔

لوموف۔ کرن سٹو سے اچھا! آپ بھی کیا باتیں کرتی ہیں (ہنسی) کرن سٹو سے اچھا ہے!

نتالیہ۔ ارے! اسمیں کیا شک، اُسکا جواب تو نواب صاحب کے پاس بھی نہیں۔

لوموف۔ معاف کیجئے گا، وہ کانا ہے اور کانے کتے کی کوئی قیمت نہیں ہے

نتالیہ۔ ارے! کانا۔ آپ تو معلوم ہوتا ہے آج بحث پر تلے ہیں۔ پہلے تو جھگڑا باغ اپنا بتایا۔ ۔ ۔ اب کہتے ہو سٹو کرن سے اچھا ہے۔ آخر آپ ہر بات کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

لوموف۔ مجھے معلوم ہوتا ہے۔ آپ مجھے یا تو اندھا سمجھتی ہیں یا بیوقوف۔ مجھے ٹھیک معلوم ہے کہ آپکا کتا کرن کانا ہے

نتالیہ۔ غلط ہے!

لوموف۔ کانا ہے

نتالیہ۔ (چلاکر) آپ جھوٹ بولتی ہیں!

لوموف۔ مگر خدا کے لئے چلائیے نہیں۔ مجھے اختلاج ہوتا ہے (چلاکر) خدا کے لئے اب بحث ختم کیجئے اور چپ ہوجائیے۔

نتالیہ۔ جب تک آپ یہ نہ مانیں گے کہ ہمارا کرن آپ کے سٹو سے اچھا ہے۔

لوموف۔ برا ہے!

نتالیہ۔ اچھا ہے!

لوموف۔ ہزار گونہ بدتر ہے۔ خدا کرے یہ آپکا کرن مرجائے، ٹھنڈا ہوجائے!

نتالیہ۔ آپکا سٹو ویسے ہی مریل ہے، اُسکے مرنے سے کیا فرق ہوگا!

لوموف۔ (روکر) خدا کے لئے اب چپ ہوجائیے مجھے اختلاج ہوتا ہے۔

نتالیہ۔ میں اور چلاؤں گی۔

(۷)

چوبوکوف۔ اب کیا ہوا؟

نتالیہ۔ ابا! اچھے آئے۔ ان کو سمجھادو۔ ہمارا کرن زیادہ اچھا کتا ہے یا انکا سٹو۔

لوموف۔ آپ یہ بتائیے کہ آپکا کرن کانا ہے کہ نہیں۔

چوبوکوف۔ کچھ بھی ہو اُسکا جواب کہیں نہیں۔

لوموف۔ مگر میرا سٹو تو اُس سے اچھا ہے؟ سچی بات کہئے۔

چوبوکوف۔ ہاں، تمہارا سٹو بھی اچھا ہے۔ مگر ذرا بڈھا ہے اور ٹانگیں چھوٹی بڑی ہیں۔

لوموف۔ (اختلاج) واقعات دیکھئے واقعات۔ پارسال کے شکار میں میرا سٹو آپ کے کرن سے کہیں آگے نکل گیا تھا . . .

چوبوکوف۔ جی ہاں اس سبب سے کہ کسی نے اُس کے لاٹھی ماردی تھی۔ اچھی چیز دیکھ کے سب ہی کو حسد ہوتا ہے، آپ خود حسد کرتے ہیں اور اسی وجہ سے آپ نے اس وقت یہ بحث چھیڑی ہے۔

لوموف۔ اور آپ خود کیسے ہیں۔ جاتے تو ہیں شکار کے نام سے، لیکن اصل مقصد نواب صاحب کے

یہاں فساد پھیلتا ہوتا ہے ... اے دل ... آپ فسادی ہیں۔

چوبوکوف۔ کیا میں فسادی ہوں (دبا کر) منہ بند کر

لوموف۔ فسادی!

چوبوکوف۔ بد ذات، سور۔

لوموف۔ بڈھا چوہا، بے ایمان

چوبوکوف۔ چپ رہو نہیں تو تجھے کتے کی طرح گولی ماردوں گا، بدمعاش۔

لوموف۔ سب کو معلوم ہے ہائے دل۔ آپ کی پہلی بیوی آپ کے کان کھینچتی تھی۔ آپ کو ٹھوکتی تھی ...

ہائے ہائے میں گرا جاتا ہوں ...

چوبوکوف۔ اور تجھے عشق کرنے کے لئے ایک چمارن کے سوا کوئی نہ ملی۔

لوموف۔ ہائے ہائے ... دل پھٹ گیا ... کندھا الگ ہو گیا ... میرا کندھا کہاں

ہے؟ ... ڈاکٹر ....

چوبوکوف۔ سور، چوہا، بدمعاش ...

لوموف۔ کوئی جواب نہیں دیتا۔

نتالیہ۔ ارے لو وہ مر گیا ... مر گیا۔

شور و غل۔ پانی وغیرہ لایا جاتا ہے۔

لوموف۔ آگ۔ آدمی پانی ... میں کہاں ہوں؟

چوبوکوف۔ تم جلدی سے شادی کر لو اور ... اور جہنم میں جاؤ۔ (ہاتھ ملا کر) بیگم صاحبہ لڑکی دینے

پر راضی ہیں ...

لوموف۔ ہائیں ... کیا ... کس کا؟

چوبوکوف۔ ارے وہ راضی ہیں!

نتالیہ۔ (سانس) ابھی زندہ ہیں ... ہاں ہاں میں راضی ہوں۔

لوموف۔ ہاں کس کو . . . (ہاتھ ملاکر) مجھے بہت خوشی ہوئی . . . بتائیے تو بات کیا ہے . . .
ہاں جی ہاں میں سمجھ گیا . . . دل . . . مجھے بہت خوشی ہوئی ہے (ہاتھ چوم کر) ٹانگ بالکل سن ہوگئی

نتالیہ۔ میں . . . میں بھی خوش ہوں . . . مگر اب تو مان لیجیے کہ ہمارا کتا آپ کے سٹوتے سے اچھا ہے۔

لوموف۔ جی نہیں میرا کتا زیادہ اچھا ہے . . .

چوبوکوف۔ ہاں اب خاندانی خوشی شروع ہوئی . . . قاضی کو بلاؤ۔

لوموف۔ میرا کتا زیادہ اچھا ہے . .

نتالیہ۔ ہمارا کتا زیادہ اچھا ہے . .

چوبوکوف۔ قاضی کو بلاؤ! قاضی کو!

پردہ

(روسی سے)

اقتباسات

مادر ہند مس کیتھرائن میونے حال میں ایک کتاب "مادر ہند" Mother India ۲۶ " کے نام سے شائع کی ہے جس پر انگریزی اخبارات میں بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔ اور ہندوستان کے خلاف خیالات وجذبات پیدا کرنیکے لئے اس کتاب کو استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کتاب کا بڑا حصہ سیاست ہند میں اینگلو انڈین نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ مصنفہ نے ہندوستانی سیاسی رہنماؤں اور تعلیم یافتہ طبقہ پر دل کھول کر زہر اگلا ہے۔ ایک ہندوستانی رئیس کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان سے گئے تو اس کے ۳ ماہ بعد ہندوستان میں نہ کوئی باکرہ عورت رہے گی نہ ایک روپیہ"

تعلیم یافتوں کی فکر معاش کی خوب ہنسی اڑائی گئی ہے اور مصنفہ کو یاد نہیں رہا کہ انکے وطن مالوف اور دیگر ممالک میں بھی یونیورسٹی میں تعلیم پانے والوں کی بڑی تعداد احقاق حق ہی کے لئے تعلیم نہیں حاصل کرتی بلکہ "دو گھنٹی والا دروازہ" اور "اپنے نام کی تختی" ان طلبہ کی ذہنیت کا بھی جزو اعظم ہے۔ اس میں کلکتہ بمبئی اور علیگڑھ ہی کی قید نہیں ہارورڈ ییل اور آکسفورڈ و کیمبرج بھی اس سے خالی نہیں۔ مصنفہ نے ہندوستان کی تاریخ کا بھی ایک مختصر سا خاکہ دیا ہے جو شاید کسی اسکول کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ نہایت فخر کے ساتھ مصنفہ نے ۱۸۳۳ء کا وہ وعدہ پیش کیا ہے کہ "ہندوستان کا کوئی باشندہ اپنے مذہب، وطن، نسل، رنگ، کی وجہ سے کمپنی بہادر کی کسی نوکری یا کسی عہدے سے محروم نہ رکھا جائیگا" اور فرماتی ہیں کہ ذات کی قید میں پابند اور ظالموں کے شکار ہندوستان کی فضا میں یہ ایک انقلابی گولا تھا جو کمپنی نے چلایا تھا۔ اگر یہ وعدہ سچ ہوتا تو ممکن ہے ایسا ہی ثابت ہوتا لیکن مصنفہ کو شاید معلوم نہیں کہ اس وعدہ کی ضرورت بار بار اسی لئے پڑتی رہی کہ اس پر عمل کبھی نہیں ہوا۔ ۱۸۵۳ء میں یہ وعدہ دہرایا گیا، پھر ۱۸۵۸ء میں اسی کا اعادہ ہوا۔ ۱۸۲۲ء اور ۱۸۲۴ء میں خود مدراس کے گورنر سر ٹامس منرو کی شہادت موجود ہے کہ ذلیل ترین عہدوں کے علاوہ اور تمام ملازمتوں کا دروازہ باشندگان ہند کے لئے بند ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ

سے آٹھ دن قبل ہنری لارنس نے بھی دھرا دیا۔ اور ان لوگوں کی شہادت کی کیا ضرورت ہے ہم کیا آج بھی خود اس رنگ و نسل کی تفریق کے مظاہر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔

غرض کتاب کے تقریباً ۲۰۵ آخری صفحات اسی قسم کے خیالات و جذبات سے پر ہیں اور انگلستان اور ہندوستان کے انگریزی اخبارات ان کو خوب اچھال رہے ہیں۔ کتاب کا پہلا حصہ اگرچہ اس طرح استعمال کیا جا رہا ہے لیکن اسمیں بعض وہ تلخ حقیقتیں ہیں جن سے انکار ناممکن ہے۔ عورت کے ساتھ ہندوستان میں جو سلوک ہوتا ہے وہ ہماری معاشرت کا تاریک ترین پہلو ہے۔ اور مصنفہ نے اس کے ثبوت میں ڈاکٹروں اور دیگر شاہدوں کی ایسی تلخ شہادتیں پیش کی ہیں جن کے پڑھنے کے بعد رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک ہندوستانی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شرم سے عرق عرق ہو جائے اور اگر اپنے اندر زندگی کی ذرا سی بھی چنگاری رکھتا ہے تو اس ظلم کو مٹانے میں اپنی پوری سعی صرف کر دے۔

کاش تعلیم یافتہ ہندوستانی ان ناگوار تفصیلوں کو پڑھ کر جو مصنفہ نے جمع کر دی ہیں شرمائیں اور دیکھیں کہ یورپ کی بداخلاقی پر بغلیں بجانے کے بجائے اگر وہ اپنی معاشرت کی کمزوریوں کی اصلاح کیطرف متوجہ ہوں تو زیادہ مفید ہے۔ دوسرے کی آنکھ کے تنکے کی تلاش میں اس قدر منہمک ہونیکے بجائے کیا اچھا ہو کہ ہم اپنی آنکھ کے شہتیر کیطرف توجہ کریں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی پر چند نئی کتابیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں تاریک ترین زمانہ غالباً ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا زمانہ رہا ہے۔ اس عہد میں خصوصاً صنعتی اور زرعی تباہی نے جو شکل اختیار کی اس نے ہندوستان کی معاشرتی زندگی کی بنیادیں ہلا دیں۔ لیکن افسوس کہ ہندوستانی جہاں اپنی قوم کے کارناموں سے ناواقف ہیں وہاں اپنے قومی مصائب کے علم سے بھی محروم ہیں۔ معاشی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے ہندوستانی طالب علموں کا فرض ہے کہ اس عہد کے عظیم الشان اور درد انگیز انقلاب کی تاریخ اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ لیکن اپنے محاسن کے بیان میں مبالغہ کا جتنا امکان ہے اس سے کہیں زیادہ مصائب کی دکھ بھری کہانی کے دہرانے میں اس لئے علمی دیانتداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہئے۔

حال میں مختلف کتابیں اس دور کے تغیرات کے متعلق شائع ہوئی ہیں جن سے طالب علم کو ان کاغذات کا کچھ پتہ چل جائے گا جن کے مطالعہ سے وہ اس عہد کی تاریخ میں مدد لے سکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل اسکول اور فرمنگر بنگال کے انتظامات مالگذاری پر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ابھی اکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے مسٹر ایس بوتھم کی کتاب Studies in The Land Revenue History of Bengal 1769-87 شائع کی ہے۔ عطا، دیوانی اور بندوبست دوامی کے درمیان بنگال کی تاریخ کا سب سے اہم زمانہ ہے۔ اس کتاب میں انڈرسن، کرافٹ وغیرہم کی یوری "امینی رپورٹ"، مسٹر شیر ین کی رپورٹ بابتہ عہدۂ قانونگو اور دوسرے قلمی نسخوں سے اقتباسات درج ہیں۔

سر جارج فارسٹ نے لارڈ کارنوالس کے سرکاری کاغذات کا مجموعہ مع تمہید دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ کاغذات میں دوسرے دلچسپ واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ٹیپو سلطان سے انگریزوں کی جنگ اودھ کا انتظام حکومت وغیرہ لیکن اس ضمن میں ہم ان کاغذات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جو بندوبست دوامی کے متعلق شائع کئے گئے ہیں۔

ایک تیسری کتاب میں سر ولیم فوسٹر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ قیام (۱۶۰۰ء) سے اختتام (۱۸۵۸ء) تک پیش کی ہے

ان تینوں کتابوں کا بڑا حصہ چونکہ اصلی ماخذوں سے لیا گیا ہے اس لئے ان کا مطالعہ تحقیق کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

انگریزی جاپانی معاہدہ

جامعہ کے گذشتہ پرچہ میں ایک مضمون نگار نے برطانوی سیاست خارجہ کے مسائل کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اسمیں بحرالکاہل اور امریکہ، جاپان اور برطانیہ کے تعلقات کا سلسلہ بھی تھا کیپتان م۔ ڈ کینڈی نے اگست ۲۷ء کے رسالہ Nineteenth Century میں ا۔۔ "مشرق بعید اور انگریزی۔ جاپانی تعاون" کے عنوان سے ایک طویل مضمون سپرد قلم فرمایا ہے جس میں انگریزی رائے عامہ کو یہ بتلانے کی کوشش کی گئی کہ جاپان کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور عہدنامہ برطانیہ کے لئے اس وقت زیادہ ضروری ہے

اور امریکہ کی خاطر پانچ سال پہلے جاپانی معاہدہ کی تنسیخ سے متوقع نتائج نہیں نکلے۔ فاضل مضمون نگار لکھتا ہے
ہمارے بہت سے امریکن دوست صاف صاف اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اگر ہم نے پچھلے دنوں
اسقدر ذلت سے دبنے کا رویہ نہ اختیار کیا ہوتا تو وہ ہماری دوستی کی کہیں زیادہ قدر کرتے۔ اس بیان کی
سچائی نے اپنا اثر دکھایا ہے اور آج وہ انگریزی اخبارات اور اہل سیاست بھی جو امریکہ سے دوستی کے بہت
حامی ہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ بس اسکے آگے جانا بہت مشکل ہے۔ ہم بیشک آپ کی دوستی چاہتے ہیں اور
آپکی مدد اور آپ کے تعاون کے طالب ہیں۔ لیکن ان چیزوں کی قیمت بھی ضرورت سے زیادہ گراں ہو سکتی ہے۔
مضمون نگار نے ۱۹۲۱ء کے حالات کا جبکہ جاپانی انگریزی معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے۔ موجودہ حالات
سے مقابلہ کیا ہے اور ان میں یہ مشابہت ظاہر کی ہے کہ اس وقت بھی چین ایک غیر متحد یورپ کی پھوٹ سے
فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور روس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے اغراض حاصل کرنیکی فکر میں تھا آج بھی چین یہی
چاہتا ہے۔ اور روس سے اگرچہ جاپان یا ہندوستان کو فوراً کوئی فوجی خطرہ نہیں لیکن اس کے مسلک سیاسی
و معاشی کی تبلیغ سے سارے نظام جماعت کا شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔

"جاپانی۔ انگریزی معاہدہ کی تنسیخ سے سوائے اس کے امریکہ سے تعلقات بہتر ہو گئے (اور یقیناً
ایک اہم چیز ہے) اور کوئی فائدہ مشکل ہی سے ہوا۔ برخلاف اس کے اسٹریلیا برابر ڈر رہا ہے، سنگاپور پر ایک
بحری مرکز کے قیام کا گراں اور پرخار مسئلہ درپیش ہے۔ جاپان کے احساس نفس کو صدمہ پہنچا ہے اور ہماری
طرف سے اسے شبہات پیدا ہو گئے ہیں، چین میں حالت ابتر ہے جس سے تجارتی نقصان ہے، فوجیں الگ
بھیجنی پڑ رہی ہیں، روسی خطرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور اسلحہ کی تخفیف کے مسئلہ میں حائل ہونے والے
اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔"

"بہترین علاج تو یہ ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں پھر سے معاہدہ کر لیا جائے۔ لیکن یہ ناقابل عمل ہے
انگلستان اس کی تجویز اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ یہ معلوم ہوگا اسکی منسوخی اور تجدید کی کوشش میں
بس اپنے اغراض کا خیال کیا۔ جاپان بھی ایسا نہ کرے گا کیونکہ اسکا غرور یہ اجازت نہیں دیتا کہ ۱۹۲۲ء
میں جو ذلت ہوئی ہے اس کے متعلق ظاہر ہو کہ اس سے کچھ نقصان ہوا . . . . "

"چین اور مشرق بعید میں امریکہ کے تعاون کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی جاپان کی مدد کی۔ لیکن امریکہ نے صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ وہ اپنے آپکو کسی ایسے رویہ کا پابند نہیں کرنا چاہتے جو انکی آزادیٔ عمل میں حائل ہو۔ یہ جذبہ آزادی کتنا ہی قابل تعریف کیوں نہ ہو لیکن دول کے اس اتحاد کے لئے یہ سخت مہلک ہے جس کے بغیر چین ہر ایک بات ٹال جائے گا۔ اور اپنے فرائض کی ادائگی کو ہمیشہ ٹالتا رہیگا۔

"جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں دو فریقوں میں تعاون زیادہ آسان ہے بہ نسبت ۳ یا کئی فریقوں کے۔ اور چونکہ چین کے معاملہ میں ۳ دول کا تعاون مشکل ثابت ہوا ہے اور چونکہ جاپان اور انگلستان کے اغراض اور دول کے بہ نسبت زیادہ ملتے ہوئے ہیں اس لئے یہی بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں قوموں میں زیادہ قریبی رشتہ تعاون کے قیام کی کوشش کیجائے۔

اطالیہ میں فاشستی حکومت۔

موقر معصر Round Table نے اپنے جون کے پرچہ میں اطالیہ کی گذشتہ پانچ سال کی حکومت پر ایک مضمون شائع کیا ہے جو مفید اور دلچسپ معلومات سے پر ہے۔ ہمارے ملک میں جب کبھی Dictator یا امام کی ضرورت پر کچھ لکھا ہوتا ہے تو اٹلی کے اصلی حکمراں مسولینی کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ اس لئے اس حکمراں اور اس کے سیاسی فرقہ کے اعمال کے متعلق اگر یہاں بھی لوگوں کو وقتاً فوقتاً کچھ معلوم ہوتا رہے تو غیر مفید نہ ہوگا!۔

گذشتہ پانچ سال میں فاشستی پارٹی سیاسی اور معاشی حیثیت سے اپنی قوت کو برابر مستحکم کرنے میں مشغول ہے۔ مسولینی نے اپنی مخصوص صاف گوئی سے کام لیکر حال میں ایک مرتبہ اعلان کیا تھا کہ ہماری حکومت قوم کی مرضی سے قائم نہیں قوت سے قائم ہے۔ چنانچہ اسی قوت کو بڑھانے کے لئے سب شعبہ جات میں کوشش کیجا رہی ہے۔ فاشستی جماعت کا نشان (لکڑیوں کا ایک گٹھا) قومی نشان قرار دیدیا گیا ہے۔ سال بھی فاشست فرقہ کے برسر حکومت آنے کی تاریخ سے گنا جاتا ہے۔ چنانچہ اطالوی اخباروں پر آپ کو پانچواں سال لکھا ہوا ملیگا۔ تمام مدرسوں اور دفتروں میں فاشستی سلام لازمی۔ کوئی دیوانی یا فوجی ملازم مجاز نہیں کہ فاشستی عقائد کے خلاف ایک نقطہ بھی زبان سے نکالے۔ تمام معلموں اور مدرسین کو فاشستی

عقائد سیاسی قبول کرنا پڑتے ہیں۔ کوئی شخص جو یہ عقائد نہ رکھتا ہو مدرس نہیں بن سکتا جج تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ خانگی مباحثہ وگفتگو میں فاشستی خیالات کی مخالفت کرنیکی وجہ سے، ۱ جج برطرف کردئے گئے۔ اخباروں میں ایسی یکسانیت ہے کہ پڑھنے والے کو فوراً محسوس ہونے لگتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اخبارات ورسائل زبان سے "ہماں می گویم" کہہ رہے ہیں۔ فاشست جماعت کے علاوہ تمام سیاسی فرقے توڑ دئے گئے ہیں اور انکو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کے لئے تین سے پانچ سال تک کی سزا ہے۔

ظاہر ہے کہ ملک میں "امن" ہے!

شذرات

جامعہ یکم اگست سے کھل گئی ہے۔ علاوہ پرانے طالب علموں کے اس سال نئے طلبہ بکثرت داخل ہو رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ کے طرز تعلیم اور طرز زندگی کے قدر دانوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اللھم زد فزد

ہم تہ دل سے اُن سب ہمعصروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ازراہ حب قومی جامعہ کے مقاصد کو علم دوست حضرات کے سامنے پیش کیا اور لوگوں کو اس درسگاہ کیطرف توجہ دلائی۔ خدائے تعالیٰ انہیں اسکا اجر دے۔ اور توفیق عطا کرے کہ پھر ضرورت کے وقت ہماری مدد کریں۔ دوستی اور یگانگت میں دستور ہے کہ احسان کا شکریہ مزید احسان کے مطالبہ کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ کیا ہمیں اس قسم کا شکریہ ادا کرنے کی اجازت ہے۔

ہم خصوصیت سے موقر ہمعصر سچ کے ممنون احسان ہیں جس نے بجائے تائید کے جامعہ اور اہل جامعہ پر نکتہ چینی کرکے سچی ہمدردی کا حق ادا کیا ہے۔ ہم نے بہت غور سے جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے کا پہلا نوٹ اور دوسرا مفصل مضمون پڑھا اور اس میں سے ضروری باتوں کا انتخاب کرنیکی کوشش کی جہانتک ہماری سمجھ کام کرتی ہے جناب مدیر کا اصل اعتراض یہ ہے کہ جامعہ کے اساتذہ "دانایان فرنگ" کے فضل و کمال سے مرعوب ہیں اور "فتنۂ مغرب" سے بچنے یا "خالص" اور "بے آمیز" (؟)، "اسلامیت" کے حاصل کرنیکی اتنی کوشش نہیں کرتے جتنی خود جناب مدیر سچ اپنے خیال میں کر رہے ہیں۔ موصوف ازراہ شفقت بزرگانہ کارکنان جامعہ کے خلوص اور اُنکی سرگرمی اور محنت کا اعتراف کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اُنہیں یہ بانگ دہل متنبہ کرتے ہیں کہ وہ بجائے "صراط مستقیم" کے جس کی طرف رسالۂ سچ لکھنؤ رہنمائی کرتا ہے "ٹیڑھی پگڈنڈی" پر چل رہے ہیں۔

ہم جناب مدیر کی ان محبت آمیز جھڑکیوں کو اہل جامعہ کے لیے بہت مفید سمجھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ باوجود انتہائی کوشش کے اہل جامعہ شیطان کے شر سے محفوظ نہیں اس لئے یہ سچی بہی خواہ کی نصیحت انکے لئے عبرت کا سامان اور حفظ ایمان کا سرمایہ ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں شیطان شرق و مغرب کا پابند نہیں اُسکے فریب کے جال سب کہیں بچھے ہیں اس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ خطابت اور فتنہ لیڈری بھی ہے جس میں آج کل ہندوستان مبتلا ہے۔ ہم جناب مدیر سچ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے اس فتنہ سے بچنے کی بھی دعا کریں جس کی زد میں ہم ہر وقت رہتے ہیں خدا کرے ہم اپنے قومی شاعر کا یہ قول کبھی نہ بھولیں کہ "عشق کا رے ست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند"

جناب مدیر کے خیال میں اُنکے اور اہل جامعہ کے نقطۂ نظر میں اصولی اختلاف ہے۔ موصوف ایسا اسلام چاہتے ہیں جس میں نہ علوم ہوں نہ فنون، نہ کتب خانے نہ عجائب خانے وغیرہ وغیرہ، لیکن جامعہ کے لوگ اُس اسلام کے قائل ہیں جس میں یہ سب چیزیں موجود ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جامعہ کے اکثر اساتذہ اور بعض طلبہ "سچ" کا بہت غور سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی دن اُن پر اسکے مضامین کا اثر ہو اور وہ "ٹیڑھی پگڈنڈی" کو چھوڑ کر "سیدھی شاہراہ" پر چلنے لگیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان راہ حق پر آنکھ بند کر کے لاٹھی کے سہارے نہیں چل سکتا۔ اُس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ آنکھ کھول کر اس شمع مبین کی روشنی میں جادہ پیمائی کرے جو خدا نے خاصان خدا کے ہاتھ ہماری رہنمائی کے لئے بھیجی ہے۔ اس کے لئے ضرورت پڑتی ہے درد آشنا دل کی جس کے جذبات و احساسات سے جناب مدیر خفا ہیں اور عقل سلیم کی جس سے موصوف بیزار ہیں۔

ہم اس گفتگو کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتے۔ اس لئے کہ یہ مسائل بحث مباحثہ سے حل نہیں ہوتے

بلکہ تعقل و تفکر اور وجدان سے بہ شرطیکہ توفیق الہیٰ شامل حال ہو۔ البتہ یہ یقین دلانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ "دانایان فرنگ" سے مرعوب ہونا اور کرنا اساتذہ اور کارکنان جامعہ ان بزرگوار کے طلسم کو توڑنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ لوگوں کے دل سے اس خیال باطل کو دور کرنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ مافوق العادۃ قوتیں رکھتے ہیں جن سے ہر شخص کو لرزنا چاہئے لیکن انکے اس کام میں زیادہ رکاوٹ وہ حضرات پیدا کرتے ہیں جو فرنگستان کی طاغوتی سطوت و جبروت کا سکہ مخالفت کے پردے میں لوگوں کے دل پر اس طرح بٹھاتے ہیں جیسے ناعاقبت اندیش دا عظ شیطان کے رعب سے جہلاء کے دلوں کو دہلاتے ہیں یا ناسمجھ کھلائیاں بھوت پریت کے ذکر سے بچوں کو ڈراتی ہیں۔

جناب مدیر کا یہ بھی بڑا احسان ہے کہ انہوں نے جامعہ والوں کو اکبر مرحوم اور اقبال مدظلہ کے کلام کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جامعہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اکبر کے سچے شیدائی ہیں لیکن وہ انکے کلام کو پڑھکر رونے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ خوب ہنستے ہیں اور عبرت و بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اکبر مرحوم نے جامعہ کے ایک اُستاد سے جو اُس زمانہ میں طالبعلم تھے کہا تھا کہ یہاں اگر فلسفہ کے پہاڑ پر چڑھتے ہو تو وہاں پہنچ کر ٹھہر نہ جانا جہاں مذہب نظر سے چھپ جائے بلکہ اس بلندی پر جا کر دم لینا جہاں سے وہ پھر نظر آنے لگے۔ جامعہ والے علوم و فنون کے ساتھ یہی رویہ رکھتے ہیں جس میں انہیں خدائے برتر ضرور کامیابی عطا کریگا۔ اسی طرح اقبال کی شاعری جامعہ کے بہت سے لوگوں کو دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ اسی سے انہیں یہ پیغام ملا ہے کہ "معاشیات" اور "معادیات" کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنا موت کی دلیل ہے اور مسلمانوں کی قوم کو مرنے کی کوئی جلدی نہیں بلکہ اسکا فرض ہے کہ ابھی بہت دن زندہ رہے اور دنیا کو اپنے قلب کی حرارت سے زندہ رکھے۔

ماڈرن ریویو بابتہ ماہ اگست میں ج۔ٹ سنڈرلینڈ صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے امریکہ کے مشاہیر کے اقوال ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید میں نقل کئے ہیں۔ اس کے آخری حصہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل امریکہ کا جذبہ ہمدردی سنہ میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ ان

کے ایوان وکلا نے مندرجۂ ذیل تجویز منظور کی تھی اور سینیٹ نے بھی اس کی تائید کی تھی "ایوان وکلا میں قرار پایا کہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ اہل امریکہ کی مرضی کے مطابق اہل ہند کی جدوجہد کا جو وہ حکومت خود اختیاری کے حصول کے لئے کر رہے ہیں بلا مداخلت اس طرح اعتراف کرے جس سے انہیں آزاد ہونے میں مدد ملے۔"

خدا جانے امریکہ کی پارلیمنٹ کی سب تجاویز ہندوستان کی انجمنوں کی طرح محض گرمیٔ محفل کے لئے پاس کیجاتی ہیں یا اسی تجویز کی یہ خصوصیت ہے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو اب تک اس کی تعمیل کی کوئی علامات نظر نہیں آئیں۔ انہوں نے اگر دیکھا ہے تو یہ دیکھا ہے کہ امریکہ کی ایک خاتون نے "مادر ہند" جیسی ناپاک کتاب لکھ ہمارے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساری دنیا میں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے ایوان وکلا اس کتاب کے خلاف بھی طوفان خطابت اٹھانے میں بخل نہ کرے۔

جس طرح ہندوستان میں یورپ کے پڑھے ہوئے لوگ باستثنائے چند قابل مضحکہ سمجھے جاتے ہیں اسی طرح چین میں بھی چینی طلبہ ساختۂ یورپ تفنن طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ صاحبزادے اپنے ساتھ محض مغرب والوں کی خفیف الحرکاتی اور سطحی باتیں لاتے ہیں جنہوں نے فرانس میں تعلیم پائی ہے وہ کیا لائے ہیں ہاتھ پیر کو جھلا نا گندے مُحکانا اور چند بالذت گناہ۔ جو جرمنی سے آئے ہیں انکا مبلغ کمال بر شراب، فوجی رعب داب اور منڈا ہوا سر ہے۔ انگلستان سے آنے والوں کو ایک آنکھ کا چشمہ تو نہیں لیکن حرف کی کڑی آواز اور آدھی زنانہ آدھی عالمانہ شان ہاتھ آئی ہے۔ امریکہ سے لوٹے ہوئے طلبہ سب سے زیادہ چلاتے ہیں اور اشتہار و اشاعت مقابلہ کی دعوت اور چلتے ہوئے فقروں کی فکر میں رہا کرتے ہیں۔ ان کی امریکی تیز روی محض اعصابی بے چینی کا نتیجہ ہے اور ان کی حمایت نسواں کی حد یہ ہے کہ عورتیں سر پر چھوٹے بال رکھیں، کوتاہ قبائیں پہنیں اور نئے نئے ناچ سیکھیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں یہ مرض کم ہوتا جاتا ہے۔ جانے کو تو بہت سے لائق اور نالائق طلبہ

ہر سال یورپ جاتے ہیں لیکن وہاں سے واپس آکر ان میں سے کم یورپ کے طرز معاشرت کے اتنے دلدادہ ہوتے ہیں جتنے بظاہر چین کے نوجوان ہیں۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سہ ماہی رسالے نے اپنے آخری نمبر میں سوسائٹی کے سالانہ جلسہ کی رپورٹ شائع کی ہے جو ۱۲ اپریل ۱۹۲۶ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۵ء میں سوسائٹی کی آمدنی تقریباً ۳۲۰۰ پاؤنڈ اور مصارف ۳۰۰۰ پاؤنڈ تھے۔ پورے سال میں سوسائٹی کی طرف سے ۷ لکچر ہوئے جس میں پروفیسر نکلسن کا مضمون "تیرھویں صدی میں ایرانی زندگی اور شاعری" اور پادری گریہم بیلی صاحب کا مضمون "ہندی شعرا اور شاعری بیسویں صدی میں" خاص طور رقابل ذکر ہیں۔ تین کتابیں سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئیں جن میں مسز بیورج کی کتاب "گلبدن بیگم کی سوانحعمری اور یادگار رحالات" اور حریری کی "الحریری" بھی ہیں دو کتابیں زیر طبع ہیں جس میں ایک ڈاکٹر گیسٹر کا ترجمہ الاساطیر ہے اور دو کتابیں اشاعت کے لئے قبول کر لی گئی ہیں جو مصارف مہیا ہونے پر فوراً طبع کی جائیں گی۔

سونے کا تمغہ جو پبلک اسکول کے لئے مخصوص ہے ناٹنگھم ہائی اسکول کے طالب علم کیتھہ آڈم کو ان کے مضمون "لارڈ کرزن کا عہد حکومت بحیثیت وائسرائے ہند" کے صلہ میں دیا گیا۔

عہدوں کے بغیر تبدیل کے سلسلہ میں یہ بات دلچسپ ہے کہ پروفیسر مارگولیتھ کا زمانہ نائب صدارت ختم ہوگیا اور انکا انتخاب عہدہ ڈائرکٹر کے لئے کیا گیا۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی ایک کامیاب جماعت ہے اور انگریزوں میں خالص علمی مذاق کی کسادبازاری دیکھتے ہوئے اس کا معیار فضیلت غنیمت ہے۔ لیکن پروفیسر مارگولیتھ کے سے متعصب لوگوں کے وجود کے سبب سے مسلمانوں کو بلکہ ہر قوم کے ارباب علم کو اس کی طرف سے ایک گونہ بےاعتباری ہے خصوصاً اب جب کہ مارگولیتھ صاحب اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے ہیں یہ بےاعتباری اور بڑھ جائیگی۔ کاش لوگوں کو یہ احساس پیدا ہو کہ علمی کام کرنے والوں پر بارگاہ علم سے یہ ذمہ داری عاید کی گئی ہے کہ وہ کسی مصلحت اور کسی وجہ سے بھی

چھپائی سے منہ نہ موڑیں۔

جامعہ کی اردو اکادمی نے جن کتابوں کی اشاعت کا اعلان کیا تھا ان میں سے بعض وقت پر شائع نہ ہو سکیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دہلی میں اچھے کاتب کم ہیں اور جو ہیں وہ اتنے مشغول رہتے ہیں کہ متعدد کتابوں کی لکھائی ساتھ ساتھ ناممکن ہے کوشش کی جا رہی ہے کہ دوسرے مقامات سے اچھے خطاط مہیا کئے جائیں انشاء اللہ جلد کامیابی ہو گی اور اردو اکادمی اس کام کو جو اس نے اپنے ذمہ لیا ہے سرانجام دے سکیگی۔

اگر بجائے پتھر کے چھپائی کے لوہے کے ٹائپ کی چھپائی ہمارے ملک میں رائج ہو جائے تو یہ دقتیں جاتی رہیں۔ جامعہ ملیہ کے مطبع میں ٹائپ کی چھپائی کا بہترین سامان موجود ہے لیکن اس خیال سے کہ یہ چھپائی لوگوں کو مرغوب نہیں ہم اپنی کتابیں ابتک اتنی تکلیف دہ طریقہ سے چھپواتے ہیں بعض لوگوں کی رائے ہے کہ رسالہ جامعہ اقتصاداً ٹائپ میں چھپوایا جائے۔ ہم قارئین کرام سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ہمارا رسالہ اس ٹائپ میں چھپے جس میں البلاغ کلکتہ کا ایک حصہ چھپتا ہے تو وہ پسند فرمائیں گے یا نہیں۔

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سے

زیر نگرانی محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

باہتمام سید کرامت اللہ پرنٹر و پبلشر شائع ہوا

کتبہ ایس ایم نصیر

Mohamed Ali Khan Bahadur
I.C.S.
Mohamed Ali Khan

جامعہ

جلد ۹	ماہ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۲۷ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

فلسفۂ خودی

ترجمہ دیباچہ اسرارِ خودی انگریزی ایڈیشن

"یہ مسئلہ کہ علم (تجربہ) محدود مراکز سے حاصل ہوتا ہے اور ہمیشہ لفظ "یہ" کے محدود جامہ میں ملبوس ہوتا ہے آخر میں جا کر ناقابلِ تشریح ہو جاتا ہے" یہ پروفیسر براڈلے کے الفاظ ہیں۔ لیکن جب وہ ان ناقابلِ تشریح مراکزِ علم سے آگے بڑھتا ہے، تو اس کو ایک وحدت نظر آتی ہے، جس کا نام وہ "مطلق" رکھتا ہے، اور جس میں تمام محدود مراکزِ علم اپنی محدودیت کو کھو دیتے ہیں۔ اس بنا پر اس کی رائے میں محدود مرکز محض ایک ظاہری شکل ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت کا ثبوت ہمہ گیری ہے (یعنی حقیقت وہی ہے جو کل کو محیط ہے[1]) اور چونکہ تمام محدودیت اضافی ہوتی ہے، لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ موخر الذکر محض فریبِ نظر ہے۔ میرے خیال میں (تجربہ) کا یہ ناقابلِ توجیہ محدود مرکز کائنات کی حقیقت اساسی ہے۔ تمام زندگی انفرادی ہے۔ حیاتِ کلی کا کہیں وجود نہیں۔ خدا خود ایک فرد ہے اور وہ سب افراد میں یکتا و بے مثل ہے[2]۔ کائنات بقول میکٹیگرٹ افراد کی ایک انجمن ہے۔ اس میں ہم اپنی طرف سے یہ اضافہ کرتے ہیں کہ جو نظم و ترتیب ہم اس میں پاتے ہیں وہ ازلی نہیں ہے۔ اور نہ بذات خود مکمل ہے۔ بلکہ یہ ہماری جبلی اور شاعرانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہم رفتہ رفتہ فساد سے کون کی طرف جا رہے ہیں اور اس کے حصول میں ہم خود ہی معین ہیں۔ اس انجمن کے ارکان معین نہیں۔ ہمیشہ نئے نئے رکن وجود میں آتے اور اس عظیم الشان کام میں تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح کائنات کا فعل ابھی تکمیل تک نہیں پہنچا ہے۔ ابھی اس کی تکوین جاری ہے۔ لہٰذا کائنات کے متعلق کوئی کلی تصدیق نہیں قائم کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ (کائنات) ابھی "کل" کی حیثیت نہیں رکھتی۔ عمل تخلیق جاری ہے۔ اور انسان بھی اس میں بقدر اس کے حصہ لیتا ہے کہ وہ کم سے کم فساد کے ایک حصہ میں کون قائم کرنے

---

[1] بریڈلے غالباً ہیگل کے اثر سے فرد کی حقیقت کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فرد کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتا۔ بلکہ وجودِ مطلق کا ایک جزو ہے۔ علامہ اقبال اس خیال کے سختی سے مخالف ہیں۔

[2] امام احمد حنبل کا یہی خیال تھا لیکن انتہائی شدت کے ساتھ۔

میں امداد کرتا ہے۔ قرآن کی اس آیت سے کہ تبارک اللہ احسن الخالقین ؎ خدا کے سوا اور خالقوں کا امکان ظاہر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کا یہ تصور فلسفہ ہیگل کے جدید انگریز شارحین و تصوف وحدۃ الوجود کی تمام اقسام کی مخالف ہے۔ کیونکہ انکی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا آخری نصب العین اور اس کی نجات اس میں ہے کہ اپنے آپکو کائنات کی زندگی میں فنا کر دے۔ ہمارے خیال میں انسان کا مذہبی اور اخلاقی نصب العین نفی خودی نہیں ہے بلکہ اثبات خودی ہے اور جوں جوں اسکی انفرادیت اور یکتائی بڑھتی جاتی ہے وہ اس نصب العین کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے تخلقوا باخلاق اللہ۔ یعنی اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرو۔ اس طرح انسان جس قدر اس یکتا ترین ذات (یعنی خدا) سے مماثلت حاصل کرتا ہے اسی قدر وہ بے مثل و یکتا ہوتا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حیات کیا ہے؟ حیات انفرادی ہے اور اس کی اعلیٰ شکل "انا" (یعنی خودی) ہے جس کا فرد ایک واحد اور مستقل مرکز ہوتا ہے۔ انسان جسمانی نیز روحانی حیثیت سے غیر مشترک اور کافی بالذات مرکز ہے۔ لیکن وہ ابھی کامل فرد نہیں ہوا ہے جس قدر اس کو خدا سے بعد ہوتا ہے، اسی قدر اسکی انفرادیت کم ہوتی ہے۔ کامل ترین انسان وہی ہے جو اقرب الی اللہ ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقرب الی اللہ خدا میں فنا ہوجاتا ہے۔ برخلاف اس کے خود خدا کو وہ اپنے اندر جذب کرلیتا ہے ؎۔ حقیقی انسان نہ صرف اس مادی دنیا کو اپنے میں جذب کرلیتا ہے۔ بلکہ اس کو مسخر کرکے خود خدا کو اپنے "انا" میں جذب کرلیتا ہے۔ حیات ایک آگے بڑھنی والی جاذبہ حرکت ہے

؎ مولانا رومی نے اس خیال کو بہت واضح کیا ہے۔ بچپن کے زمانہ میں ایک مرتبہ نبی صلعم جنگل میں غائب ہوگئے حضرت حلیمہ سعدیہ مارے غم کے آپے سے باہر ہوگئیں۔ جب آپ جنگل میں ادہر ادہر سرگرداں حضور صلعم کی تلاش میں پھر رہی تھیں، تو غیب سے ندا آئی: "رنج مت کرو وہ گم نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ساری دنیا اسمیں گم ہوجائیگی"۔
حقیقی انسان دنیا میں گم نہیں ہوسکتا۔ دنیا اس کے اندر گم ہوجاتی ہے۔ میں اس سے ایک قدم آگے جاتا ہوں اور یہ اضافہ کرتا ہوں ؎

در ضمایش مرضی حق گم شود　　این سخن کے باور مردم بود

اس مضمون کے متعلق سرمد کا شعر بھی خوب ہے۔ ؎ ملا گوید کہ بر فلک شد احمد + سرمد گوید فلک به احمد در شد

اس کو جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ان کو جذب کر لیتی ہے اور اس طرح اپنا راستہ ہمیشہ صاف رکھتی ہے۔ اس کی ماہیت یہ ہے کہ وہ مسلسل خیالات اور خواہشات کی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اپنی توسیع اور ارتقا کے لئے اُس نے کچھ آلات مثلاً حواس و ذہن وغیرہ کے ایجاد، یا بذریعہ ارتقا پیدا، کر لئے ہیں جو اسکو رکاوٹوں کے جذب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔[۵۱]

زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یعنی نیچر (فطرت) ہے لیکن نیچر شر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کو قوائے باطنی کے اظہار کے لائق بناتی ہے۔ "انا" کو آزادی اسوقت نصیب ہوتی ہے جب اس کے راستہ سے تمام رکاوٹیں دور ہوجائیں۔ یہ کچھ تو مختار ہے اور کچھ مجبور۔ (حدیث: سچا ایمان جبر و اختیار کے بین بین ہے) اور کامل آزادی اس ذات واحد کی قربت سے حاصل ہوتی ہے، جو سب سے زیادہ آزاد ہے یعنی خدا۔ مختصر یہ کہ حیات عبارت ہے آزادی کی جدوجہد سے۔

خودی "انا" اور تسلسل شخصیت

انسان میں مرکز حیات "انا" یا خودی شخص ہے۔ شخصیت اطناب[۵۲] کی ایک حالت ہے اور اسکا تسلسل اس حالت کے قیام سے وابستہ ہے۔ اگر اطناب کی حالت قائم نہ رہے تو استرخا[۵۳] پیدا ہوجاتا ہے۔ چونکہ خودی (شخصیت) یا حالت اطناب انسان کی سب سے گراں قدر کامیابی ہے، لہٰذا اس کو خبردار رہنا چاہئے کہ پھر استرخا کی کیفیت اس پر طاری نہ ہوجائے۔ جو چیز کشیدگی کی حالت کو قائم رکھنے میں معین ہوتی ہے، وہی ہمارے غیر فانی ہونے کا موجب ہوتی ہے۔ اس طرح شخصیت کا تصور ہمارے سامنے قدر و قیمت کا ایک معیار پیش کرتا ہے۔ اس سے خیر و شر کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ جو چیزیں خودی کو مستحکم کرتی ہیں وہ خیر ہیں اور جو اس کو کمزور کرنے والی ہیں وہ شر۔ آرٹ[۵۴]۔ مذہب۔ اور اخلاقیات[۵۵] پر خودی ہی کے نقطۂ نظر سے رائے قائم کرنی

---

۵۱ آرزو صید مقاصد را کمند + دفتر افعال را شیرازہ بند

۵۲ اطناب (Tension) کا ترجمہ ہے اس سے مراد ہے نفس کی وہ حالت جب اسے خودی کا احساس قوی ہو

۵۳ استرخا (Relaxation) کا ترجمہ ہے۔ اس سے مراد ہے نفس کی وہ حالت جب اس میں یہ احساس کمزور ہو

۵۴ تو جہاز سکر او مسموم گشت + خفت و از ذوق عمل محروم گشت

۵۵ آن شنیدستی کہ در عہد قدیم + گوسفندان در علف زارے مقیم

چاہئے [۵۱] افلاطون پر جو میرے اعتراضات [۵۲] ہیں، وہ دراصل ان تمام فلسفیانہ نظامات پر وارد ہوتے ہیں جو زندگی کو چھوڑ کر موت کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں جن میں زندگی کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بجائے اس کو (مادے کو) مسخر کرنیکے اس سے بھاگنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

جس طرح "انا" کی آزادی کے مسئلہ میں مادہ کا عقدہ پیش آتا ہے۔ اسی طرح غیر فانیت کے سلسلہ میں وقت کا سوال پیدا ہوتا ہے [۵۳] برگسان نے ہمیں یہ بتلایا ہے کہ وقت کوئی غیر محدود خط (خط مفہوم مکانی) نہیں جس سے ہم سبھوں کو خواستہ ناخواستہ گزرنا ضروری ہے۔ یہ تصور مخلوط و مزدوج وقت کا ہے (وقت کا ایک ناپاک تصور ہے) خالص وقت کوئی طول نہیں رکھتا۔ شخصی لافانیت ایک آرزو ہے۔ تم اگر کوشش کرو تو اُسے حاصل کر سکتے ہو۔ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اس زندگی میں خیال و عمل کے وہ طریقے اختیار کریں، جو اطناب کی حالت کو قائم رکھنے میں معین ہوں۔ بودھ مذہب عجمی تصوف اور اس قبیل کے دوسرے نظامات اخلاقی ہماری غرض پوری نہیں کر سکتے لیکن یہ کلیتاً بیکار بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک مدت دراز کی سعی و عمل کے بعد ہم کو کچھ دیر کے لئے خواب آور دواؤں کی حاجت پڑ ہی جاتی ہے۔ اس قسم کے اعمال و افکار گویا ایام زندگی کی راتیں ہیں۔ پس اگر ہمارے اعمال اطناب کی حالت کو قائم رکھنے کے لئے ہوں تو اغلب یہ ہے کہ مرگ کے صدمے سے اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ مرنیکے بعد استرخا کا ایک زمانہ آتا ہے جیساکہ قرآن میں برزخ یا درمیانی حالت کا ذکر آیا ہے۔ یہ زمانہ حشر تک رہے گا اس سکون استرخا

---

۵۱ "عربی شاعری پر نبی صلعم کے اعتراضات" کے زیر عنوان ۱۹۱۶ء نیرنگ خیال میں صفحہ ۲۰۱ پر علامہ اقبال تحریر فرماتے ہیں :۔ انسانی جد و جہد کا آخری مقصد حیات ہے (جس سے مراد ایک شاندار، طاقتور اور کثیر العمل زندگی ہے) تمام انسانی آرٹ اسی آخری مقصد کے ماتحت ہونے چاہئیں اور ہر شے کی قیمت اس کی حیات بخش قوت کے لحاظ سے معین ہونی چاہئے۔ اعلیٰ ترین آرٹ وہ ہے جو ہماری خفتہ قوت عمل کو بیدار کر دے اور ہمکو زندگی کے مشکلات سے مردانہ وار مقابلہ کرنیکے لائق بنا دے۔ جو چیز خواب آور ہے اور ہم کو گرد و پیش کی اس حقیقت سے غافل کر دینے والی ہے جس کے مسخر کر لینے پر انحصار زندگی ہے، وہ زوال اور موت کا پیغام ہے۔ آرٹ میں افیون نوشی نہ ہونی چاہئے "تحصیل فن بغرض فن" کا اصول وہ انحطاط اور پستی کی ایجاد ہے، جو ہمکو فریب میں لا کر قوت و حیات سے بے بہرہ کر دینا چاہتی ہے۔

۵۲ راہب اول افلاطون حکیم + از گروہ گوسفندان قدیم الخ ۵۳ سبز بادا خاک پاک شافعی + عالمے سرخوش ز تاک شافعی الخ

کی حالت کے بعد صرف وہی "انا"، باقی رہیں گے، جو موجودہ زندگی میں بہت محتاط رہی ہیں۔ اگرچہ ارتقاء حیات میں تکرار و اعادہ کا گزر نہیں تاہم بقول وِلڈن کار، برگسان کے اصول کے مطابق حشر اجساد بھی بالکل ممکن ہے۔ وقت کو لمحوں میں تقسیم کر کے ہم اسمیں مکان کا مفہوم پیدا کر دیتے ہیں اور تب اس کی تسخیر ہمکو مشکل معلوم ہوتی ہے۔ وقت کی حقیقی نوعیت ہم کو اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب ہم اپنے عمیق تر خودی پر غائر نظر ڈالتے ہیں۔[۱] حقیقی وقت خود زندگی ہے، جو بقاء دوام حاصل کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اُس مخصوص حالت اضطراب کو قائم رکھے، جس کو اس نے تا ایں دم قائم رکھا ہے۔ ہم وقت کے محکوم اسوقت تک بنے ہیں، جبتک ہم وقت کو ایک مکانی چیز سمجھتے ہیں۔ مکانی وقت ایک زنجیر ہے جس کو زندگی نے اپنے واسطے اس غرض سے اختراع کر لیا ہے، کہ موجودہ ماحول کو جذب کر سکے۔ حقیقتہً ہم وقت کی پابندی سے آزاد ہیں۔ اور وقت سے بےقیدی کا احساس (علم) ہمکو اس زندگی میں بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ احساس بالمکاشفہ محض عارضی ہوگا۔

خودی کی تربیت

خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔[۲] یہ لفظ (عشق) بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور اس سے مراد خواہش جذب و تسخیر ہے۔ اسکی اعلیٰ ترین شکل تخلیق قدور و مقاصد اور اُنکے حصول کی سعی ہے عشق، عاشق و معشوق، دونوں کو منفرد کر دیتا ہے (خدا کی) بےمثل و یکتا ترین ذات کے وصل (حصول) کی کوشش، طاقت کو شخص (منفرد) بناتی ہے۔ اور ضمناً یہ مفہوم مطلوب کی فردیت پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ کوئی اور چیز طالب کی فطرت کو تسکین نہیں دیسکتی۔

جس طرح عشق سے خودی مستحکم ہوتی ہے، اُس طرح سوال سے وہ ضعیف ہوتی ہے۔[۳] ہر وہ چیز جو بغیر ذاتی کوشش کے حاصل ہو سوال ہے۔ ایک دولتمند آدمی کا لڑکا جو اپنے والدین کی دولت ورثہ

---

۱ اے اسیر دوش و فردا در نگر، در دل خود عالمے دیگر نگر
۲ نقطہ نورے کہ نام او خودی ست، زیر خاک ما شرار زندگی ست الخ
۳ اے فراہم کردہ از شیراں خراج، گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج الخ

میں حاصل کرتا ہے۔ وہ بھی سائل ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی، جو دوسروں کے خیالات کو اپنے خیالات بناتا ہے۔ پس خودی کو مستحکم کرنے کے لئے ہم کو چاہئے کہ عشق (یا عمل جاذبہ کی قوت) پیدا کریں۔ اور ہر قسم کے سوال یا فقدانِ عمل سے بچیں۔ نبی صلعم کی حیات مبارک سے کم از کم ایک مسلم کو تو عمل جاذبہ کا سبق مل ہی سکتا ہے۔

مثنوی کے کسی دوسرے حصہ میں میں نے اشارتاً اسلامی اخلاقیات کے عام اصول بیان کئے ہیں۔ اور شخصیت کے تصور کے سلسلہ میں انکے معنی سمجھانیکی کوشش کی ہے۔ خودی کو بے مثل دکھیا ہونیکے لئے تین مراحل طے کرنا پڑتے ہیں:۔

(۱) اطاعت قانون۔

(۲) ضبطِ نفس[۱]، جو احساس نفس و خودی کا آخری مرتبہ ہے۔

(۳) نیابت الٰہی[۲]۔

نیابت الٰہی اس دنیا میں ارتقاء انسانی کی تیسری اور آخری منزل ہے۔ نائب حق خلیفۃ اللہ علی الارض ہے۔ یہ کامل ترین "انا" ہے جو بنی نوع انسان کا نصب العین، اور زندگی کی روحانی و جسمانی معراج[۳] ہے۔ اس کے اندر ہماری حیات نفسی کے تمام انتشارات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ ترین قوت اس میں اعلیٰ ترین علم سے متحد ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں خیال و عمل۔ اور عقل و جیلت ایک ہوتے ہیں۔ وہ نخل انسانیت کا ثمر آخریں ہے۔ اور بار ارتقاء حیات کی تمام صعوبتیں اور تلخیاں اس لئے گوارا ہو سکتی ہیں کہ انکا آخری انجام اسکی شکل میں ظاہر ہونیوالا ہے۔ بنی نوع انسان کا وہ حقیقی حکمراں ہے۔ اس کی حکومت، حکومت اللہ فی الارض ہے۔ وہ اپنی فطرت کے خزانے سے دوسروں کو زندگی کی دولت عطا کرتا ہے اور انکو اپنے قریب تر لاتا جا رہا ہے۔ جس قدر ہم منازل ارتقاء طے کرتے جاتے ہیں اسی قدر اسکے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے تقرب سے میزان حیات میں اپنے آپ کو بلند تر

---

[۱] نفس تو مثل شتر خود پرور است ÷ خود پرست و خود سوار و خود سر است [۲] گر شتربانی جہاں بانی کنی ÷ زیب سر تاج سلیمانی کنی

[۳] انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ۔ تا خدائے کعبہ بنوازد ترا ÷ شرح انی جاعلٌ سازد ترا۔

کرتے جارہے ہیں۔ نوع انسانی کا ذہنی و جسمانی دونوں حیثیتوں سے ترقی یافتہ ہونا اس کی آمد کا ایک لازمی مقدمہ ہے۔ فی الحال وہ محض خیالی ہے۔ لیکن ارتقا مانسانی ایک آئیڈیل قوم کے وجود میں آنے کی خبر دے رہا ہے جس کے افراد کم و بیش ایسے بے مثل و یکتا ہونگے جن میں اس نائب حق کے والدین ہونیکی صلاحیت ہوگی پس حکومت اللہ علی الارض سے مراد وہ جمہوریت ہے جس کے افراد کم و بیش یکتا ہونگے، اور جس کا صدر وہ یکتا ترین فرد ہوگا جس کا امکان اس دنیا میں ہو سکتا ہے نیٹشے کو اس آئیڈیل قوم کی ایک جھلک نظر آئی، مگر اس کی دہریت اور امارت پسندی نے اس کے سارے فلسفہ کو مسخ کر دیا۔

مترجمہ ارشاد الحق صاحب بی اے

عرب فرانسیسی ادبیات میں

رولان کا گیت

(۴)

پادری تُرپان نے جب رولان اور اولیوئے کی تو تو میں میں سنی تو انکے پاس آیا اور خدا کا واسطہ دیکے کہنے لگا "خدا کے لیے رحم کرو، اب جھگڑا کرنے کا وقت نہیں، اگر تم اپنا نرسنگھا بجا بھی دو گے تو کیا اپنی جانیں بچا سکتے ہو، بس اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ شارل واپس آکے ہمارا بدلہ لیگا اور عرب خوش وخرم اپنے گھروں کو نہیں لوٹنے پائیں گے ہمارے بھائی فرانسیسی ہماری تجہیز وتکفین کریں گے، ہمارے لئے روئیں گے اور ہماری لاشوں کو ماتم کرتے ہوئے فرانس واپس لے جائیں گے ہمیں کلیساؤں میں دفن کرینگے، اس طرح ہمارے شہیدوں کو بھیڑئے اور سور نہیں کھا پائیں گے۔

یہ کہہ کر نرسنگھا ہونٹوں پر رکھا اور اس زور سے بجایا کہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا، پہاڑیوں اور آس پاس کی وادیوں میں آواز گونج اٹھی، یہانتک کہ شارل نے ۳۰ کوس کے فاصلہ پر رولان کے نرسنگھے کی آواز سنی، شارل اور اس کے ساتھیوں میں یوں باتیں شروع ہوئیں۔

شارل۔ یہ آواز مجھے رولان کے نرسنگھے کی معلوم ہوتی ہے، شاید اس پر کچھ مصیبت پڑی ہے اور وہ ہمیں واپس بلانا چاہتا ہے۔

گینلون۔ نہیں یہ صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے، آپ بوڑھے ہوئے لیکن بچپنے کی باتیں ابھی تک نہیں گئیں آپ رولان کو اچھی طرح جانتے ہیں، وہ بڑا مغرور آدمی ہے، آپ کے کہے بغیر اس نے عربوں کو شکستیں دیکر نوبل تک مٹا دیا۔ کبھی وہ ایک خالی خرگوش کے لئے دن دن بھر نرسنگھا بجایا کرتا ہے، آج بھی میرے خیال میں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہے، بھلا عرب اس سے لڑنے کی کیا ہمت کرینگے؟ آسمان کے تلے اسکا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ آپ گھوڑے پر سوار ہوجیے، وہم میں نہ پڑیے، یہاں بیکار ٹھہرنے سے کیا فائدہ

اب ہم اپنے بزرگوں کے وطن کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔

رولان بڑی دیر تک نرسنگھا بجاتا رہا، یہاں تک کہ وہ ٹوٹ گیا، شارل نے پھر دوبارہ نواب نائم سے مخاطب ہو کر کہا۔

شارل۔ سنتے ہو کیسی لمبی سانس سے کوئی آدمی نرسنگھا بجا رہا ہے،

نائم۔ معلوم ہوتا ہے ہمارا کوئی بہادر مصیبت میں ہے، میں یقین سے کہتا ہوں کہ ضرور ہمارے آدمی ہمیں واپس مدد کے لئے بلا رہے ہیں۔ جو آپ سے اس کام میں سستی کرنے کو کہے وہ آپ کو دغا دیتا ہے۔ آپ فوج کو مسلح کرا کے جواب میں اپنے فوجی نرسنگھے بجوائے، آپ سنتے ہیں، میں تو سمجھتا ہوں یہ رولان ہے جو ان ایڈیوں میں دم توڑ رہا ہے۔

شارل نے فوج کے سارے نرسنگھے بجوانے کا حکم دے دیا۔ آپس میں سب لوگ کہنے لگے "معلوم ہمارے آدمی کیسی مصیبت میں ہیں، رولان زندہ ملیگا کہ نہیں، اگر زندہ ملا تو اسی کے ساتھ ذرا عربوں پر تلواروں کے دو دو ہاتھ چلائینگے بعضوں کی آنکھیں رنج میں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی ہیں، شارل نے دغاباز گینلون کو حراست میں قید کرا دیا ہے[۱]۔ بگون اس پر متعین ہے۔ اس نے گینلون کو باورچی خانہ کے نوکروں کے ساتھ رکھا ہے جو ہر وقت اسے اس کی دغابازی کی سزا میں چھیڑتے رہتے ہیں کبھی داڑھی نوچتے ہیں، کبھی مونچھیں اکھیڑتے ہیں، کبھی گھونسے مارتے ہیں اور کبھی ریچھ کی طرح اس کی گردن میں زنجیر ڈال کے ادھر اُدھر گھماتے ہیں۔

۱۔ گینلون کی دغابازی اور اسے حراست میں دئے جانے کا مضمون ایکدم یہاں سے شروع کر دیا گیا ہے، اس کی قصورواری کا کوئی ثبوت ہے اور نہ کوئی تفصیل، منطقیانہ تسلسل کا اسی لئے غالباً لحاظ نہیں رکھا گیا کہ مفصل واقعات سب کو معلوم ہوں گے، ان گیتوں کا یہ مقصد نہیں کہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو بلکہ یہ گیت انہیں روایتوں کو منظوم شکل میں قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں جنہیں ہر ایک جانتا ہے اور جو بچہ بچہ کی زبان پر ہیں ان روایتوں کو پھیلانے والا کون تھی! اس سوال کے جواب میں قطعیت کیساتھ صرف کلیسا کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جس نے اپنی تمام قوتیں عربوں کے خلاف فرانسیسیوں کی نئی قوم کو ابھارنے میں صرف کیں۔

شارل اپنے ساتھیوں کے ساتھ غصہ اور رنج میں بھرا ہوا رولان کی مدد کو واپس جا رہا ہے، پہاڑ، ٹیلے اور وادیاں طے کر رہا ہے، ہر کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہا ہے، ہر شخص دعائیں مانگ رہا ہے کہ اے یا اللہ! رولان کو اس وقت تک جیتا جاگتا رکھیو جب تک کہ وہ اس کی مدد کو اس کے پاس نہ پہنچ جائیں، ہر بہادر عربوں کو ہلاک کرنے کا عہد کر رہا ہے۔

رولان بیچارہ پہاڑوں اور میدانوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا ہے، جدھر دیکھتا ہے اپنے ساتھیوں کی لاشیں دکھائی پڑتی ہیں، لاشوں کو دیکھکر وہ یوں کہتا ہے۔

"پیارے ساتھیو! خدا تمہاری روحوں کو بہشت میں جگہ دے، پاک پھولوں میں تمہیں لٹائے بھلا تم جیسے وفادار ساتھی کہاں ملیں گے؟ تم نے ہمیشہ میری مدد کی اور تمہاری مدد ہی کے بھروسہ پر میں نے شارل کے لئے سیکڑوں ملک فتح کر ڈالے، واقعی تم سب کو فرانس کی پیاری زمین سے محبت تھی، میں تمہیں دم توڑتے دیکھتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا، ہائے کیسی بے بسی ہے؟ پیارے بھائی اولیویئے! میں تم سے کبھی دغا نہ دوں گا، اگر کسی نے مجھے جان سے مارا تو تمہارے غم میں جان دے دوں گا۔ دوستو! بڑھے چلو ایک دفعہ اور میرے کہنے پر دشمنوں کو نیزوں پہ دھر لو"

رولان ہر طرف اپنی تلوار دور نداں چلا رہا ہے، ملادروں والی پوپی اور عربوں کے چیدہ چیدہ چنے ہوئے بہادروں کو آن کی آن میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ دنیا میں کبھی کوئی ایسا بھرپور بدلہ نہ لے گا جیسے شکاری کتے کے آگے جنگلی ہرن بھاگتے پھرتے ہیں، وہی حالت عربوں کے سورماؤں کی رولان کے سامنے ہی۔ بھلا کوئی بہادر ہو تو ایسا تو ہو، جو گھوڑے پر مسلح ہو کر چڑھے اور اتنا بھی نہ کر سکے تو اس کی قیمت چار دینار کے برابر بھی نہیں، بہتر ہے کہ وہ خانقاہ میں بیٹھکر ہمارے گناہوں کی معافی مانگا کرے اور عبادت کیا کرے۔[۱۵]

---

[۱۵] ازمنہ وسطی کا بہادر اگرچہ کٹر مذہبی ہے لیکن اس کے نزدیک زہد و عبادت کا پیشہ نکمے اور بیکار لوگوں کے لئے ہی جو میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے کے ناقابل ہو وہ خانقاہ میں بیٹھکر اللہ اللہ کرے خیال بہت خوب ہی مسلمانوں کی بہادری کا آئیڈیل بھی یہی ہے کسی مجاہد نے میدان جنگ سے فضیل ابن عیاض کو اسی قسم کی باتیں کہلوا بھجوائی تھیں

بادشاہ مارسیل اپنے گھوڑے گیگنون پر سوار ہے، مہمیز لگاتا ہوا اپنے گھوڑے کو فرانسیسیوں پر چڑھانے لا رہا ہے۔ بیدن والی دیجوں پر حملہ کرتا ہے اور اس کی ڈھال اپنی تلوار کے وار سے کاٹ کے اس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے، اس کے بعد یوق اور آوار، جیرارا اور روستون اس کے ہاتھ سے شہید ہو تے ہیں۔ رولان نے جو یہ دیکھا تو اس طرح سیکڑوں لعنتیں بھیجتا ہوا مارسل کی طرف بڑھا۔

"خدا تجھے ذلیل کرے، تو نے میرے اتنے ساتھیوں کو شہید کر ڈالا، پیشتر اس کے کہ میں اور تو جدا ہوں تجھ سے ان مقتولوں کی قیمت لوں گا اور تجھے اپنی تلوار کا نام بتاؤں گا۔ یہ کہکر کڑک کے جو مارسیل پہ وار کیا تو اس کا سیدھا ہاتھ شانے سے کٹ کر زمین پر جا پڑا، اس کے بیٹے جرفالو کو اس کے بعد رولان نے قتل کیا۔ یہ دیکھکر سارے عرب چلا اٹھے۔

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری مدد کرو، اے ہمارے دیوتاؤ شارل سے ہمارا بدلہ لو اس نے ہمارے مقابلہ کے لئے ایسے آدمی بھیجے ہیں کہ چاہے ان کی جانیں چلی جائیں لیکن میدان نہیں چھوڑتے" انہیں سے ایک بولا، یار بھاگ چلو، یہ سنتے ہی ساری فوج میں بھگدڑ مچ گئی، اب کوئی کتنا ہی بلانے وہ لوٹنے والے نہیں۔

لیکن عربوں کی اس پسپائی سے ہمارا بہت فائدہ نہیں ہوا، مارسیل کے آدمی بھاگ گئے لیکن اس کا چچا مارگانیس والی کارتھج وحبش ابھی میدان میں موجود ہے، اس کے ساتھ حبشیوں کی فوجیں ہیں انکی ناکیں چوڑی اور کان لمبے لمبے ہیں، وہ کم وبیش پچاس ہزار ہوں گے، وہ سب اپنے گھوڑے فرانسیسیوں کی طرف بڑھاتے ہیں اور پھر کچھ اپنی بولی میں چلا چلا کے کہتے ہیں، رولان نے انہیں آتے دیکھکر اپنی فوج سے یوں کہا۔

رولان۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم سب آج یہاں شہید ہوں گے، ہم میں سے کوئی زندہ واپس نہ جائیگا۔ لعنت ہو اس پر جو اپنے کو سستا نہ بیچے، لڑو، مارو، آج موت اور زندگی کی کشمکش کا تماشہ ہو، دیکھو پیارے فرانس کے نام پر کہیں دھبہ نہ لگنا، جب شارل یہاں پہنچکر دیکھے گا کہ ہم نے عربوں کے ساتھ خوب انصاف کیا ہے اور جب وہ دیکھے گا کہ ہماری ایک لاش کے پہلو میں دشمن کی پندرہ لاشیں ہیں، تو وہ ہم پر رحمتیں بھیجے گا۔

اولیوئے ۔اس پر لعنت ہو جو ذرا سی بھی سستی کرے۔

عربوں نے جب فرانسیسیوں کی تعداد بہت کم دیکھی تو بڑی گھمنڈ میں حملہ کے لئے بڑھے ارگانیس آیا یہ کیت گھوڑے پر سوار تھا، سونے کی ہمیز وں سے اسے آگے بڑھا رہا تھا، اولیوئے کو دیکھکر اس نے بڑی پھرتی سے اس پر وار کیا، اس کی تلوار اولیوئے کے سینہ کے پار ہوگئی، اولیوئے کو گرتا دیکھکر یوں کہنے لگا

"تو نے برا زخم کھایا، تیری بدنصیبی میرے مقابلہ کے لئے تجھے لائی ،شارل نے بیکار تم لوگوں کو پھاٹکوں کی رکھوالی کے لئے یہاں چھوڑا۔"

اولیوئے زخم کھاکر گر پڑا لیکن اس نے پھر ہمت کی اور کھڑا ہوکے ،ارگانیس کو یوں جواب دیا۔

اولیوئے ۔ارے بے دین! تجھ پہ لعنت ،میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ شارل نے کچھ کھویا نہیں، لیکن تو بھی اپنی سلطنت کو صحیح سلامت نہیں واپس جا سکے گا، اور یہ نہ ہوگا کہ تو اپنے دیس میں پہنچکر ہر عورت کے سامنے شیخی بگھار کر تو نے مجھ جیسے بہادر کو مارا ہے۔ یہ کہکے وہ گھوڑے پر سوار ہوکر دشمنوں میں گھس جاتا ہے اور دہتی تلوار چلانا شروع کرتا ہے، اگر کوئی اس وقت بے دینوں کی لاشوں پہ لاشیں گرتے دیکھے تو بول اٹھے کہ ہاں اصل بہادر اسکا نام ہے، پھر اولیوئے بالکل تھک کے رولان کو اپنے پاس بلاتا ہے اور کہتا ہے" دوست میرے قریب آؤ، میرا اب آخری وقت ہے، دو گھڑی میں ہم تم ہمیشہ کے لئے جدا ہوجائینگے۔"

رولان یہ سنکر گھبرا جاتا ہے اور کہتا ہے۔

"ہائے خدایا! اب کیا کروں، پیارے فرانس کے کیسے کیسے بہادر ہمیشہ کے لئے آج رخصت ہورہے ہیں یہ کہہ کے اسے گھوڑے پر غش آگیا۔

رولان کا یہ حال ہے ادہر اولیوئے زخموں سے چور چور ہو رہا ہے، اس کے بدن میں اب خون نام کو بھی باقی نہیں رہا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آرہا ہے، دور نزدیک کی کوئی چیز اسے صاف نہیں دکھائی دیتی اسی حالت میں اس نے رولان کے قریب جاکر اس زور سے اس کے خود پر ہاتھ مارا کہ وہ نیچے ناک کی ہڈی تک دھس گیا۔

رولان ۔کیوں بھائی، میں نے تمہارا کونسا قصور کیا ہے؟

اولیوے۔ معاف کردیں نے جان بوجھکر ایسا نہیں کیا، مجھے اچھی طرح دکھائی نہیں دیتا، بھلا میں نے اپنی تمام عمر میں کوئی بات تمہارے خلاف کی ہے؟

رولان۔ مجھے چوٹ نہیں لگی، میں نے تمہیں یہاں اور خدا کے یہاں معاف کیا،

یہ کہتے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے، اولیوے پر بالکل مردنی چھا چکی تھی، وہ گھوڑے سے اتر کر زمین پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ آسمان کیطرف اٹھائے یوں زور سے دعا مانگنے لگا،

"اے خدا! میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں مجھے اپنی پاک روحوں کیساتھ جنت میں جگہ دے شارل اور رولان کو اپنی رحمت کے سایہ میں رکھ"

اولیوے نے یہ دعا ختم کی اور ساتھ ہی اپنی زندگی کی آخری سانس لی، رولان یہ دیکھکر رونے لگا اور اولیوے کی لاش کے پاس جا کر یوں کہنے لگا۔

"پیارے دوست! ہم تم بچپن سے ساتھ کھیلے، ہماری دونوں کی عمر بالکل ایک تھی، نہ کبھی تم نے مجھے تکلیف پہنچائی اور نہ کبھی میں نے تمہیں دکھ دیا، آج تم مرگئے، میری زندگی اب دنیا میں بے کار ہے" یہ کہکر اسے اپنے گھوڑے پر غش آگیا، سونے کی رکابوں نے اسے زین پر سیدھا رکھا ورنہ وہ قریب تھا کہ گر پڑے، جب ہوش آیا تو سارے فرانسیسیوں کو مرا ہوا پایا، اس کے سب ساتھیوں کو عربوں نے ختم کردیا تھا بس ایک پادری تریان باقی رہ گیا تھا، وہ عربوں کا بڑی دیر سے مقابلہ کر رہا تھا اور برابر وادی کیطرف ہٹتا جا رہا تھا، رولان کو دیکھکر یوں مخاطب ہوا

"اے شریف النفس سردار! اے ہمارے بہادر سورما! تو کہاں ہے؟ میں نے آج تک ڈر کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی ہے کیونکہ تو میرے پاس رہتا تھا میں نے اپنی بہادری سے تیری محبت حاصل کرلی تھی، اب تیا میرا نیزہ بالکل ٹوٹ گیا، میری ڈھال چھلنی ہو چکی، زرہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، اب میں کیا کروں، ہاں میں مرونگا لیکن اپنی جان دشمنوں کے ہاتھ بہت مہنگی بیچوں گا"

تریان یہ باتیں کرتا ہوا گھوڑا بڑھاکے رولان کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے، رولان رنج اور غصہ میں غرق ہے، ایکدم سے دشمن کیطرف جو گھوڑے کو خنجر کرکے بڑھتا ہے تو اٹھائیس عربوں کا خاتمہ کردیتا ہے اور ہر بار کی

تریان سنے اس گئی گذری حالت میں بھی چھ کو قتل کر ڈالا، عربوں نے یہ رنگ دیکھا تو سب مل کر کہنے لگے، دیکھنا کہیں یہ دونوں بچ کے نہ جانے پائیں، اب جو ان پر حملہ نہ کرے وہ دغا باز ہے اور جو انہیں جیتا جانے دے وہ بزدل ہے، ان دونوں کو ہر طرف سے عربوں نے گھیر لیا۔

رولان اور باردری تریان چالیس ہزار عربوں کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں[1] کوئی پشت دکھانے کا نام نہیں لیتا، عربوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ انکے پاس پھٹک تو جائیں، دور ہی دور سے تیر، نیزے اور تلواریں پھینک پھینک کے مار رہے ہیں، تریان کی ڈھال میں چھید ہو گئے ہیں اور اس کے سر کی خود بالکل ٹوٹ گئی ہے، باوجود ہر طرف سے نیزوں اور تلواروں کے حملوں کے اس نے اب تک ہار نہیں مانی، اس کی آنکھیں رولان کو ڈھونڈھ رہی ہیں، اسے دیکھ کر اس کے دل کو ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ لڑتے لڑتے اس کے پاس جا کر اس سے یوں کہتا ہے۔

"میں نے اپنی پیاری تلوار الماس سے ہزاروں کو ٹھنڈا کیا ہے، شارل اب اگر ہمیں مردہ دیکھیگا بھی تو یہ کہیگا کہ ہم نے عربوں کے ساتھ رو رعایت بالکل نہیں برتی۔ وہ دیکھے گا کہ ہزاروں عرب میدان جنگ میں مرے پڑے ہیں اور بہت سے زخمی پڑے ہیں جن کے بدن ہمارے نیزوں سے چھدے ہوئے ہیں ہماری قوم میں جو گیت جائیں گے ان میں یہ سب باتیں بیان کیجائیں گی"

رولان کی حالت لحظہ بہ لحظہ خراب ہوتی جا رہی ہے جس وقت سے اس نے نرسنگھا بجایا ہے اس وقت سے اس کی کنپٹیاں پھٹی جا رہی ہیں، وہ اب تک شارل کا انتظار کر رہا ہے پھر آخری دفعہ زور سے نرسنگھا بجاتا ہے لیکن اس کے بدن میں اب پہلی سی طاقت باقی نہیں۔

شارل نے نرسنگھے کی آواز سنی اور ساتھیوں سے کہا "ہائے ہماری بدنصیبی میرا پیارا بھتیجا رولان آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جس طرح کہ اس نے اس دفعہ نرسنگھا بجایا ہے اس سے

---

[1] فتوح شام میں حضرت خالد کے متعلق جو کہانیاں بیان کی گئی ہیں انمیں بھی اتنا مبالغہ نہیں، وہاں ایک آدمی دس ہزار کے لئے کبھی کبھی ہمت کر جاتا ہے، لیکن یہاں دو فرانسیسی چالیس ہزار عربوں کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب بہت دیر زندہ نہیں رہے گا، چند لمحوں کا اور مہمان معلوم ہوتا ہے، اچھا اب نوج کے سارے بگل اس کے جواب میں بجاؤ۔"

ان بگلوں کی آواز سے نزدیک نزدیک کی سب پہاڑیاں اور وادیاں گونج اٹھیں عربوں نے جب یہ گونجتی ہوئی آواز سنی تو انہیں خیال ہوا کہ شاید شارل پھر دوسری دفعہ ان سے لڑنے کو آرہا ہے، انہیں بڑی پریشانی ہوئی، انہوں نے سوچا کہ اگر رولان زندہ بچ گیا تو شارل سے ٹکر بڑا نقصان پہنچائیگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ بہت جلد رولان کا خاتمہ کر دیا جائے اس کے بعد جو کچھ ہو سو ہو یہ ارادہ کرکے چار سو چیتے ہوئے عرب رولان کے مقابلہ کو نکلے، رولان نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا اور خوب تن کر گھوڑے پر بیٹھ گیا، جب تک وہ زندہ ہے اس وقت تک بھلا ان سب کی اس پر ہاتھ ڈالنے کی کب ہمت ہو سکے گی، اُس نے اپنے گھوڑے ویانیف کو مہمیز لگائی اور عربوں کی طرف بڑھایا، پادری تریان میں ابتک تھوڑی بہت جان باقی تھی ہمت کرکے کھڑا ہوا اور رولان کی مدد کو چلا اور رولان کے پاس جاکر کہنے لگا " شارل اب بالکل قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے بگلوں کی آواز اس دفعہ پہاڑیوں میں بڑے زور سے گونجی ہے۔"

رولان۔ پادری کیطرف دیکھکر، ہم دونوں ملکر عربوں کا مقابلہ آخری وقت تک کرینگے، جو گذرے گی دونوں پر ساتھ گذرے گی، کسی عرب کی بھلا مجال ہے کہ اس وقت تک وہ ہمیں چھو بھی سکے جب تک کہ میں زندہ ہوں، دیکھو ایک دفعہ اور دورنڈال کے جوہر دکھاؤنگا۔

تریان۔ شارل اب آیا ہی چاہتا ہے، وہ ہمارے شہیدوں کا عربوں سے خوب دل کھول کر بدلہ لیگا۔

عربوں میں آپس میں یوں باتیں ہو رہی ہیں "شارل اب نزدیک آن پہنچا، نہ معلوم ہماری کیا گت بنائیگا، ہماری بدنصیبی نہ جانے کیا برے دن دکھائیگی، اسکے نوجی بگلوں کی آواز فضا میں ہر طرف زوروں سے گونج رہی ہے، رولان کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا، کوئی آدمی جس کا بدن گوشت سے بنا ہے لڑنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ لیکن ہمیں چاہئے کہ شارل کے آنے سے پہلے ہی پہلے کسی نہ کسی طرح اسے ختم کر ڈالیں اور پھر میدان چھوڑ چلیں۔"

پے شوویسے کرنے کے سبب روؔلان پر ٹوٹ پڑے، اُسکی ڈھال توڑ ڈالی اور اس کے خود میں بزدل سے چھید کر دئے لیکن ابھی تک اس کے زخم پر کوئی وار نہیں پڑ سکا، تاہم وہ تھوڑا بہت زخمی ضرور ہوگیا تھا اسکا گھوڑا تین زخم کھا کے گر پڑا ہے، گھوڑے کے گرتے ہی جو طیش میں آکے اس نے تلوار چلائی تو عرب بھاگ اٹھے، اسے اپنے گھوڑے ویلنتف کے مرنے کا بہت رنج ہوا، افسوس کہ وہ عربوں کا پیچھا نہیں کرسکتا، وہ تر پان کو مدد دینے کو بڑھتا ہے۔

تر پان نے دیکھا کہ روؔلان اس کی طرف آتے آتے کمزوری سے زمین پر گر پڑا، اُسکا ارادہ ہوا کہ کسی پاس کے چشمہ سے جاکر پانی لائے اور اس پر چھڑکے شاید کسی طرح سے کچھ تسکین پہونچے، وہ یہ ارادہ کرکے اٹھا لیکن چونکہ اس کے بدن سے بہت خون نکل چکا تھا وہ دو قدم بھی نہ چل سکا، اس نے پھر دوسری دفعہ ہمت کی اور پھر زمین پر گر پڑا اور اس دفعہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا، یہ اس کی آخری کوشش تھی، روؔلان کو ہوش آیا تو اس نے تر پان کو مرا پایا، اس کے قریب جاکر لاش سے یوں مخاطب ہوا۔

"اے پاک انسان! تو نے مسیحی دین کی حمایت میں اپنی جان تک کھپا دی، حواریوں کے بعد تو ہی ہے جس نے ہمارے مذہب کی تبلیغ میں ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں تو شارل کے بہادروں میں فرد تھا، تو نے ساری عمر عربوں کے خلاف وعظ کہا اور ان سے جنگ کی، اب خدا تیری روح کو بہشت میں جگہ دے"

روؔلان اچھی طرح سمجھ رہا ہے کہ وہ خود بھی بہت دیر زندہ نہ رہیگا، اس نے اپنے نرسنگھا اور اپنی تلوار درونداں کو اپنے پہلو میں رکھ لیا تاکہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اسے بزدلی کا الزام نہ دے سکے، جہاں

ملہ مسیحی بھاٹ کو روؔلان کی شجاعت بیان کرنے میں اس بات پر اصرار ہے کہ کوئی عرب بہادر اس کا جسم نہیں چھو سکا، ظاہر ہے کہ دشمن جب اسکا بدن چھو بھی نہیں سکے تو اس کو مار کیوں کر سکتے تھے لیکن تھوڑی دیر کے بعد چونکہ اس کی موت کا حال بھی بیان کرنا ہے اس لئے بادل نخواستہ اور بڑی سرسری طور پر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ہاں دشمنوں نے اسے زخمی کردیا، یہ بات بالکل ایسی ہی ہوئی کہ جیسے کوئی کہے کہاں روؔلان کے چند زخم مزدرنگ گئے ہیں لیکن بھلا کسی کی مجال ہے کہ اس کے پاس تو پھٹک سکے، اس قسم کی ہٹ دھرمی اور اپنی بڑائی کو مبالغہ سے بیان کرنا دنیا کے سارے قومی فسانوں میں مشترک ہے۔

یوسف

وہ پڑا ہوا تھا اس کے قریب ایک جھاڑی میں ایک خوبصورت نوجوان عرب کی لاش تھی، یہ عرب اصل میں زندہ تھا، وہ مردہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے رولان کو اس حالت میں دیکھ کر اس کی تلوار اٹھائی اور یوں کہا۔ "شارل کا شہرۂ آفاق بھتیجا ہار مان گیا اس کی تلوار پر اب میں قابض ہوں، اسے اب میں اسپین لے جاؤں گا" یہ لفظ سنتے ہی رولان بے ہوشی سے چونک پڑا اور اس زور سے اس نے اپنا نرسنگھا اس عرب نوجوان کے سر پر مارا کہ اس کا بھیجا اور دونوں آنکھیں نکل پڑیں اور اس کی طرف یوں مخاطب ہوا،

"اے غلام زادے! تیری اور یہ ہمت کہ تو میری تلوار پر قبضہ کرنیکا ارادہ کرے، میری تلوار پر قبضہ کرنا آسان نہیں، چاہے وہ لڑ کر ہو یا دھوکے سے ہو، میرے نرسنگھے کا سارا سونا بکھر گیا۔

رولان میں اتنی طاقت باقی نہیں تھی کہ وہ زیادہ دیر تک اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکے، اس کی آنکھوں کے تلے اندھیرا آ جاتا تھا، اس کے چہرے کا رنگ بالکل فق ہو گیا تھا غصہ میں آ کر سامنے کی چٹان پر تلوار کے دس وار کر ڈالے تاکہ تلوار کسی طرح سے ٹوٹ جائے¹ لیکن دورندال ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی جب اس نے دیکھا کہ وہ ٹوٹتی نہیں تو یوں کہنے لگا۔

"میری پیاری دورندال! تو میری محبوبہ ہے، تیرے قبضہ میں متبرک تعویذ پیوستہ ہیں، بطرس کا ایک پاک دانت ہے، سینٹ باسل کا خون ہے، بی بی مریم کے لباس کا ایک ٹکڑا ہے اور سینٹ ڈینس کا بال ہے یہ ٹھیک نہیں کہ کوئی عرب تجھ پر قبضہ کرے، یہ تو مسیحیوں کا حق ہے کہ وہ تیری خدمت گذاری کریں، خدا کرے ایسی نوبت کبھی نہ آئے کہ کوئی بزدل تجھے اپنے ہاتھ میں لے تجھ ہی سے تو میں نے سیکڑوں ملک فتح کئے۔ تو کیسی خوبصورت چمکدار اور سفید ہے، تو سورج کی روشنی میں ایسی چمکتی ہے کہ دشمنوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں، شارل جب موزین کی وادیوں میں تھا اس وقت خدا نے اپنے فرشتے سے اسے کہلوا بھیجا تھا کہ وہ تجھے میرے حوالہ کرے، تجھ سے میں نے انجو اور برتانی، پیوا تو اور مین، نارمنڈی اور پرووانس، لمبانڈی اور رومانیہ، باویر اور فلانڈر، بورگنڈی اور قسطنطنیہ، اکوس اور انگلستان فتح کئے، اب میرا اور تیرا ساتھ چھوٹتا ہے، خدا فرانس

---

¹ بعض عقیدت مندوں کا خیال ہے کہ یہ چٹان جس پر رولان نے اپنی تلوار توڑنے کی کوشش کی تھی اب تک پیرینیس کے پہاڑی سلسلہ میں رونسیوس کے قریب موجود ہے۔ ذرا سی چٹان پر اس کی تلوار کے نشانات بھی ملتے ہیں۔

کو کبھی یہ ذلت نہ دکھائے کہ وہ کسی عرب کے ہاتھ میں جائے۔"

یہ کہکر رولان ایک سبز جھاڑی پر گر پڑا، اس کی تلوار اور نرسنگھا اس کے پاس رکھے ہوئے تھے وہ سمجھا تھا کہ اب اسکا آخری وقت ہے۔ اس نے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنے سیدھے ہاتھ کا دستانہ آسمان کیطرف اٹھایا، اس آخری وقت میں اُسے بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں، وہ سب ملک جو اس نے اپنے زور بازو سے فتح کئے، اپنے بہادر ساتھی، پیارا فرانس، بادشاہ شارل کی محبت جس نے بچپن سے اس کی پرورش کی، سب کے سب اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں وہ سرد آہیں بھرتا ہے اور پھر اپنے گناہوں کی معافی ان لفظوں میں مانگتا ہے۔

"اے ہمارے سچے باپ! تو نے کبھی جھوٹی بات نہیں کہی، اے وہ جس نے مرنے کے چار دن بعد سینٹ لزار کو زندہ کیا[۱] اور دانیال کو شیر کے منہ سے بچایا[۲]۔ ان سب کے طفیل میں اے خدا میرے سب گناہ بخش دے۔

اسکا سر اسی کے بازوؤں پر گر پڑا، اس نے دم توڑ دیا، آسمان سے میکائیل اور دوسرے فرشتے اس کی روح کو جنت لے گئے۔

شارل رونسیوو پہنچکر رولان کو ہر طرف ڈھونڈتا ہے، قدم قدم پر عربوں اور فرانسیسیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہیں، جب کسی طرف اس نے رولان کو نہیں دیکھا تو یوں چلایا:

پیارے بھتیجے، تو کہاں ہے؟ تُرپان اور اولیوئے کہاں ہیں؟ میرے اور سب ساتھی کہاں ہیں؟ افسوس میں اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے ذرا پہلے کیوں نہ پہنچ گیا"، وہ اپنی داڑھی اس آدمی کی طرح مروڑتا ہے جو بڑے ہی رنج اور سوچ میں ہو۔ اس کے سب ساتھی اسی کے ساتھ رونے لگے ہیں کوئی اپنے بھائی اور کوئی اپنے بیٹے کا ماتم کر رہا ہے، بہت سوں کو تو غش آگیا ہے، نواب نائم جو بڑا سمجھدار اور جہاندیدہ آدمی ہے شارل

---

۱ سینٹ لزار، مارتھا اور مریم کے بھائی ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ نے مرنے کے چار دن بعد معجزہ سے زندہ کیا، انجیل جان (۱۱ - ۱۲)

۲ غالباً سیمالیقی فسانہ کیطرف اشارہ ہے جس میں دانیال کو زنا کا مجرم قرار دیا گیا اور بعد میں وہ بے گناہ ثابت ہوئے

سے یوں کہتا ہے۔

"آسمان پر غبار چھا رہا ہے معلوم ہوتا ہے عربوں میں ہمارے آنے کی خبر پہنچ گئی ہے وہ اب ہم سے دو کوس سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہوں گے۔ اب ہمیں چاہئے کہ مسلح ہو کر اپنے گھوڑوں سے اتر پڑیں دعا مانگیں اور اپنے شہیدوں کا بدلہ لینے کے لئے جلد روانہ ہوں" ان کی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ دعا مانگیں اور اپنے شہیدوں کا بھی کھوج کر دیکھیں، اس کام میں اب دیر بالکل نہیں ہونی چاہئے۔

شارل: افسوس میرے فرانس کے سارے پھول پژمردہ ہو گئے، میرے دوستوں اور سرداروں میں سے کوئی باقی نہیں رہا، اچھا اب ان لاشوں کو جیسا کا تیسا چھوڑ کے عربوں پر حملہ کی تیاری کرنی چاہئے، نزدیک کے ٹیلوں اور پہاڑیوں کو گھیر لینا چاہئے۔

اس نے حکم دیا کہ فوج کے سارے نرسنگھے بجائے جائیں اور سب فوج حملہ کے لئے تیار ہو جائے رات زیادہ جا چکی تھی وہ گھوڑے سے اتر کر ایک جھاڑی کے پاس عبادت میں مشغول ہو گیا اور دعا کی کہ سورج غروب نہ ہو اور دن باقی رہے تاکہ وہ روشنی میں دشمن پر حملہ کر سکیں، ایک فرشتہ آسمان سے اتر کر اس کے پاس آیا، یہ فرشتہ ہمیشہ اس کے پاس آیا کرتا ہے۔ اس نے شارل کو یوں مخاطب کیا:

"اے شارل گھوڑے پر سوار ہو جا، روشنی کی تجھے کمی نہیں ہو گی، تو نے فرانس کے سب پھول کھو دئے تو چاہے تو اس نقصان کا بدلہ لے سکتا ہے۔"

شارل کی خاطر سورج جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا، عرب بری طرح فرانسیسیوں کے سامنے بھاگ رہے تھے، فرانسیسی انہیں دھکیل کے سارا گوس کی وادی تک لے گئے اور وہاں ان پر ہر طرف کا راستہ بند کر دیا، ایک طرف پہاڑ اور فرانسیسی فوجیں تھیں اور دوسری طرف دریائے ایبر تھا کوئی پل موجود تھا اور نہ کوئی کشتی انہوں نے اپنے خداؤں [1] سے بہت التجائیں کیں لیکن کوئی دعا کارگر نہیں ہوئی اس وقت کوئی نہیں جو انہیں اس مصیبت سے بچا سکے، فرانسیسیوں نے چن چن کے سبھوں کو قتل کیا، جو ان کی تلواروں سے بچے وہ دریائے ایبر میں ڈوب ڈوب کے مر گئے۔

---

[1] خداؤں کی ایک ہی رہی۔

جب شارل نے دیکھا کہ سب عرب مرکھپ گئے تو اس نے گھوڑے سے اتر کر خدا کا شکر ادا کیا گھوڑے تھکے ہوئے تھے سب نے زمین آ لی کے انہیں قریب کی چراگاہوں میں چھوڑ دیا، سپاہیوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیے، رات اتنی جا چکی تھی کہ وہ انسیو واپس نہیں جا سکتے تھے، شارل کی ساری سپاہ گھوڑے چھوڑ چھوڑ کے سو گئی۔[1] شارل مسلح ایک چراگاہ کے پاس ایک سبز جھاڑی سے ٹیک لگا کے لیٹ رہا اس نے دانستہ اپنے سر کے خود اور بدن کی زرہ کو اتارا نہیں، وہ رولان کے غم میں ڈوبا ہوا تھا، اس کے دل پر اولیویئے اور تربان کی موت کا بڑا صدمہ تھا کبھی روتا تھا کبھی ٹھنڈی سانس لیتا تھا، کوئی آدمی یا گھوڑا نہیں جو تھکن کی وجہ سے زمین پر دراز نہ ہو گیا ہو اور خراٹے نہ لے رہا ہو شارل کی ذرا دیر کو آنکھ لگی حضرت جبرئیل اس کے سرہانے اس کی حفاظت کو موجود تھے!

شارل نے خواب میں دیکھا کہ بڑے زور کا طوفان آ رہا ہے، آندھی چل رہی ہے، ہر طرف فضا میں شعلے نکل رہے ہیں، پھر اس نے اپنے آدمیوں کو بڑی مصیبت میں دیکھا کبھی ریچھ بھیڑیے اور سانپ اور کبھی شیطانوں کے گروہ انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ حال دیکھ کے اس نے کوشش کی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کو جائے لیکن وہ اس نے اپنے میں اتنی طاقت نہیں پائی کہ ایک قدم بھی اٹھا سکے اس کے بعد اس نے خواب میں ایک گھنا جنگل دیکھا جہاں شیر غصہ میں بھرے ہوئے اس کی طرف جھپٹتے ہیں اس سے اور ان شیروں سے کشتی ہوتی ہے، اسے یہ معلوم نہیں کون جیتتا ہے اور کون ہارتا ہے۔ پھر کیا دیکھتا ہے کہ ایکس میں محل کی سیڑھیوں پر ایک ریچھ زنجیروں میں بندھا ہوا بیٹھا ہے، اردین کی طرف سے تیس اور ریچھوں کو آتے دیکھتا ہے، ہر ریچھ انسان کی بولی بولتا ہے، وہ سب شارل سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

"حضور والا! اس ریچھ کو ہمیں حوالہ کر دیجئے۔ یہ کونسا انصاف ہے کہ آپ اسے قید میں رکھیں۔ وہ ہمارا جد امجد ہے اس کے وجود سے ہم سبھوں کی تسلی ہوتی ہے، اسی اثنا میں اس نے ایک شکاری کتا دیکھا جو محل کی طرف سے دوڑ کر آتا ہے اور سب سے الگ ہری جھاڑی کے پاس سب سے بڑے ریچھ پر حملہ کرتا ہے، شارل ان دونوں کی لڑائی بہت دیر تک دیکھتا رہا اسے کچھ پتہ نہیں لگتا کہ ان دونوں

---

[1] گھوڑے بیچنے کی بجائے ان لوگوں نے گھوڑے چھوڑ دئے ہیں۔

میں کون غالب رہتا ہے ؟ اصل میں یہ خواب حضرت جبرئیل نے شارل کو دکھایا ہے۔

بادشاہ مارسیل سارا گوس بھاگ کر چلا گیا تھا۔ ایک زیتون کے درخت کے سایہ میں وہ اپنے گھوڑے پر سے اترا۔ اپنے ملازموں کو اپنے سر کا خود، زرہ اور تلوار حوالے کی اور ایک جھاڑی کے پاس مکلا مند لیٹ گیا۔ اس کا سیدھا ہاتھ جڑ سے کٹ گیا تھا۔ اس کے بدن سے اتنا خون نکل چکا تھا کہ کمزوری سے وہ بالکل بے ہوش تھا۔ اس کے سامنے اس کی بیوی برامیموند رو رہی تھی اور بڑے زور زور سے چیخیں مار رہی تھی۔ اس کی چیخوں سے عربوں کے دل ہل رہے تھے۔ وہ سب شارل اور اس کی فوج کو کوستے تھے۔ وہ کھسیانی بلی میں اپولو کے بت کی طرف گئے اور اس کی بے عزتی کی اور کہنے لگے

"اے منحوس خدا! تو نے ہماری اس مصیبت میں کوئی مدد نہیں کی۔ تو نے ہماری یہ ذلت کیوں کرائی؟ ہمارے بادشاہ کو کیوں تباہ کرایا؟ جو تیری خدمت کرتے ہیں انہیں کو تو خوار کرتا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اس کے سر سے تاج اتار لیا اور اس کے ہاتھ سے عصا چھین لیا اور اسے الٹا اوندھے منہ زمین پر گرا دیا اور ڈنڈوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بت کو انہوں نے ایک گڑھے میں ڈال دیا جہاں کتے اور سور اسے کچلتے تھے۔

مارسیل کو جب ہوش آیا تو اسے محل کے آراستہ کمرے میں لے گئے۔ رانی برامیموند دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور اپنے بال نوچتی تھی اور کہتی تھی کہ عربوں کے سارے خداؤں نے انہیں دھوکا دیا۔

عنفوانِ شباب کی مجموعی نفسی سیرت

(۲)

آہستہ آہستہ زندگی کا دستور العمل مرتب ہونا۔

اگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ عمل پیشہ کے انتخاب تک محدود ہے تو بڑی غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ یہ کوئی شعوری بات نہیں کہ ہمارا نوجوان ایسا دستور العمل بنائے جسیں سوچ سمجھ کر زندگی کا کوئی مقصد معین کیا گیا ہو یہاں مراد صرف یہ ہے کہ اندرونی نفسی زندگی، فطری رجحانات اور بیرونی دنیا کے اثرات کے تعامل سے ایک خاص سمت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح تہہ کے نیچے نفس کی لاشعوری بھول بھلیاں میں انسان کی سیرت نشوونما پاتی ہے۔

ان سب تغیرات کی بنیاد اس پر ہے کہ نوجوان زندگی سے نئے قسم کا تعلق قائم کرتا ہے۔ بچے کے نزدیک عموماً زندگی غیر مربوط لمحات کی توالی کا نام ہے وہ نت نئے لطف اٹھاتا اور نئی دلچسپیاں پیدا کرتا رہتا ہے اور زندگی کو ایک کل سمجھ کر عمل کرنے کا اُسے کبھی خیال تک نہیں آتا زمانہ اس کی نظر میں نامحدود ہے۔ دلی احساس میں عمر کا کوئی حصہ اتنا طویل نہیں معلوم ہوتا جتنا بارہ برس سے تیرہ برس تک کا زمانہ۔ یہ بھی سبب جاتا ہیں کہ بچہ کو گزرے ہوئے جذبات و احساسات بہت کم یاد رہتے ہیں۔ وہ ابھی مرکز زندگی کے لئے اتنے اہم نہیں ہوتے جتنے آگے چل کر ہوتے ہیں جب بلوغ کا زمانہ قریب آتا ہے تو بہت ہی آہستہ آہستہ مثال کے طور پر یہ نیا احساس پیدا ہوتا جاتا ہے: "تیرے عمل کا موضوع ایک کل ہے۔ تیرا عمل اس کل کا جز ہو جاتا ہے اور کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا یہ خود تیری ذات کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے" خود اپنی زندگی میں تسلسل کو ڈھونڈنے اور گزرے ہوئے زمانے کی یاد کو قائم رکھنے کی جو کوشش نوجوان کرتے ہیں اس کی ایک اہم علامت روزنامچہ ہے۔ اس میں اکثر بچپن کی یاد نمایاں حصہ رکھتی ہے لیکن قدرتی طور پر اس کے مد نظر زیادہ تر آنے والا زمانہ ہوتا ہے نہایت خاموشی کے ساتھ خود بخود ایک نصب العین زندگی بن جاتا ہے۔ مستقبل کی اس تصویر میں ابتدا میں وہ چیز جسے ہم واقعیت کہتے ہیں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ واقعات کے نقطوں کے درمیان جو وسیع

خلو ہوتا ہے اسے خلاق تخیل پر کر دیتا ہے۔ یہ تخیل کا عنصر آئندہ زندگی میں بار بار نمودار ہوتا ہے۔ یہ رفتہ رفتہ واقعات کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس طرح کھوپڑی میں کرتی رفتہ رفتہ سر کی ہڈی بن جاتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے تمدن میں پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے اور اُس کے مختلف شعبے مستقل صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ بلوغ کے قبل کا زمانہ طویل ہوا جاتا ہے۔ خارجی تمدن میں جو پہلے سے ایک صورت اختیار کر چکا ہے جڑ پکڑنا، اُس سے صحیح تعلقات قائم کرنا اس میں اپنی مناسب جگہ ڈھونڈھنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اصل سوال اسکا ہے کہ بہت سی زندگیوں میں سے جنہیں انسان اختیار کر سکتا ہے وہ ایک زندگی اختیار کرے لیکن اس مقصد کی خبر ہمارے نوجوان کو نہیں ہوتی۔ فطرت ہر اس کام کو جسکا تعلق توالد اور تخلیق سے ہی پردہ کے پیچھے کرتی ہے۔ الفریڈ آڈلر نے سچ کہا ہے: "زندگی میں اور انسان کی نشو و نما میں جس قدر پوشیدگی نصب العین حیات کی تعمیر میں برتی جاتی ہے کسی چیز میں نہیں برتی جاتی۔ اس بچوں کے نصب العین کو معلوم کرنے کے لئے جو اعداد و شمار مہیا کئے جاتے ہیں ان سے محض غلط نتائج نکلتے ہیں جن لوگوں کی زندگی کو بچے اپنے لئے مثال قرار دیتے ہیں وہ عموماً بڑے آدمی نہیں ہوتے بلکہ اکثر وہ معمولی آدمی ہوتے ہیں جن سے تعلق خاطر ہو جیسے اپنا چچا یا بھائی کا لڑکا جو سن میں تین برس بڑا ہے"

ہم نوجوانوں کے تخلیقی نصب العین کی حقیقت پر آئندہ باب میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ ریوگر کا مشہور قول بالکل سچ ہے کہ: "اس عمر میں ہر شخص کے پیش نظر اس زندگی کی تصویر ہوتی ہے جسے وہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ تصویر کانٹ کے قطعی امر اخلاقی کی مجرد شکل میں نہیں ہوتی بلکہ خود اپنے نفس کی مکمل صورت چشم تصور میں نظر آتی ہے اور یہ قانون صورت(۱) جس کی تکمیل میں سب اعلیٰ اندرونی قوتیں صرف ہوتی ہیں۔ اندر اور باہر کی رکاوٹوں کے مقابلہ میں قانون عمل بن جاتا ہے۔"

لیکن یہ رکاوٹیں اکثر انحراف، خرابی ملکہ دماغی اور نفسی امراض کا باعث بن جاتی ہیں۔ پیستالوزی کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ انسان اچھا ہے اور اچھائی کرنا چاہتا ہے۔ البتہ آتا ہے کہ وہ اچھائی کے ساتھ

---

(۱) قانون صورت محض بیانی قانون ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی شے کا نشو و نما فطرتاً کیونکر ہوتا ہے۔

(۲) قانون عمل حکمی قانون ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کسی شے کی نشو و نما کیونکر مدد کرنا چاہیے۔

خوشی کا بھی طالب ہو۔ اگر کوئی انسان بُرا ہے تو یقیناً اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے اُسے اُس طرح اچھا نہیں بننے دیا جس طرح وہ چاہتا تھا۔

علمی تحلیل نفس کے اُس مذہب نے جس کا بانی الفریڈ آڈلر ہے نفس کی ان گہرائیوں پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ اگر کسی کو اُس کے نظریہ کے کل حصوں سے اتفاق نہ بھی ہو تو بھی اُس کے بہت سے اہم اور صحیح مشاہدات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آڈلر نے اس بحث کا آغاز عضویاتی پہلو سے کیا ہے اگر کسی عضو میں پیدائشی نقص ہو تو ساری قوت حیات اسی عضو میں جمع ہو جاتی ہے اس طرح نہ صرف کافی بلکہ ضرورت سے زیادہ تلافی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آڈلر بہت تفصیل کے ساتھ نفسی زندگی کے مظاہر کا ذکر کرتا ہے۔ نقص کا احساس انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ (لوگوں کے طعن و تشنیع سے) بچاؤ کا راستہ ڈھونڈھے۔ کیونکہ انسان کی یہ جبلی خواہش کہ وہ نیچا نہ رہے بلکہ اونچا رہے جسے ہم اثبات خودی کی امنگ یا حصول قوت کا ارادہ[1] کہتے ہیں زندگی کی بنیادی جبلت ہے۔ اگر یہ جبلت سیدھے راستہ سے اپنی منزل پر پہنچ جائے تو شخصیت کی تعمیر صحیح بنیاد پر ہوتی ہے لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو بلکہ یہ جبلت کسی وجہ سے دب جائے تو یہ لاشعوری حالت چپکے چپکے کام کرتی رہتی ہے اور اونچا رہنے کے لئے انسان من گھڑت تصورات سے کام لیتا ہے اور کسی دور دراز راستہ سے منزل پر پہنچنا چاہتا ہے۔ یہی من گھڑت تصورات عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ اس سے ہماری سمجھ میں آجائیگا کہ بعض لوگ کیوں زندگی کے بے سرو پا دستور العمل بنایا کرتے ہیں یا اس خبط میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہر شخص اُنکا دشمن ہے اور اُن پر ظلم کرتا ہے یا اعصابی دوروں میں گرفتار رہتے ہیں (یہاں تک کہ اپنی تذلیل کرنے میں بھی انہیں قوت کا مزہ ملتا ہے) اس طرح کی صورتیں اپنی ابتدائی حالت میں روزمرہ زندگی میں بھی پیش آتی ہیں۔ عورتیں غش میں آکر وہ کیفیت حاصل کرنا چاہتی ہیں جو انہیں تصورات سے نہیں حاصل ہوتی۔ وہ جان بوجھ کر غش نہیں کھاتیں لیکن اُنکے نفس کے تحت شعوری حصہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو انہیں اس پر مجبور کرتی ہے کیونکہ وہ سیدھے راستہ سے بہ جبر ہٹا کر ٹیڑھے راستے پر لگا دی گئی ہے۔ بکتی کھانسی (بچوں کا جھوٹ موٹ کھانسنا تاکہ مکتب جانے سے بچ جائیں) کو نفس بالارادہ حفاظت اور اندفاع کی غرض

---

(۱) جرمن ترکیب WillE ZUR MAcHT کا ترجمہ ہے جسے انگریزی میں WILLT.P.WER کہتے ہیں۔

سے پیدا کرتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ آہستہ آہستہ سچ مچ کی کھانسی بن جائے۔ مرض اختناق میں جو اندھاپن اور بہراپن ہو جاتا ہے اُس کی اصل تحت شعوری عالم میں یہ ہے کہ انسان خود سننا اور دیکھنا نہیں چاہتا۔

لیکن اس کتاب میں ہمیں مریضوں کا ذکر کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس قسم کی بالواسطہ محرکات اُس زندگی میں بھی پائی جاتی ہیں جسے ہم معمولی (یعنی صحت کی) زندگی کہتے ہیں اور دو خاص صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ نقص کا احساس خود اپنی تلافی کی صورت پیدا کر لیتا ہے۔ یہ تلافی کبھی کبھی اُسی شعبۂ ذہنی میں ظاہر ہوتی ہے جس میں نقص ہو لیکن اکثر دوسرے شعبوں میں رو سو نے جس کے دل میں آرزوئے زندگی اور محبت کا طوفان موجزن تھا لیکن اس آرزو کے پورا کرنے کی قوت نہ تھی۔ اس کی شاعرانہ تلافی کے لئے لوح قلب پر EMIL کا نقشہ کھینچا جو شخص خود زور و شور سے زندگی کا لطف اٹھاتا ہے وہ فسانے نہیں لکھا کرتا۔ تحقیر کا احساس یعنی اپنے نفس میں نقص کا وہ احساس جو لوگوں کی ناقدری اور بے اعتنائی سے پیدا ہوتا ہے قوائے ذہنی کا رُخ اُس طرف پھیر دیتا ہے جدھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ دل میں جو امنگ اپنے آپ کو منوانے کی ہوتی ہے وہ یا تو سماج (سوسائٹی) کے کسی دوسرے طبقہ کی طرف رجوع کرتی ہے یا اعتراض اور نفی کے جذبہ میں تبدیل ہو جاتی ہے یا انسان کو تنہائی کی زندگی کا لطف اٹھانے پر مائل کر دیتی ہے اُس کی مثال نیٹشے کی زندگی میں ملتی ہے جس کا یہ حال تھا کہ ایک طرف واقعی زندگی کا پیمانہ اُس کے ہاتھ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف وہ اپنی داخلی زندگی کی شراب عالم آشوب میں سرشار ہوتا جاتا تھا[1]۔ نوجوانوں کے نصب العین زندگی کی حیرت انگیز بے اعتدالیوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اُس عمل کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہو جس سے نفس میں فعل کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اس عمر میں اخفا کا مادہ اس قدر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام اعمال کو جو قلب کی گہرائی میں واقع ہوتے ہیں، چھپا لیتا ہے۔ بظاہر جو چیز نوجوانوں میں نظر آتی ہے وہ محض خودسری، مخالفت، ضد اور مردم بیزاری ہے۔ ان خصلتوں کا اُن میں موجود ہونا اس قدر تعجب خیز ہے کہ اس کی توجیہ کے لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ زمانہ کا جبر اور سختی اٹھانے سے اضطراد فخر

---

(۱) جس شخص کی سماج تحقیر کرتی ہو وہ ذہنی خلاقی کے اعلیٰ نمونے پیش کر کے عزت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ زیادہ غرور انسان کو ایسی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کے لئے وہ بالکل مناسب نہیں۔ بہت سی ناکامیاب زندگیوں کا یہی راز ہے۔

اپنے پرانے عقائد، یا اپنے محبوب دوستوں سے جدا کر لئے جانے سے یا مانوس مقامات سے چھڑا لئے جانے سے اُن میں نفی (ہر بات کی مخالفت کرنے کا) مرض پیدا ہوجاتا ہے۔ عالم بیزاری کے جتنے مظاہر نظر آتے ہیں ان سب کی تہہ میں وہی خیال ہوتا ہے جسے الفریڈ آڈلر نے ان الفاظ میں خوب ادا کیا ہے "مجھے ایسا رویہ اختیار کرنا چاہئے کہ آخر میں میدان میرے ہی ہاتھ رہے"۔ کبھی کبھی داخلی کشمکش نوجوانی ہی میں ایسی خراب صورتیں اختیار کر لیتی ہے کہ انسان محض دوسروں کو اذیت پہنچانے کے خیال سے خودکشی تک کر گذرتا ہے مجروح احساس خودی اپنی ذلت کی تلافی اور اپنی عزت کو کسی حد تک دوبارہ قائم کرنے کے لئے ہر تدبیر اختیار کرتا ہے خواہ کچھ ہی انجام کیوں نہ ہو۔

جرمنی کی تحریک شباب میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو کوئی مثبت نصب العین نہیں رکھتے۔ انہیں اس کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے آپ کو بالغ سمجھیں۔ اس لئے انہوں نے وہ راہ اختیار کر لی ہے جو اُن کے لئے کھلی تھی۔ "ہم اب بالغ بننے کی کوشش نہیں کریں گے ہم اپنے آپ کو نابالغ سمجھیں گے اور ہمیشہ سمجھتے رہیں گے"۔ دوسری صورت یہ ہے کہ موجودہ مغربی تمدن کے مطالبات اپنے نوجوانوں سے روز بروز سخت ہوتے جاتے ہیں اس لئے اُنکے نفس نے حفظ ماتقدم شروع کر دیا ہے۔ وہ یہ اعتراف نہیں کرتے کہ وہ اس تمدن میں حصہ لینے کی قوت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنا بچاؤ یہ کہہ کر کرتے ہیں "ہم اس تمدن میں حصہ نہیں لیتے یہ کسی کام کا نہیں ہے"۔ تحریک شباب کا یہ پہلو یعنی زندگی کی کارزار سے منہ چھپانا ہمارے تمدن کی بیماری کی علامت ہے۔ لیکن جیسا ہم آگے چل کر بیان کریں گے اس تحریک میں دوسری قوتیں بھی پنہاں ہیں۔

مختصر یہ کہ عنفوان شباب کی آرزوئیں جو دل میں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ انہیں اگر زمانہ پورا ہونے کا موقع نہ بھی دے۔ تب بھی وہ بے اندازہ قوت کے ساتھ آئندہ زندگی میں باقی رہتی ہیں۔ یہ پوشیدہ محرکات کی شکل میں انسان کے اعمال پر اثر ڈالتی رہتی ہے اور کبھی کبھی ساٹھ برس تک کی عمر میں (جس کی ایک مثال خود مجھے معلوم ہے) زندگی میں دفعتہً انقلاب پیدا کر دیتی ہیں اب خواہ یہ انقلاب نشأۃ ثانیہ (یعنی بلوغ میں جو کمی رہ گئی تھی اُس کا بہت دن کے بعد جا کر پورا ہونا جو ہمیشہ مفید ہوتا ہے) کی صورت میں

ہو یا کسی افسوس ناک حادثہ کی صورت میں جس میں برسوں کے جبر کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور اُس کے ساتھ خود انسان کا طلسم حیات بھی۔

تشکیلِ ذات کے عمل میں جو عنوان شباب میں شروع ہوتا ہے۔ علاوہ نفس کے بیدار ہونے اور آہستہ آہستہ ایک مربوط تحریک زندگی پیدا ہونے کے ایک تیسرا عنصر بھی ہوتا ہے اور ان تینوں کے ملنے سے نئے سازِ حیات کا زیر و بم بنتا ہے۔ تیسرا عنصر یہ ہے کہ جہاں مدرک اپنے نفس کا مشاہدہ شروع کرتا ہے وہاں مدرکات میں بھی اُسے نئی نئی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ خارجی حیثیت سے تو یہ چیزیں ہمیشہ اُس کے ماحول میں موجود تھیں لیکن اُنکی مخصوص ماہیت کے ادراک کے لئے اُس میں کوئی حس نہ تھی۔ اب یہ حس اس طرح پیدا ہو جاتی ہے گویا وہ پھول کا کٹورا جو ابِ غنچہ نفس کو اپنے آغوش میں چھپائے تھا کھل گیا اور اس کی ایک ایک پتی الگ ہو گئی ہے

چیزوں میں انتشار پیدا کرنے یا انکا انتشار سمجھنے کی جو مختلف صلاحیتیں نوجوانوں میں ہیں وہ بچہ میں بھی ہوتی ہے۔ وہ جمالی قدور، علمی قدور اور مذہبی قدر کا احساس رکھتا ہے اور فائدہ، انس اور حکومت کا منشاء سمجھتا ہے لیکن ان قدور سے بچوں اور نوجوانوں کے تعلق میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بچہ یہ شعور نہیں رکھتا کہ یہ زندگی کے شعبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس نکتہ کو فروبل کی باریک بین نظر نے خوب سمجھا تھا۔ چنانچہ اس نے فطرتی ذرائع تعلیم کا تعین اسی حقیقت کی بنیاد پر کیا تھا کہ بچہ کے نفس کی خصوصیت زندگی کی وحدت ہے اُس نے بچوں کو مشغول رکھنے کے لئے ایسے کھیل نکالے جن کی بنا ادراک کے نقطۂ وحدت پر ہے جہاں علم کی صورتیں(۱) جمال کی صورتیں اور فائدہ کی صورتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں کیونکہ خود بچہ اب تک اس ازلی وحدت سے خارج نہیں ہوا ہے جو وہ ماں کیساتھ فطرت کے ساتھ اور صانعِ فطرت کے ساتھ رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے نوجوان کو زندگی کے مختلف شعبوں

---

(۱) صورت سے مراد ہے وہ سانچہ جس میں ذہن انسانی حواسِ خمسہ کے ذریعہ پہونچنے والے حسیات کو ڈھالکر علم بناتا ہے۔

کا احساس کسی اور ہی رنگ میں ہوتا ہے۔ اس احساس میں مدرک کی نفسی کیفیت کا عنصر غالب ہوتا ہے اور مدرک کی واقعی حالت پر بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ بڑی خصوصیت نوجوان کے ادراک و احساس میں یہ ہے کہ یہ احساس اُسے بذاتِ خود اپنے مخصوص انداز میں ہوتا ہے۔ اب خارجی محسوس اشیاء کو وہ بلا چون و چرا جیسی وہ نظر آتی ہیں ویسی تسلیم نہیں کر لیتا بلکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب ان میں وہ اپنے ذاتی احساس سے رنگ آمیزی کرتا ہے۔ اب جا کر اُن پر غور کیا جاتا ہے، انکی قدر کا تعین ہوتا ہے اور وہ واردات نفس کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ اب تک (یعنی بچپن میں) زیادہ سے زیادہ صنعتی کاموں میں ایک خاص طرح کا انہماک تھا لیکن تعین قدر کا وہم و گمان بھی نہ تھا کیونکہ صنعت و حرفت میں تو قدر کا تعین نہیں ہوا کرتا بلکہ انسان پہلے سے مقرر کی ہوئی قدروں کو بلا تنقید مان کر انکے حاصل کرنیکے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ لیکن اب انسان خود قدر کا تعین کرنے لگتا ہے کیونکہ اب وہ اپنا ذاتی ادراک اور اپنی ذاتی قوت حکم رکھتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عنفوان شباب سے پہلے انسان فاعلی حیثیت سے تمدن میں حصہ نہیں لے سکتا۔ بچہ کا تعلق تمدن سے محض انفعالی ہے۔ اگر وہ خود کچھ کرتا ہے تو اُس کی وقعت دوسروں کی نقالی سے زیادہ نہیں۔ وہ خود کسی شعبہ میں کوئی تخلیقی کام نہیں کرتا بلکہ تمدن کو جس طرح وہ موجود ہے اُسی طرح قبول کر لیتا ہے اور اُس میں اپنی پابند فطرت لاشعوری وحدت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ جب اس کے اور کائنات کے درمیان یہ رشتہ وحدت قطع ہو جاتا ہے تو ایک طرف تو اُسے شعبہ ہائے تمدن کی کثرت کا احساس ہونے لگتا ہے اور دوسری طرف وہ خود اس خزانہ میں اپنی حیثیت کے مطابق اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب آغاز ہوتا ہے اپنی صناعی کا، اپنے غور و فکر کا اور اپنے مذہبی احساس کا۔ علاوہ اس کے ہمارا نوجوان موجودہ تمدن کی دولت میں خود بھی کچھ اضافہ کرتا ہے خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اُس کا یہ بدلا ہوا رویہ سب سے زیادہ اقتصادی شعبہ میں نمایاں ہوتا ہے۔ بچے اگر کھاتے پیتے خاندان کے ہوں تو انہیں کبھی اس کی فکر نہیں ہوتی کہ ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوتی ہیں۔ ایک لڑکا جس کے والدین تھیٹر میں تماشہ کرتے اپنے بچپن کے زمانہ میں ایک بار اس سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اُس نے جلد اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ روز شام کو تماشے کے بعد آسمان والے پردے سے ایک دوانی گرا کرتی ہو۔ خود کمانے کی خواہش دل میں پیدا ہونا اور اُس کی باضابطہ کوشش بھی اس بات کی علامت

ہے کہ نفسی شباب شروع ہو گیا۔

لیکن جب شعبہ ہائے تمدن سے یہ تعلقات پیدا ہونے لگتے ہیں تو ساتھ ہی زندگی کی دشواری اور عجب کشاکش بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ابتدا ہی سے آدمی مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق تفکر اور اس مسئلہ پر غور کرنے لگتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو خود اس کی زندگی کی تشکیل میں کہاں تک دخل ہونا چاہئے۔ یہ بات اگر ہوتی بھی ہے تو بہت دن کے بعد اور شاید ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو جان بوجھ کر اپنی تربیت آپ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی میں یہ عمل بلوغ کے بعد بھی سالہا سال تک جاری رہتا ہے۔ نوجوانی کے ابتدائی زمانہ میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں انکے محض ایک جزو کا شعور ہوتا ہے۔ لیکن دشواریوں کا ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے تمدن کے مختلف شعبوں میں وحدت موجود نہیں ہے بلکہ طرح طرح کا تضاد اور کشاکش پائی جاتی ہے۔ چونکہ ذہن خارجی (تمدن) بہت سی شاخوں میں تقسیم ہو گیا ہے اس لئے ہمارے نوجوان کی داخلی ذہنی زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی ابتدا میں کوئی ربط نہیں ہوتا بلکہ اس سن میں ایسے تناقض ہوتے ہیں (اس سے مراد منطقی تناقض نہیں ہے بلکہ اخلاقی تعین قدر کا تناقض) جو ہمیشہ رہ نہیں سکتے اور جن کو پوشیدہ قوت تشکیل سیرت کبھی نہ کبھی ضرور دور کر دیتی ہے۔

آجکل مختلف ذہنی شعبوں کا غیر مربوط ہونا عنفوان شباب کی ایک اہم نفسی خصوصیت سمجھی جاتی ہے اس لئے مناسب ہے کہ ہم نظام نفسی کے ان مختلف پہلوؤں پر جو کہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور کہیں مل جاتے ہیں ایک ایک کر کے غور کریں اور اپنی نفسیات شباب کی تقسیم انہیں کی بنا پر کریں۔ اس سے خود بخود ظاہر ہو جائے گا کہ نمو اس عمر میں کونسا شعبہ ذہنی غلبہ رکھتا ہے۔ آخر میں یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اس غالب شعبہ کی پرورش ایک ایسی چیز سے ہوتی ہے جو نفس کی گہرائیوں میں رہتی ہے اور غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ جوہر ہے جو سیرت کی تشکیل اور عہد شباب کی ذہنی زندگی کی تہذیب کرتا ہے۔

دُوربین

انسان کو عقل و ہوش آنیکے بعد جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ اجرام فلکی اور اُن میں خصوصیت کے ساتھ آفتاب تھا۔ اُس کی روشنی اور گرمی نے اسے وہ رتبہ دیا جو دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھا۔ ایرانیوں نے اسے خدا سمجھا اور یونانیوں نے بھی اسے اپنا سب سے بڑا دیوتا مانا۔ مشرقی ممالک کی صاف آب و ہوا نے اور گرمی کے دنوں میں آسمان کے نیچے بسیرا لینے والوں نے جب نظر اٹھائی تو نیلی چھت پر تاروں کا کھیت دیکھا فطرتی طور پرست، فلسفی اور غور کرنیوالے دماغوں نے مشاہدہ کرنا شروع کیا اور اجرام فلکی کے مختلف قوانین دریافت کئے۔ جو ستارے روز نظر آتے تھے اور زیادہ نمایاں تھے جنکی چالیں آسانی سے دیکھی جاتی تھیں۔ اُنکے نام رکھے گئے۔ اُنکے دور معلوم کئے گئے۔ ان تمام واقعات کو قبل تاریخی واقعات کہہ سکتے ہیں۔ یہانتک کہ سبع سیارہ کس نے کس زمانہ میں اور کہاں دریافت کئے کوئی نہیں بتا سکتا۔ جہالت اور لاعلمی نے ان اقوام میں یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ان تاروں کی چال سے انسان کی تقدیر اور کاموں پر اثر پڑتا ہے۔ موجودہ سائنس باوجود اپنی انتہائی علمی اور غیر مذہبی رویہ کے اس خیال کو ابتک یورپ کے دماغ سے نہ نکال سکا۔ ایشیا والوں کا تو کیا کہنا۔ ابتدا میں علم ہیئت اور اصل نجوم تھا اور آسمان کی سیر صرف اس لئے کیجاتی تھی کہ امرا اور روسا کے زائچہ بنا کر انہیں ٹھگا جائے۔ اُن کی تقدیر بتا کر اُنکے منحوس دنوں کا شمار کیا جائے اور اُس کی روک تھام کے ڈھکوسلے بتائے جائیں۔

ان اجرام فلکی کی خدائی کو تو حضرت ابراہیم نے سب سے پہلے لا احب الآفلین کہکر توڑا۔ اور یہی سب سے پہلے بت تھے جو بغیر تیشہ کے اس خدا پرست کے ہاتھ سے شکست ہوئے۔ مگر عرب میں صابی گروہ زمانہ رسالت تک رہا۔ ہندوستان میں ان سیاروں کی پوجا ہوتی رہی اور آج تک ہوتی ہے۔ یونان کے فلسفیوں نے راز خداوندی کو نہ پہچانا حضرت عمرؓ کی تلوار نے آتشکدۂ ایران کی آتش جمشیدی کو سرد

کیا گروں سے آفتاب و آتش پرستی کو نہیں نکالا۔ جب ایرانی مسلمان ہونے لگے تو اگرچہ عقیدہ چھوڑ بیٹھے تھے مگر دل سے کے اثرات کا کیا کرتے اسلامی ادبیات میں ایسا ہی اثر شامل ہوا جس طرح یہودیت میں موجود ہے اور جب اسلامی قانون کے مطابق نجوم اور آئندہ کے واقعات کی پیشین گوئی ممنوع قرار پائی تو اب علم ہیئت کی طرف توجہ کی چنانچہ خلیفہ مامون کے زمانہ میں عرب کے ریگستانوں میں سب سے پہلے زمین کے نصف دائرے کے ناپنے کی کوشش کی۔ ایک درجہ کو میلوں میں[1] ناپنے کا سب سے پہلا کام مسلمانوں کے ہاتھ انجام پایا۔ اُس وقت کے آلات کا پتہ اس وقت ہم کو نہیں لگتا۔ اصطرلاب نے علم ہیئت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ یہی علوم اور یہی آلات تھے جن کی مدد سے عرب تمام دنیا کے سمندروں پر حکمرانی کرتے تھے۔ جس طرح آج "برطانیہ سمندروں پر حکومت کرتی ہے" ایک زمانہ مسلمانوں کی حکومت کا گزر چکا ہے۔ ریاضی اور ہیئت مسلمانوں کے مشاغل میں شاعری کے بعد سب سے زیادہ دلچسپ مشاغل تھے مگر جہاں تک حالات سے علم ہوتا ہے دوربین سولہویں صدی کی ایجاد ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے اقبال کا آفتاب مغرب میں ڈوبنا شروع ہو گیا تھا۔

گیلیلو پیزا PISA میں ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۱۰ء میں پہلی دوربین ایجاد کی۔ جو نظام بطلیموسی کہ زمین کل کائنات کا مرکز ہے۔ آج تک مسلم مانا جا رہا تھا وہ کوپرنکس نے باطل ٹھہرا دیا۔ اُس کے شاگرد ٹائیکو براہی TYCHOBVQHE نے یورپ میں اس خیال کو پھیلایا۔ اس اصول کے مطابق نظام شمسی میں مرکز آفتاب کو ٹھہرایا۔ اور زمین کو جو صدر کی جگہ دی گئی تھی وہ چھین گئی بلکہ زہرہ مشتری وغیرہ کی طرح ایک سیارہ تسلیم ہوئی اور سیارہ بھی ایسا جو اکثر سیاروں سے چھوٹا۔ چاند کو سیارے کے درجہ سے گرا کر قمر[2] کا درجہ ملا گیلیو نے جب ان قوانین کی تعلیم دی تو بھلا پادریوں کی جماعت کو کب برداشت ہو سکتی تھی انہوں نے اپنے محکمہ احتساب کی زد میں لا کر اسے سزا دی اور اس سے توبہ کرائی کہ وہ اس طرح کا کفر نہ بکے کہ زمین گردش

---

[1] موجودہ صحیح آلات سے پھر اس زاویہ کو ناپا ہے مگر مامون کے زمانہ کے ناپ سے بہت کم فرق نکلتا ہے۔

[2] سیارہ تو وہ ہے جو کسی قائم ستارہ کے گرد چکر لگائے۔ جسے انگریزی میں PLANET کہتے ہیں اور جو اجرام فلکی سیاروں کے گرد گھومیں انہیں SATELLITE کہتے ہیں۔ اور اب اصطلاح میں انہیں قمر کہتے ہیں جیسے اقمار مشتری یعنی وہ اجرام جو مشتری کے گرد گھومتے ہیں۔

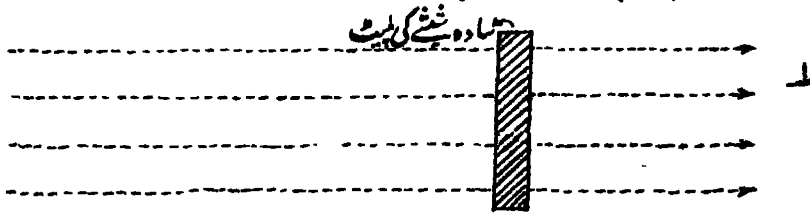
کرتی ہے اپنی جہالت کو بعض جھوٹے مذہبی پیشواؤں نے مذہب کی آڑ لیکر چھپایا ہے اور چونکہ عوام کا طبقہ انکے ساتھ ہوتا ہے اس لئے انہیں فی الجملہ اقتدار رہتا ہے اور جن حقائق کو نہیں سمجھ سکتے اُسے کفر کہکر اپنے مریدوں میں سرخرو رہنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ انکا یہ انجھر چلا اور گلیلیو نے توبہ کی مگر حق کا اثر ایسا نہ تھا جو زائل ہو جاتا اور اس نے دوربین کی ایجاد کی کہ اجرام فلکی کو بغور دیکھ سکے۔ اور اس کے نظریہ کو مشاہدہ کر کے مسلم مانیں۔ اندلس کی فتح نے یورپ پر بڑا احسان کیا تھا۔ اور یوروپ اُس احسان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔ موجودہ شان و شوکت اگرچہ یورپ کو بھلادے کہ اُس پر علمی احسان کرنیوالے کون تھے اور اُس نو دولت احسان فراموش کی طرح ہو جائے جو اپنے اس بے مایہ محسن کو بھول جائے جس نے اپنی ثروت کے زمانہ میں اس شخص کو کس مپرسی کی حالت سے ہاتھ پڑا کر گرنے سے بچایا تھا۔ مگر اہل انصاف جب کبھی تاریخ لکھینگے یہ ناممکن ہے کہ مسلمانوں کا تذکرہ نہ کریں۔ چنانچہ آپ کسی علم المرایا (Optics) کی کتاب کو دیکھئے اندلسی مسلمان الہیثم کا نام ضرور ملے گا۔ گویا کتاب اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جبتک اس شخص لافانی کا نام نہ آجائے۔ مگر چونکہ ہمکو اس وقت مسلمانوں کی یا الہیثم کی تاریخ لکھنی نہیں ہے بلکہ دوربین کے متعلق لکھنا ہے اس لئے ہم یہاں صرف اس قدر لکھکر اکتفا کرتے ہیں کہ جو قوانین الہیثم نے دسویں صدی میں دریافت کرلئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے نیوٹن نے اصول لاسلکی (وائرلیس) دریافت کرلئے تھے مگر عملی شکل میں مارکونی نے اُسے آلات کی شکل میں بنایا اسی طرح الہیثم کے اصول کو دوربین میں تبدیل کرنا گلیلیو کا کام تھا جو مارکونی کی طرح اطالوی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم دوربین کی ساخت کو بیان کریں تھوڑا سا ذکر انسان کی آنکھ کی ساخت کا بتانا ضروری سمجھتے ہیں انسان کی آنکھ میں ایک تپلی یا قزحیہ ہے جو خود بخود روشنی کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے کم زیادہ ہوتی رہتی ہے جب روشنی تیز ہوتی ہے تو یہ تپلی سکڑ جاتی ہے کہ زیادہ روشنی آنکھ میں نہ داخل ہو سکے۔ جب روشنی کم ہوتی ہے تو پھیل جاتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ یہ روشنی کو آنکھ میں داخل ہونے دے فوٹو کے کیمرہ میں اسی اصول پر Shutter بناتے ہیں اس کے علاوہ ایک عدسہ ہے جسکی شکل ایسی ہوتی ہے۔ اس عدسہ میں یہ بھی قابلیت ہے کہ دور و نزدیک کی چیز دیکھنے کے لئے

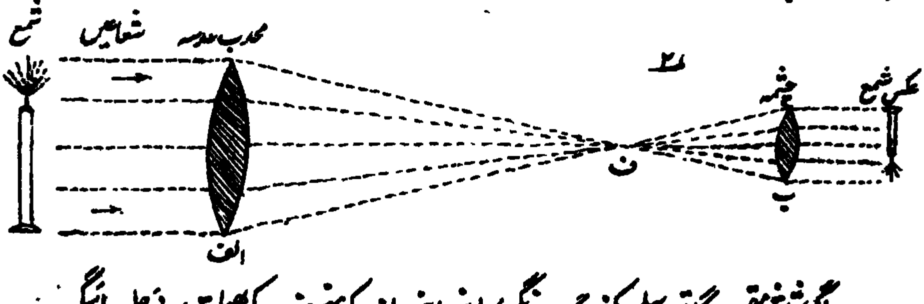
یہ خود بخود ہوتا اور پتلا ہوتا رہتا ہے کہ اُس کا فوکس (ماسکہ) قائم ہوجائے کیمرہ میں ہاتھ سے آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ یہ خود بخود ہوتا جاتا ہے۔

یہی اصول دوربین میں ہے کہ اول تو زیادہ سے زیادہ روشنی دوربین میں داخل ہوکر ہماری آنکھ میں پہونچے۔ مگر ہماری آنکھ کا عدسہ (منہ تو) تو زیادہ سے زیادہ ایک انچ کا ½ حصہ کھل سکتا ہے اور اسی قدر روشنی فراہم کرسکتا ہے۔ اس لئے ہم نے دوربین سے فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ دوربین میں اس قدر روشنی داخل ہوگی جس قدر بڑا اُسکا عدسہ منظر Objective Lense ہوگا۔

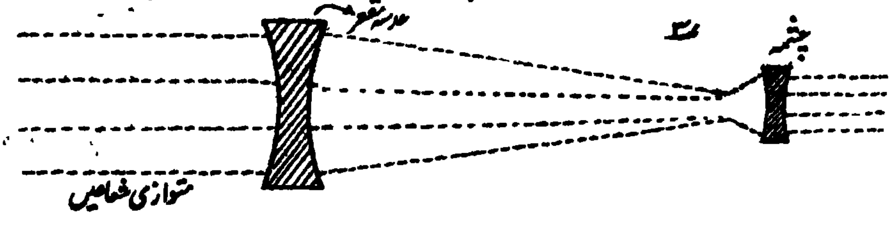
اب یہاں ہم دو قسم کے عدسوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر روشنی شیشے کی ایسی پلیٹ میں گذرے جس کی سطح بالکل ہموار ہو تو شعاعیں سب برابر سے گذر جائینگی دیکھو شکل نمرا



مگر جب آئینہ کی سطح محدب ہو یا مقعر ہو تو وہ کسی طرح سیدھی نہ جائینگی بلکہ ایک طرف سے تو متوازی آئے گی اور پھر سب مرکز پر جمع ہوکر دوسری طرف منحرف ہوکر نکلے گی۔ دیکھو ذیل کی اشکال



اگر شیشہ مقعر ہوگا تو پہلے مرکز پر جمع ہونگی پھر اپنی اپنی جانب کو منحرف ہوکر پھیلتی ہوئی چلی جائینگی۔



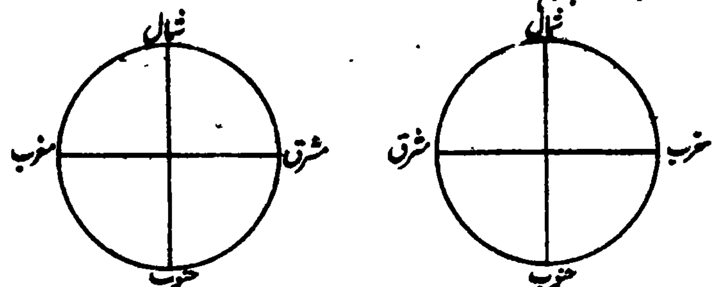
ان دو اصولوں کے سمجھنے کے بعد ہم دوربین کے اصول کو بیان کرتے ہیں۔

دوربین میں ایک لمبی پیتل کی نالی میں ایک شیشہ الف جو اصطلاح میں محدب عدسہ کہلاتا ہے لگا جاتا ہے اس کے دائرہ پر دوربین کی طاقت منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر بڑا شیشہ ہوگا اسی قدر بڑے رقبے پر روشنی پڑے گی۔ اور چونکہ یہ محدب ہے اس لئے وہ سب روشنی ایک مرکز پر جمع ہوکر دوسری جانب نکلیگی۔ جس فاصلہ پر یہ روشنی ایک نقطے کی شکل میں پڑتی ہے اسے مقام فوکس یا ماسکہ کہتے ہیں آتشی شیشہ سے لوگ کپڑا جلا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ روشنی اور حرارت جو پورے آتشی شیشہ پر پڑکر ایک نقطہ پر جمع ہوتی وہ بحالت مجموعی اس قدر تیز ہوجاتی ہے کہ کپڑا ویسے دھوپ میں نہیں جلتا مگر جس وقت اس فوکس کے سامنے آتا ہے تو فوراً جل جاتا ہے۔ جب روشنی نقطہ ف یعنی فوکس تک آگئی تو چونکہ وہ ایک نقطہ پر ہوتی ہے اس لئے ہم کسی جسم کا مشاہدہ ایک چھوٹے سے نقطے کے سوا نہیں کرسکتے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اس نقطہ کو ذرا اور بڑھالیں جس کے واسطے دوسرا شیشہ جسے چشمہ کہتے ہیں لگا کر ان شعاعوں کو جو اب تک منحرف تھیں اب پھر متوازی ہوگئیں اور اب ہمکو منظر نہایت واضح اور صاف نظر آنے لگا۔ محدب شیشہ کو آپ نے دیکھ لیا کہ کس طرح اس میں روشنی ایک طرف سے آتی ہے اور منحرف ہوکر شیشے کی دوسری جانب برآمد ہوتی ہے۔ اسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو چیز دیکھی جاتی ہے وہ الٹی نظر آتی ہے (دیکھو شکل نمبر۲) دوربین کو ہاتھ سے گھٹا بڑھا کر ہم اس فوکس کو ٹھیک بجاتے ہیں تاکہ روشنی چشمہ پر متوازی اور ہموار پڑے۔

اب جب کسی ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں تو الف شیشہ اپنی تمام روشنی کو جو ستارہ سے متوازی خطوط میں آرہی ہے جمع کردیتا ہے اور یہاں سے منظر الٹا نظر آئے گا یہاں تک کہ یہ ب شیشہ پر پہنچکر پھر آنکھ پر پڑا اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس قدر روشنی الف پر پڑی تھی وہ اگر منتشر ہوتی تو ہم کو ایک چھوٹی سی چیز ہی نظر آتی کیونکہ اس کا ایک چھوٹا سا جزو ہی ہماری آنکھ پر پڑتا۔ مگر اب یہ سب جمع ہوکر ب کے رقبہ پر تقسیم ہوگئی۔ اور ب کا رقبہ ایسا ہے جس کی تمام شعاعوں کو ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلی دوربین جو گلیلو نے بنائی وہ صرف تین گنی طاقت کی تھی۔ پھر آٹھ گنی طاقت کی بنی۔ اس کے بعد ترقی ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ امریکہ میں

مونٹ ولسن رصدگاہ پر جو دوربین ہے اُسکا شیشہ تقریباً پونے تین گز کے قطر کا ہے۔ صرف شیشہ کی قیمت کئی لاکھ روپیہ آئی ہے۔ دوربین کا وزن ۶۰ ٹن کا ہے۔ مگر ایسی بڑی جسیم اور وزنی چیز کو ہلانیکے اور ٹھیک کسی ستارہ کی سمت جمانیکے آلات اسقدر نازک اور صحیح ہیں کہ ایک آدمی اسے بآسانی جس ستارہ کی طرف چاہے لگا سکتا ہے۔ اُس کے زاویہ ثانیہ اور ثالثہ تک کے معلوم کر سکتا ہے۔ حسب ضرورت تمام فرش کو مع دوربین اونچا نیچا کر سکتا ہے۔ چاند جسکا فاصلہ زمین سے دو لاکھ ۴۰ ہزار میل کے قریب ہے وہ صرف ایک میل کے فاصلہ پر نظر آتا ہے۔

شکل نمبر ۱ میں ہم دیکھ چکے ہیں دوربین میں روشنی منحرف بالمقابل ہو جاتی ہے یعنی منظر الٹا نظر آتا ہے اس کے ذریعہ سے ہم کسی چیز کو دیکھیں تو سر نیچا اور ٹانگیں اوپر نظر آتی ہیں۔ مگر ستاروں کے دیکھنے کے لئے اسمیں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ صرف یہ فرق رکھتے ہیں کہ اگر ہم شمال اوپر کی جانب رکھیں تو بجائے بائیں ہاتھ کے مغرب رکھنے کے مشرق رکھیں گے اور مشرق کو بائیں ہاتھ پر رکھیں گے۔ زمین پر اسکا بالکل برعکس ہوگا جو شکل نمبر سے ظاہر ہوگا۔

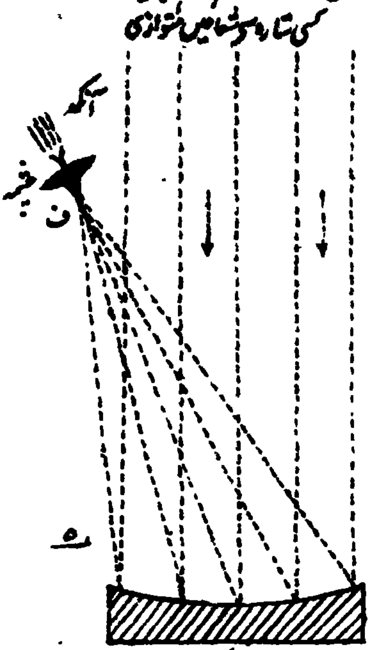


اس قسم کی دوربین میں روشنی براہ راست آتی ہے اور اسے منعطفہ کہتے ہیں Refractor

جن لوگوں نے دوربینوں سے دیکھا ہے انہیں معلوم ہوگا دوربین کو دیکھنا کس قدر تھکانے والا کام ہے۔ بالخصوص جبکہ رات رات بھر نظر جمائے گردن اونچی کئے کسی ستارہ کو دیکھنا منظور ہو۔ اس لئے فکر ہوئی کہ کسی طرح نیچے کی طرف دیکھکر ہم کو ستارہ نظر آنے لگے۔ چنانچہ دوسری قسم کی دوربین جسے منعکسہ Reflector کہتے ہیں۔ سر ولیم ہرشل نے ایجاد کی۔

منعطفہ میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ منظر عدسہ بہت بڑا ہونا چاہیے تھا اور بڑا شیشہ بنانیکی قیمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اُس کی ادائیگی تقریباً ناممکن ہو گئی تھی

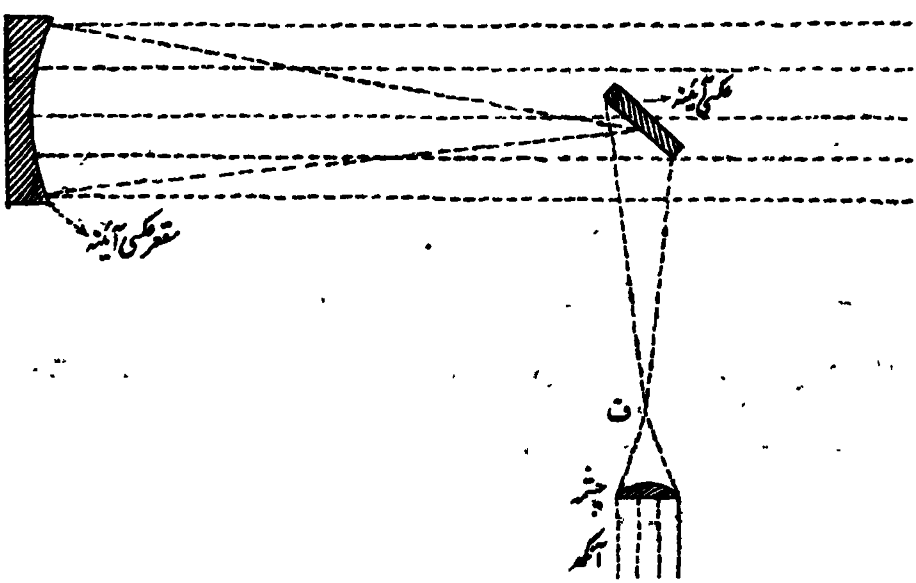
چنانچہ سرولیم ہرشل نے بھی اصول پر یہ دوربین منعکسہ بنائی وہ اس نقشہ سے ظاہر ہوجائیں گے۔ اس



ایک مقعر عکسی آئینہ

اس اصول سے بڑے شیشے کی ضرورت بھی جاتی رہی روشنی ایک بڑی لمبی نلکی کے ذریعہ رصدگاہ میں داخل ہوتی اسی نلکی کے آخر میں مقعر عکسی آئینہ لگا ہے جو روشنی کی شعاعوں کو جمع کرکے ترچھا کرکے اور اپنا فوکس ایک نقطہ پر جا دیتا ہے۔ یہاں پر دوسرے قطعے کے ذریعہ یہ پھر متوازی شکل میں شعاعیں چلتی ہیں اور آنکھ پر اثر کرتی ہیں۔

گلیلو کے زمانے سے اس وقت تک کئی شکلیں بدلیں۔ سب سے ابتدائی اور پہلی شکل تو نمبر ۲ ہے اور اب بھی بڑی دوربین اسی اصول پر مبنی ہیں۔ دوسری دوربین جو زیادہ تر مروج ہے منعکسہ ہے جس کا اصول شکل نمبر سے ہوگا ایک تو نوٹین کے نام سے مشہور ہے۔ جسے نیوٹن نے بنایا تھا۔ اسمیں ایک عکسی آئینہ اور ایک گوشہ شیشہ کے ذریعہ روشنی کو جمع کیا تھا۔ اسکا اصول ذیل کی شکل سے واضح ہوگا۔



ان دونوں شکلوں سے واضح ہوگا۔ انمیں اصولاً کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ نیوٹن کی دوربین اور ہرشل کی دوربین کا تقریباً اصول ایک ہی ہے۔

یہاں تک تو خاص خاص اصول دوربینوں کی ساخت کے ہم نے بیان کئے۔ اب رصدگاہ میں انکے طریقہ استعمال کی بنا پر مختلف نام ہیں۔ مثلاً ہم چاہتے ہیں کہ جرم فلکی کو اس طرح دیکھیں کہ کم سے کم بارہ گھنٹے تک اسے مسلسل دیکھتے رہیں تاکہ اس کی مختلف کیفیات اور اس پر جو کچھ مناظر ہیں وہ ہمیں نظر آتے رہیں۔ اسی دوربین کو اس طرح اس جرم پر جماتے ہیں کہ وہ نظر آئے اور رصدگاہ میں بجلی کی موٹروں سے اس دوربین کی رفتار کو بالکل اس طرح صحت کیساتھ متحرک کرتے ہیں کہ زمین کی گردش کا کچھ اثر نہیں ہوتا جیسے جیسے زمین گردش کرتی ہے دوربین بھی زمین کی حرکت کے خلاف سمت حرکت کرتی ہے اور اس جرم فلکی کو اپنے حد نگاہ سے باہر نہیں جانے دیتی۔ اس دوربین کو اصطلاح میں Equatorial یا استوائی کہتے ہیں۔ بڑی دوربینوں میں منعطف قسم ہی سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ اور اس کی مدد سے چاند وغیرہ کے تو ایسے صحیح نقشے بنائے گئے ہیں جیسے خود زمین کے اور دیگر ستاروں سیاروں کے حالات بھی بہت سے معلوم ہوگئے ہیں۔

طریقہ استعمال کی اصول پر دوسری دوربین Transit Instrument کہلاتی ہے۔ یہ دوربین اکثر چھوٹی ہوتی ہے۔ اسکا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی جرم کے کسی خاص مقام پر پہنچنے کا صحیح وقت بتا دے۔ مثلاً گہن کے وقت ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کس وقت گہن لگنا شروع ہوا ہے اور کتنی دیر میں گہن ختم ہوگیا۔ اس وقت استوائی کے برخلاف اس دوربین کو ایک جگہ جمادینگے اور اس جرم کو دیکھینگے کہ وہ دوربین کی زد میں کس وقت آیا اور کس وقت نکل گیا۔

اس دوربین میں سب سے زیادہ قیمتی چیز شیشہ نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے اور جس جگہ دو لکیریں صلیب کی طرح ملتی ہیں وہاں ایک نہایت باریک نقطہ ہوتا ہے۔ یہ نقطہ نہایت صحت کے ساتھ صحیح میں جمایا جاتا ہے اور اس سے مختلف ستاروں اور سیاروں کے زاویہ ناپ کر ایک جدول کی شکل میں مرتب کر لیتے ہیں چنانچہ جو وقت زہرہ کا گہن جو کئی سو سال کے بعد ہوتا ہے اور ایک دفعہ ہونیکے آٹھ برس بعد ہو کر پھر کئی سو برس کے بعد

ہوتا ہے۔ وہ اسی دوربین سے آگیا اور اس سے بعض اہم نتائج مرتب کئے گئے ہیں۔

دوربین سے بیشک انسان کی نظر کو بڑی حد تک مدد ملی کہ اُس نے فضائے عالم کے بعض پوشیدہ اجسام کو دیکھ لیا۔ مگر پھر بھی انسان میں تھکنے اور غلطی کرنیکا مادہ موجود ہے۔ کوئی شخص رات رات بھر بیٹھکر آسمان سے نظربازی نہیں کرسکتا۔ اس لئے فوٹو کے کیمرہ نے خاص مدد دی۔ اگرچہ آسمانی فوٹو کا کیمرہ خاص ساخت کا بڑا قیمتی ہوتا ہے مگر جب سے بنا ہے اور اسکا استعمال دوربین کے ساتھ ہوا ہے اُس وقت سے بہت سے ستاروں اور آثار کا انکشاف ہوا کیونکہ بعض وقت بہت خفیف روشنی تو نظر سے بچ سکتی تھی مگر فوٹو کی پلیٹ نے اُس کے عکس کو فوراً قبول کرلیا اور بتادیا کہ یہاں ایک لامعلوم ستارہ بھی موجود ہے۔ یہ کیمرہ اکثر استوائی کے ہمراہ لگایا جاتا ہے تاکہ وہ کسی خاص سیارہ یا ستارہ کی پوری حالات بتاتا رہے چنانچہ پچھلے ہفتہ امریکہ کے ایک فلکی نے ایک ستارہ فوٹو کے عکس سے معلوم کیا جسکا فاصلہ آٹھ مہاسنگ میل ہے جس کی روشنی کو زمین تک آنے میں ایک کروڑ تینتیس لاکھ برس لگتے ہیں جبکہ روشنی کی رفتار ایک سکنڈ میں لاکھ ۸۶ ہزار میل یا ایک سال میں ۶۰ کھرب میل ہے

اس آلے کے علاوہ طیف پیما Spectroscope نے بھی بڑی مدد دی۔ یہ آلہ خود بذاتہ ایک علیحدہ مضمون کا محتاج ہے مگر مختصراً ہم یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے تحلیل شعاع ہوجاتی ہے اور سفید رنگ کو تحلیل کرکے یہ اُس کے سات رنگ نمایاں کردیتی ہے۔ یہ مختلف دھاتوں اور گیسوں کے رنگ بناکر ہمکو یہ بتا سکتی ہے کہ سورج میں کون کون سے عناصر موجود ہیں۔ اور کون کون سے عناصر اس میں نہیں ملتے۔ چنانچہ بعید ترین اجرام کے تمام عناصر اسکے ذریعہ ہمکو معلوم ہوجاتے ہیں۔ اور ہم زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمان کے اُن اجرام کا تجزیہ کرسکتے ہیں جنکی روشنی کو یہاں تک آنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگ جاتے ہیں۔

ایک جھلک

ہر کسے از ظن خود شد یار من   وز درون من نجست اسرار من

شباب کا زمانہ جستجو کا ہوتا ہے. نوجوان چاہتے ہیں کہ اپنی فطرت کے بھید دریافت کریں، اور ایسے لوگوں سے اُنکی دوستی ہو جو اُنکی طبیعت کو سمجھ سکتے ہوں اور اُن سے محبت اور ہمدردی کریں۔ یوسف محمود ایک تعلقہ دار کا بیٹا جب کالج پہنچا تو تعلیم سے زیادہ اُسے دوستوں کی تلاش تھی۔ اُس کے باپ کو اپنی دلچسپیوں سے کبھی فرصت نہیں ملتی تھی، ماں کا انتقال ہو گیا تھا، ورنہ وہ بھی اپنے باپ دادا کے راستہ پر چلتا اور تعلیم کا اُسے خیال بھی نہ ہوتا۔ لیکن اُس کے چچا کو باپ کی بے پروائی اور ماں کی موت کی وجہ سے اُسے تعلیم دلانے کا موقع مل گیا۔ اور جب وہ سکول سے نکلا تو اُسے کالج بھی بھیج دیا، اور یوسف محمود بڑی خوشی سے گیا، اس لئے کہ اُسے اپنے ہم عمر لوگوں سے ملنے کا اور اُنکی صحبت سے فائدہ اٹھانے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بورڈنگ میں پہونچنے کے کچھ روز بعد ہی اُس نے معلوم کر لیا کہ وہاں کس کس قسم کے لوگ ہیں۔ ایک خاص حلقہ تھا جو دوسروں سے الگ الگ رہتا تھا، اور اپنے آپ کو کسی وجہ سے دوسروں سے برتر بھی سمجھتا تھا۔ یوسف محمود نے دیکھا کہ یہ لوگ دبی آواز میں کسی عورت کا نام لیکر آپس میں مسکرانے لگتے ہیں، اور اگر کوئی اُنکی طرف غور سے دیکھتا تو کچھ جھینپ کر اپنا منہ پھیر لیتے ہیں۔ اس رویہ نے خواہ مخواہ یوسف محمود میں ان لوگوں سے ملنے کی خواہش پیدا کر دی، انسان کی خاصیت ہے کہ جو چیز اُس سے چھپائی جاتی ہے اُسے دیکھنے اور سننے کا شوق خود کو ہو جاتا ہے، اور وہ ہر راز کو اسی وجہ سے ایک غلط اور غیر ضروری اہمیت دیدیتا ہے۔ اس لئے جب یوسف محمود نے دیکھا کہ یہ طالب علم پان زیادہ کھاتے ہیں، آپس میں بہت آزاد اور خوش رہتے ہیں، دوسروں کی موجودگی اُنکے چہروں کو روکھا، اُنکی گفتگو کو پھیکی کر دیتی ہے تو اُس نے طے کر لیا کہ ان لوگوں کا بھید کسی طرح سے ضرور معلوم کرے گا اور اُنکے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ اُسے ابھی تک اپنی طبیعت کے اصل رجحان کی خبر نہ تھی، اور اُسے امید تھی کہ اگر وہ کسی حلقہ میں شامل ہو گیا تو اُسے دوست مل جائیں گے

اور ایک چھوٹی سی دنیا جس میں وہ خوشی اور بےفکری سے اپنا وقت کاٹ سکے گا، اور اُس کی طبیعت میں جو بےچینی تھی وہ جاتی رہے گی۔ مگر اس دنیا میں داخل ہونے سے پہلے اُسے بہت دقتیں پیش آئیں۔ پہلے تو وہ لوگ جن سے وہ بےتکلفی پیدا کرنا چاہتا تھا اُس سے الگ رہنے کی کوشش کرتے رہے، اور جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ وہ دراصل ان کی صحبت چاہتا ہے تو اُس کے ساتھ اُسی طرح پیش آنے جیسے شہری گنوار کے ساتھ، یا ماہرِ فن نوسکھئے کے ساتھ۔ مگر رفتہ رفتہ اُسے اُنکی خاص گفتگو سننے کی اجازت مل گئی، اور اُنکے بھید اُسے معلوم ہونے لگے۔ جن عورتوں کے نام اُنکی زبان پر رہا کرتے تھے اُن سے بھی اُس کی ملاقات ہو گئی یوسف محمود کا خیال تھا کہ جب وہ اُنکے فن میں ماہر ہو جائے گا تو اُسے وہی تسکین ہو گی جو کاریگر کو ایک اعلیٰ کام ختم کرنے پر ہوتی ہے مگر اُسے ہر طرح سے مایوسی ہوئی۔ اُس کے ساتھی اپنی معشوقوں کے حسن میں غرق ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اُنہیں اپنی اداشناسی پر فخر تھا۔ لیکن اُن کی آشنائی صرف ایسی عورتوں سے تھی جو پیٹ پالنے کے لئے اُنکی خاطر کرتی تھیں۔ یوسف محمود نے سوائے لاچاری اور [illegible]ری کے اُنکے چہروں پر کبھی کوئی ادا نہیں پائی، اور یہ ادا بجائے دلربا ہونے کے تکلیف دہ تھی لیکن اُس نے اپنے دوستوں کو خوش رکھنے کے لئے اپنی رائے کبھی اُنکے سامنے ظاہر نہیں کی اور اُنکا جیسا رہنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُن کی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی جب اُسے اس کا احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو جان بوجھ کر دھوکا دے رہا ہے تو وہ شرمندہ ہو جاتا ایک دو دن الگ الگ رہتا، لیکن پھر گھبرا کر انہیں لوگوں کی صحبت میں پہنچ جاتا۔ اُس کی طبیعت میں آپ ہی آپ ایک بےچینی سی پیدا ہوا کرتی تھی اور اس بےچینی کو اُس کے خیال میں صرف عورت دور کر سکتی تھی۔ فطرت نے اپنے نظام کو قائم رکھنے کے لئے جو طریقے نکالے ہیں اُن میں سے یہ بھی ایک ہے مگر اس میں معصوم نوجوان مردوں اور عورتوں کو ایک بےرحم دنیا کے پھندوں سے بچانے کا کوئی خیال نہیں رکھا ہے۔ شباب کے ساتھ ہی نوجوانوں پر کوئی جادو سا کر دیا جاتا ہے، اور فطرت کو اس سے کوئی مطلب نہیں رہتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور کتنی زندگیاں اس کی وجہ سے تلخ ہو جاتی ہیں، لیکن جو نوجوان اس پھندے میں پھنسے ہوتے ہیں ان کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی، اور جب وہ اس راستہ پر ایک مرتبہ

قدم اٹھا لیتے ہیں تو پھر انکار و کنارہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یوسف محمود پر جب کبھی افسردگی یا یاسیت طاری ہوتی تھی تو اُسے یقین ہو جاتا تھا کہ جن عورتوں کی صحبت میں وہ اپنی طبیعت کی ڈگمگاتی کشتی کے لئے سہارا ڈھونڈ رہا ہے وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی ہیں اور اُسے صرف ایک وہم انکی صحبت میں خوش اور مطمئن رکھتا ہے۔ اُس کی بے چینی صرف وہی دور کر سکتی تھی جو خود بے چین ہو۔ ان بیچاریوں کو نہ چین کی خبر تھی اور نہ بے چینی کی۔ ان کے دلوں میں آرزو رکھنے کی جرات نہیں رہی تھی۔ زندگی کی ساری تمناؤں سے وہ ہاتھ دھو چکی تھیں صرف اپنی بھوک پیاس کے مٹانے کی فکر باقی رہ گئی تھی۔

ابھی تک یوسف محمود کا کہنا چاہئے صرف بہکا تھا، وہ گرا نہیں تھا۔ اس کے ساتھی اکثر اُسے چھیڑا کرتے۔ کہیں نہ کہیں اُس کے لئے وقت مقرر کرتے لیکن وہ کسی بہانہ سے اُسے ٹال دیتا۔ اُس کی طبیعت میں ایک جھجک سی پیدا ہو گئی تھی جسے دور کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے اُسے اکثر فقرے اور پھبتیاں سننا پڑتی تھیں لیکن انہوں نے اُس کی جھجک مٹانے کی بجائے اور بڑھا دی۔ جب کبھی وہ ملاقات کے لئے جاتا تو ہمیشہ کسی کے ساتھ، اور تھوڑی دیر میں اُس پر ایسا خوف طاری ہوتا تھا کہ وہ کسی بہانے سے نکل بھاگتا۔ اس کے ساتھی اس عشق پر تعجب کرتے تھے جو دیدار کے شوق میں معشوق کے دروازہ تک پہنچا کر وصل کے ڈر سے پھر واپس بھگا لیجاتا تھا، مگر کچھ دنوں کے بعد وہ اس کے عادی ہو گئے، اور دوستانہ چھیڑ چھاڑ سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کیا۔

کالج اور تعلیم سے فارغ ہو کر یوسف محمود مکان واپس آیا۔ اُسکا باپ اپنی عیش کی زندگی میں بدستور مبتلا تھا، اور سوائے "اخاہ یوسف کہو کیسے ہو؟" دونوں میں اور کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ یوسف محمود کے بلوغ کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اُسکے دل میں وہ بے تابی اور بے چینی نہیں رہی تھی۔ وہ خوش مذاقی کی حد سے کبھی نہیں گذرا تھا اور اس وجہ سے اُس کے مزاج میں ابھی نرمی باقی تھی۔ مظلوموں پر اُس نے ظلم نہیں کیا تھا، نہ بیوفاؤں کے ساتھ بے رحمی، اس لئے اُسے تلخ تجربہ کی چھوٹی شکایت بھی نہیں تھی اور عورتیں اس کی نگاہ میں اُن پھولوں میں نہیں شامل ہو گئی تھیں جنہیں ہم خوشبودار سمجھ کر شوق سے توڑتے ہیں اور جب ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوتی ہے تو بے پروائی سے جس طرف چاہیں ہاتھ اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں میں

وہ رہتا تھا اُنکے اثر سے بچے رہنا ناممکن تھا، اوراس کے علاوہ خود اُس کے دل میں اکثر عورتوں کی صحبت میں بیٹھنے اور اُنکی باتیں سننے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا، اور وہ یہ کہ انہیں عورتوں کے پاس جائے جہاں اُس کے جان پہچان کے لوگ جایا کرتے تھے۔ وہ بہت دنوں تک ہچکچاتا رہا کیونکہ کہ اُسے اسکا یقین نہیں تھا کہ اُس کی جھجک دور ہوگئی ہے، اور وہ اس پر نہیں تیار تھا کہ لوگوں کی ہنسی اور اُن کی پھبتیاں دوبارہ سنے۔

آخر کار یوسف محمود ایک مرتبہ حسن پرستی کا ارادہ کرکے اپنے گھر سے نکل پڑا۔ کسی دوست نے اُسے یہ صلاح دی تھی کہ اُسے معمولی ناچ گانے کی مجلسوں میں شریک ہوکر رفتہ رفتہ ان عورتوں سے پہلے واقفیت پیدا کرنا چاہیئے۔ اُس کے بعد بے تکلفی۔ جب ایک مرتبہ بے تکلفی ہوگئی تو اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا ہوگا۔ اُس طرف سے خود ہی اشارہ ہوگا۔ یوسف محمود کو یہ ترکیب پسند آئی۔ اور وہ ایک رات کو چند دوستوں کے ہمراہ واقفیت پیدا کرنے کا قصد کرکے چلا۔

موٹر پر بیٹھ کر سب اُس سڑک کی طرف گئے جو عیاشی کے لئے مخصوص تھی، اور ایک مکان کے سامنے ٹھہر گئے جہاں غالباً پہلے سے اُنکے آنے کی اطلاع کردی گئی تھی۔ یوسف محمود موٹر سے اتر کر دوسروں کے پیچھے پیچھے زینہ پر چڑھ گیا۔ اوپر کی منزل سے ایسی آوازیں آرہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا وہاں شہد کی مکھیوں کے کئی چھتے ہیں اور کسی نے انہیں چھیڑ دیا ہے۔ جب وہ کمرہ کے اندر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے جان پہچان کے لوگوں کا بہت بڑا مجمع دو عورتوں کو گھیرے ہوئے بیٹھا ہے۔ اس مجمع میں ہر شخص چاہتا تھا کہ کم از کم ایک عورت کو اپنی طرف متوجہ کرلے، اس لئے ہمیشہ کئی آدمی ایک ساتھ بول اٹھتے تھے اور اکثر ایک ہی مرتبہ گھبرا کر خاموش بھی ہوجاتے تھے۔ صرف چند لوگ جو علم مجلس سے واقف تھے۔ وہ بلند آوازیں بولتے تھے اور وہ عورتیں جواب میں مسکراتی تھیں۔ اکثر لوگ آپس میں باتیں کررہے تھے۔ مگر اُنکے خیالات ایسے اُلجھے تھے اور ایسی دبی آوازیں اور اُنکے نکل جارہے تھے کہ کوئی کسی کی بات نہیں سمجھ پاتا تھا اور سب صرف ادہر ادہر دیکھتے اور بکتے جاتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو بالکل خاموش دوسروں کی گفتگو سن رہے تھے، اور خود کبھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔

جن دو عورتوں کو مجمع گھیرے ہوا تھا اُن میں سے ایک نوجوان تھی، اُسکا رنگ تو ذرا کالا تھا مگر چہرہ کی نمکینی اور آنکھوں کی شوخی نے اُسے کافی خوبصورت بنا دیا تھا۔ دوسری کی عمر قریب تیس سال کے تھی، رنگ صاف تھا اور صحت بھی بہت اچھی تھی مگر اُس کے چہرہ پر عیاشی اور شراب خواری نے اپنی مہر لگا دی تھی، یعنی اُسے دیکھتے ہی ہر شخص یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کا ڈھنگ کیا ہے، اور اسی لئے ان لوگوں کو جو ویسی ہی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اُس کی صورت بہت پسند تھی۔ موٹے ہونٹ، اندر کو گھسی ہوئی آنکھیں تیس برس کی عمر۔ اس سب کا خیال کسی کو نہیں ہوتا تھا جس نے اُس کی باتیں سنیں اُسکی نگاہوں کے نشہ سے مست ہو چلا۔ اور اس سے مطمئن رہا کہ اُسے کسی بے موقع بات کی حیا سے سابقہ نہیں ہوگا۔

نوجوان عورت غالباً اس مجمع میں پہلی مرتبہ آئی تھی، کیونکہ وہ سہمی ہوئی ادہر اُدہر دیکھ رہی تھی اور اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ جب کوئی اُس سے خاص طور سے مخاطب ہوتا تو وہ گھبرا کر مسکرا دیتی۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہتی۔ برخلاف اس کے دوسری عورت بہت اطمینان سے گفتگو کر رہی تھی تجربہ نے اُسے سکھا دیا تھا کہ ایسے مجمع کو کیسے سنبھالنا چاہئے اور غور کرنے سے اس وقت یہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ جو کچھ ہوتا تھا وہ اُسی کے حکم سے اور جو باتیں ہوتی تھیں وہ اُسی کی فرمائش پر۔ اُس کی نظر ہر شخص پر تھی، ہر ایک کو یہی خیال ہوتا تھا کہ وہ اُس پر فدا ہے، اور جو خاموش دیوار کے پاس بیٹھے تھے۔ اُن کو بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کبھی اُن کے منہ پر ایک بہت ٹھنڈی فرحت بخش ہوا آ کر لگ جاتی ہے۔

جب یوسف محمود اپنے چند ساتھیوں کے پیچھے کمرہ میں داخل ہوا تو مجمع میں ایک صاحب جو ہر بات میں بہت آگے آگے رہتے تھے کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے یوسف محمود کو دونوں عورتوں سے ملایا۔

"یہ ہمارے تعلقدار صاحب کے فرزند ارجمند ہیں، ابھی کالج سے فارغ ہو کر نکلے ہیں۔ کتابیں، پڑھتے پڑھتے آدمی کا مزاج خشک ہو جاتا ہے، انکے مزاج کو پھر ذرا تر و تازہ کر دیجئے" وغیرہ وغیرہ۔

نوجوان عورت مسکرا کر رہ گئی، دوسری نے بغیر اُٹھے ہاتھ ملایا، اشارہ سے یوسف محمود کو اپنے پاس بٹھایا اور باتیں شروع کر دیں۔ کالج کا نام پوچھا تعلیم کی حالت پر اپنی رائے ظاہر کی، کتابی علم کا اُس علم سے مقابلہ کیا جو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ایسی طرح ہنستی مسکراتی شرماتی رہی کہ جو

دور سے دیکھتا وہ ضرور سمجھتا کہ دونوں میں خاص طور سے رسیلی باتیں ہو رہی ہیں، یوسف محمود پر اس انداز کا بہت اثر ہوا، اس نے بہت دل کھول کر بغیر جھجکے یا شرمائے اُس کے سوالوں کا جواب دیا اور اپنی طرف سے نئے مضمونوں پر گفتگو چھیڑی، اُس کے آنے کے کچھ دیر بعد ہی کسی نے گانے کی فرمائش کی، طبلے سارنگی ستار والے آئے، نوجوان عورت جو شاید اسی لئے بلائی گئی تھی سر ملانے لگی، مگر یوسف محمود کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوئی، وہ اپنے ہمکلام کی صورت تک رہا تھا، اور اُس کی زبان چل رہی تھی۔ اور اُس کے ہمکلام نے کسی طرح سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کمرہ میں کوئی اور بھی ہے اور کچھ اور بھی ہو رہا ہے

جب مجلس گرم ہوئی تو لوگ شراب بھی پینے لگے۔ یوسف محمود نے کبھی شراب چکھی تک نہیں تھی لیکن جب اس کے ہمکلام نے مسکرا کر گلاس پیش کیا تو وہ اُسے ایسی طرح پی گیا جیسے کوئی پرانا شرابی جس کے رگ و ریشہ میں اتنا نشہ سرایت کر گیا ہے کہ اُسے مست ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ اور لوگوں نے اس کی حالت کو محسوس کیا اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے، بلکہ ایک نے کافی بلند آواز میں کہا۔

"ہماری آرزو تھی کہ کسی کو عاشق ہوتے ہوئے دیکھیں، سو وہ بھی آج پوری ہو گئی" لیکن یوسف محمود نے کچھ نہ سُنا . . .

جب رات کے دو پہر گزر چکے تو سب اپنے اپنے گھر جانے لگے۔ یوسف محمود کو اتنا ہوش نہ تھا کہ وہ بھی گھر جانے کا خیال کرے، اور نہ اپنے اوپر اتنا قابو کہ خود اُٹھ سکے جس نشست پر بیٹھا تھا بیٹھا رہا نگاہ جہاں پر اٹک گئی تھی اٹکی رہی، نہ پہلو بدلا۔ نہ نگاہ ہٹی۔ آخرکار اُس کے دوستوں نے اسے پکڑ کر اٹھایا، اور آخری آواز جو اُس کے کان میں آئی یہ تھی۔

"اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ ہم جیسوں کی روزی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے" اور یہ کہکر کسی نے بہت خلوص کے ساتھ اُس سے ہاتھ ملایا۔ یوسف محمود پر اس آخری التجا کا بہت گہرا اثر ہوا، لیکن بیہوشی میں وہ صرف اتنا کر سکا کہ اُس کے ہاتھ میں جو ہاتھ تھا۔ اُسے زور سے دبایا . . .

جب وہ اپنے سونے کے کمرہ میں پہنچا تو اچکن ایک طرف پھینکی، ٹوپی ایک طرف اور بڑی مشکل

سے جوتا اور موزے اتار کر پلنگ پر گر پڑا۔

شراب میٹھی ہوتی ہے نشہ کی پہلی منزلوں میں برسوں کی بندھی ہوئی گرہیں کھل جاتی ہیں یعنی جو جھجک عام طور سے انسان کو خاموش رکھتی ہے یا پوری بات نہیں کہنے دیتی، جو شک و شبہ اس کے خیالات کو اسی کے دل میں بند رکھتا ہے، یہ سب دو گلاس شراب میں دھل جاتے ہیں۔ انسان کو اپنی لیاقت اور اپنے ذہن پہ بھروسا ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی موجودگی کی پروا نہیں رہتی، اس حالت میں دراصل انسان کی لیاقت کا بہتر اندازہ ہو سکتا ہے بہ نسبت اس وقت کے جب اس نے اپنی پیاس صرف ٹھنڈے پانی سے بجھائی ہو۔ یہ تو سب صحیح ہے، لیکن جس کسی نے رات کو شراب کا مزا چکھا ہے وہ دوسرے دن اپنے سر کو بھاری اور اپنے دماغ کو خالی پاتا ہے۔ یوسف محمود جب اپنی پہلی بے ہوشی کی نیند سے کوئی چار بجے کے قریب جگا تو اس کے سر میں بہت سخت درد ہو رہا تھا، گدی جھنجھنا رہی تھی، گردن اکڑ گئی تھی، آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ لیکن اس حالت میں بھی جو بات اسے سب سے پہلے یاد آئی وہ اس عورت کی پر درد الوداع تھی۔

"ہم جیسوں کی روزی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

یوسف محمود ان الفاظ پر غور کرتا رہا۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن جس لہجہ میں وہ کہے گئے تھے اس نے انکے معنی اور مطلب کو بالکل بدل دیا اور وہ بجائے طوائفوں کے ایک عام فقرے کے ایک انسان کی فریاد بن گئے۔ کون جانتا ہے، اس نے سوچا، شاید یہ ایک شریف طبیعت کی عورت ایک ذلیل پیشہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس سے صرف کمینہ لوگ ملنے جاتے ہیں، اسے فطرتاً بد اخلاق سمجھ کر علاوہ بیہودہ باتوں کے نہ اس سے کچھ کہتے ہیں اور نہ سننا چاہتے ہیں۔ اسے وہ برداشت کرتی رہتی ہے۔ اپنی عزت کا اسے خیال نہیں ہوتا۔ لیکن جب کبھی ایک اچھی خصلت کا آدمی اسے مل جاتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے۔ یوسف محمود کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ ایک درد کے دریا میں غوطہ کھانے لگا، اور درد کی شدت بھی اس خیالی دنیا کی آفتوں سے اس کی توجہ نہ ہٹا سکی، اس کے دماغ میں بہت دیر تک غمگین چہروں کی تصویریں بنتی رہیں جن کے آنسو پونچھنے کے لئے کبھی کسی نے اپنا ہاتھ اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔

دوسرا دن اس کا بہت مشکل سے کٹا۔ لوگ اس سے ہنس ہنس کر رات کے واقعات پوچھتے تھے۔ اور

اس کے سر میں درد تھا اور دل میں غم۔ لیکن خدا خدا کر کے رات آ گئی، اُسے اپنی کالی کملی میں لپیٹ کر دنیا سے چھپا لیا۔ اور اُس کی دن بھر کی آرزو کہ کہیں جلد اکیلا چادر اوڑھ کر پڑ رہے اور اپنے غمگین چہرے کو دیکھ کر پھر روئے پوری ہو گئی۔ نیند کی اُسے نہ خواہش تھی نہ امید، مگر وقت سے بہت پہلے ہی اُس پر ایک خمار سا چھا گیا۔ اُس کی تصویریں دھندلی ہو گئیں، اور نیند نے آ کر اسے اپنا اور اپنا غم بھلا دیا۔

اُس کی آنکھ پھر سویرے کھل گئی، اور وہ ایک نیم بیداری کی حالت میں دیر تک لیٹا رہا۔ لیکن نیند نے ایک اور حملہ کیا اور اپنے ساتھ ایک خواب بھی لے آئی۔ جب وہ اٹھا تھا تو اُس نے ہر طرف اندھیرا پایا تھا۔ مگر اب ایکبارگی اُس کے سامنے سے ایک پردہ سا اُٹھ گیا کمرہ میں روشنی سی ہو گئی اور اُسے آپ ہی آپ اس کا خیال ہوا کہ یہ روشنی کسی کے ساتھ آئی ہے۔ روشنی تو کیا تھی، شوخ رنگوں کی لہریں تھیں جن میں سُرخ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یوسف محمود نے جب غور سے دیکھا تو انکے بیچ میں اُسے ایک صورت نظر آئی جو ان رنگوں سے بنی تھی لیکن اُن سے بالکل بے تعلق تھی۔ ایک کوئی اٹھارہ برس کی لڑکی کی صورت جس کے نقشہ کو زندگی کی مایوسیوں نے نہیں بگاڑا تھا، مگر جس سے ہوشیاری، تجربہ کاری اور دانشمندی برستی تھی۔ ایک عجیب سا چہرہ، جو کبھی اپنی ناک کے نازک بانسے کے پیچھے چھپ جاتا، کبھی اپنی لمبی پلکوں کے پردہ میں غائب ہو جاتا، کبھی پیچھے ہٹ کر رنگوں میں ایک دھندلا دھبا بن جاتا، کبھی یوسف محمود کے سر کے بالکل پاس آ جاتا۔ وہ بڑی دیر تک اس صورت کو گھومتے پھرتے، آگے بڑھتے پیچھے ہٹتے دیکھتا رہا۔ پھر ایکبارگی کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز آئی، وہ صورت جو ابھی تک کچھ بیجان تھی سوتی سی معلوم ہوتی تھی، جاگ پڑی، ہونٹ مسکرانے لگے، آنکھیں شوخی سے چمکنے لگیں۔

"نہیں پہچانا!"

یوسف محمود نے دیکھا کہ وہ چہرہ جو ہوا میں اُڑتا ہوا نظر آ رہا تھا دراصل ایک نوجوان لڑکی کا سر ہے، اور وہ ایک ہاتھ سے ٹیک لگائے اُس کے سرہانے جھکی ہوئی اُسے تک رہی ہے اور مسکرائی جاتی ہے۔

"ارے یوسف، تو نے مجھے نہیں پہچانا؟"

یوسف محمود نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی لیکن نہ اُن شوخ شریر آنکھوں سے وہ نظر ہٹا سکا نہ وہ سریلی پرجوش آواز سن کر اس کی زبان میں ہلنے کی قوت باقی رہی۔

"میں تو یہیں کی رہنے والی ہوں!"

"کہاں کی؟" یوسف محمود نے دبی آواز سے پوچھا اور پھر آپ ہی آپ ڈر گیا اور آنکھیں نیچی کر لیں

"یہیں کی، تیرے ملک کی، تیرے شہر کی، تیرے مکان کی، کمرہ کی۔ اب اور پوچھ کہاں کی رہنے والی ہوں"

یوسف محمود خاموش رہا۔

برسوں سے تو تو مجھے تلاش کر رہا ہے۔ میرے انتظار میں بے چین ہے، اب جو میں خود آگئی تو تو پوچھتا ہے کہ کہاں کی ہو اور کون ہو؟ یوسف، یہ بھی کیا اندھیر ہے ... "

لڑکی کی آواز سے سارا کمرہ گونج رہا تھا، یہاں تک کہ اگر کوئی اُس کے ہونٹوں کو ہلتے نہ دیکھتا تو وہ نہ بتا سکتا کہ آواز کس طرف سے آرہی ہے۔ آخری جملے کے بعد یوسف محمود نے دیکھا کہ اس لڑکی کا چہرہ پیلا پڑ گیا، آنکھوں کی چمک کم ہوگئی اور وہ صورت بالکل ایک معمولی لڑکی کی سی ہوگئی، لیکن اس سے اس کی کشش بڑھ گئی اور حسن دوگونہ ہو گیا۔

"یوسف اگر میری بیعزتی مقصود تھی تو دوسروں کی طرح مجھے یاد رہی۔ کیا ہوتا میں اپنے درد کو لئے بیٹھی رہتی تجھے کچھ معلوم نہ ہوتا مجھے کوئی امید ہوتی لیکن تو مدت سے میرا نور دوسری عورتوں کے چہروں پر، میری محبت اُنکے برتاؤ میں، میری غمگساری اُن کی توجہ میں تلاش کرتا رہا ہے، جب کبھی میری جھلک تو نے کہیں دیکھی تو تیرا دل اُچھل پڑا جب کبھی تجھے میرے دیدار سے مایوسی ہوئی تو ساری رات سر ٹپکتا رہا۔ سچ بتا، تو ان بازار کی عورتوں سے کیوں ملنے جاتا ہے تیرے دل میں یہ بے چینی کیسی تھی۔ کل کے تماشے میں تیری آنکھیں آنسوؤں سے کیوں بھر گئیں، ہر جگہ تو مجھے ڈھونڈھتا پھرتا رہا ہے، اب انکار کرنے سے کیا مطلب ہے؟ مجھے پھر سے دیکھ اور پہچان لے ... "

لڑکی پلنگ سے ہٹ کر بیچ کمرہ میں کھڑی ہوگئی۔ یوسف محمود نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ ایک تیسرے

معصوم لڑکی جس کی ہر ادا میں شوخی تھی محبت اور خلوص، سیدھی طبیعت، سادے خوشنما کپڑے۔ آبی دوپٹہ گلابی پائجامہ، اس پر کالی آنکھیں اور سانولا رنگ۔ یوسف محمود ایک پاک دلی محبت کے جوش میں پلنگ پر بیٹھ گیا، کچھ دیر اس مسکراتے ہوئے چہرہ کو تکتا رہا، پھر چلا اٹھا۔

"ہاں میں پہچان گیا!"

"یوسف، تو کیسے نہ پہچانتا" لڑکی پھر اس کے پلنگ کے پاس آگئی، اس نے بہت گھور کے دیکھا اور مسکرائی، یوسف کے ہر رگ و ریشہ میں ایک نئی جان سی آگئی، اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً پلنگ سے کود پڑے اور ساری دنیا میں اعلان کردے کہ ....

"ٹھہر یوسف ٹھہر، تو نے مجھے پہچان تو لیا، مگر تیری زبان میں ابھی بولنے کی طاقت نہیں ہے۔ آبی دوپٹہ گلابی پائجامہ اس پر کالی آنکھیں اور سانولا رنگ۔ اس سے کوئی کیا سمجھے گا؟ میری تعریف زبان سے نہیں ہو سکتی، اور مجھے تو صرف دیکھ سکتا ہے، دکھلا نہیں سکتا ... مگر دیکھ، یہ یاد رکھنا۔ میری آنکھیں ویسی ہی ہیں جیسی تو پسند کرتا ہے، رنگ وہی کپڑے وہی۔ تو نے برسوں جو اپنے دل میں ایک عورت کی تصویر بنا کر رکھی تھی، وہ میری ہی تھی ... آبی دوپٹہ گلابی پائجامہ، اس پر کالی آنکھیں اور سانولا رنگ مسکراتا ہوا چہرہ، شوخ باتیں، دل میں صرف تیری محبت، زندگی کا مقصد صرف تیرا ساتھ، تیری غمگساری۔ ایسی ہی عورت کی تجھے جستجو تھی کہ نہیں؟ مگر تو کسی کو کیا سمجھائیگا۔ میری صورت تو ہر شخص نے بنائی ہے، اور ہر شخص نے بنا کر اپنے دل میں رکھ لی ہے .. لیکن میرے پجاری، میری آرزوؤں کو پورا کرنے والے۔ میرے سچے عاشق بہت کم ہیں، سب مجھے سجاتے سنوارتے ہیں اور پھر مجھ پر کیچڑ پھینکتے ہیں۔ مجھے بدنام اور ذلیل کرتے ہیں ... یوسف مجھے دنیا نے بہت ذلیل کیا ہے!"

یوسف نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جب کچھ دیر بعد اس نے پھر نظر اٹھائی تو وہ لڑکی کمرہ میں نہیں تھی، ہر طرف اندھیرا تھا، جو باہر کے پردوں سے چھن چھن کر ذرا سی روشنی آرہی تھی اس میں ہر طرف بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑی ہوئی کرسیاں، زمین پر بکھرے ہوئے کپڑے دیکھ سکتا تھا۔ خواب کے منظر کے بعد دنیا کی یہ پریشان تصویر اسے بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ باہر کوئی مرغ

بولا، اور اُس کے کانوں میں اُس لڑکی کی پر درد سریلی آواز گونج رہی تھی۔ یوسف محمود نے کالمہ کر کروٹ بدل لی، اور دل میں یہ فریاد کی کہ اُسے پھر اس صورت کے دیکھنے کی عزت بخشی جائے۔ پھر وہ آبی دوپٹہ گلابی پائجامہ، کالی آنکھیں، سانولا رنگ اُسے اپنے نشہ میں مست کر دیں . . .

اس خواب کے بعد یوسف محمود پر جو گذری اُسے بیان کرنا مشکل ہے اُس کے جیسے خواب بہتیروں نے دیکھے ہیں، اور کسی نے شاعری کی ہے، کسی نے انسان کی خدمت میں اپنی جان دیدی ہے، کسی نے انسان کو خدا کی شان دکھائی ہے۔ زیادہ تر یوسف محمود کی طرح صرف عاشق ہوئے اور اس عشق کا اُن پر اتنا اثر ہوا کہ وہ سوا اپنی ہستی کو کھو دینے کے اپنی معشوقہ کے سامنے اور کوئی تحفہ نہ لا سکے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یوسف محمود ایک رات کو چند دستوں کے ساتھ ایک رنگیلی مجلس میں شریک ہوا، ایک طوائف پر عاشق ہو گیا اور اُس کے چند روز بعد ہی باوجود بہت مضبوط اور تندرست ہونے کے اس کو ایک عجیب سا بخار آنے لگا جس کو حکیم ڈاکٹر کسی طرح سے دور نہ کر سکے۔ کبھی کبھی رات کو اُس کے تیمار دار اُسے کسی لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے سنتے تھے، مگر اُس کی گفتگو بالکل اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔

ہندوستان کا قدیم تمدن

(جدید معلومات کی بنا پر)

اب تک بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ہندوستان کے قدیم ترین باشندے جو تہذیب و تمدن سے کسی قدر آشنا تھے، وہ آرین تھے لیکن جدید اکتشافات اور تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان سے پیشتر بھی یہاں جو لوگ آباد تھے، وہ اپنا ایک مخصوص اور مستقل تمدن رکھتے تھے۔ لیکن اس جدید نظریے کے ذرائع معلومات ابھی اس درجہ نامکمل اور غیر مستقل ہیں کہ ان پر کسی خیال اور اعتقاد کی بنیاد قائم کرنا ریتیلی زمین پر ایک عالیشان عمارت بنانا ہے۔ اس کے متعلق کم و بیش جو معلومات ان ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں کہ یہاں کے لوگ جو آریوں سے پیشتر اس ملک میں آباد تھے، ایک مہذب اور متمدن حالت میں رہتے تھے۔ مرتب اور باضابطہ صورت میں انکی کسی نظام زندگی کا ہمیں پتہ نہیں چلتا۔

برعکس اس کے آریوں اور انکی زندگی کے ایک ایک صیغہ کے متعلق اس قدر مرتب اور باضابطہ معلومات ہمارے پاس موجود ہیں کہ اگر انہی کے تہذیب و تمدن کو ہم ہندوستان کا قدیم تہذیب و تمدن قرار دیں تو یہ صحت سے کچھ زیادہ بعید نہ ہوگا۔ انکے ذرائع معلومات قدیم کتبات یا آثار نہیں ہیں جن سے ہم محض قیاسی نتائج اخذ کر سکیں، بلکہ ان کے تاریخ و تمدن کا دارومدار ان صحائف اور کتب پر ہے جو اگر ایک طرف الہامی اور آسمانی مانی جاتی ہیں تو دوسری طرف وہ دنیا کی قدیم ترین کتب میں شمار کیجاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب تک یہ وید بھی اسی طرح مہر بلب تھے جس طرح آثار و کتبات مدفونہ ہوا کرتے ہیں۔ وید ہندوؤں کی مقدس آسمانی کتاب مانی جاتی ہے لیکن کتنے ہندو ہیں جو اپنی اس کتاب آسمانی کا ایک حرف بھی پڑھ سکتے ہیں؟۔ سیکڑوں اور ہزاروں پنڈت ہیں جو اپنے ہم مذہبوں کے لیے عبادات اور دیگر رسوم مذہبی ادا کرتے ہیں لیکن کیا انہوں نے کبھی ان کتب مقدسہ کی شروع سے آخر تک ورق گردانی کی بھی زحمت گوارا کی ہے؟ ایکے دکے جو سنسکرت زبان سے کسی حد تک واقف بھی ہیں، انہوں نے کیا کبھی اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے اور اس سے تاریخی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت زبان و ادب

کا مطالعہ علمی نقطہ نظر سے اٹھارویں صدی سے قبل بالکل مفقود تھا خدا بھلا کرے کلکتہ ہائیکورٹ کے اس چیف جسٹس کا جس نے سب سے پہلی بار اس زبان و ادب کے مطالعہ کیطرف لوگوں کو توجہ دلائی۔ میری مراد سر ولیم جونس سے ہے جس نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"سنسکرت ایک عجیب و غریب ساخت کی زبان ہے۔ یہ یونانی سے زیادہ مکمل ہے، لاطینی سے زیادہ وسیع ہے اور ان دونوں سے زیادہ شستہ و رفتہ ہے"

ان الفاظ نے علمی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی جس کے بعد سے سنسکرت زبان و ادب کا مطالعہ روز بروز ترقی کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یورپین مستشرقین کی ایک ایسی بڑی جماعت پیدا ہو گئی جنہوں نے اس زبان و ادب کے مطالعہ میں اپنی زندگی ختم کر دی۔ انہی کا طفیل ہے کہ آج ہندوؤں میں بھی دو چار نفوس ایسے نظر آتے ہیں جو اپنے اس کلام ربانی اور کتب آسمانی سے علمی نقطہ نظر سے بھی واقف ہیں۔

زمانہ حال کے انہی مستشرقین میں ایک ذات ای۔ جے ریپسن کی ہے جو آج کل کیمبرج یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر ہیں۔ اس شخص کو سنسکرت کے عالم ہونیکی بنا پر ہندوستان کے قدیم تاریخ و تمدن سے جو دلچسپی ہے، اس کا ثبوت اس سے پیشتر وہ ایک چھوٹی سی کتاب "ہند قدیم" کے نام سے لکھ کر دے چکا ہے لیکن ابھی حال میں کیمبرج یونیورسٹی نے قدیم ہندوستان پر ایک نہایت ضخیم کتاب شائع کی ہے جو انہی کی ادارت میں مرتب ہوئی ہے۔ یہ تقریباً آٹھ سو صفحوں کی کتاب بڑی تقطیع پر صرف اشوک کے حالات پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اسوقت کتاب پر کوئی تبصرہ کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ آب سے تقریباً ۴ ہزار برس پیشتر ہندوستان میں کس قسم کا تہذیب و تمدن رائج تھا۔ آریوں کو ابھی ہندوستان میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور وہ دریائے سرسوتی سے آگے نہیں بڑھے تھے کہ انہوں نے اس محدود زمان و مکان کے اندر تہذیب و تمدن کی ایک نہایت عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی جو آج اپنے تو اپنے غیروں کی آنکھوں کو بھی خیرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آئیے ذرا دیکھیں کہ اس واقعہ کی کہاں تک حقیقت ہے اور اس عمارت کے مختلف حصے اور ٹکڑے کس حیثیت کے تھے۔ سب سے پہلے خانگی زندگی کو لیجئے۔

خانگی زندگی: گھر میں بڑا بوڑھا باپ سمجھا جاتا تھا۔ وہی گھر کا مالک ہوتا تھا۔ گھر کے اندر کی مالکہ ماں ہوتی جو اپنے

شوہر کی حد درجہ مطیع اور فرمانبردار ہوتی تھی۔ باپ کو اولاد کی تنبیہ کا ہر طرح سے حق ہوتا تھا۔ اولاد بھی اپنے والدین کی نہایت اطاعت گزار ہوتی۔ شادی وغیرہ کے معاملہ میں اگرچہ اولاد کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی لیکن ان معاملات میں والدین کا بھی بڑی حد تک دخل ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بیٹا اکثر باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا بہو اپنے سسر کا بہت لحاظ رکھتی تھی لیکن جوں جوں والدین کبرسنی کو پہونچتے تو بیٹے اور بہو کے اختیارات وسیع ہوتے جاتے تھے یہانتک کہ اخیر عمر میں بیٹا اور بہو گھر کے اندر اور باہر دونوں کے پورے پورے مالک ہوجاتے کنبہ کا بڑا بوڑھا ساری جائداد کا مالک ہوتا منقولہ جائداد مثلاً مویشیوں کے گلے فصلوں کی پیداوار وغیرہ میں ہر رکن خاندان شریک ہوتا کھیت عموماً ہر بالغ اور ہوشیار رکن کے علیحدہ علیحدہ ہوتے۔ اس لئے کہ ملک خدا، ان توانا اور تندرست آریوں کے لئے تنگ نہ تھا۔ تقریباً تین پشت تک یہ اسی طرح یکجائی زندگی بسر کرتے لیکن اس کے بعد ایک کنبہ میں اتنے افراد ہوجاتے کہ قدرتاً ان سب کے لئے گنجائش کافی نہ ہوتی اور وہ تقسیم خاندان کے لئے مجبور ہوتے، پھر بھی وہ سب کے سب پاس ہی پاس رہتے اس طرح ایک کنبہ بڑھتے بڑھتے ایک گاؤں یا قریہ ہوجاتا۔

معاشرتی زندگی اس خانگی زندگی کے علاوہ ان کی معاشرتی زندگی بھی نہایت باضابطہ اور منظم تھی اور اس سے بھی ایک اعلیٰ تہذیب و معاشرت کا ثبوت ملتا ہے۔ بہت سے عادات و رسوم جو آجکل ہندو سوسائٹی کے پیشانی پر بدنما دھبے ہیں، اُس زمانہ کے آریوں میں انکا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مثلاً بچپن کی شادی کا ان میں کوئی دستور نہ تھا۔ لڑکا جب سن شعور کو پہنچتا تو اپنی شادی کا انتخاب آپ کرلیتا لیکن والدین کو بھی ان معاملات میں بڑی حد تک دخل ہوتا تھا۔ طلاق کی نوبت بہت مشکل سے آتی تھی۔ شادی پر لڑکی کیطرف سے کافی جہیز دیا جاتا تھا اور دلہن باقاعدہ رخصت ہوکر اپنے نئے گھر آتی تھی۔ آریوں میں عموماً ایک شادی ہوتی تھی ایک سے زیادہ شادیاں یا تو راجہ کرتا یا اُس کی تقلید میں وہ لوگ جو صاحب دولت ہوتے۔ مردوں کے لباس میں عموماً دو یا تین کپڑے ہوتے جو روئی کے علاوہ بھیڑ کے اون سے بھی بنتے تھے۔ اکثر ہرن کی پوستین بھی بطور پوشاک کے استعمال کیجاتی۔ وہ اپنی امارت اور تعیش کا اظہار زری کے کپڑوں سے کرتے۔ مرد اکثر زیورات بھی پہنتے تھے مثلاً بالے، جوشن اور کوئی چیز گلے میں تیوہاروں کے موقعہ پر

وہ ہار پہنتے تھے۔ مرد بالوں میں تیل ڈالتے اور کنگھیاں کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنے بالوں کا جوڑا بنا کر سر سے دائیں جانب باندھ لیتے۔ وہ مونچھیں اور داڑھیاں بھی رکھتے تھے۔ ان کی غذا میں زیادہ تر دودھ، گھی اور مکھن ہوتا تھا۔ وہ غلہ سے آٹا بنانا جانتے تھے اور اس سے گھی، دودھ میں ملا کر طرح طرح کی مٹھائیاں تیار کرتے تھے۔ انکے کھانوں میں سبزی اور پھل بھی ہوتے تھے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ گوشت نہیں ہوتا تھا۔ قربانی کے موقع پر تو وہ ذبیحہ کرتے ہی تھے لیکن احباب کی ضیافتوں میں بھی وہ بلا تکلف فربہ بچھڑوں کو ذبح کرتے تھے۔ انکے نزدیک اس سے گائے کے احترام میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ بھیڑ، بکری کا گوشت بھی پکتا تھا، علاوہ اس کے انکے ہاں گھوڑے کی قربانی بھی ہوتی اور اس کا گوشت کھایا بھی جاتا۔ گوشت کے پکانے کے دو طریقے تھے ایک تو اُسے ابال کر پکاتے دوسرے سیخ کباب بناتے تھے۔ مشروبات میں دو چیزیں داخل تھیں جو شراب کی قائم مقام تھیں۔ ایک کا نام 'سوم' تھا جو کسی پودے کے عرق سے بنتا تھا، اور دوسرے کا نام 'سُورا' تھا جو غلہ سے تیار کیا جاتا اور اسمیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ نشہ ہوتا تھا۔

تفریحی مشاغل | کسی قوم میں معمولات زندگی کے علاوہ تفریحی مشاغل کا پایا جانا تمدن کی ایک بہت بڑی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بلا شبہ اس سے کم سے کم تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ کے کاموں کے علاوہ جو بقائے زندگی کے لئے لازم ہیں، کچھ ایسے مشاغل بھی رکھتے ہیں جو زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ضروری ہیں چنانچہ آرینوں کے اس دور تمدن میں بھی بہت سے ایسے مشاغل پائے جاتے ہیں جو محض حظ نفس اور سرور قلب کے لئے کئے جاتے تھے۔ مثلاً رتھوں کا دوڑانا۔ یہ انکے ہاں کی ویسی ہی اعلیٰ سواری تھی جیسے آج کل ہمارے ہاں گھوڑے کی سواری ہے اور جس طرح اس زمانہ میں گھوڑ دوڑ ایک بہت بڑا تفریحی شغلہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح انکے ہاں رتھوں کا مقابلہ بھی اسی دلچسپی اور شوق کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے قمار بازی کا رواج بھی پایا جاتا تھا۔ ایک حد اعتدال تک ممکن ہے یہ کسی قدر دلچسپی اور تفریح کا باعث ہو لیکن جب اپنے پورے سرمایۂ حیات کے ساتھ بازی کھیلی جائے تو یہی شے مذموم ہو جاتی ہے۔ آرینوں کے اس ابتدائی عہد میں کہیں حد اعتدال سے گزرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ رقص و سرود کا بھی رواج ہو چلا تھا۔ آج ابتدائی سے ابتدائی تمدن رکھنے والی جماعتوں میں بھی یہ شے کسی نہ کسی حالت میں پائی جاتی ہے۔ لیکن آرینوں کے ہاں اس فن

میں کافی ترقی ہوگئی تھی۔ ناچنے میں عموماً کنواری لڑکیاں ہوتی تھیں لیکن عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں مرد بھی ناچتے تھے۔ موسیقی میں تو انہوں نے بہت خاصی ترقی کر لی تھی، باجہ کی ہر اقسام پائی جاتی تھیں۔ مثلاً منڈھی ہوئی شکل کے جیسے طبلہ وغیرہ، تار سے بنے ہوئے جیسے سارنگی، ستار وغیرہ، اور پھونک کر بجائے جانیوالے جیسے بانسری وغیرہ۔ نغمہ و سرود انکے ہاں مستحسن سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ ان کی عبادت میں بھی داخل تھا۔

معاشی زندگی | جب کچھ لوگ یکجا رہتے بستے ہیں تو آئین باہم داد و ستد کے مخصوص طریقے رائج ہوجاتے ہیں اور وہ پیدائش دولت اور افزائش مال کے اپنے خاص طور طریقے بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ زندگی کا یہ پہلو معاشی پہلو کہلاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آریوں میں یہ پہلو کہاں تک نمایاں تھا۔ ان میں آپس میں لین دین کا طریقہ یا تو دان پن کے ذریعہ تھا یا خرید و فروخت کے ذریعہ۔ مستطیع اشخاص خیرات و زکوۃ کے طور پر مویشی، غلہ، یا کھیت بہت کچھ دے ڈالتے تھے اور برہمنوں کو اس طریقہ پر بہت کچھ مل جاتا تھا۔ خرید و فروخت میں سکوں کا رواج نہ تھا۔ تمام لین دین اجناس میں ہوتا تھا۔ گائے ایک بہت بڑی جنس مبادلہ سمجھی جاتی تھی۔ عموماً ١٠ گایوں کے بدلے ایک اندر کی مورتی آتی تھی۔ نشکہ ایک قسم کا زیور ہوتا تھا جو بطور سکہ کے چلتا تھا۔ بعد میں یہی آگر ایک طلائی سکہ کا نام ہوگیا۔ ان میں وراثت کا بھی دستور تھا اور ایک رکن خاندان کے مرنے پر ورثا کو جائداد وراثۃً ملتی تھی لیکن بیشتر وہ اپنی قوت بازو سے حاصل کرتے۔ انکے ہاں قرض کے لین دین کا بھی دستور تھا جسے وہ رینڑ کہتے تھے۔ بصورت عدم استطاعت مقروض کو بذات خود اپنے قرضخواہ کے ہاتھ بک جانا پڑتا تھا۔

انہوں نے صنعت و حرفت میں بھی کافی ترقی کر لی تھی اور انکے ہاں مختلف قسم کی مصنوعات کا ذکر ملتا ہے۔ رتھوں اور گاڑیوں کی مرمت اور انکو بنانے کے لئے بڑھئی کا کام نہایت خوب ہوتا تھا۔ اسکے علاوہ لکڑی کی اور دوسری چیزیں بھی بنتی تھیں۔ پہلے کہیں آچکا ہے کہ وہ چمڑے کا لباس بھی پہنتے تھے۔ اس لحاظ سے چرم سازی کا کام بھی ہوتا تھا اور اس سلسلہ میں چمڑے کی مختلف چیزیں بنتی تھیں۔ پھر کپڑے بننے کا کام تو لازمی ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے، زیبائش و امارت کے اظہار کے لئے زری کے کپڑے

استعمال کئے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ پیشہ بہت کافی ترقی پر تھا۔ ساتھ ہی اسکے خیاطت کا ہونا بھی ضروری ہے اور زری کے کام کے ساتھ اس فن کا ترقی پذیر نہونا ناممکن ہے۔ علاوہ اس کے چھوٹے چھوٹے کام، مثلاً چٹائیاں وغیرہ بنانے کا دستور بھی تھا۔ طرح طرح کے مٹی کے برتن بھی بنتے تھے اور اس فن نے کچھ عرصہ بعد جو ترقی کر لی تھی، وہ آجکل کے اکتشافات سے ظاہر ہے اور جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ فن کچھ بہت زیادہ پیچھے نہ رہا ہوگا۔ ان سب باتوں میں ایک بات جو سب سے زیادہ عجیب و غریب پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ابھی تک کسی پیشہ کو ذلیل اور حقیر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح بعض دوسری ابتدائی قومیں مثلاً یونانیوں اور رومیوں میں غلامی کا رواج تھا اور غلاموں ہی سے تمام کام لئے جاتے تھے آریوں میں اس قسم کا کوئی دستور نہ تھا۔ سارا کام آرین خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، زراعت و کاشتکاری صنعت و حرفت غرض تمام کام وہ خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ کوئی غیر قوم یا غیر قبیلہ کا شخص مزدور یا نوکر نہوتا، جو انکے بجائے ان کے سارے کام کرتا، پھر وہ ذلیل یا حقیر سمجھتے تو کیسے؟

سیاسی نظام اس سے یہ مفہوم ہرگز نہ لینا چاہئے کہ تمدن کے اس دور میں انکے ہاں کوئی بہت بڑا سیاسی و ملکی نظام ہوگا۔ لے دے کے صرف ایک بادشاہ ہوتا تھا جو جنگ میں فوج کا سردار ہوتا اور امن کے زمانہ میں انکے تمام امور کا نگراں رہتا۔ چھوٹی چھوٹی مہموں پر راجہ خود نہ جاتا بلکہ کسی دوسرے کو فوج کا سردار بنا کر بھیجتا۔ امن وامان کے زمانہ میں اُسے کچھ بہت زیادہ کام نہوتا اکثر عبادت و قربانی کے موقعوں پر وہ انکا امام ہوتا۔ اس کے علاوہ مال اور فوجداری کے تمام معاملات اسی کو طے کرنے ہوتے قانون وراثت و مال کا جھگڑا نہ تھا جو مقدمات میں پیچیدگی ہوتی ہر شخص بالعموم اپنی قوت بازو کی کمائی کا مالک ہوتا۔ چوری وغیرہ کے معاملہ میں چور کو پکڑ کر باندھ رکھتے تاوقتیکہ وہ اپنے جرم کا اقرار نہ کرلے اور اس کے اعزہ آکر مال مسروقہ کی تلافی نہ کر دیں۔ پولیس کا بھی کم و بیش انتظام تھا اور بالعموم ان سے سراغرسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ پنجاب میں "کھوجی" کے نام سے آجتک ایک ذات ہی جو اس کام میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ "سبھا" یا "سمیتی" کے نام سے ایک مجلس بھی تھی جس کا کام بادشاہ کو مشورہ دینا ہوتا یہی جماعت آگے چلکر بہت با اختیار ہوگئی اور سنگین مقدمات کے فیصلہ کرنے میں اس سے "جوری" کا کام لیا جاتا تھا۔

جنگ میں قبیلہ کا قبیلہ شریک ہوتا۔ پروہت، اس کے لئے لوگوں کو آمادہ کرتا تھا۔ لڑائی عموماً رتھوں پر سوار ہو کر ہوتی تھی۔ جنگ کے دوران میں کوئی خاص نظام و ترتیب نہ ہوتی۔ تیرانداز راجہ کے بائیں جانب کھڑا ہوجاتا اور وہاں سے تیر چلاتا۔ اسلحہ میں تیر و کمان کا خاص طور پر استعمال تھا۔ تیر کا اصل حصہ بڑی یا کسی دھات کا ہوتا تھا جو کسی پتلی لکڑی میں لگا ہوتا۔ بعض وقت تیر زہر میں بجھائے ہوئے استعمال ہوتے تھے اس کے علاوہ نیزے، بلم، تلواریں، تیشے بھی استعمال ہوتے تھے۔ مدافعانہ اسلحوں میں زرہ اور بکتر پہنے جاتے۔ جنگ میں سواری کے لئے گھوڑوں کا استعمال نہ تھا۔ میدان جنگ عموماً دریا کا ساحل منتخب کیا جاتا تاکہ پانی وغیرہ کی آسانی ہو اور کم سے کم ایک جانب تو دشمن کے حملہ کا خوف نہ رہے

مذہب و فلسفہ آرین تہذیب کے مختلف شعبے اگرچہ ایک بلند معیار پر پہونچ چکے تھے، پھر بھی ان میں ایک طرح کی سادگی اور بے تکلفی باقی تھی لیکن انکے مذہب و عقائد میں بہت زیادہ پیچیدگی اور طوالت نظر آتی ہے اسکا سب سے بڑا سبب غالباً مذہبی جماعت کا وجود ہے جس کا کام مذہب کے معاملات پر غور و فکر کرنا اور مذہبی عبادات کا انجام دینا ہوتا تھا۔ ان کا مذہب ایک بالکل فطری مذہب تھا۔ کائنات فطرت مثلاً سورج، چاند، تارے، آسمان، ہوا، زمین، دریا، پہاڑ ان سب سے انکا روزانہ کا سابقہ پڑتا تھا اور یہی انکے معبود تھے۔ وہ سورج سے روشنی اور گرمی پاتے تھے، وہی زمین سے غلہ اگاتا اور ان کی فصلوں کو پکاتا تھا، زندگی کے نفع و بقا کا اس پر بہت حد تک دارومدار تھا، لامحالہ اسکا ایک احترام و وقار دل میں پیدا ہوگیا اور وہ معبود بنگیا چاند اور تاروں سے رات کی تاریکی دور ہوتی، ان کی ٹھنڈی اور دھیمی روشنی انکے قلوب پر ایک اثر اور کیفیت پیدا کرتی۔ اس لحاظ سے انکے ساتھ انہیں ایک طرح کا تعلق خاطر اور لگاؤ پیدا ہوگیا اور یہ بھی انکے معبودوں میں داخل ہوگئے۔ اسی طرح زمین جس پر وہ دن رات چلتے پھرتے اور اپنے مکانات بناتے اور جو انہیں اپنی چھاتی سے غلہ اگا کر دیتی، ان کے ادب و احترام کی ایک شے ہوگئی۔ اس طرح کائنات عالم کی وہ تمام چیزیں جو انکے نفع و سود کا باعث ہوتیں، ان کی معبود بنگئیں چنانچہ رگ وید کے اندر ان کے دیوتاؤں میں ہم ورُن (آسمان) پرتھوی (زمین) سُوریہ (سورج) وایو (ہوا) اِندر (رعد) اشترا (سحر) اسوین (صبح و شام کے دو ستارے) اگنی (آگ) کے نام پاتے ہیں

جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔

انکے علاوہ ان میں بعض غیر مرئی معبودوں کا تخیل بھی پایا جاتا ہے مثلاً وہ اعتقاد (شردھا) اور غصہ (منیو) کے متعلق بھی ایک طرح کا ادب اور خوف اپنے دل میں رکھتے تھے۔ انہوں نے بعض دیوتاؤں کو اپنے خیال کے مطابق بعض جانوروں کی شکلوں پر ڈھال لیا تھا۔ مثلاً اندر (رعد) اور دیادس (آسمان) بیل کی شکل کے بنائے گئے تھے۔ سوریہ (سورج) ایک گھوڑے کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ جانور بذات خود انکے مسجود نہ تھے اور اسی کی وجہ سے انمیں بت پرستی نہیں پائی جاتی تھی

"خیر" کی ان قوتوں کے ساتھ انکے ہاں بعض "شر" کی قوتوں کا تصور بھی پایا جاتا ہے جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ عبادت و قربانی کے راستے سے انہیں روکتے ہیں مثلاً "اسور" اور "رکشش" ان کے ہاں بمنزلہ شیطان کے مانے جاتے تھے۔

دیوتاؤں کے ساتھ ان کا تمامتر رویہ امید و توقع کا تھا۔ وہ ان کا ادب و احترام اس بنا پر کرتے اور ان کے ساتھ محبت و عقیدت اس وجہ سے رکھتے تھے کہ ان سے انہیں نفع و سود کی توقع ہوتی تھی۔ قربانی بھی وہ اسی امید پر کرتے کہ اس سے ان کے دیوتا خوش ہونگے انکا عقیدہ تھا کہ قربانی کی چیزوں میں ان کے دیوتا بذات خود شریک ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں قربانی میں دودھ، گھی، غلہ گوشت اور سوم، شامل تھے جو از قسم ماکولات و مشروبات انکے ہاں کی بہترین چیزیں ہیں۔ ان کے قربانی کا طریقہ نہایت باضابطہ اور بہت طویل ہوتا تھا بسا اوقات سات سات برہمن شریک قربانی ہوتے تھے کچھ منتر پڑھتے بعض کام میں لگے رہتے اور کچھ گانے بجانے میں مصروف رہتے

کائنات فطرت سے محبت و تعلق ہونے کے ساتھ ان میں ایک صانع کل، (وشوکرمن) کا تخیل بھی موجود تھا۔ جہاں ان کے متعدد دیوی اور دیوتا تھے۔ وہاں انہیں ایک معبود حقیقی کی تلاش بھی تھی اور وہ ان الہیاتی مسائل پر بعد از غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ تخلیق عالم کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا عدم سے وجود میں آئی۔ اس عالم کی تخلیق پہیلیاں کی شکل میں ہوئی۔ پھر گرمی کی۔ لیکن حیات بعد الممات کلاں کے ہاں کوئی خاص تخیل نہیں پایا جاتا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح یا تو پانی پر چلی

جاتی ہے یا پودوں پر رہتی ہے۔ وہ ایک دوسری زندگی کے قائل ضرور تھے اور اس کے متعلق وہ صرف اتنا یقین رکھتے تھے کہ اُس عالم کی زندگی پر اس عالم دنیا کے افعال و اعمال کا اثر ہوتا ہے۔

فرقہ وارانہ تعلیم

بہ طرز اسٹیفن لی کاک

اسمبلی ۔ ۱۵ ؍ جنوری ۱۹۳۸ء ۔ آج عام جلسے میں مسودہ قانون تعلیم کی دفعہ ۴۴۳۲ پر بحث ہوئی ۔ آنریبل ممبر تعلیم نے تحریک کی کہ " اسمبلی کی رائے میں جس مثلث کے دو اضلاع مساوی ہوں اس میں ان اضلاع کے مقابل زاویے مساوی ہوتے ہیں اور اگر یہ اضلاع آگے کو بڑھائے جائیں تو دونوں بیرونی زاویے بھی مساوی ہوں گے ۔" آنریبل ممبر نے اپنی تقریر میں حکومت کے انصاف پسندی اور معدلت گستری پر زور دیا آپ نے فرمایا کہ اگر کا لفظ اس تحریک میں محض احتیاط کی غرض سے ہے ورنہ اصل میں حکومت تمام اضلاع کو ایک نظر سے دیکھتی ہے اور سب کو مساوی سمجھتی ہے اسی طرح سب زاویے بھی حکومت کے زاویۂ نگاہ سے برابر ہیں ۔ دوسرے حصہ کی بابت آپ نے فرمایا کہ حکومت کو معلوم ہے کہ اضلاع کا بڑھانا قدامت پسندوں اور ترقی کے مخالفوں کو ناگوار ہے لیکن ایسی حالت میں کہ زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اور ترقی کی راہیں ہر سمت کھلی ہوئی ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ حکومت جو ترقی کی علمبردار ہے اضلاع کو آگے نہ بڑھائے اور بیرونی زاویے نہ بنائے ۔ آپ نے کہا کہ بیرونی زاویوں کی برابری کی انجمن اقوام ذمہ دار ہے اس لئے اسمبلی کو ان کی طرف سے بالکل مطمئن رہنا چاہئے ۔ مخالف بنچوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے یقین دلایا کہ حکومت اضلاع کو بڑھانے کے معاملے میں نہایت حزم و احتیاط سے کام لے گی اور اسمبلی سے مشورہ کر کے آہستہ آہستہ باقساط اس مہم کو سرانجام دے گی ۔

جب آنرایبل ممبر اپنی تقریر ختم کر چکے تو ہوم رول پارٹی کے لیڈر اٹھے اور آپ نے بہت زور و شور سے اس تحریک کی مخالفت کی پچھلے ڈیڑھ سو سال کی سیاسی تاریخ پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ حکومت نے کسی زمانے میں بھی اضلاع کو مساوی نہیں سمجھا بلکہ کبھی ایک کو بڑھا رکھا کبھی دوسرے کو اور زاویوں کو جب موقعہ ملا دو میں تقسیم کر دیا یہاں تک کہ موجودہ تحریک میں بھی صرف دو ضلعوں اور زاویوں کی برابری کا ذکر ہے اور تیسرے ضلع اور زاویے کی طرف سے جان بوجھ کر چشم پوشی کی جا رہی ہے ۔ آپ نے کہا کہ اس سے صاف بدنیتی اور خیانت نہیں بلکہ ظلم و استبداد ثابت ہوتا ہے اضلاع کو بڑھانے کی بابت آپ نے کہا کہ یہ

ملک اور قوم کے لئے نہایت مہلک تجویز ہے جب اضلاع بڑھائے جائیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اور تیسرے ضلع سے دور ہوتے جائینگے۔ علاوہ اس کے مثلث سے باہر نکلنے کے بعد اضلاع پر بیرونی رنگ غالب آجائے گا اور ان سے جو زاویے بنیں گے وہ بھی بالکل بیرونی ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ مجموعی حیثیت سے یہ تحریک "مساوات، حریت، اخوت" کا گلا گھونٹنے کے لئے پیش کی گئی ہے اس لئے اسمبلی کو چاہئے کہ خود اس تحریک کا گلا گھونٹ دے۔

اس کے بعد مولانا مظہر الاسلام کھڑے ہوئے اور آپنے آنرایبل ممبر تعلیم کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے یہ ضروری تحریک ایسے پر آشوب زمانے میں بلا خوف و خطر پیش کر دی آپ نے فرمایا میں خوشامدی نہیں، لیکن میرے خیال میں یہ کارنامہ آنرایبل مسٹر رستم اور آنرایبل مسٹر اسفندیار کی شجاعت کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ افسوس ہے کہ مجھے اس تحریک میں ایک ترمیم پیش کرنیکی ضرورت ہے۔ مجھ سے زیادہ اتفاق و اتحاد کا حامی کوئی نہیں لیکن موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے میں صرف اپنے ضلع کی مساوات کا ذمہ دار ہوں اور اسی کو بڑھانے کی رائے دیتا ہوں، مساوات میرے ضلع کی بلا شرکت غیرے ملک ہے اس میں کسی کو حصہ دینا مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔ اسی طرح بڑھنے کا مستحق صرف میرا ضلع ہے۔ دوسرے ضلع رجعت پسندی جس سے وہ میرے ضلع کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھا جاتا ہے اس کی بزدلی جس سے وہ میرے ضلع کو ہر قدم پر شکست دیتا ہے۔ اُسکا آپس کا نفاق جس سے وہ میرے ضلع کی مخالفت میں یکدل اور یک زبان ہو گیا ہے اظہر من الشمس ہے اس لئے اس کے مقابل زاویہ کبھی میرے مقابل زاویہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دوسرا ضلع اگر بڑھایا جائے گا تو بیرونی زاویہ کے بنے گا اور اس سے اسے وحشت ہو گی اس لئے اسے ہرگز بڑھانا نہ چاہئے۔ دوسری ترمیم آپ نے یہ پیش کی کہ بیرونی زاویے اور اندرونی زاویے کی تفریق میرے ضلع کے لئے نہیں کیجا سکتی۔ میرے یہاں مساوات کی روح اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ بیرونی اور اندرونی زاویے آپس میں بالکل برابر ہیں بشرطیکہ وہ میرے ضلع سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لئے میں اس تحریک کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہوں "اس اسمبلی کی رائے میں چونکہ میرا ضلع اپنے شاندار ماضی اور قابل فخر روایات کی بنا پر مساوی ہے اس لئے اس کے مقابل

زاویہ بھی مساوی ہے اور اگر نہیں بلکہ ضرور اس زاویے کو بڑھانا چاہئے کہ بیرونی زاویہ بذات خود مساوی ہو اور اپنے مقابل اندرونی زاویے کے برابر ہو"

مولانا کی تقریر ابھی طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ پنڈت برج لال اٹھے اور آپ نے حکومت آنریبل ممبر تعلیم کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ آپ نے کہا کہ چاپلوسی میری عادت نہیں لیکن اس نازک وقت میں ایسی دلیرانہ تحریک پیش کرنا آتنی بڑی شجاعت کا کام ہے کہ مجھے بے اختیار آزاد میں جاں نثار جن یاد آگئے۔ آپ نے تحریک سے اصولی اتفاق ظاہر کیا لیکن اس کے بعض الفاظ سے اختلاف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اتحاد و اتفاق میرا دھرم ہے لیکن آج کل ہوا ایسی بگڑی ہوئی ہے اور دوسرے ضلع والے ایسے قوی اور خوفناک ہیں کہ میرے خیال میں اس تحریک میں صرف میرے ضلع کا ذکر ہونا چاہئے۔ اگر تاریخ پر گہری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ یہ مثلث پہلے میرے ہی ضلع سے گھرا ہوا تھا۔ باقی دو ضلعے خدا جانے کہاں سے آن کودے۔ ان میں سے ایک ضلع اس قدر شورہ پشت اور ظالم ہے کہ اس کے نام سے میرا دل کانپتا ہے جب کبھی مقابلہ ہوتا ہے خواہ پہل اس کی طرف سے ہو یا نہ ہو خواہ اُسے شکست ہو یا فتح لیکن ظلم اور زیادتی ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے اس لئے یہ ضلع اصل میں مثلث میں رہنے کے قابل نہیں چہ جائیکہ اس کے مقابل کا زاویہ میرے مقابل کے زاویے کے برابر ہو۔ اب رہا اضلاع کو بڑھا کر بیرونی زاویے بنانا تو خدا کے لئے کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا ورنہ دوسرے ضلع کا بیرونی زاویہ میرے زاویہ کو فوراً نسل ڈالے گا لہٰذا میں تحریک کو ذرا سے تغیر کیا تم ان الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

مثلث کے ایک ضلع سے کچھ بحث نہیں دوسرا ظالم ہے البتہ میرے ضلع کے مقابل کا زاویہ مساوی ہے ضلع کے بڑھانے کا میں مخالف نہیں بڑھائیے مگر اس کا خیال رہے کہ بیرونی زاویہ ہرگز نہ بننے پائے"۔ پنڈت جی بیٹھے ہی تھے کہ خانساماں داخل ہوا اور اس نے جناب صدر کی اجازت سے تحریک کی جلسہ جانے کے لئے ملتوی ہونے یہ تحریک باتفاق رائے منظور ہوئی۔

غزل

مصورِ جذبات حضرت ثاقب لکھنوی مدظلہ العالی

نالہ و فریاد و آہ و کاہشِ جاں دیکھنا
مجھ فقیرِ بے نوا کا ساز و ساماں دیکھنا

قلبِ صد پارہ مرا اب تک ہے تصویرِ وفا
ٹوٹنے پر بھی نہ ٹوٹا دل کا پیماں دیکھنا

خون کا قطرہ نہ ہو دل میں تو پھر اک حشر ہے
لاکھوں ارمانوں کو اپنے گھر میں مہماں دیکھنا

خیر دل تو پھر بھی دل ہے کیوں نہ ہو محوِ رخِ حسن
ہوش اڑا دیتا ہے آئینہ کا حیراں دیکھنا

تنگیِ دل بعد وسعت آ نہیں سکتی کبھی
دشت والوں کی قضا ہے خوابِ زنداں دیکھنا

حسرتوں کو آگ دے کر تم نے مشکل سہل کی
ورنہ کیا آساں تھا دل میں بیاباں دیکھنا

پیس ڈالا خواہش بجانے کوہِ طور کو
دل کی قوت دیکھ لے پھر روئے جاناں دیکھنا

بخیہ گر جس کا نہیں وہ چاک زن ہے بہشت
دل نہ یوسف کا نظر آئے تو داماں دیکھنا

تم جو بچ جاؤ تو ابھی ہے مجھے شامِ فراق
دور ہی سے میری ان اشکوں کا طوفاں دیکھنا

کھل گیا داغِ جگر یا کچھ کسر باقی رہی
اک ذرا جھک کر مرا چاکِ گریباں دیکھنا

موت کی خواہش سوا میری کسی کو بھی نہیں
کارِ اہلِ دل ہے مشکل کو آساں دیکھنا

ایک خنجر ہو گیا دل کے لئے انکارِ وصل
اس نہیں نے کیا اثر پیدا کیا ہاں دیکھنا

کائناتِ موت ابن میں لئے ہیں دل کے زخم
درد اگر کم ہو تو تم سوئے نمکداں دیکھنا

ہم نہ مرجاتے تو کیوں سنتا کوئی فریاد ہو
اک قیامت ہے کسی بستی کو ویراں دیکھنا

ہستیِ فانی پہ اک اصرار تھا تقدیر کو
ورنہ کب منظور تھا خوابِ پریشاں دیکھنا

پتی پتی سے نہ خوں اُبلے تو مجرم جاننا
ذبح میں ہو لوں تو پھر رنگِ گلستاں دیکھنا

سو جہانوں کو مٹا کر ایک زمیں آباد ہے
تم کسی دن عالمِ گورِ غریباں دیکھنا

گر یہی پہلو یہی دل اور یہی تم ہے تو پھر
عمر بھر آساں ہے ثاقب کو پریشاں دیکھنا

شبِ ماہ کشمیر میں

مژدہ ہو آرزو کے بسمل کو — مژدہ ہو درد آشنا دل کو
مژدہ ہو حسرتِ تماشا کو — مژدہ ہو چشمِ حسن پیا کو
جلوۂ طور ہے مقابل آج — زیبِ گردوں ہے ماہِ کامل آج
بے نقاب آج ماہِ انور ہے — کس قدر دلفریب منظر ہے
یہ سہانا سماں یہ پیاری زمیں — کیوں نہ کہیے اسے بہشت بریں
حسنِ فطرت کی دلربا تصویر — جانِ نظارہ خطۂ کشمیر
سبز و شاداب وادیِ جہلم — آج کی شب ہے رشکِ باغِ ارم
دونوں جانب پہاڑ کی دیوار — سر بہ افلاک چوٹیوں کی قطار
ہے مجسم وقار و شوکتِ حسن — پیکرِ اعتبار و عظمتِ حسن
بہہ رہا ہے نشیب میں دریا — گونجتی ہے فضا میں جس کی صدا
نالۂ بیقرار ہے ہر موج — سازِ ہستی کا تار ہے ہر موج
نغمہ پیدا ہے آبشاروں سے — راگ جھڑتا ہے کوہساروں سے
آج اس بزم میں ہے صدر نشیں — شاہدِ مہ کا عارضِ سیمیں
دل کو بھاتی ہے سطحِ جہلم پر — صاف شفاف نور کی چادر
موجیں آپس میں لڑتی جاتی ہیں — شکنیں اس میں پڑتی جاتی ہیں
کچھ عجب دلکشی ہے پانی میں — چاندنی بہہ رہی ہے پانی میں
ماہِ کامل کے روئے روشن سے — حسنِ فطرت کو چار چاند لگے
رات کو اس نے دن بنایا ہے — سوتے سنسار کو جگایا ہے
دیکھو اعجازِ لذتِ دیدار — ذرہ ذرہ زمیں کا ہے بیدار
ہاں مگر محوِ خواب ہے سبزہ — کیا قیامت شباب ہے سبزہ

اقتباسات

فاشستی تحریک

جنگ عظیم نے دنیا کے نظام میں بہت کچھ تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ وہ اصول جو جنگ سے قبل قطعی و ناقابل تردید سمجھے جاتے تھے آج مشکوک نگاہوں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ مغربی نظام سیاست میں جمہوریت ایک ضروری عنصر تھا۔ لیکن آج روس، اسپین، ترکی اور اطالیہ کے سیاسی حالات کسی اور سمت کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اطالیہ میں فاشستی تحریک جس کا لیڈر مسولینی ہے۔ اس ہی تحریک کا سب سے عجیب مظہر ہے لیکن بعض اہل نظر اس تحریک سے بالکل مخالف نہیں ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک عارضی شے ہے جو فی الحال کتنی ہی مرعوب کن کیوں نہ ہو لیکن آخر کار رفا ہو جائے گی۔

مسٹر اسٹوارٹ ہاجسن جو ابھی اپنے سفر اطالیہ سے واپس آئے ہیں اپنے اخبار ڈیلی نیوز میں رقمطراز ہیں کہ مجھے اس بات کا قطعی یقین ہے کہ فاشستی تحریک کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ آخر میں یا ان سب جرائم کے سبب جو اس کے نام سے کئے جاتے ہیں اور یا ان جذبات کے سبب جن کا اظہار اس کے پرجوش پیرو کیا کرتے ہیں تباہ ہو گی بلکہ اس کی تباہی اس لئے قطعی ہے کہ یہ ذہنی اور روحانی بنیادوں پر استوار نہیں ہے۔ اس کی محرک صرف ناعاقبت اندیشانہ قومیت ہے۔ میں نے فلورنس میں اسیلو بوڈریو کے تصنیف کردہ چند پمفلٹ دیکھے جنہیں اطالیہ کے نوجوان بہت ذوق سے پڑھا کرتے ہیں۔ اسیلو بوڈریو میرا خیال ہے کہ نائب وزیر تعلیمات ہیں اور بذاتہ ایک نہایت ایماندار اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ میں انکی کتابوں سے چند اقتباسات درج کرتا ہوں جنہیں میں اس تحریک کی روح سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اخوۃ ایک ناممکن الحصول نصب العین ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ نصب العین ممکن الحصول ہو تو ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم صفحۂ وجود سے ہلاک ہو جائیں چونکہ حقیقۃً انسانی خوشی کا انحصار اس کی جد و جہد اور اس کی

بگولوں ہی پر ہے۔

تمام طلبہ اپنے دلوں میں انہیں خیالات کو لئے ہوئے ہیں۔ ایک اس قدر معمر اور سنجیدہ شخص کا ایسے نظریہ کو پیش کرنا اس تحریک کے طفلانہ پہلو پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ انسانیت کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ انسانیت وہ ہے جس میں ہم فاشستی یقین رکھتے ہیں . . . . ہمارے لئے انسانیت صرف ۴۲ ملین ملکی اور ۱۰ ملین باہر رہنے والے اطالین پر مشتمل ہے باقی دنیا کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہے۔

سن فینون نے بھی اپنے انتہائی جنون کے زمانہ میں ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس کی مثال صرف متعصب یہودیت ہی۔ مگر متعصب یہودیت کی داستان کو چراغ ہدایت نہ سمجھنا چاہئے بلکہ شمع لحد جاننا چاہیئے۔"

جمہوریت کا مستقبل

موجودہ جمہوری نظام حکومت کے خلاف جو شورش برپا ہے اسے پروفیسر رشبروک ولیمس نسبتاً دیگر معاصرین کے زیادہ سمجھتے ہیں وہ اس کو جمہوریت کے منافی نہیں بلکہ معاون سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "واقعہ یہ ہے کہ لوگ پارلمنٹری طرز حکومت سے عاجز آگئے ہیں اور اس کی بجائے ایک نئی طرز حکومت کے خواہشمند ہیں جہانتک اس زمانہ کی تحریک کو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت ہونا چاہئے جس کی باگ ماہران حکومت کے ہاتھوں میں ہو جسے وہ کامیابی سے چلا سکیں مگر وہ بذات خود عوام الناس کے سامنے جوابدہ ہوں۔ کابینہ اور سکریٹریٹ باوجود اجتماعی سیاست کے نشیب و فراز کے ایک عرصہ تک برقرار رہتی ہیں اس لئے زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔ یہ رجحان زیادہ نمایاں ہے کہ حکومت کے لئے ماہران فن پلے گئے جائیں اور انہیں روزمرہ کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ پارلمنٹری حکومت سے بیزاری اور جمہوری خیالات سے اختلاف ہم مفہوم الفاظ نہیں ہیں کوئی شخص گذشتہ زمانہ کے استبداد کو اب دیکھنا نہیں چاہتا یہ ایک تاریخی اتفاق ہے کہ اس وقت پارلیمنٹری ادارے اور جمہوریت ہم معنی سمجھی جا رہی ہے۔

اضطراب کا عام جذبہ جمہوریت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس نظام حکومت کے خلاف ہے جو رائے عامہ

کی فوری اور صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ سیاسی مدبرین پارلیمنٹری نظام حکومت میں تبدیلیاں کرلیں اور وہ زیادہ بوجھ اٹھانیکے قابل ہوجائے ممکن ہے کہ ہمیں سوویٹ نظام حکومت کے خلاف فیڈرل نظام حکومت اختیار کرنا پڑے۔ میں ان امور کا قطعی فیصلہ نہیں کرسکتا تاہم اسکا مجھے کلی یقین ہے کہ رائے عامہ کا اثر ہمارا اضطراب کے سبب خطرہ میں نہیں ہے۔ لوگ جو چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کو اور زیادہ موثر بنایا جائے"

زوال مغرب

اس خیال کا اکثر اعادہ کیا جاتا ہے کہ یورپ کا موجودہ تمدن تباہ ہوجائیگا چونکہ اس کی بنیادیں مادیت پر قائم ہیں اور اسکا غیر روحانی اجزا سے بالکل خالی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ حیات اجتماعیہ میں یہ عدم توازن ہمیشہ تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ لیکن یورپ کے موجودہ نظام میں ایک جدید عنصر کا اضافہ شروع ہوگیا ہے اور یہ اخلاقی اور روحانی عنصر ہے جس نے جنگ عظیم کے بعد کافی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ اگر یہ عنصر موجودہ طمع اور خودغرضی پر غالب آگیا تو یورپ کے زوال کی پیشین گوئیاں محض خواب ثابت ہونگی لیکن یہ طے کرنا کہ یورپ ان اصولوں کی تسلیم کرکے خود کو تباہی سے بچائے گا یا نہیں اسکا بہتر جواب صرف مستقبل دیسکتا ہے۔

مسٹر ولفرڈ لاک یورپ میں اس روحانی تحریک کے وجود کے قائل ہیں چنانچہ CURRENT THOUGHT میں آپ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اس وقت مغرب تباہی سے صرف اس لئے بچ سکتا ہے کہ وہاں ایک زبردست روحانی تحریک جاری ہے۔ تمام خارجی انقلابات ضرور رونما ہونے چاہئیں لیکن اگر ہم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انکا اصلی محرک اس خواہش کو ہونا چاہیے کہ ہم انسان کو آزادی اور ترقی کے زیادہ مواقع دیں۔

یورپ کی جدید روح صنعت اور حرفت میں تعاون چاہتی ہے تاکہ کام میں خوشی حاصل ہو۔ وہ مساویانہ تقسیم دولت چاہتی ہے تاکہ لوگ غربت اور بے روزگاری کی تفکرات سے آزاد ہوجائیں۔ وہ پیدائش دولت کا ایک معقول نظام چاہتی ہے تاکہ لوگوں کو علوم و فنون کے لئے وقت حاصل ہو جسے موجودہ تجارتی زندگی نے تباہ کردیا ہے۔ وہ خارجی تعلقات میں ایک انقلاب چاہتی ہے تاکہ خودغرضانہ قومیت کا جسے اس وقت حب الوطن کہا جاتا ہے خاتمہ ہوجائے اور تمام دنیا کے لوگ قریب تر ہوجائیں۔

مختصر یہ کہ یہ روح تخریبی اصول طمع کی جگہ تعمیری اصول محبت کو دینا چاہتی ہے۔ یہ اس انقلاب کو اسی وقت شروع کر دینا چاہتی ہے چونکہ اس وقت حرص و آز نے دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جنگ دشمنی غربت اور نفرت کا دور دورہ ہے۔ سائنس کے تمام اکتشافات تباہی کے لئے اکارت کئے گئے ہیں۔ یہ بالکل نمایاں ہے کہ محبت یا شوق خدمت ایک عملی اصول ہے چونکہ تعمیری اصول انسان میں سب سے قوی محرک ہے۔ وہاں کون کام کے لئے آمادہ نہ ہوگا جہاں تعلقات خوشگوار ہوں، جہاں انصاف کا دور دورہ ہو اور جہاں محنت کا مقصد انسان کی فلاح و بہبود ہو۔ جبکہ خوف و طمع نے پیدائش دولت میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے تو محبت اور آزادانہ خدمت کس قدر حیرت انگیز اضافہ نہ کرے گی؟

تعاون اور محبت کی روح اور خدمت کی خوشی موجودہ تمدن میں جاگزیں ہو کر تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا انقلاب کر سکتی ہے۔ یہ انقلاب یقیناً ایک جدید تمدن کا پیش خیمہ ہوگا جس میں ذاتی خود غرضی اور انفرادی ملک کی بجائے فلاح عامہ اور مشترکہ ملک کا خیال غالب ہوگا۔ یہ ہر ایک اہل فکر پر واضح ہوگا کہ قلیل مشترکہ کوشش سے تمام انسانوں کی احتیاجات پوری ہو سکتی ہیں۔ اس سے نجات حاصل کئے بغیر انہیں اپنے جذبات اور خیالات کو فنون کے ذریعہ اظہار کا کافی موقعہ مل سکتا ہے۔ سوسائٹی کے اس روحانی نظام میں انسان اپنی ضائع شدہ قوتوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کریگا اور ایک قرن کے اندر ہی دنیا حیرت انگیز ترقی کر لے گی۔

ہندوستان کی زراعت

ہندوستان کی ترقی کا انحصار زراعت کی ترقی اور کسانوں کی فلاح و بہبود پر ہے لیکن جو بدتر حالت ہمارے ہاں کی زراعت اور کسانوں کی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ زراعت کے متعلق تمام حالات کی تفتیش کے لئے حال ہی میں رائل کمیشن زراعت کا تقرر ہوا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ کے پہلے حصہ کی دوسری جلد میں سے جس میں گورنمنٹ ماہران زراعت کی آراء درج ہیں۔ ہم مندرجہ ذیل اقتباس درج کرتے ہیں۔

تمام حالات کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے کاشتکار کی تباہی کا سب سے بڑا سبب

اس کی جہالت اور توہم پرستی ہے۔

ایک شہادت سے جو پوسا میں لیگئی پتہ چلتا ہے کہ غریب کاشتکاروں کو اپنی جہالت کے سبب دلالوں سے کاروبار کرنے میں بہت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ رعیت کو جعلی پیمانوں اور وزنوں سے دھوکا دیا جاتا ہے۔

مسٹر ڈبلیو اسمتھ نے جو امپیریل ڈائری بنگلور کے ماہر فن ہیں فرمایا کہ ہندوستان میں مویشیوں کی پرورش جاہل قبائل کے ہاتھوں میں ہے جو مویشیوں کی بندش اور پرورش کے اصولوں سے محض ناواقف ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر سال ہزاروں کمزور بچے پیدا ہوتے ہیں جن میں نہ تو کھیتوں میں کام کر سکتے ہیں اور نہ دودھ دے سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ ایک بار وہ پیدا ہوجاتے ہیں اس لئے مذہبی جذبات کے سبب انہیں قتل نہیں کیا جاتا اور ہندوستان کو انکی موت تک انکے بیجا اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں۔ بغیر کسی فائدہ کے وہ اس غذا کو ہضم کر جاتے ہیں جسے مفید مویشیوں کو کھانا چاہیئے تھا کسی دوسرے ملک میں یہ مویشی غذا کا کام دیتے۔ ہندوستان میں فصل کے زمانہ میں انہیں کافی غذا ملتی ہے مگر اس کے بعد آٹھ نو مہینہ تک یہ بھوکے مرتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے مر جاتے ہیں۔

مسٹر اسمتھ نے کہا کہ ایسی موثر تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں جن سے مویشیوں کی پیدائش، پرورش اور غذا کے اصولوں کی ترویج ہو سکے۔ نیز انکے لئے غذا کا کافی انتظام کرنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ بائسکوپ جادو کی لالٹین اور لکچروں کے ذریعہ نہایت باضابطہ تبلیغ کی ضرورت ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ کھیتوں میں عملاً مفید مویشیوں سے کام لیا جائے اور بتایا جائے کہ کاشت کے ہمراہ کس طرح مویشیوں کی بھی پرورش کیجا سکتی ہے۔

تنقید و تبصرہ

تاریخ فلسفۂ اسلام

مصنفہ ٹ۔ ج۔ دوبوئر مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین پروفیسر فلسفہ و تعلیمات و ناظم اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

اس موضوع پر اردو کا تو ذکر ہی کیا اور کسی زبان میں بھی تھوڑا عرصہ پہلے کوئی مستقل تصنیف موجود نہ تھی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر میں مشہور مستشرق دوبوئر نے متفرق کوششوں سے مستفید ہو کر یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب اس موضوع پر پہلی تصنیف ہونے کی وجہ سے بہت مفید ہے اگرچہ بہت سی خامیاں بھی رہ گئی ہیں۔ اس موضوع پر فاضل مترجم کے ان الفاظ کا جو انہوں نے دیباچہ میں لکھے ہیں اعادہ مناسب ہوگا "فاضل مصنف خود اعتراف کرتا ہے کہ جس قدر تحقیقات فلسفۂ اسلام کے متعلق ہو چکی ہے اس میں سے بعض چیزیں اس کی نظر سے نہیں گزریں۔ وہ اپنی کتاب کا مقصد محض اس بحث کا چھیڑنا قرار دیتا ہے نہ کہ اس عظیم الشان کام کی تکمیل۔ اس پر لحاظ رکھتے ہوئے کہ یورپ کے مستشرقین کے لئے عربی غیر زبان ہے اور وہ مشرقی طرز خیال سے بیگانہ ہیں۔ اگر اس کتاب میں کوئی اغلاط پائی جائیں تو تعجب نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتاب اسلامی فلسفہ پر اُن چند کتابوں میں سب سے زیادہ مستند ہے جو اس عہد میں لکھی گئی ہیں اور یوں تو اصل میں یہ کام خود مسلمانوں کا ہے کہ اپنے تمدن کے متعلق خود اپنی قوم کے لئے اور ساری دنیا کے لئے صحیح معلومات بہم پہنچائیں لیکن جو کوئی اس سلسلہ کو شروع کریگا اُسے دوبوئر کی کتاب سے یقیناً معقول مدد ملیگی۔"

ہمیں مصنف کے بعض خیالات سے اختلاف ہے مثلاً صفحہ ۲ پر تحریر ہے کہ "اُسے (یعنی مدینہ کو) اس پر اکتفا کرنا پڑا کہ ایک حد تک یہودیت اور عیسائیت کے زیر اثر فقہ اور حدیث کی تدوین کرے" فقہ اور حدیث کی تدوین میں یہودیت اور عیسائیت سے کیا کیا اثرات قبول کئے گئے۔ اس کی تشریح کی ضرورت تھی بغیر دلیل کے یہ دعویٰ مسموع نہیں ہو سکتا۔ بظاہر تو یہودیت اور عیسائیت کا کوئی

اثر کم از کم نقد اور حدیث پر نظر نہیں آتا۔

اسی طرح صفحہ ۸ پر ہے کہ "منصور ہی کے عہد سے یونانی ادب کا ترجمہ عربی میں زیادہ تر شامی زبان کے واسطے سے شروع ہوگیا تھا" حالانکہ عربوں نے یونانی ادبیات کا ترجمہ بالکل نہیں کیا اس لئے کہ انہوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی نظم و نثر کا خود انکا ذخیرہ اتنا وافر اور بے پایاں تھا کہ وہ دوسروں کے محتاج نہیں تھے ہاں فلسفہ اور دیگر علوم میں انکے پاس کچھ زیادہ نہیں تھا اس لئے انکا ترجمہ انہوں نے کیا اور یہ منصور سے پہلے یعنی بنی امیہ کے عہد میں ہی شروع ہوگیا تھا۔

صفحہ ۹ "صرف شام کے شہر حیرہ میں قدیم عہد اسلامی تک وثنیت عیسائیت سے غیر متاثر رہی" اول تو یہ کہ حیرہ عراق میں واقع ہے شام میں نہیں دوم یہ کہ حیرہ کا عیسائیت سے غیر متاثر ہونا محل بحث ہے عبادی کا خاندان جو ملوک حیرہ کا میر منشی اور خاص مصاحب تھا عیسائی تھا اس کے علاوہ نعمان بن منذر اور اس کے بعد قبیصہ جو کسریٰ کی طرف سے وہاں کا والی ہوا عیسائی گنے جاتے ہیں۔

صفحہ ۱۱ "زروانی نظام (زروان عربی میں زمانہ کو کہتے ہیں)" لفظ زروان عربی کی کسی لغت میں نہیں ملتا معلوم نہیں مصنف نے کہاں سے یہ تحقیق کی ہے۔ حوالہ بھی نہیں دیا کہ کچھ پتہ چلتا۔

صفحہ ۱۳ "سب سے پہلے ضرب الامثال حکیمانہ اقوال، خطوط، وصیت نامے اور عموماً تاریخ فلسفہ کے متعلق کتابیں جمع کی گئیں اور انکا ترجمہ ہوا" یہ صحیح نہیں۔ سب سے پہلے جن چیزوں کا ترجمہ کیا گیا وہ آئین جنگ اور سیر ابطال ہیں۔ یہ تراجم اکثر زبانی قصوں کی صورت میں تھے مگر کچھ کتابیں بھی موجود تھیں اس کے بعد طب کا ترجمہ ہوا کیونکہ یہی زیادہ ضروری چیز سمجھی گئی پھر اور چیزوں کا۔

صفحہ ۱۴ "کفار کو یقین تھا کہ وہ کتاب مقدس میں زبان کی اغلاط دکھا سکتے ہیں" یہ غلط خیال ہے کفار نے قرآن کی زبان یا اس کے محاورے پر کبھی اعتراض نہیں کیا بلکہ اکثر شہادتیں ایسی ملتی ہیں کہ انہوں نے بادل ناخواستہ اس کے معجز نما طرز ادا کا اعتراف کیا۔ اسی سلسلے میں مصنف لکھتا ہے کہ "اس لیے پرانے اشعار اور بدویوں کے روزمرے سے مثالیں جمع کی گئیں تاکہ قرآنی عبارت کی صحت ثابت کی جائے" یہ بھی صحیح نہیں۔ اشعار جاہلیتہ سے تفاسیر وغیرہ میں جو استشہاد کیا گیا ہے اسکا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کی

صحت زبان کی دلیل بہم پہنچائی جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی لفظ یا محاورے کے معنی اور مفہوم کا یقینی تعین ہو سکے

صفحہ ۲۰ "کہا جاتا ہے کہ پرانے رومی صوبوں یعنی شام اور عراق میں بہت دن تک زیادہ تر روما کا قانون چلتا رہا" یہ دعوٰے بے دلیل ہے اسکا بالکل پتہ نہیں چلتا کہ مسلمانوں کے قبضے کے بعد ان صوبوں میں پرانا قانون باقی رہا ہو۔ بخلاف اس کے مسلمان جہاں جاتے تھے فوراً قرآن اور سنت رسول پر عمل شروع کر دیتے تھے اور حسب ضرورت اجتہاد بھی کرتے تھے۔

صفحہ "ان کی (حدیثوں کی) صحت کے جانچنے کے اصول مدون کئے گئے لیکن ان اصولوں کی ترتیب میں روایات کی خارجی صحت اور سودمندی پر بہ نسبت منطقی استقامت اور تاریخی صحت کے زیادہ زور دیا گیا"۔ یہ صحیح نہیں تاریخی صحت کا تو احادیث کی جانچ میں خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور فن اسماء الرجال کی بنیاد اسی طرح پڑی۔

اس صفحہ پر علم الفقہ سے بحث کرتے ہوئے قیاس کی جو دو صورتیں بیان کی گئی ہیں وہ واضح نہیں ہیں عموماً قیاس کی وہی صورت ہے جسے منطقی قیاس (قیاس العلۃ) کہتے ہیں یعنی کسی ایک یا چند چیزوں سے علت تلاش کرکے اس کی بنیاد پر حکم عام کیا جائے۔ دوسری صورت قیاس الشبہ یا تمثیل کی ہے یعنی علت عام نہیں نکالی جاتی بلکہ محض مشابہت کی بنا پر حکم لگایا جاتا ہے۔

یہانتک تو خود مصنف کے بعض خیالات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ترجمے اور کتابت کی بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

صفحہ ۲۰۰ "آخر کار سنہ ۵۰۲ء میں شیعوں کی سلطنت ایران میں قائم ہونے کے بعد سنیوں کی اور ان کی دائمی کشمکش کا خاتمہ ہوا"۔ صحیح غالباً ۱۵۰۲ء ہے ایک ہندسہ کتابت میں چھوٹ گیا ہے۔

صفحہ "ترجمہ کا کام منصور کے زمانہ میں فرازی نے ہندی علماء کی مدد سے کیا" غالباً صحیح فزاری ہے۔

صفحہ ۱ "برس اعظم کی کتاب الخیہ" غالباً کتاب الخیر صحیح ہے۔

صفحہ ۱ "غیر طبیعات" صحیح طبعیات ہے اسی طرح "طبیعی" کے بجائے طبعی ہونا چاہئے۔

صفحہ ۲۰ "وہی تحریم جو محمد (صلعم) اپنے زمانے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ کی کرتے تھے مسلمان علما یونانی علمی تصانیف کی کرتے تھے" یہاں لفظ تحریم کے بجائے لفظ احترام ہونا چاہئے اگر سیاق و سباق کا لحاظ رکھا جائے تو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ان کتب مقدسہ کا پڑھنا حرام سمجھتے تھے حالانکہ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ وہ انکی عزت کرتے تھے۔

صفحہ ۲۴ "لیکن یہ بھی اس کے ساتھ ہے کہ مرادف الفاظ کی کثرت کے سبب سے (عربی زبان) ارسطو کے اصول کی، کہ علوم صحیحہ میں مرادف الفاظ کا استعمال جائز نہیں ہے، خلاف ورزی کرتی ہے " مرادف کے بجائے مترادف کا لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ علوم صحیحہ میں مترادف الفاظ کے استعمال سے کیا نقص واقع ہو سکتا ہے۔ غالباً مصنف کا مطلب مشترک الفاظ سے ہے جو متواطی بھی کہلاتے ہیں۔ مترادف الفاظ تو وہ ہیں جو ایک ہی معنی کے لئے مستعمل ہوں بخلاف اس کے مشترک یا متواطی وہ الفاظ ہیں جو ایک سے زیادہ معانی اپنے اندر رکھتے ہوں ان کا استعمال البتہ علوم صحیحہ میں التباس کا باعث ہو سکتا ہے لیکن یہ عربی زبان میں ہی کوئی خاص بات نہیں ہے دوسری زبانوں میں بھی یہ صورت موجود ہے اور سیاق و سباق یا مخصوص ترکیب سے انکے معنی کا تعین ہو جاتا ہے۔

صفحہ ۳۸ تفرہ صحیح طفرہ۔ صفحہ ۳۹ معر؟

صفحہ ۴۸ ابو العلا المری صحیح المعری۔ صفحہ ۴۹ و ۵۰ "حریری کا ہیرو نقیر اور سیاح ابو سعید زروقی" صحیح ابو زید سروجی۔

صفحہ ۵۱ تعلموا الناس علی قدر عقولہم، صحیح کلموا الناس۔

صفحہ ۸۷ ابو بسر متے صحیح ابو بشر متی بن یونس۔ صفحہ ۱۲۵ ابجاری صحیح ابہری۔

صفحہ ۱۲۷ عبداللہ بن ماسرہ صحیح مسرہ۔ صفحہ ۱۲۹ فیض صحیح فاس۔ عربی میں اس شہر کا نام فاس ہے جسے انگریزی میں Fez کہتے ہیں۔

صفحہ ۱۲۹ "وائے برحال افلاطون اور سقراط کے" آخر میں کے زائد ہے یوں ہونا چاہئے وائے

برحال افلاطون وسقراط
صفحہ ۱۴۸ ابن سیین صحیح ابن سیعین۔

المحمود ۱ | یہ ماہوار رسالہ مدینۃ العلوم دیوبند سے بیادگار شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ زیر سیادت مولنا شبیر احمد صاحب عثمانی مولوی محمد یحیٰی صاحب صدیقی تھانوی کی ادارت میں ماہ گذشتہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اسکا پہلا نمبر ریویو کے لئے موصول ہوا۔ حجم دو جز لکھائی چھپائی اچھی اور کاغذ اوسط درجہ کا ہے قیمت سالانہ ۶؍ مع محصولڈاک۔ مقام اشاعت کتب خانہ عثمانیہ دیوبند۔ اور مقصد علم۔ دین اور اصلاح ہے۔

دیوبند تقریباً نصف صدی سے جب سے وہاں کا مدرسہ قائم ہوا ہے اچھے اچھے علماء و فضلاء کا مرکز رہا ہے اور ہے۔ ایسے علمی مقام سے مسلمانوں کی صحیح دینی رہنمائی کے لئے ایک اچھا رسالہ نکالا جاسکتا تھا۔ مگر ملک کی بدقسمتی سے وہاں سے جو رسالہ نکالا گیا یعنی القاسم اس نے اہل علم کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہ پیدا کی۔ اور طالب علمانہ حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اب اسی مرکز یعنی دیوبند سے یہ دوسرا رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ سابق تجربہ کی بنیاد پر اس سے بھی کچھ زیادہ توقعات قائم کرنا مشکل ہے لیکن مولانا شبیر احمد صاحب کی سرپرستی بیشک کچھ امید دلاتی ہے کہ یہ کوئی کام کریگا اور کچھ نفوذ و اثر دلوں میں پیدا کر سکے گا۔ چنانچہ اس پہلے نمبر میں مولنا کا لکھا ہوا ایک مضمون ارہاصات کے عنوان سے اچھا خاصا درج ہوا ہے۔

لیکن مضمون نگاری اور مفید مضمون نگاری جس سے امت اسلامیہ کو صحیح علمی فوائد پہنچیں آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ اسمیں بہت تعمق و تفکر کی ضرورت ہے اور کتابوں سے صرف روایات کا درج کردینا کافی نہیں چنانچہ مضمون مذکورہ بالا میں مولنا موصوف نے قریش عرب کی تفضیل پر ایک حدیث کتب سیر سے درج کی ہے کہ بنی نوع انسان کی جبریل نے تقسیم کرتے کرتے قریش کو چن لیا۔ اسمیں اللہ تعالیٰ نے مجھکو (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیدا کیا۔

مولانا کا فرض تھا کہ لکھنے سے پہلے وہ اس حدیث کی صحت کو جانچ لیتے۔ اس کے بعد ان روایات

وہ بھی دیکھئے جن سے تمام انسانی برادری یکساں ثابت ہوتی ہے اور قرآن کریم کی تعلیم بھی پیش نظر رکھتے کہ محض آب و گل پر کسی قبیلہ یا انسان کے شرف کا مدار رکھا گیا ہے یا تقوے پر۔ جن کتب سیر سے انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے انہیں سرور عالم کا وہ خطبہ بھی درج ہے جو حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی الناس کلھم من آدم وآدم من التراب	نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر سارے آدمی آدم سے پیدا ہوئے ہیں اور آدم خاک سے۔

دراصل آنحضرت کی بدولت قریش کو شرف حاصل ہوا ہے نہ کہ قریش کی بدولت آنحضرتؐ کو۔ پھر کسی آیت یا روایت سے جبریل کا یہ شیوہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ وہ انسانی اقوام اور قبائل کی جانچ کرکے منتخب قبیلہ کی تعین کریں کہ اس میں سے رسول پیدا کیا جائے۔ الغرض اس روایت میں بہت کچھ تامل کی ضرورت ہے۔

شذرات

آئندہ مہینہ کا "جامعہ" تاسیس نمبر کے نام سے خاص اہتمام سے نکالا جائے گا۔ انشاء اللہ قارئین کرام مضامین نظم و نثر کے لحاظ سے اور ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے اسے بہت پسند کریں گے۔ حجم ۱۰ جزء کے قریب ہوگا۔ اور چھپائی ٹائپ میں ہوگی تاکہ ٹائپ کی عمدہ چھپائی کا ایک نمونہ نظر کے سامنے ہو اور یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ رسالہ آئندہ ٹائپ میں چھپے گا یا لیتھو میں۔ بعض مضامین کے ساتھ نقشے وغیرہ بھی ہوں گے جن کا بلاک بنوایا جائیگا۔ ہمارے قارئین کے علاوہ جو حضرات اسے خریدنا چاہیں گے۔ اُن کے لئے قیمت ایک روپیہ ہوگی۔

جناب مدیر سچ اپنے ۲۳ ستمبر کے پرچہ میں شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے اُن کی خیر خواہی کو نکتہ چینی سمجھا اور جواب تعریض کی صورت میں دیا۔ ہم پر منحصر نہیں جامعہ کے اندر اور جامعہ کے باہر اکثر حضرات کا خیال ہے کہ جناب مدیر کے پچھلے مضامین سے جامعہ پر نکتہ چینی اور تعریض ہی نہیں بلکہ اس کی کھلی ہوئی مخالفت ظاہر ہوتی ہے اسی لئے "جواب" کی ضرورت ہوئی اور جواب میں تعریض کا پہلو بھی رہا لیکن چونکہ جناب مدیر فرماتے ہیں کہ آپ جامعہ کے مخالف نہیں اور بعض ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کے مورد عتاب فقط جامعہ کے دو ایک اساتذہ اور طلبہ ہیں اس لئے ہمارے رسالہ کو اس بحث میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر جناب مدیر جامعہ ملیہ کی نسبت وہی خیالات رکھتے ہیں جو آپ نے ۲۳ ر کے پرچہ میں ظاہر فرمائے ہیں تو ہمیں با وجود اختلاف خیال کے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں۔

بیا کہ نوبت صلح است و آشتی و صفا
کہ با تو نیست مرا جنگ و ماجرا حافظ

جناب مولانا سید سلیمان ندوی مدیر معارف ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ نے قوم سے جامعہ کی سفارش کی ہے اور اُس کی مدد کیطرف توجہ دلائی ہے۔ مولانا کو صرف یہ "اندیشہ" ہے کہ جامعہ کے عام طلبہ میں جنہیں عربی اور علوم اسلامی کی محض ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے مجتہدی کا شوق نہ پیدا ہو جائے۔ ہم مولانا کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اس جہل مرکب کی مثال اگر تلاش کیجائے گی تو جامعہ کے اندر نہیں بلکہ جامعہ کے باہر ملیگی۔ انگریزی خوانوں کا جو نیا ٹائپ پچھلے دس سال میں پیدا ہوا ہے اور جسے مذہبی تعلیم کا شوق ہے مگر اس کے بوجھ کا اپنے ذہن کا مرکز ثقل قائم نہیں رکھ سکتا بلکہ سطحی معلومات کی بنا پر مذہبی مسائل میں علمائے دین سے کج بحثی کیا کرتا ہے وہ جامعہ میں معدوم ہے۔

اب رہا ہندویت سے متاثر ہونیکا اندیشہ اُس کی اصلی صورت یہ ہے کہ جامعہ کے مخالف جس چیز کو۔ "ہندویت" کہتے ہیں وہ اصل میں "ہندیت" ہے، ملکی آزادی کی خواہش، ملکی ہمدردی، ملکی لباس کا شوق یہ جامعہ کا طرۂ امتیاز ہے مگر "ہندویت" کا اثر جامعہ پر آج کیا اس وقت بھی نہیں تھا جب بادۂ سیاست کے نشے میں مدہوش حضرات ہندوؤں سے اتحاد رکھنے کے زبانی دعوے اس انداز سے کیا کرتے تھے جو سراسر خودداری کے منافی تھا۔ جامعہ والے جس نقطۂ اعتدال پر اُس زمانے میں قائم تھے آج بھی ہیں۔

ہم مولانا سے اس معاملہ میں بالکل متفق ہیں کہ مغرب کا ذہنی استیلا اس کے سیاسی استیلا سے زیادہ مہلک ہے شکر ہے کہ مولانا نے اس فتنہ کے زیر اثر بہ ہیئت مجموعی جامعہ کو نہیں پایا بلکہ جامعہ کے ایک طالبعلم کو جو یورپ میں مقیم ہے ہم مولانا کو یقین دلاتے ہیں اس معاملہ میں جامعہ کے طلبہ جو یورپ میں مقیم ہیں نصیحت کے مستحق ہوں مگر شبہ کے نہیں کیونکہ انکے دل میں اپنے مذہب کی سچی وقعت اور محبت موجود ہے اس لئے باوجود غیروں میں رہنے کے وہ انشاء اللہ اپنے رہیں گے۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا باوجود اپنے کثیر مشاغل کے کبھی کبھی جامعہ میں تشریف لاکر یہاں کے حالات خود ملاحظہ فرمایا کرینگے۔ مولانا کا دہلی کے قریب کے شہروں میں بعض تعلیمگاہوں میں آنا اور ہمارے یہاں نہ آنا ہمارے لئے سخت شکایت کا باعث ہے۔ مانا کہ مولانا کو دوسروں سے بھی تعلق ہے لیکن جامعہ سے جو رشتہ ہے اُس کی کچھ اور ہی شان ہے۔

آسام میں ایک انجمن علمی تحقیقات خصوصًا تاریخی تحقیقات کے لئے کامروپ انوسندھن سمیتی کے نام سے قائم ہوئی ہے اس کے سکریٹری پروفسر س۔ک۔ بھوئن صاحب ایم۔اے۔ بی۔ایل ہیں۔ یہ انجمن ۱۹۱۲ء میں بمقام گوہاٹی قائم ہوئی تھی۔ پہلے کامروپ کے ضلع میں پرانی پوتھیاں پتھروں کے کتبے ایسی بند وقیں اور توپیں جن پر عبارت کندہ ہی جمع کرتی رہی اور اب دوسرے ضلعوں میں اسی طرح کی قدیم چیزیں جمع کررہی ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک عارضی عمارت میں رکھ دی گئی ہیں اور کوشش کیجارہی ہے کہ ایک مستقل کتب خانہ اور عجائب خانہ کی بنیاد پڑجائے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے پروفسر ایڈون۔ر۔ الف سیلگمان کی زیر نگرانی "علوم اجتماعی" کی ایک معلمہ تیار ہورہی ہے۔ اس میں تاریخ اقتصادیات، سیاست مدن، اجتماعیات، علم الانسان، نفسیات، علم الاخلاق، علم حیات، تعلیمات، جمالیات، فلسفۂ مذہب اور فلسفۂ قانون کے تقریبًا اسی لاکھ الفاظ کی تشریح کی جائے گی اور اندازہ کیا جاتا ہے کہ دس سال میں یہ کام ختم ہوجائیگا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ایسی قاموس کی بہت سخت ضرورت ہی جس میں "علوم اجتماعی" پر جنہیں علوم ذہنی کہنا زیادہ مناسب ہوگا تبصرہ کیا جائے اور ان علوم پر ارباب فکر نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں انہیں یکجا کردیا جائے اس لئے پروفسر سیلگمان کی یہ کوشش لائق تحسین ہے لیکن معاملہ کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ علوم ذہنی کے مسائل ایسے قطعی اور معینہ قوانین کے ماتحت نہیں جن پر کل ارباب فکر

کا اتفاق ہو سکے یہ چیزیں محض عقل سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ اکثر صورتوں میں ان کا دار و مدار وجدان اور روحانی احساس پر ہے اس لئے انہیں مختلف قومیں اپنی ذہنی خصوصیات اور تاریخی روایات کی بنا پر مختلف طریقوں سے حل کرتی ہیں۔ خود یوروپ میں جس کا تمدن ایک لحاظ سے ہم رنگ ہے اس قدر اختلاف خیال ہے کہ کوئی ایک کتاب علوم ذہنی کے مسائل پر جامع اور مانع بحث نہیں کر سکتی اب رہیں ایشیائی قومیں اگر وہ اپنی آزادی فکر اپنے سیاسی حاکموں کے ہاتھ بیچ نہ چکی ہوں تو ایسی کتابیں اُن کے لئے محرک خیال ہونے کی حیثیت سے ضرور قیمت رکھتی ہیں۔ لیکن اُن کی ذہنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ یہ سائنس کا میدان نہیں جس میں دوسروں کی زلہ خواری سے ہمارا کام چل جائے ان مسائل کو اگر حل کرنا ہے تو سوائے اس کے چارہ نہیں کہ ہم خود غور و فکر کی زحمت گوارا کریں۔

علاوہ ازیں یوں بھی قاموس اور معلم صرف ان لوگوں کے لئے مفید ہیں جو انہیں محض وسعت معلومات کے لئے استعمال کرتے ہیں اپنا ہادی اور رہنما نہیں بناتے۔ جو لوگ علم کے راستہ کو تقلید کے سہارے طے کرنا چاہتے ہیں۔ اُن میں یہ کتابیں ذہنی کاہلی اور جمود پیدا کرتی ہیں اور اُنکی کثرت ترقی کی علامت نہیں بلکہ تنزل کا پیش خیمہ ہے۔

ماڈرن ریویو میں بحوالہ رسالہ "بودھ مذہب انگلستان میں" اُس عام جہالت کی ایک ایک عجیب مثال نقل کی گئی ہے جو ایشیا کی بابتہ یوروپ میں پائی جاتی ہے۔ لندن میں بودھ مذہب والے ایک جلسہ کرانا چاہتے تھے جس کے لئے انہیں ایک ہال کی تلاش تھی انہوں نے "غیر مقلد" عیسائی فرقہ کی ایک عمارت اس مقصد کے لئے مانگی۔ پادری صاحب نے جو اس عمارت کے نگراں تھے دریافت کیا کہ یہ بودھ لوگ عیسائیوں کے کس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہا گیا کہ یہ عیسائی نہیں ہیں تو انہوں نے ہال کے دینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ہم کیتھولک عیسائیوں

تک کو اپنے یہاں جلسہ نہیں کرنے دیتے۔ اسی طرح لندن کے ایک دوکان میں ایک چینی دیوتا کا بت بکتا ہے جس پر لکھا ہے "چین کا لڑائی کا دیوتا بودھ"۔ بودھ کو لڑائی کا دیوتا قرار دینا یہ ستم ظریفی قابل داد ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سے

باہتمام محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) رجسٹرڈ پبلشر شائع ہوا

(مطبوعہ جید برقی پریس بلیماران دہلی)

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جلد ۹	جمادی الاول و جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۶ھ مطابق اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۲۷	نمبر ۴، ۵

فہرست مضامین

بلاغت قرآن

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القرآن لا یاتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا۔

(ای پیغمبر ان لوگون سی کہو کہ اگر آدمی اور جنات اس بات پر مل جائین کہ اس قرآن کی مثل اور کلام بنا لائین باہم اس جیسا نہ بنا سکین گی اگرچہ ان میں سی ایک کی پشتی پر ایک کیون نہ ہو۔)

علمائی متکلمین کی اس امر مین بہت سی اقوال ہین۔ قرآن مین وہ کون سی صفت ہی جسکی بناء پر یہ دعوی کیا گیا ہی؟ ان اقوال کی دیکھنی سی معلوم ہوتا ہی کہ کم و بیش فصاحت و بلاغت سب کی نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہی۔

نزول قرآن کی وقت غیر مسلمون کی رائی۔

ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہ کی ابن عم جو ایک معمر نصرانی بزرگ تھی جاہلیت ہی مین شرک سی تائب ہوچکی تھی۔ جب قرآن کی اول اول آیات سنین تو کہا یہ کلام اس طرز کا کلام ہی جیسی موسی پر اترا تھا۔ ولید بن مغیرہ حالانکہ کافر رہا اور کفر ہی پر مرا اسکی الفاظ ذیل کتب ادب مین منقول ہین:

ان اعلاہ لمورق، وان اسفلہ لمعذق، وان لہ لطلاوۃ، وان علیہ لحلاوہ

(اس کا اوپر کا حصہ پتہ والا سرسبز ہی اور اسکا حصہ زیرین پھل والا ہی اس مین ایک رونق پائی جاتی ہی، اور اس پر ایک شیرینی ہی)

صحابہ مین جو نہایت سلیم الفطرت لوگ تھی ان مین سی اکثر کا حلقہ بگوش اسلام ہو نیکا سبب صرف اس کلام مقدس کی آیات کا سننا اور اس سی انتہا درجہ کا متاثر ہونا ہوا ہی۔ قرآن مجید کی بیشمار صفات مین سی یہاں ہمارا موضوع بحث صرف فصاحت و بلاغت ہی۔ اس لئی ایک نہایت مختصر سی فصاحت اور بلاغت کی تعریف مناسب معلوم ہوتی ہی۔

فصاحت: کلام کا هر مفرد لفظ ثقل اور اجنبیت سی پاك هو مفردات، الفاظ کی ترکیب و بندش اسقدر برمحل و موقع هو که الفاظ نگینوں کی طرح جڑی هوں اور غیر مناسب تقدیم و تاخیر نه هو جو مخل بالفهم هو.

بلاغت: کلام مین وصف فصاحت کی بعد یه صفت بهی پائی جائی که وه محل و موقع کی مناسب هو، مثلاً کہین کلام مین ایجاز هو کہین اطناب (مشرح و مفصل گفتگو). ارسطو کی کتاب « بلاغت » میں جو معیار بلاغت کا لکها هی اسکی دیکهنی سی معلوم هوتا هی گویا یه کتاب قرآن کو دیکهکر لکهی هی.

سلف مین قرآن کی بلاغت پر اکثر لوگوں نی خامه فرسائی کی هی. قاضی ابوبکر باقلانی کی کتاب « اعجازالقرآن » جو اهل مصر نی اتقان للسیوطی کی حاشیه پر چهاپی هی اس موضوع پر نهایت اچهی هی اگرچه بهت مختصر هی اور مصنف نی کہین کہین اساطین بلاغت کی کلام پر تعصب سی جرح کی هی. امام رازی لکهتی هین که مین نی « دلائل‌الاعجاز » ایك کتاب اس موضوع پر لکهی هی.

زمخشری کی تفسیر کشاف قرآن مجید کی ایسی تفسیر هی جس مین تقریباً فصاحت و بلاغت کا مضمون مد نظر رکها گیا هی ابن خلدون کی رائی هی اور هماری نزدیك ٹهیك هی که فن بلاغت کی بیشمار نکتی کشاف سی ماخوذ هین ابن خلدون کی رائی مین اهل مشرق کی نظر اس فن میں زائد عمیق هی. کشاف مین اعتزال کا رنگ هی جسکا ایك حد تك تدارك بیضاوی نی کردیا مگر کشاف کی دیگر خوبیوں کا تتمه بیضاوی مین پته بهی نهین. علامه طیبی کی کتاب « التبیان » بهی قرآن مجید کی بلاغت کیلئی ایك عمده ذخیره هی.

قرآن مجید کا مقابله کرنی والی.

نضر بن حارث نی معیار حسن کلام داستان گوئی قرار دیکر رستم اور اسفندیار کی قصوں کو مقابله مین پیش کیا، ابن‌المقفع نی کلیله و دمنه و دیگر مزخرافات پیش کین، قابوش و شمگیر اور معری کا نام بهی اس فهرست مین هی، مؤخرالذکر کا

مثلاً سورہ ایک آیت کی معارضہ مین آخر مضمون مین آئیگا۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید کی معارضہ مین جس جس نی جو کہا وہ قرآن مجید کی سامنی مضحکہ خیز اور ہزلیات سی کم نہین، باوجود اسکی کتب ادب مین محفوظ ہی۔

مسیلمہ کذاب کی عبارت ناظرین کی دلچسپی کی لئی درج کیجاتی ہی اسی طرح کی معری کی بعض فقری بہی کتب ادب مین منقول ہین۔

انا اعطیناک الجواہر۔ فصل لربک وجاہر۔ والطاحنات طحنا۔ والخابزات خبزا

(ہم نی تجہکو جواہر دئی اپنی رب کی لئی نماز پڑہ اور اعلان کر، قسم ہی پیسنی والیون کی اور قسم ہی روٹی پکانیوالیون کی۔)

ایک اور عبارت ہی جو کلام اعلی سی کلام ادنی کی مقابلہ کرانی میں ضرب المثل مستعمل ہی

الفیل ما الفیل و ما ادراک ما الفیل، له خرطوم طویل و ذنب اثیل.

(ہاتہی! کیا ہی ہاتہی اور تجہی کیا خبر کہ کیا ہی ہاتہی، اوس کی لانبی سونڈ ہوتی ہی اور کچہیدار دم)

عبارت مین نحو کی غلطی نہین، الفاظ کی بندش اور طرز قرآن کا سا ہی مگر روح بلاغت مفقود۔ «فکر ہر کس بقدر ہمت اوست». یہ گویا الحاقة ما الحاقة اور القارعة کا جواب ہی۔ وما ادراک کی لفظ سی پوچہنا اور بہر تفصیل کرنا شان قیامت کی مناسب ہی یا ہاتہی جیسی مشہور اور مبتذل چیز جسکو کم و بیش عرب کا بچہ بچہ جانتا تہا۔

صفحات ذیل مین ایک نہایت مختصر سا خاکہ قرآن کی بلاغت کا ہدیہ ناظرین کیا جاتاہی۔ افسوس کہ ہم نی یہ مضمون ایسی مقام پر لکہا ہی جہان ہماری پاس کافی کیا معمولی سا سامان بہی نہین۔

امام رازی لکہتی ہین کہ چونکہ قرآن مین وہ امور نہین بیان کئی گئی جس مین متکلم اپنا زور کلام اور حسن بیان دکہلاتی ہین مثلاً کوئی سمان باندہنا جنگ کی جزئیات کا خاکہ کہینچنا کسی کرتب یا ما فوق العادت واقعہ کی تفصیل،

بلکہ اکثر اس قسم کی امور ہین جو عموماً فصاحت اور بلاغت کی منافی ہوتی ہین. مثلاً ترک دنیا، توجه الی الاخرة وغیرہ، اجتناب قبائح، پابندی احکام جیسی خشك امور ہین. شعر مین فصاحت کی لئی تو جھوٹ آب و نمك کا کام دیتا هی جس سی قرآن بالکل مبرا و منزہ هی چنانچه بعض شعرا مثلاً لبید بن ربیعه او حضرت حسان بن ثابت نی حب سی اسلام قبول کیا اسوقت سی ان کی شعر مین وہ لطف باقی نہین رہا. روزمرہ کا تجربہ هی که منجھی ارگ بہت کم فصیح و بلیغ ہوتی ہین، قران کی فصاحت اول سی آخر تك یکساں اور ہر آیت و جملہ جان فصاحت و روح بلاغت هی، بر خلاف دیگر بلغاء کی کلام کی که اون کی یہان بعض حصہ ثریا پہنچا ہوا هی، بعض متوسط او بعض بہت ادنی. عموماً فصحا و بلغاء خاص خاص اصناف سخن مین جوہر فصاحت دکھلاتی ہین دوسری اصناف مین بعض اوقات عوام سی بھی فرو تر ثابت ہوتی ہین. سعدی، خواجه حافظ، خسرو، نظیری غزل کی مرد میدان ہین تو خاقانی اور عرفی قصیدہ مین بی نظیر. سودا قصیدہ مین همسر نہین رکھتی تو میر غزل مین سب کی سرتاج ہین یہی حال عرب کی شعرا کا هی امرءالقدس عورت اور گھوڑی کی بیان مین سب سی بڑھ چڑھ کر اعشی وخمریات اور ممدوح سی صلہ طلب کرنی اور لبھانی مین، زهیر کو جب کسی سی امید ہوتو اعلی سی اعلی شعر اس سی نکلتی ہین. بر خلاف اس کی قران مجید مین جو مضمون ادا کیا گیا هی اس کی قریب پهونچنی سی بھی بشر عاجز هی کہین ملاطفات اور شفقت کی باتین ہین. کہین زجر وتوبیخ. کہین قصہ هی تو اس کا بیان محیرالعقول. جس طرز کی بات ویسا هی بیان: یہی سبب هی که اکثر یورپین مستشرقین مثلاً کارلائل وغیرہ کہتی ہین که روانی و یکسانی نہین هی.

بہر حال کلام بلیغ مین تین جہتوں سی بحث کی جا سکتی هی: انتخاب مفردات، بندش وترکیب، تیسری اسلوب و طرز ادا. ابك مختصر سا نمونه تینوں امور کا آئندہ صفحات مین دینگی اور آخر مین کلام عرب کا تھوڑا سا وہ نمونه دینا ضروری سمجھتی ہین جہاں قران کا مضمون کسی دوسری کلام مین بھی پایا جاتا ہو. ناظرین کی ادنی دلچسپی خود فیصلہ کر لی گی.

انتخاب مفردات

بعض جگه قران مین کسی چیز کو بطور خطاب کی کسی خاص لفظ سی یاد کیا هی. اس لفظ مین اس قدر زور اور اس شی کی حقیقی اور ذاتی صفات کا اس طریق پر بیان هی که بهت سی جملون سی مستغنی کر دیتا هی.

متاع : چند روزه فائده اٹهانی کی چیز (دنیا کی لئی استعمال هوا هی).

سکن . چین اور جس چیز سی چین حاصل هو.

ان صلاتك سکن لهم (تیری دعا اون کی لئی اطمینان کی چیز هی). مسلمانون نی لئی رسول اللّٰه صلعم کی لئی دعائی خیر جیسی کچهه اطمینان بخش هو سکتی هی وه ظاهر هی.

من بیوتکم سکنا : (تمهاری گهر کو چین کا (ذریعه) بنایا)

جعل اللیل سکنا : (رات کو چین (کی چیز) بنایا

لباس : ظاهری معنی معلوم هین. قران مجید مین بطور استعاره کئی چیزون کو اس خطاب سی یاد کیا گیا هی جن مین پرده پوشی اوربعض جگه تلازم وجه مناسبت هی. لطف اس کا اهل ذوق خود سمجهین گی. ملاحظه هو :

جعلنا اللیل لباساً : (همنی رات کو پرده بنایا) ایك لطیفه یاد آگیا. بعض علماء نی اس آیت پر یه مسئله استنباط کیا هی که رات کو اگر کوئی شخص بلا کپڑون کی نماز پڑهی تو پڑه سکتا هی.

لباس الجوع والخوف : استعاره استعمال هوا هی عرب بولتی هین تدرع الفقر (فقر کا کرته پهنا) ولبس الجوع (فقر کی زره پهن لی اور بهوك کی پوشاك بنالی) عرب کا محاوره هی. راغب کهتی هین : جعل الجوع و الخوف لباساً علی التجسم والتشبیه تصویراله (سمان باندهنی کی لئی اور مشکل بنانی کی لئی بهوك کو لباس قرار دیا هی.

رحمة : باران کو رحمت کا خطاب عطا ہوا. اسکی ساتھہ لفظ ینشر پھیلا دیتا ہی. وسعت رحمت اور صفت جود کا ثبوت ہی. ملاحظہ ہو: ورحمتی وسعت کل شی (میری رحمت ہر چیز کو سمائی ہی). لیکن باران رحمت کا عموم و شمول لفظ نشر ہی کا مقتضی ہی. مخلوقات مین سی بہت بلکہ اکثر اشیاء کو باران رحمت سی استغنا ہی. لیکن رحمت کی حاجت سبکو ہی.

هنئی مری : (رچتا پچتا) دونوں لفظ ساتھہ استعمال ہو گئی ہین، هموزن و تقریباً ہم معنی ہین. عربی مین مری اس نالی کو کہتی ہین جس سی معدہ مین غذا جاتی ہی، لہذا مری وہ چیز جو اس نالی مین نہایت آسانی سی چلی جائی. ہی وہ چیز جو کھانی کی بعد خوب ہضم ہو اور مضر نہ ہو. یہ لفظ اس موقع پر استعمال ہوئی ہین کہ اگر عورتین کچھہ خوش دلی سی مہر معاف کردین تو اوس کو کھاؤ رچتا پچتا. زمخشری کہتی ہین . فکلو هنیئاً مریا وهذا عبارة عن تحلیل والمبالغه فی الاباحة وازالةالتبعة (اس سی حلال قرار دینا مراد ہی اور حلت مین مبالغہ مقصود ہی کہ کسی قسم کا حرج نہین) گویا آخرت تو کیا دنیا مین بھی اس مین کوئی عیب نہین.

قیام : (دار ومدار) مال و دولت کو فرمایا گیا. اس لفظ کا اشتقاق قام یقوم سی ہی قیام و قوام وہ چیز جس سی کسی جز کا وجود وابستہ ہو.

امام راغب کہتی ہین والقوام اسم لما یقوم بهالشئی ای نثبت (اس کا نام ہی جس سی کوئی شی قایم رہی) اسی طرح ایك جگہ مال کو خیر سی تعبیر کیا دولت کو اس سی بہتر خطاب نہین مل سکتا. کعبہ کو بھی قیاما للناس فرمایا جعل اللّٰہ الکعبة قیاماللناس، کیونکہ اس سی دین و دنیا کی امور وابستہ ہین، قیامت کی اسماء بیشمار ہین مثلاً قارعہ : کھنکھنانو الی. حاقه : شدنی واقعہ وغیرہ کس قدر اپنی مسمی کی اوصاف پر دلالت کرتی ہین. اسی طرح فرشتوں اور ہواؤں و دیگر مناظر قدرت وغیرہ کو مختلف صفات سی آخیر کی سورتوں مین یاد کیا گیا ہی. والذاریات، والمرسلات، والصافات وہاں یہ حقیقت واضح طور پر نمایاں ہی. قران کو نور، ہدی، رحمة کہا گیا.

چند مرکبات اضافی و توصیفی ملاحظہ ہوں. اس مین بعض ایسی ہین

جو اسم ذات کی طرف مضاف ھین.
فضل اللہ : مراد قرآن شریف
رحمۃ اللہ : " (کہین جنت کو بھی کہا گیا ھی)
زینۃ اللہ : تمام زینت والی چیزوں کو زینۃ اللہ کہنا لفظ اللہ کا لگجانا گویا اس کی حلت کی گارنٹی ھی چنانچہ ارشاد ھوتا ھی: من حرم زینۃ اللہ (کس نی اللہ کی زینت کو حرام کیا) کلوامن رزق اللہ : (اللہ کی رزق کو کھاؤ.)
قرۃ العین : (آنکھوں کی ٹھنڈک) جنت کی لئی فرعون کی بیوی (حضرت آسیہ) فرماتی ھین کہ یہ بچہ قرۃ العین لی ولك (میری اور تیری آنکھہ کی ٹھنڈك ھی) اس کی مقبولیت محتاج بیان نہین.
ارذل العمر : (بدترین حصۂ عمر) (اخسہ واحقرہ) (کشاف)
مقعد صدق : سچی (عزت کی) جگہ.
قدم صدق (بڑی پایگاہ).
ابن السبیل : راستہ کا بیٹا (مسافر)
احسن تقویم (بہتر سی بہتر ساخت)
احسن الحدیث : (بہتر سی بہتر بات)
مختصر جملی مع کثرۃ المعانی ملاحظہ ھون.

اس عنوان کی تحت مین کچہ لکھنی سی پہلی یہ بات ذھن نشین رکھنی چاھئی کہ قرآن مجید مین احکام و مسائل جزئیات قصہ کی بیان کرنی مین عموما ایجاز (اختصار) سی کام لیا جاتا ھی برخلاف اس کی وعظ و عبرت اندوزی تخویف و تبشیر و تفاصیل جنت و نار و حشر و نشر کا بیان اطناب (تفصیل) سی کیا جاتا ھی طویل اور مسلسل قصہ کی دوران مین اکثر وعظ انذار کی آیات لازم و ملزوم کی طرح لگی رھتی ھین، قصہ کی صرف وھی جزئیات بیان ھوتی ھین جنسی سبق آموزی مقصود ھوتی ھی. (ایك شبہ کا ازالہ) یہ یاد رھی کہ بلاغت کی لئی ھمیشہ ایجاز و اختصار ھی ضروری نہین ھین بلکہ محل و موقع کی مناسب کہین ایجاز بہتر ھوتا ھی کہین اطناب.

ذیل مین چند آیات درج کی جاتی ھین. کمال درجہ کی ایجاز کی ساتھہ

مقصود پر غایت درجه دلالت کرتی هین.

عزیز مصر یوسف علیه‌السلام کو خرید کر اپنی بیوی سی کهتا هی اکرمی مثواه : (اچهی‌طرح رکهو). لفظی معنی هین که اس کی قیام کی عزت کرنا. نه اس قسم عبارت هی که من حضرة فلان یا من جنابه ان کی درگاه سی حکم هوا هی. مقصد انهین کی ذات سی هوتا هی اور تعظیما یون بولتی هین.

قد شغفها حباً . (محبت اس کی دل مین بیٹهه گئی). مصر کی عورتون کی زبانی زلیخا کی فریفتگی کا ذکر هی.

فیه شفاء‌للناس : (اس مین لوگون کی لئی شفا هی). شهد کی تعریف مین.

فاستقم کما امرت : (جیسا تمکو حکم دیا گیا هی ویسی هی ره راست پر رهو) لفظ استقامت کس قدر معانی پر مشتمل هی. کماامرت : (جسطرح تمکو حکم دیا گیا هی) معیار استقامت بتلایا هی.

رب زدنی علماً : (ای خدا میری علم مین ترقی دی.)

جاء‌الحق وزهق‌الباطل ان‌الباطل کان زهوقا: (دین حق آیا اور باطل نیست و نابود هوگیا باطل نیست و نابود هونی‌والا تها.) یه مختصر جمله بطور ضرب‌المثل استعمال هوتا هی

فصبر جمیل : (لهذا صبرو شکر هی بهتر هی) حضرت یعقوب اپنی صاحبزادی کی جدائی پر فرماتی هین.

والله‌المستعان : (خدا هی مدد کی امید گاه هی)

ولاتزروا وازرة وزراخری: (اور نهین بوجهه اٹهاتا بوجهه اٹهانی‌والا کسی دوسری کا بوجهه.) لفظ وازرة نی اتنی‌الفاظ کی معنی سی مستغنی کردیا اگر کوئی گنه کریگا اور اپنا قائم مقام دیگا تو قبول نه هوگا.

ومن تزکی فانما یتزکی لنفسه : (اور جو شخص سدهرتا هی تو اپنی هی لئی سدهرتا هی.)

اس طرز کی مختصر جملی بیشمار ایسی هین جو ضرب المثل هین اور عبارت مین نگینه کا کام دیتی هین اور ازلی صداقت کی حامل هین. ذیل مین چند ایسی مختصر جملی درج کی جاتی هین جن مین سی بعض نهایت نازك معا ملات مثلا

زنا شوئی وقار و متانت کا دامن نہ چھوڑتی ہوئی تمام ضروری و اہم معاملات پر روشنی ڈالتی ہوئی بیان ہوئی ہین. ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (وہ تمہاری لئی دامن کی طرح ہین اور تم چولی اون کی لئی.) ترجمہ میں چولی دامن کا ساتھ صرف تلازم پر دلالت کرتا ھی جو صرف یورپ کی زن و شوئی کا خاکہ ھو سکتا ھی. برخلاف اس کی آیت میں، انتہائی بی تکلفی بی حجابی وغیرہ وغیرہ سب پر کس خوبی سی روشنی ڈالی گئی ھی. اردو میں ایک محاورہ ھی کہ فلاں شخص فلاں کی لئی مثل ڈھکن کی ھی یعنی عیب پوش ھی، وہ مضمون بھی اس جملہ میں موجود ھی. مفسرین نی اس کی طرف بھی اشارہ کیا ھی. اس دلچسپ تعلق کی دیگر حقوق و فرائض ذیل کی مختصر جملوں میں ملاحظہ ہوں:

ولھن مثل اللذی علیھن بالمعروف (اور جیسی مردوں کا حق عورتوں پر ویسی ھی دستور کی مطابق مردوں پر عورتوں کا)

وللرجال علیھن درجہ: (ھاں مردوں کو عورتوں پر فوقیت ھی.)

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا: (اور تم ھی مین سی اللہ نی تمہاری لئی تمہاری بیبیوں کو پیدا کیا.)

لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ و رحمہ: (تم اس کی پاس چین کرو اور تم (میاں بی بی) مین رفقت و محبت رکھی)

ستر عورت اور لباس سی تن ڈھکنی کا جہاں ذکر ھی وھاں اولا تو لباس کو لفظ ریش سی جس کی معنی پرندہ کی پر کی ہین جو اس کی لئی باعث زینت و ساتر جسم ھی پھر لفظ زینت اللہ زینتکم سی تعبیر کرنا اور اخر مین فرمانا:

و لباس التقوی ذالك خیر: (اور پرہیزگاری کا لباس سب سی بہتر ھی.)

ستر عورت بھی تقوی مین داخل ھی یعنی مقصد اصلی تو تقوی ھی. اسی سلسلہ مین ایك اور لطیفہ ھی. دوسری آیت قابل لحاظ ھی جو ان لوگوں کی شان مین نازل ہوئی ھی جو بلاخرچ سفر حج کرتی تھی: وتزودوا فان خیر الزاد التقوی (توشہ لی لیا کرو کہ بہترین توشہ تقوی ھی) اور منجملہ اون امور کی جن سی تقوی حاصل ھوتا ھی سوال کرنی سی احتراز بھی ھی اور یہ بھی سمجھا گیا کہ مقصود اصلی تو تقوی ھی اور وھی توشہ کہلانی کا مستحق ھی اسی طرح ایك حدیث کا

مضمون ھی کہ پہلوان وہ ھی جو غصہ کی وقت قابو رکھی ان دونوں آیتوں مین شان بلاغت اس وجہ سی زائد نمایاں ھی کہ کسی چیز کو کسی ایسی صفت یا نام سی موسوم کیا گیا جو صحت عموماً لوگوں کی ذھن مین اس شی کی لئی ثابت نہ ھو حسی اوپر والی حدیث ھی۔ تقوی کو توشہ و لباس کوئی نہین کہتا لیکن یہان کہا گیا اور کس خوبی سی نباھا گیا۔

اس سلسلہ سی ایک گونہ تعلق رکھنی والی آیت اور درج ذیل ھی جوغزوہ بتوک مین منافقین کی نہ جانی اور معذرت کرنی کی جواب مین نازل ھوئی۔ منافقین نی ایک دوسری سی کہا: لاتنفروافی الحر (اور وہ لوگوں کو سمجھانی لگی کہ اتنی گرمی مین گھر سی نہ نکلو۔) جواب مین ارشاد ھوتا ھی

قل نار جھنم اشد حرا (ای پیغمبر اون سی کہدو) کہ جہنم کی گرمی بہت سخت ھی۔

بغیر اس طرح کہی یہ حقیقت منافقین جیسی بلید لوگوں کی سمجھہ مین کب انیوالی تھی۔ آگی ارشاد ھوتا ھی: لوکانوا یفقھون (ای کاش اون کو اتنی سمجھہ ھوتی)۔ اس کی بعد ھی متصل یہ آیت: فلیضحکوا قلیلا والیبکوا کثیرا (چاھئی کہ ھنسین کم اور روئین زیادہ) مین بھی یھی سلسلہ ھی۔

حسن بیان مع الایجاز

اس عنوان سی مراد" کوئی سماں باندھنا۔آنکھوں کی سامنی کسی غیرحاضر چیز کی اوصاف بیان کرکی دل کی آنکھوں کی سامنی پیش کرنا" نکتہ۔ سوائی امور مہتم بالشان قیامت حشرو نشر مناظر قدرت کی دیگر امور کی اگر تصویر کھینچی گئی ھی تو نہایت مختصر مگر اھم خد و خال اوس شی کی یا واقعہ کی سامنی آجاتی ھین۔ ملاحظہ ھو: دوزخی کو پیپ پلائی جارھی ھی اور وہ اس کو نہین پی سکتا۔ ارشاد ھوتاھی: یتجرعہ ولایکاد یسغہ و یاتیہ الموت من کل مکان و ما ھو بمیت (اور اوس کو وہ زبردستی چسکیاں لی لیکر پئی گا اور پھر بھی اوس کو گلی سی نہ اتار سکی گا اور موت اوس کو ھر جگہ سی آتی دکھائی دیگی اور پھر بھی نہ مریگا۔

یتجرع: گھونٹ گھونٹ کر کی پینا کبھی لذت کی لئی بھی ھوتا ھی یہان کلفت

دور کرنیکی لئی هی. و لایکاد یسیغه (اس لیئی اس کا خوشگوار هونا ناممکن هوگا) ایك اور جگه دوزخی کا حال ان لفظون مین بیان هوا هی. لایموت فیها ولا یحیی (اوس (دوزخ مین) نه وه جیتوں مین هوگا نه مردون مین).

بیان قدرت. من بین فرث و دم لبناً خالصاً سائغا للشاربین (گوبر اور خون مین سی (هم تم کو) خالص دوده پلاتی هین جس کو پینی والی آسانی سی غٹ غٹ پی جاتی هین) یہاں تفصیل مقدر کی هی جہاں سی دوده نکلتا هی. لفظ خالصا نی قدرت کی تفصیل کردی.

مناظر قدرت: کشتی کا دریا مین چلنا، بادلوں کا هوا پر سوار آنا وغیرہ نہایت عجیب و غریب اندازسی بیان کیا گیا هی، بعض جگه یه مناظر تهی بهی عجیب و غریب اور مخاطبین اولین وهی هین. بادلان اور کشتی کا بهی ذکر هی دیگر مرئیات کی جزئیات کی تصویر کی مثالین بهی موجود هین بنی اسرائیل والی گائی کی تصویر ملاحظه هو: صفراء فاقع لونها تسر الناظرین (وه گائی هو زرد اوس کا رنگ خوب گہرا هو که دیکهنی والوں کو بهلی لگی) رنگ اسی چیز هی جو سب سی پهلی مرئی چیز کا نظر کی سامنی آتا هی اور سب سی نمایاں رخ وهی هی لفظ تسر الناظرین نی حوبصورتی کا انتہائی بلاغت کی ساتهه ذکر کیا. اچها لگنا وغیرہ الفاظ سی ذکر نہین کیا گیا بلکه خوش کرنی هی دیکهنی والوں کو

بعض بعض جگه اثنائی بیان قصه کی کسی جزئیه کا ذکر هی اور مصلحت سی هی اس جزئیه کی اهم خد و خال سامنی آجاتی هین اور اختصار بهی هوتا هی. ملاحظه هو: عزیز مصر کی بیوی نا جائز مراد حاصل کرنی کی لئی حضرت یوسف کو کسی خصه مکان مین لیجاکر دهوکه سی بند کردیتی هین. ان کو معلوم هوتا هی تو نکلنی کی کوشش کرتی هین هر ایك کی کوشش هی که دروازہ پر پہلی وہ پہونچی.

واستبقا الباب: (اور دونو بهاگا بهاگ دروازہ پر پہنچی) یہاں چار امور هین. (۱) دروازہ (۲) حضرت یوسف کا دروازہ کی طرف بهاگنا اپنی خلاصی کی لئی (۳) امرة العزیز کا پیچهی تعاقب کرنا (٤) هر ایك کی اپنی ساتهی سی زاید تیز رفتاری. یه سب باتین اور دو لفظ.

اسی کی آ گی ھی: وقدت قمیصه من دبر (أور بھاگتی کی پکڑنی مین) عورت نی اس کا کرتا پیچھی سی پھاڑ دیا: ایك سوال ھوتا ھی که ایك فعل شنیع کی لئی جو تدابیر کی گئین ان کی اسقدر تفصیل حالانکه ایك دو جمله سی زاید نهین ھی۔ اس کی وجه یه ھی که قصه حضرت یوسف کی پاکدامنی کا ھی اور اس کا بیان بغیر ان تفاصیل کی نا ممکن تھا۔ ایسی موقعه پرنفس پرقابو رکھنا اس شخص کا کام ھی جو من عبادنا المخلصین (ھماری برگزیده بندوں مین سو تھی) کا مصداق ھو

حضرت موسی کو حضرت شعیب کی دونوں صاحبزادیوں مین سی ایك صاحبزادی اپنی پدر بزرگوار کی ارشاد کی تعمیل مین بلانی آتی ھی۔ ان کی آنی کی کیفیت کی بیان میں ارشاد ھوتا ھی: فجاءته احداهما تمشی علی استحیاء (ان مین سی ایك اس کی پاس آئی شرم سی چلتی ھوئی)۔ صرف استحیا نی آنکھون کی سامنی سماں باندہ دیا وه مقدسه کیسی چلتی ھوں گی۔

کسی جماعت کی خصوصیات کا ذکر

مومنین کی شب بیداری و تہجد گذاری کا ذکر ھی۔ تتجافی جنوبهم عن المضاجع (رات کو اون کی کروٹین بستروں سی الگ رھتی ھین) یدعون ربهم خوفاً و طمعاً (اپنی مالك کو ڈر کر اور امید رکھکر پکار تی ھین)۔

ایك اور جگه تمام خصوصیات صحابه کا ذکر ھی اشداء علی الکفار رحماء بینهم (کفار پر سخت آپسمین مہربان)

واذارئیتهم تعجبك اجسامهم (اور جب تم ان کو دیکھتی ھو تم کو اون کی ڈیل ڈول بھلی معلوم ھو تی ھین۔

و ان یقولوا تسمع لقولهم (اور اون کی بات کان دھر کی سنتا ھی) انسانی فطرت ھی که معزز آدمی کی ھر شخص بات کان دھر کی سنتا ھی۔

کانهم خشب مسنده (گویا که وه لکڑیاں ھین جو ٹیکا لگا رکھی جائین) لکڑی بھی ٹیك لگائی لکڑی بزدلی کی انتہا ھی۔

یحسبون کل صیحة علیهم (جہاں زور کی آواز ھوئی وه سمجھتی ھین که ھم للکاری گئی)۔

هم العدو : (بڑی دشمن وہ ھی لوگ ھیں.)
فاحذرھم : (اون سی بچتی رھو.)
قاتلهم الله انی یوفکون : خدا کی مار اون پر، کہاں بھٹکی جارھی ھین.

حضرت عایشه پر تہمت لگانا بھی منافقین کی خبث باطن کا کرشمه تھا لیکن بعض صادق مومن بھی اس بات میں ھمنوا ھو گئی. ارشاد ھوتا ھی.

اذ تلقونه بالسنتکم و تقولون بافواھکم ما لیس لکم به علم و تحسبونه ھینا و ھو عندالله عظیم: (تم لگی اپنی زبانوں سی اوسکی نقل در نقل کرنی اور اپنی منه سی ایسی بات بکنی جسکی تمکو مطلق خبر نہین اور تم نی اس کو ھلکی سی بات سمجھا حالانکه وه الله کی نزدیك بڑی سخت بات ھی.

کہنا منه سی ھوتا ھی تاکید ذم کیلئی ایسا کہا گیا. محاورہ ھی: یونہی یه بات زبان سی نکالی کیسی

حامله عورت کو دوران حمل اور وضع حمل کی وقت جو تکالیف ھوتی ھین سبکو معلوم ھی. ارشاد ھوتا ھی: حملته امه کرھا وضعته کرھاً. (مصیبت جھیل کر اس کی ماں نی اس کو پیٹ میں رکھا اور مصیبت جھیل کر اس کو جنا).

رات دن کا چکر کس اختصار سی بیان کیا ھی مگر ایك تصویر سی کھنچ جاتی ھی: یغشی اللیل النھار (اسی رات کو دن کا پردہ پوش بنایا).
یطلبه حثیثا (رات دن کی پیچھی لگی ھوئی چلی آ رھی ھی).

پانی برسنی سی جو رونق و شادابی رونما ھوتی ھی دو لفظوں مین اسکا سماں کھینچا گیا : فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت و ربت (پھر جب اس پر پانی برسادیتی ھین تو وہ سبزہ سی لہلہا نی اور ابھر نی لگتی ھی).

کبھی ایك ایسی امر کی تصویر کھینچی جاتی ھی جو حواس ظاھری سی ادراك نہین کیا جا سکتا. یتیموں کی مال کھا جانیوالوں کی متعلق ارشاد ھوتا ھی:

انما یاکلون فی بطونھم نارا.

کہین کسی امر کو منع کرتی ھوئی اس کی وہ شکل پیش کردی جاتی ھی جو

عموماً ہوا کرتی ہی۔ اور اس سی منع کرنا مقصود ہوتا ہی۔ یتیموں کی مال کی سلسلہ مین ہی: ولا تاکلوها اسرافاً و بداراً ان یکبروا (اور ان کی بڑی ہونیکی اندیشہ سی اون کا مال و متاع جلدی جلدی کھا نی نہ ڈالنا۔)

ان دونوں لفظوں اسرافاً و بداراً نی سب کچھہ بتلادیا جو عموماً ایسی مواقع پر ہوا کرتا ہی۔ جہاں غیبت سی ممانعت کیگئی ہی کسقدر بلیغ الفاظ مین منع کیا گیا ہی اور طبعی نفرت دلائی گئی ہی۔ ارشاد ہوتا ہوتا ہی:

ولا یغتب بعضکم بعضاً (اور کوئی تم مین سی دوسری کی غیبت نہ کری۔)

ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ (بھلاتم میں سی کوئی یہ پسند کرتا ہی کہ وہ اپنی مردہ بھائی کا گوشت کھائی۔)

فطرۃ سلیمہ کو مخاطب کیا گیا ہی: لحم اخ کھانا کسقدر قابل نفرت چیز ہی مزید برآں مردہ بھائی۔ صاحب طراز نی اس آیت کی تحت مین ورق کی ورق لکھی ہین اور مفید باتین پیدا کی ہین۔ اس سلسلہ مین تکبر کی مذمت ذیل کی الفاظ مین بھی قابل لحاظ ہی:

انك لن تخرق الارض (تو نہ زمین کو پھاڑ سکی گا اور نہ تن کر چلنی سی پہاڑوں کی لمبائی کو پہونچ سکی گا۔)

حضرت ذکریا علیہ السلام نہایت مسن ہو گئی ہین اولاد کی امید نہین مجیب الدعوات کو پکارتی ہین: کہنا یہ ہی کہ مین بوڑھا ہوگیا ہوں جو اس ایك کلمہ سی ادا کیا جاسکتا تھا: شخت۔ اس کی بجائی الفاظ ذیل مین پکارتی ہین: رب انی وھن العظم منی واشتعل الراس شیباً۔ صاحب طراز نی نو یا دس صورتوں مین اس مضمون کو ادا کیا ہی جن مین بعض بیان کیجاتی ہین۔

وھنت عظام بدنی، انا وھنت عظام بدنی، انی وھنت العظام من بدنی، انی وھنت العظام منی، اشتعل الراس شیباً (بڑھاپی کی سفیدی چمك اٹھی سر مین)۔

جنت کا تفصیلی ذکر تو بہت جگہ ہی مگر ایجاز کی ساتھہ اس آیت مین سب کچھہ بیان کردیا گیا ہی۔

وفیہا ما تشتھہ الانفس و تلذ الاعین فلاتعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین: (اورجس چیز کو اون کا جی چاہی اور جو ان کی نظر مین بھلی معلوم ہو

بهشت مین ان کی لئی موجود هوگی. اور کوئی شخص بهی نہین جانتا که لوگون کی نیك عملون کی بدلی‌مین کیسی کیسی آنکهون کی ٹهنڈك ان کی لئی پرده غیب مین موجود هین).

طوفان نوح اپنا کام کر چکا هی جن منکرین و معاندین کی تباهی مقصود تهی وه تباه هوچکی زمین پر سناٹا هی هر طرف پانی هی پانی هی. اب یه عارضی حالت منظور نہین ارشاد هوتا هی. وقیل یاارض ابلعی ماءك ویسما اقلعی و غیض الماء و قضی الامر واستوت علی الجودی و قیل بعداً للقوم الظالمین (حکم دیا گیا ای زمین اپنا پانی جذب کرلی اور ای آسمان تهم جا اور پانی کا چڑهاؤ اتر گیا اور اقوام کا کام تمام کروا گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر کهڑی هوگئی اور چار دانگ عالم مین پکروا دیا گیا که ظالم (خدا کی هان سی) دهتکاری گئی.)

هر هر فقره اور فقره کا هر هر لفظ قابل غور هی. اول کی دو جملون کا توازن اسی طرح بعد والی دو کا توازن دیکهنی کی قابل هی.

قضاء امر کام هوچکا یا کیا جا چکا کسقدر عمده اور برمحل جمله هی استوت الخ مین صاحب قصه اور ان کی همراهیون کی نجات کا ذکر هی اخیر فقره و قیل بعد غارت طوفان کی علاوه کیلئی مرثیه خوانی کر رها هی جسقدر افعال مذکور هین سب صیغه مجهول کی شکل‌مین هین جن مین اشاره هی اس امر کی طرف که اسقدر بڑی بڑی کام صرف ایك هی ذات سی ظهور پذیر هو سکتی هین. اس آیت مین کسقدر نفوذ امر وقوت سلطان پر دلالت هی.

اس آیت کی بلاغت مین علماء بلاغت نی بیسون صفحی رنگی هین کسی کو مزید شوق هو تو سکا کی کی مفتاح العلوم اور طراز کا مطالعه کری ابلعی مین بهی نفوذ امر پر دلیل هی ایك نکته یه هی که پانی زمین کی غذا هی اسی لئی ماءك کہا گیا نفوذ امر اور قوت سلطان مع حسن بیان مع الایجاز کی لئی دوسری آیت بهی ملاحظه هو :

فانما هی زجرة واحده فاذا هم بالساهره (بس اس کی صرف اتنی سی حقیقت هی که ایك ڈانٹ بتلائی اور سب کی سب میدان حشر مین آ موجود هوئی.)

جنت کا بیان مع الایجاز

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین (تو کسیکو معلوم نهین که اس کی لئی (آخرت مین) آنکهون کی ٹهنڈك چهپاکر رکهی گئی هی)

لاطیفی کی ایك مثال هی که هر غیر معلوم چیز اهم معلوم هوتی هی جو چیز کسی کی لئی چهپا کی رکهی جاتی هی کسقدر دل اس کو چاهتا هی پهر من قرة اعین کا لفظ کوئی بات نهین چهوڑتا. و فیها تشتهه الانفس و تلذالاعین (اور اس مین وه کچهه هی جسکو نفوس چاهین گی اور آنکهوں کو لذت دیگی. انتهائی خوشی و عیش مین اسکی زوال کا هونا تمام عیش کو مکدر کردیتا هی دنیا مین سب سی بڑا عیب زوال هی متنبی کهتا هی اور خوب کهتا هی:

اشدالغم عندی فی سرور تیقن عنه صاحبه انتقالا

(خوشی مین سب سی بڑا غم میری نزدیك خوشی والی کا یه یقین هی که یه خوشی زائل هونی والی هی.)

لهذا ارشاد هوتا هی: وانتم فیها خالدون. وعظ اس سی بڑه کر کیا ممکن هی.

افرئیت ان متعنا هم سنین ثم جاء هم ما کانوا یوعدون ما اغنی عنهم ما کانوا یمتعون. (ذرا دیکهو تو سهی که اگر هم چند برس ان کو (دنیاوی) فائده اٹهانی (بهی) دین پهر جس (عذاب) کا ان سی وعده کیا جاتا هی وه ان کی روبرو آموجود هو تو وه جو اونهوں نی (دنیاوی) فائدی اٹها لئی اب (اس حالت مین) اون کی کیا کام آسکتی هین.) فقره ما اغنی عنهم کسقدر وعظ بلیغ هی.

حسرت: فتلك بیوتهم خاویة بما ظلموا ان فی ذالك لاٰیة لقوم یعلمون.

(اب یه اون کی گهر هین که اون کی نافرمانیوں کی وجه سی پڑی بهائیں بهائیں کر رهی هین اس واقعه مین اون لوگوں کیلئی جو جانتی اور سمجهتی هین بڑی عبرت هی.)

حسرت و تمنا: کافر کهیگا یا لیتنی کنت ترابا (ای کاش که مین مٹی هوتا) عربی مین لفظ لیت اس آرزو کیلئی آتا هی جو محال هوتی هی.

یا لیت ایام الصباء راجعاً (کاش بچپن کی دن لوٹ آئین) اس سی بڑه کر

کافر کی حسرت ذیل کی آیت میں:
یالیتہا کانت القافیۃ (ای کاش مرنیسی مری ھستی کا خاتمہ ھو گیا ھوتا)
ضمیر کا مرجع مذکور نہین ھی گویہ متکلم کی ذھن مین موت اس حیثیت کی ساتھہ جاگزیں ھی کہ کوئی اور تصور نہین۔
"منحصر مرنی پہ ھو جسکی‌اُمید' نا امیدی اسکی دیکھا چاھئی"
قصہ کی معنی فیصلہ کردینی ختم کردنی کی ھین۔ قصہ ھی پاك کر چکی‌ھوئی حضرت مریم بھی موت کی آرزو کرتی ھین لیکن طرر بیان سی معلوم ھوتا ھی کہ ان کو سوسائٹی مین اپنی حفاظت. ناموس کی خاطر موت کی آرزو تھی اور وہ ابھی نہین آتی۔ کافر نہایت تمنا سی گذشتہ موت کو یاد کر رھا ھی۔
حضرت مریم کہتی ھین: یا لیتنی مت قبل ھذا او کنت نسیامنسیا (ای کاش کہ مین اس مصیبت سی پہلی ھی مر چکی ھوتی اور بھولی بسری ھو جاتی۔
خدا کی ذات و صفات کی متعلق کہان تك آیات نقل کی جائین. سورتون مین بکثرت یہ مضمون موجود ھی. سورہ رعد مین اللہ یعلم ما تحمل کل الشئ سی دور تك پڑھو یہان صرف ایۃالکرسی نقل کیجاتی ھی:
اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم۔
لفظ اللہ کو مقدم کیا اور یون نہ کہدیا لا الہ الا اللہ الحی القیوم تاکہ مخاطب خبر اور واقعہ کی طرف متوجہ ھو. فرمایا اس کی سوا کوئی معبود نہین ھی. صفات مین سب سی اول حیات لفظ حی کی ذیل مین ذکر کی گئی جس مین سمیع' بصیر' علیم و قدرت وغیرہ بھی آ گئین. لفظ حی صفت کا صیغہ ھی جو دوام پر دلالت کرتا ھی لیکن ایك چیز حی ھو معلوم نہین کہ وہ دوسرن کو بھی حیات بخش ھی یا نہین. فرمایا القیوم: یہ مبالغہ کا صیغہ ھی اس کی معنی دوسری چیزون کو قائم رکھنی والا مدبر وغیرہ۔
امام راغب لکھتی ھین القیوم۔ ای القائم الحافظ لکل شئ والمعطی لہ مابہ قوامہ و ذالك ھو المعنی المذکور' فی قولہ الذی اعطی کل شئ خلقہ ثم ھدی۔
یعنی محافظ ھر شئ کا اور اس کو وہ چیز دینی والا جس پر اس شئ کا دار و مدار ھو. اور یہی بات اس دوسری آیت مین مذکور ھی کہ وہ ذات جس نی ھر

سئی کو اس کی خلقت دی اور طریق معاش بتلائی.
منتظم اور نگراں کیلئی آرام بھی تو ضروری ھی. فرمایا :
لا تاخذہ سنة و لا نوم (اونگه اور نیند نہین آتی) ترتیب کی با قاعدگی بھی ملحوظ رھی لیکن اس پر یه شبهه ھوسکتا ھی زندہ سہی ھر وقت نگراں سہی مدبر سہی مگر مالك کوئی اور ھو ارساد ھوا :
له ما فی السموات و الارض (جو آسمان اور زمین مین ھی سب اسی کا ھی) جلال و کبریائی کی رھی سہی بات اس جمله نی پوری کردی.
من ذالذی یشفع عنده الا باذنه (کون ھی جو اس کی اذن بغیر اس کی جناب مین (کسیکی) سفارش کری) باوجودیکه آیت مین تمام صفات جبروت کی بیان ھوئی ھین، لیکن الا باذنه بتلارھا ھی که اجازت سی سفارش کی جا سکتی ھی بلاسفارش قبول ی فائدہ چیز ھی اس لئی ضرور سنی بھی جانی ھو گی. لفظ القیوم مین اشارہ علم کا ذکر آ چکا.
یعلم ما بین ایدیهم و ما خلفهم (جو کچھه که لوگوں کو پیش آ رھا ھی اور جو کچھه ان کی بعد (ھونیوالا) ھی (وہ) اس کو (سب) معلوم ھی) لیکن اور ھستیان بھی علم سی متصف ھین. لهذا نسبت معلوم ھونی چاھئی. ارشاد ھوا:
و لا یحیطون بشئ من علمه الا بما شاء. (اور لوگ اس کی معلومات مین سی کسی چیز پر دسترس نہین رکھتی مگر جتنی وہ چاھی)
پہلی جملوں مین گذر چکا که سب عالم اسی کا ھی مالکیت معلوم ھو چکی جبروت و جلال و قوة سلطان کی کچھه مدارج غیر بیان شدہ رہ گئی ھین. ارشاد ھوا :
وسع کرسیه السموات والارض (اس کی کرسی آسمان و زمین پرحاوی ھی) پہلی گذر چکا که نیند اور اونگه نہین آتی مگر شاید تھکن لاحق ھوتی ھو. ارشاد ھوا :
و لا یؤدہ حفظهما آخر مین و ھو العلی العظیم (اور آسمان و زمین کی حفاظت اسپر (مطلق) گراں نہین اوروہ عالی شان اور عظمت والا ھی)
نتیجه سمجھو دلیل سمجھو عام انداز قرآن کا ھی که اسماء حسنی

مین سی کسی سفت مناسب پر آیت ختم فرمائی هی.

ذیل کی دو آیات جامعه ایجاز کی مثال کافی هین جن مین تمام فرائض دینی و دنیوی و معاشیات بیان کردئی گئی.

واعبدوالله ولا تشرکو به شئیا و بالوالدین احسانا و بذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب و صاحب بالجنب وابن السبیل و ما ملکت ایمانکم ان الله لا یحب من کان مختالا فخورا. (اور الله هی کی عبادت کرو اور اس کی ساتهه کسی چیز کو شریك مت ٹهراؤ اور ماں باپ اور قرابت والوں کی یتیموں اور محتاجوں اور قرابت والی پڑوسیون اور اجنبی پڑوسیوں اور پاس کی بیٹهنی والوں اور مسافروں اور جو (لونڈی غلام) تمهاری قبضه مین هین ان سب کی ساتهه سلوك کرتی رهو الله ان کو دوست نهین رکهتا جو اترائین اور بڑائی مارتی پهرین)

ان امور مین سی کسی مین کوتاهی کرنا گویا فخر اور تکبر کی شان هی.انسان کی فطرت هی که جب کسی سی اپنی کو مستغنی سمجهتا هی اسکی ساتهه احسان کرنا گویا ضائع کرنی کی مرادف سمجهتا هی. عبادت کی ساتهه هی والدین کا ذکر کرنا ان کی ساتهه حسن سلوك کی اهمیت پر دال هی. ترتیب فرائض الفاظ کی بندش اصحاب ذوق خود ملاحظه کرسکتی هین.

دوسری آیت: فلذلك فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اهوائم و قل آمنت بما انزل الله وامرت لاعدل بینکم الله ربنا و ربکم لنا اعمالنا و لکم اعمالکم لا حجة بیننا و بینکم الله یجمع بیننا و الیه المصیر. (تو اسی لئی (لوگوں کو) اسی (اصل دین) کی طرف بلاتی رهو اور خود (بهی) جیسا تم سی فرما دیا گیا هی (اسپر) قائم رهو اور ان کی خواهشوں پر نه چلو (ان سی صاف) کهدو که کتاب (کی قسم مین) سی جو کچهه خدا نی اتارا هی میرا تو سب پر ایمان هی اور مجهکو (خدا کی هاں سی) حکم ملا هی که تمهاری درمیان (تمهاری اختلافات کا فیصله) انصاف کی ساتهه کروں. الله (تمهارا پروردگار هی) همارا کیا همکو اور تمهارا کیا تم کو هم مین تم مین کچهه جهگڑا نهین الله هی (قیامت کی دن) همکو اور تم کو ایك جگه جمع کری گا اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹ جانا هی)

الفـاظ کی بندش و جملون کا جوڑ.

قرآن مجید مین جو لفظ جہان ہی گویا نگینہ ہی کہ اپنی جگہ جڑا ہوا ہی. جو لفظ مقدم ہونا چاہئی وہ مقدم ہی، جو مؤخر ہونا چاہئی وہ مؤخر ہی. تقدیم و تاخیر کا ایك وسیع باب ہی.

صاحب صرازی کئی ورق مین لکھا ہی قرآن مجید جا بجا جن و انس کو مخاطب کیا کثر مقامات پر لفظ انس مقدم ہی، بسبب شرف کی کہین جن کو مقدم کیا گیا ہی. یہ وہ مقامات ہین جہان قہر و غلبہ یا تسلط و استیلاء کا مقام ہی مثلا وما خلقت الجن والانس الالیعبدون. (کہ مین نی جن اور انس کو صرف اپنی عبادت ہی کی لئی پیدا کیا ہی.)

جن سی سرکشی کا زائد اندیشہ ہی ممکن ہی کہ اپنی قوت پر گھمنڈ ہو چھوٹی سی سورت اذاجاء پر غور کرو. الفاظ کی نشست کی خوبی درجۂ اعلی پر ہی. نصرالله (الله کی مدد) کا آنا کسقدر اعلی خوش خبری ہی اور نیك فالی. ایك مستقل وجود تسلیم کر کی لفظ جاء (آیا) لایا گیا یہ نہین کہ تمہاری مدد کیگئی وغیرہ جیسی دوسری جگہ لقد نصرکم الله وغیرہ الله کی مدد کی بیشمار نتائج ہین مگر آنحضرت کی مشن کی مناسب فتح مکہ بڑی نعمت ہی لہذا اس کی متصل والفتح کہا گیا.

و رأیت الناس یدخلون فی دین الله افواجا: فتح سی اسیقدر متصل ہی جیسی فتح نصرالله سی فتح مکہ کی بعد سنہ ۹ مین تمام عرب کی وفود آئی اور اسلام مین داخل ہوئی نصرالله سی مناسب تسبیح و تقدس ہی.

اور اسلام کی اشاعت و نشر کی مناسب استغفار ہی کہ فرائض نبوت پوری ہوئی اب خدا کو یاد کرو (حدیثون سی معلوم ہوتا ہی کہ یہ سورۃ گویا خبر موت ہی تھی.)

معوذتین کو دیکھو دونوں مین خدا کی حمایت اور پناہ چاہی گئی ہی. تناسب و حسن تالیف نمایاں ہی. رب الناس لوگوں کا آقا ممکن ہی بادشاہ نہ ہو. آگی ہی ملك الناس ممکن ہی بادشاہ ہو خدا نہ ہو الہ الناس چونکہ شیطان کی وسوسی سی پناہ طلب کی ہی جو بڑا مظہر شر و فساد کا

هی. اس لئی اس قدر صفات عظام ذکر کئی هین. بر خلاف سورہ فاق نی وهاں جسمانی مصائب سی حمایت چاهی هی.

ربط آیات: اسی سلسله مین آیات کا ربط قابل لحاظ هی. علمای معانی متفق اللفظ هین که بلا تناسب کی ایك بات کا دوسری پر عطف کرنا خارج از بلاغت هی. قرآن مجید مین بعض آیات کا تعلق بعض سی بادی النظر مین ظاهر نهین هوتا. واقعات و حالات کی اقتضاء سی آیات کی نزول کا اقتضاء بهی یهی هی. تاهم علماء نی غور و فکر کرکی ربط آیات کی مرحلی کو بهی صاف کردیا هی. بعض مقام مین اگرچه آدمی ربط کی وجه بیان نهین کرسکتا. لیکن ذوق اور وجدان سی کلام کو مربوط سمجهه لیتا هی. ملاحظه هو:

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت. (تو کیا لوگ اونٹوں کی طرف نهین دیکهتی که کیسی (عجیب) پیدا کئی گئی هین اور آسمان کی طرف که کیسا اونچا بنایا گیا هی اور پهاڑوں کی طرف که کیسی کهڑی کئی گئی هین اور زمین کی طرف که کیسی بچهائی گئی هی.) سکا کی نی عرب کی تمدن و معاشرت کو لحاظ کرتی هوئی ربط بیان کیا هی. عربوں کی نظر آسمان کی طرف منه کی لئی هوتی هی اونٹ ان کی معاش کا ایك بہت بڑا رکن اهم هی. پهاڑ اور زمین بهی آیات قدرت مین سی بڑی نشانیاں هین. امام رازی لکهتی هین که اس آیت مین وه چیزیں جمع کی هین جن مین خوبصورتی اور نزاکت نهین هی. خوبصورت چیزوں کی دیکهنی سی تذکر اور عبرت اندوزی نهین حاصل هوتی لیکن ان کی خلقت مین انتهائی حکمت پائی جاتی هی، نیز یه که زمین عرب کی صحرا مین سفر کرتا هوا تنها آدمی جب اپنی داهنی دیکهیگا تو پهاڑ بائین پهاڑ اوپر آسمان. ان اشیاء کا جمع هونا نهایت پر لطف هی جو وجدان سلیم اور ذوق سی محسوس هوسکتا هی. سورہ بقره مین ایك مقام پر جهاد کی متصل حج کا ذکر آیا هی. علماء نی جهت جامعه سفر نکالی هی مهائمی کی تفسیر اس موضوع پر اچهی کتاب هی لیکن کهین کهین تکلف معلوم هوتا هی.

ارسطو نی کتاب بلاغت مین لکھا ھی کہ ھر مضمون کی لئی اوسی کی مناسب طرز style ہوتا ھی. قران مجید مین بھی مسائل کا طرز علیحدہ ھی، قصہ کا جدا انداز و تخویف کا اس سی الگ. چنانچہ پورا علم فرائض (میراث کی مسائل) بتفصیل بیان کئی گئی. مگر شان ایجاز بھی خوب قائم رکھی گئی ھی. یك تہائی رکوع وعظ و نصیحت کا ھی باوجود ایجاز کی قانون بیان کرنی مین معمولی سی معمولی سمجھہ کی پہوبچ کی مطابق کلام کیا گیا ھی اور وہ شبہہ جو کم فہم آدمی کو ھو اسکا ازالہ بھی کردیا گیا چنانچہ جہاں محرمات بتلائی گئی ھین.

و ربائبکم اللاتی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بہن فان لم تکونوا دخلتم بہن فلاجناح علیکم. (اور جن بیبیوں کی ساتھہ تم صحبت داری کر چکی ھو ان کی گیلڑ لڑکیاں جو (غالبا) تمھاری گودوں مین پرورش پائیں (تم پر) حرام ھین لیکن اگر ان بیبیوں کی ساتھہ تم نی صحبت داری نہ کی ھو تو (گیلڑ لڑکیوں کی ساتھہ نکاح کرلینی سی) تم پر کچھہ گناہ نہین.)

لفظ (فان لم تکونوا دخلتم بہن) کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن رحمۃ علی العباد اس عقدہ کو بھی کھولدیا.

ایسی ھی وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم (اور تمھاری بہوئین یعنی تمھاری (اپنی) صلبی بیٹوں کی بیویاں (بھی) تم پر حرام ھین).

ایسی ھی حج مین جو شخص قربانی پر قدرت نہ رکھی اس کیلئی حکم ھی کہ تین روزی ایام حج میں رکھی اور سات بعد کو. یہ حکم بتلا کی ارشاد کیا گیا تلك عشرۃ کاملۃ (یہ پوری دس ہوئی)

بعض ملاحدہ کا اعتراض ھی سات اور تین دس تو ھوتی ھی ھین اس فقرہ کی ضرورت ھی کیا تھی یہ فقرہ اعتراض کا باعث کیا معنی اور موجب فصاحت ھی اور زیادتی وضاحت کا باعث لفظ واؤ عربی مین جیسی اور کی معنی میں آتا ھی ویسی ھی یا کی معنی مین آتا ھی. جالس الحسن وابن سیرین (حسن یا ابن سیرین کی پاس اٹھا بیٹھا کرو.)

تو کہین حاجی یہ نہ سمجھہ لی کہ سفر مین چونکہ شدائد زائد ھوتی ھین

اس لئی اگر وهاں روزہ رکھا جائی تو تین اور سات مکاں پر هوں گی اس کی تردید کردی گئی اور اس کی اهمیت جتلادی گئی که دس مین ایك کم نه هو یعنی دس کی تعداد مقصود هی۔

طرزآدا۔ بڑا طویل الذیل عنوان هی هم صرف یہاں چند آیات بطور نمونه پیش کرتی هین اور اس مین اس دلچسپی کو ملحوظ رکھا هی که وہ آیات نقل کی جائین جن مین ظاهری طرز تکلم چھوڑ کر کوئی اور طرز اختیار کیا گیا هو یا جس مین کوئی نکته هو۔

کافر سود کو شیر مادر سمجھتی هین اور اس کو بیع کی طرح جائز۔ ظاهر محل کا اقتضا تو یه هی که کہا جاتا (قالو انما الربوا مثل البیع) معامله سود مثل معامله بیع کی هی ارشاد هوا: انماالبیع مثل الربوا (معامله بیع معامله سود کی طرح هی)

اس کی خوبی وہ سمجھی گا جو اس جمله کی جگه که زید شیر کی طرح هی یه کہی که شیر زید کی طرح هی گویا زید بہادری مین شیر سی زائد شہرت رکھتا هی۔

ایك اور مضمون هی که اگر عورتین کچھه مہر معاف کردین تو وہ جائز هی ارشاد هوا فان طبن لکم عن شئ منه نفسا (اگر وہ خوشدلی سی کچھه معاف کر دین، فکلو هنیئا مریاً (اس کو کھاؤ رچتا پچتا) یعنی بالکل رضا و خوشنودی سی معاف کرین تب جائز هوگا۔

جنت کی لباس کا ذکر هی۔ ارشاد هوتا هی: بطائنها من استبرق (اسکی استر اطلس کی هوں گی۔ جسکا استر اطلس کا هوگا اسکی ابرہ کا کیا کہنا۔ جنت کی وسعت کا ذکر هی عرضها السموات (اسکی چوڑائی آسمانوں کی وسعت جیسی هی

بیان یه کرنا هی که مطلقه عورت کا نان نفقه لڑکی کی باپ کی ذمه هی۔ ارشاد هوا، وعلی المولود له رزقهن و کسوتهن بالمعروف (اور جس کا بچه هی (یعنی باپ) اس کی ذمه دستور کی مطابق ماؤں کا کھانا کپڑا دینا هی۔)

امام ابو حنیفه نی اس سی استدلال کیا هی که نسب کا اعتبار باپ سی هی۔

حضرت یوسف کو امرءة العزیز نا جائز مطلوب کیلئی پھسلاتی هی،

ارشاد هوتا هی: وراودته اللتی هو فی بیتها عن نفسه (اور جس کی گهر مین یوسف رهتی تهی اسنی اپنا (نا جائز) مطلب نکالنا چاها.)

راودت امرءة العزیز نهین کها که شایان شان نهین که کسی پرائویٹ عورت کا نام لیا جائی.

دوسری اس صورت سی ادا کرنی مین حضرت یوسف کی پاك دامنی کا بدرجه اتم ثبوت هی.

طرز ادا کی سلسله مین ادب کی متعلق بهی کچهه لکهدینا نامناسب نه هو گا. حضرت ابراهیم اپنی کافر باپ سی کس طرح یا ابت یا ابت کر کی خطاب کرتی هین. (دیکهو سورهٔ مریم) ایك اور جگه جناب موصوف کی دعا کی الفاظ منقول هین جهاں وه خدا کی صفات بیاں کر رهی هین الذی هو یطعمنی و یسقین و اذا مرضت فهو یشفین (اور جومجهکو (کهانا) کهلاتا هی اور جو (پانی) پلاتا هی اور جب مین بیمار پڑتا هوں تو وهی مجهکو شفا دیتا هی) بیماری کو اپنی طرف منسوب کیا هی یه نه کها که بیمار کرتا هی تو وهی شفا دیتا هی.

سوره جن مین جنوں کی زبانی ارشاد هوتا هی: و انا لایدری اشر ارید بمن فی الارض اما اراد بهم ربهم رشدا (اور هم نهین جانتی که (اس انتظام سی) زمین کی رهنی والوں کو کچهه نقصان پهونچانا مقصود هی یا ان کی پروردگار کا اراده ان کی حق مین بهتری کرنی کا هی.

ایجاز و اطناب: ایك هی مضمون کو کبهی اطناب کی ساتهه بیان هوتا هی حضرت موسی کا قصه سوره طه مین کس قدر مفصل هی. خلاف اسکی والنازعات مین تمام اهم باتین آ گئین اور صرف چند آیات مین: هل اتاك حدیث موسی اذ ناداه ربه بالوادالمقدس طوی اذهب الی فرعون انه طغیٰ فقل هل لك ان تزکی و اهدیك الی ربك فتخشی فاراه الایة الکبری فکذب و عصی ثم ادبر یسعی فحشر فنادی فقال انا ربکم الاعلی فاخذه الله نکال الاخرة و الاولی.

لهجه: صاحب طرازنی لهجه کی متعلق بهت کچهه لکها هی اور آیات

نقل کی هین. لہجہ سی مراد یہ هی کہ جہاں شفقت اور رحمت کا موقعہ هی وهاں الفاظ فقری ضمائر وغیرہ سب اسی کی مناسب هوں اور جہاں غضب کا موقعہ هی اس کی مناسبت کا لحاظ هو. (شفقت شکایت کا رنگ لئی هوئی) غزوۂ تبوك ایك بڑی آزمائش کا غزوہ تہا. منافقین نی گہر بیٹہنی کی اجازت حاصل کرلی هی بعض مخلص مسلمانوں نی بھی کمزوری دکھلائی هی آیت نازل هوتی هی: عفاالله عنك لم اذنت لهم (خدا تمہیں معاف کری تم نی اونکو (گہر بیٹھی کی) اجازت کیوں دیدی.) گفتگو مین پہلا فقرہ شفقت اور رحمت سی پر هی دوسری فقری مین شکایت محبت آمیز طریق پر هی. اسی طرح سورۂ عبس و احزاب میں بھی عتاب آمیز لہجہ هی.

دوسری آیت ملاحظہ هو جس مین اس خاك کی پتلی کو جو حشر کا اپنی قصور فہم کی سبب سی منکر هوتا هی خطاب عام هی اولم یر الانسان انا خلقنه من نطفة فاذا هو خصیم مبین و ضرب لنا مثلا و نسی خلقه قال من یحی العظام و هی رمیم (کیا آدمی کو معلوم نہین کہ همنی اسکو نطفہ سی پیدا کیا بااین همہ وہ (همارا) کھلم کھلا (مقابل بن کر) لگا جھگڑنی اور لگا هماری نسبت باتین بنانی اور اپنی اصالت کو بھول گیا کہتا (کیا) هی کون (ایسی قدرت رکھتا) هی کہ (آدمی کی) هڈیاں گل (کرخاك هو) گئی هوں اور وہ ان کو جلا کھڑا کری). انسان کی بی حقیقت مبدء کی طرف توجہ دلا ئی هی اور فرمایا اس بی حقیقت قطرہ سی همنی پیدا کیا جس کی قدرت سی وہ منکر هی. خصیم مین گویا کٹھ حجتی اور بحث کرنی کا مفہوم ادا کیا گیا هی جیسی بولتی هین کہ فلاں شخص منطق بگھارتا هی یہاں لفظ عاصی اور کافر طاغی جیسی الفاظ سی نہین یاد کیا گیا اس لئی کہ آیت کا لہجہ محض شکایت پر دلالت کرتا هی.

اسی طرز کی ایك اور آیت هی: وتجعلون رزقکم انکم تکذبون (اور تمنی اپنا راتب باندہ لیا هی کہ (اسکو) جھٹلاتی هی رهوگی) الرزق العطاء الجاری (بندھا راتب). لفظ رزق قابل غور هی.

شدت عتاب: لقد جئتم شیاً ادا تکادالسموات یتفطرن منه و تنشق الارض

و تخرالجبال ھدا ان دعو للرحمن ولدا. (تم ایسی بڑی سخت بات (اپنی طرف سی گھڑہ کر) لائی جس سی (عجب نہین) آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائی اور پہاڑ ریزی ریزی ہوکر گر پڑیں کہ لوگوں نی (خدای) رحمن کی لئی بیٹا قرار دیا.

محض شفقت و رحمت کا لہجہ دیکھنا ہو تو والضحی اور الم شرح پڑھو مگر وہاں بھی نعمتین گنوا کر ایك ایك اخلاقی حکم بھی ساتھہ لگا ہوا ھی. پھر وہ خطاب خاص ھی رحمة للعالمین کو. ذیل کی دو آیتین قابل غور ھیں. فاذکرونی اذکرکم واشکروالی ولاتکفرون (اور تم ہماری یاد مین لگی رہو کہ ہماری یہاں بھی تمھارا ذکر ہوتا رہی) درا لفظ ذکر (یاد کرنا) پر غور تو کرو کون کس کو یاد کر رہا ھی پھر ضمیر واحد متکلم یعنی مجھی فرمایا. یہ نہیں فرمایا کہ ھمین. موقع رحمت اور شفقت کا ھی نہ کہ اظہار عظمت و جبروت و شوکت کا.

دوسری آیت ملاحظہ ہو: واذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوةالداع اذا دعان فلستجیبوالی ولیومنوابی لعلهم یرشدون (جب میری بندی تمسی میری باری مین دریافت کریں تو ان کو سمجھادو کہ مین ان کی پاس ہوں جب کبھی کوئی مجھسی دعا کری تو مین دعا کرنیوالی کیدعا کو قبول کرتا ہوں تو اونکو چاھئی کہ میرا حکم (بھی) مانین اور مجھہ پر ایمان لائین تاکہ وہ سبد ھی راستی لگ جائین.

میری بندی کہا نہ کہ ھماری بندی کہ موقع شفقت کا ھی لفظ عبد (بندہ) خود رحمت و لطف کا مقتضی ھی پھر جبکہ کہا جائی میری بندی کسقدر تخصیص ھی. میرا خادم، میرا آدمی، میرا مرید جس طرح تخصیص و شفقت پر دلالت کرتی ھین اسی طرح عبادی بھی.

«جب پوچھین» کسی خاص وقت کی تعئین نہین. یہ نہین فرمایا گیا جیسی دوسری مقامات پر ھی یسئلونك عن‌الشهرالحرام قتال فیه قل قتال فیه کبیر. (تم سی ادب والی مہینوں کی نسبت یعنی ان مین لڑنیکی بابت دریافت کرتی ھین تو سمجھا دو کہ ادب والی مہینوں مین لڑنا بڑا گناہ ھی)

یا جیسی یسئلونك عن الاهله قل هی مواقیت للناس والحج (یعنی چاند کی بارى مین دریافت کرتی هین تو کهو چاند سی لوگون کی (معاملات اور عبادات مثلا) حج کی واقعات معلوم هوتی هین) گویا بالکل تیاری هی انتظار کی دیر هی نهین. یه آیت بهی جب نازل هوئی که لوگون نی دریافت کیا تها که همارا پروردگار دور هی یا نزدیك جیسی اور بزالی آیات فرمایا (انی قریب) " ان " کی لفظ سی مضمون جمله کی تاکید هو جاتی هی اهل علم اس چهوٹی سی جمله کی زور کو سمجهه سکتی هین.

اجیب — اذا دعان نان. وهی واحد متکلم کی ضمیر (مجهی) چلی جاتی هی آگی ارشاد هوتا هی: فلیستجیبوالی (میری بهی تو مان لین) لفظ استجابة (ماننا سننا قبول کرنا) دعا کی قبول کرنی مین عموما مستعمل هوتا هی یهان بنده کیلئی مستعمل هوا هی؛ جیسی کوئی مطلق العنان باد شاه اپنی رعایا سی کهی که مین تو حاضر هون تمهاری درخواستون کی قبول کرنی کیلئی لیکن تم بهی تو میری سنو. والیومنو بی اصل الاصول مقصود اعلی کا ذکر هی آگی تعلیم یرشدون (تا که وه لوگ رستی لگجائین: لفظ رشد اس موقع پر تمام ان الفاظ سی زائد مناسب هی جو اس کی هم معنی یا قریب معنی رکهتی هین، مثلا فلاح صلاح نجات وغیره لفظ رشد کی متعلق امام راغب کی تصریح سی معلوم هوتا هی که دنیا و آخرت دونون کی صلاح و بهبودی کیلئی یه لفظ آتا هی مضمون بهت طویل هوچکا لیکن ایك مختصر سی بحث باقی ره گئی جس کی بغیر هماری خیال مین مضمون بالکل ناقص رهتا هی. کها جا سکتا هی که شاعر ناظم و ناثر کی کلا م مین خوبیان نکالی جا سکتی هین. تفوق کا یه معیار هونا چاهئی که ایك مضمون اور معنی کی دو عبارتین نظم هون اور پهر تفوق حا صل هو تب یه بیشك مانا جا سکتا هی که فلان کلا م دوسری هم معنی کلا م سی اس درجه تك بڑها هوا هی که گرد کو بهی نهین پهونچ سکتا هر چند تفحص اور استقراء کیا گیا لیکن اس قسم کا کلام بهت کم ملا هی تاهم ذیل کی دلچسپ بیان سی بهت کچهه روشنی پڑی گی اس قسم کی مضمون کی مواد کی کم ملنی کی وجه سب سی بڑی یه هی که جو مضامین قرآن مین

هین انپر کوئی ناظم و نا ثر طبع آرمائی نہین کرتا بہر حال اس مختصر نمونہ سی اندازہ لگایا جا سکتا ہی۔

سموءل ابن عادیا عرب کا مشہور جوانمرد اور شریف النفس شاعر فخر مین کہتا ہی (جس قصیدہ سی یہ شعر لیا گیا ہی وہ قصیدہ فخریہ شاعری کی بہترین نمونوں مین شمار کیا جاتا ہی)

و ننکر ان شئنا علی الناس قولہم ولا ینکرون القول حین نقول

ہم چاہین تو لوگون کی باتون کی تردید کرسکتی ہین اور ہماری کہی کی وہ تردید نہین کرسکتی

اس سی ملتی جلتی آیت ملاحظہ ہو: لا یسئل عما یفعل و ہم یسألون (اس کی کئی کی باز پرس نہوگی لیکن ان کی کئی کی باز پرس ہوگی)

سموءل کا یہ فخر صرف یہان تك محدود ہی کہ اسکی بات کی کوئی تردید نہین کرسکتا اعمال و افعال کا ذکر نہین ہی لیکن کہا جا سکتا ہی کہ سموءل کی غرض ہی اسی قدر تھی۔

ذیل کی مضمون مین بالکل ایك ہی چیز دو عنوانون مین پیش کی گئی ہی مضمون ہی بڈھا ہو جانا سیاہ بالون مین سفیدی نمودار ہونا: حریری چھٹی صدی کا مشہور ادیب (جسکی کتاب مقامات کو بعض بد مذاق مستشرقین یورپ نی قرآن کی بعد دوسرا درجہ دیا ہی) اس مضمون کو ذیل کی الفاظ مین ادا کرتا ہی۔ اقمر لیلہ الدجوجی (اس کی تاریکی والی رات چاندنی والی ہوگئی ہی) لفظ دجوجی نی فقریکی رونق کو مٹا دیا ورنہ استعارہ برا نہ تھا اسی مضمون کو ایك شاعر ادا کرتا ہی لیل ایصبح بجانبیہ نہار ہماری خیال مین حریری سی اس کا طرز ادا زائد دلکش اور سماں کھینچنی والا ہی۔ قرآن مین ہی واشتعل الراس شیباً (سر بڑھاپی سی بھڑك اوٹھا)۔ سیاہ سر جو کوئلہ کی برابر سیاہ تھا اب اس مین آگ کی طرح بڑھاپا بھڑك اوٹھا۔ حریری کا جملہ نزول قرآن کی بعد کا ہی۔ ایك اور دلچسپ ترین مقابلہ ملاحظہ ہو: ضرب الامثال پہیلیون کی متعلق یاد رکھنا چاہئی کہ جب تك کوئی زبان زندہ رہتی ہی اس کی ضرب الامثال جون کی تون

باقی رہتی ہین. گویا اس زمان کی بولنی والون کی ادبی تنقیدی مذاق نی اس کو بالکل بلاسقم تسلیم کرلیا ہی. اب ذیل کی بیان کو دیکھو: عرب مین اس مضمون کی ادا کرنی کی ایك مثال ہی کہ قاتل کو قتل کردینہ آئندہ قتل کی وارداتکو روکدیتا ہی، القتل انفی للقتل (قتل وارداتِ قتل کو زائد منانیوالا ہی) اس کی مقابلہ مین ایك آیت ملاحظہ ہو.

فی القصاص حیوة (قصاص (کی قاعدی) مین زندگی ہی) عربون کی ضرب المثل مین لفظ قتل دو دفعہ آنسی کلام بھدا ہوگیا، دوسری لفظ نفی کی اثی ایك دم چھلہ محذوف ماننا پڑیگا. من ترکہ یعنی قتل کرنا قتل نہ کرنیکی نسبت جرم قتل کو زائد مٹانیوالا ہی برخلاف اسکی آیت مین ایك ادبی خوبی ضمن مطابقت یعنی دو مخالف چیزوں کا ذکر زندگی اور قصص کی علاوہ کس قدر لطف و خوبی ہی کہ قصص یعنی قتل کردینی مین زندگی ہی عربون کی مثال مین یہ نقص بڑی تھا کہ بدلہ مین قتل کرنا بہ نسبت ترك فعل کی اچھا ہی نا ظلما قتل کرنا اس نقص کو لفظ قصاص نی اٹھادیا باقی خوبیان نحو و معانی سی تعلق رکھتی ہین جنکا بیان خاص طبقہ کی علاوہ باعث تکدر ہوگا. آیت مین لفظ قتل ہی سری سی ندارد ہی جو عرب کی یہان دو جگہ آیا ہی تعداد مین بھی آیت کی حروف کم ہین. ضرب المثل قران کی نزول سی پہلی کی ہی: لہذا ایك اور مقابلہ نقل کرکی مضمون کو ختم کرتی ہین. قران مجید دوزخ کی ذکر مین اتھا ترمی بشرر کالقصر کانہ جمالة صفر (اسکی مثل محل کی چنگاریان برستی ہونگی گویا کہ وہ زرد اونٹون کی گلی ہین.)

ابو العلاء معری پانچوین صدی کا مشہور ادیب مگر مذہب مین نہایت آزاد بلکہ دہریت تك پہونچا ہوا اس آیت کی معارضہ مین ذیل کا شعر نظم کرتا ہی.

حمراء ساطعت الذوائب فی الدجی ترمی بکل شرارة کطراف

آگ سرخ رنگ کی ہی اسکی مینڈھیان تاریکی مین بلند و بالا ہین اسی چنگاریان پھینکتی ہی جو مثل چمڑی کی سرخ خیمہ کی ہین.

آیت کی متعلق امام رازی بحوالہ ابن عباس لکھتی ہین کہ اس تشبیہ

میں عربوں کی معاشرت اور مذاق کا بہت لحاظ رکھا گیا ھی ان کی محل چھوٹی چھوٹی خیموں کی طرح ہوتی ہین. امام رازی کہتی ہین کہ ابوالعلاء نی یہ جدت طرازی کی کہ بجائی چھوٹی چھوٹی محل کی سرخ خیمہ کو مشبہ بہ بنایا پھر امام موصوف نی تقریباً بارہ اعراض اس تشبیہ پر کئی جن مین. کچی اہم باتیں درج ذیل ہین.

(۱) چنگاری کا رنگ زرد ہوتا ھی لہذا زرد اونٹ سی تشبیہ زائد مناسب ھی. (۲) اونٹ متحرك رہنی والی چیز ھی خمیہ ایسا نہین (۳) چنگاریوں کا ایك دوسری کی بعد سےپی آنا اسکی تشبیہ اونٹوں کی چھوٹی چھوٹی سی متحرك جماعت سی مناسب ھی (٤) عادة محل خواہ کتنا ھی مختصر ہو خیمہ بڑا ہوتا ھی پھر جب کہ وہ تعداد مین اونٹوں کی گلوں کی طرح ہو خیمہ کی تشبیہ مین یہ بات حاصل نہیں (٥) قران کی تشبیہ مین جسامت کا بیان بھی آچکا اور تعداد کا بھی اور موقع کا اقتضاء بھی یہی ھی. معری کی ھاں صرف جسامت کا ذکر ھی یوں سمجھو کہ قران کی تشبیہ مفصل ھی جو زائد بلیغ ھی بہ نسبت تشبیہ مجمل کی (٦) آیات سابقہ کو لحاظ کرتی ہوئی اس تشبیہ مین زاید مناسبت ھی بہلی گذر چکا ھی: انطلقوا الیٰ ظلٍ ذی ثلث شعب (یعنی (دھوئین کی) سائبان کی طرف چلو جس کی تین حصی ہین) ظل کی مناسب محل ھی ھی کہ خوب سایہ دار ہوتا ھی. محل والی کی پاس اکثر اونٹ ہوتی ہین لہذا قصر اور اونٹ کا ذکر نہایت مناسب ھی. انطلقوا الی ظل والی آیت ایسی سمجھو جیسی ایك دوسری مقام پر ھی ذق انك انت العزیز الکریم (چکھہ! تو تو معزز و گرامی قدر ھی) (۷) محل بہ نسبت خیمہ کی زاید ثقیل چیز ھی اسکا ہوا مین اڑنا بہ نسبت خیمہ کی اڑنی کی زاید دھشتناك ھی اگر کسی پر گرجائی تو خیمہ کی گرنی کی نسبت زاید باعث مصیبت ہوگا. (۸) شتر جب بی مہار ہو تو خدا کی پناہ پھر جبکہ ایسی اونٹوں کی بیشمار جماعتیں ہوں. مختصر یہ کہ ابوالعلاء نی سوچ سوچ کر آگ کی جس قدر صفات ہو سکتی تھین نہایت عجیب و غریب طرز

سو بیان کین لیکن ابوالعلاء نی جس آگ کا ذکر کیا
هی وه آتشباری کی آگ هو تو هو لیکن قران مین
جس آگ کا ذکر هی وه دوزخ کی آگ هی

حضرت اویس قرنی رح

قبیلۂ مراد سی تھی جو مذحج کی ایک شاخ ھی. سلسلۂ نسب یہ ھی اویس بن عامر بن جزء بن مالك بن عمرو بن سعد بن عصوان بن قرن بن ردمان بن مراد.

بیان کیا گیا ھی کہ عہد رسالت مین موجود تھی اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت کی وجہ سی جو نابینا تھین دربار نبوی مین حاضر نہ ھو سکی. اسوجہ سی صحابیت کی رتبہ سی محروم رھی. لیکن باتفاق صلحاء و صوفیۂ کرام انکا درجہ زھد و تقوی کی لحاظ سی تابعین مین سب سی بڑھکر ھی. علقمہ کا بیان ھی کہ تابعین مین آٹھہ اشخاص ھین جن پر زھد منتہی ھو گیا. عامر بن عبدالقیس، اویس قرنی، ھرم بن حبان، ربیع بن جشم، ابو مسلم خولانی، حسن بصری- امام مسروق رحمہم اللہ.[2]

متعدد روایات مرفوعہ بھی اس مضمون کی ھین. ابن سعد[3] نی لکھا ھی کہ جنگ صفین مین ایک شامی نی نکل کر پکارا کہ کیا تم (کوفہ والوں) مین اویس قرنی ھی؟ لوگوں نی کہا کہ «ھاں». اس نی کہا کہ مین نی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سی سنا ھی کہ اویس قرنی تابعین مین سب سی بہتر ھین یہ کہکر اپنی گھوڑی کو مہمیز لگائی اور آکر کوفیوں مین شامل ھوگیا.

دوسری روایت سلام بن مسکین کی حوالہ سی اسی مین ھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نی فرمایا کہ اس امت مین سی میرا خلیل اویس قرنی ھی.[4]

---

(۱) انکی حالات ابن سعد، حافظ ابونعیم اصفہانی، حافظ ابن مندہ، امام یافعی اور امام ذھبی وغیرہ نی لکھی ھین. ادھر فارسی اور اردو کی اولیا و اصفیا واخیار و ابرار کی تذکروں مین بھی وھی باتین کسی قدر تغیر اور غیر معتبر اضافوں کی ساتھہ درج کی گئی ھین. اس لئی ان سی مین نی تعرض نہین کیا اور صرف قدما کی روایات کو لیا. یہی وجہ ھی کہ اس مضمون مین بہت سی دلچسپ قصی جو متاخرین نی لکھی ھین. نہین آسکی.

(۲) لیکن یہ تو صرف سات ھوئی- غالباً آٹھوین امام ابن سیرین ھوں گی. مگر ذھبی کی نزدیك اس روایت کا یہ سیاق ھی باطل ھی (میزان الاعتدال)

(۳) طبقات جلد ٦ صفحہ ۱۱۲ (٤) اس کی ساتھہ صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی یاد رھی » لو کنت متخذاً خلیلا لاتخذت ابابکر خلیلا «

تیسری روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سی ھی کہ جب انھوں نی اویس سی فرمایا کہ "میری لئی مغفرت مانگو" جواب دیا کہ "مین کیسی آپ کی لئی استغفار کرون، آپ تو صحابۂ رسول مین سی ھین." حضرت عمر نی کہا کہ "مین نی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سی سنا ھی کہ تابعین مین سب سی بہتر ایك شخص ھی جسکا نام ھی اویس."

حافظ ابونعیم نی حلیۃ الاولیاء[1] مین حضرت ابوھریرہ سی روایت کی ھی کہ وہ بیان کرتی ھین کہ "مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی پاس اصحاب خاص کی حلقہ مین تھا. آپ نی فرمایا کہ "کل تمھاری ساتھہ ایك جنتی شخص نماز پڑھی گا." مجھی امید ھوئی کہ شاید وہ مین ھوں. سویری مسجد مین گیا اور آن حضرت کی پیچھی نماز پڑھی. جب سب لوگ چلی گئی تو ایك سیاہ چردہ مرد پیوند لگا ھوا تہبند باندھی ھوئی آیا. آن حضرت سی مصافحہ کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ میری لئی دعا فرمائی. سرور عالم نی اسکی لئی شہادت کی دعا کی. اسکی جسم سی مشك اذفر کی مہك آرھی تھی. مین نی پوچھا کہ "یہی وہ شخص ھی؟" فرمایا کہ "ھاں، یہ غلام ھی اور فلاں خاندان کی ملکیت مین ھی." مین نی کہا "آپ اسکو خرید کر آزاد فرما دیتی." جواب دیا کہ "مجھی اس سی کیا جبکہ اللہ تعالی نی اسکو جنت کی بادشاھوں مین سی بنایا ھی. ای ابوھریرہ! جنت مین بھی ملوك اور سادات[2] ھین اور یہ حبشی جنت کی انھیں ملوك اور سادات مین سی[3] ھی. اللہ تعالی اپنی مخلوق مین سی ان پاك نفس، مخفی فرمانبرداروں کو پسند کرتا ھی جنکی بال پریشان، چہری خاك آلودہ، اور شکم بجز کسب حلال کی بھوکی اور لاغر رھتی ھین، امیروں کی یہاں جب وہ باریابی چاھتی ھین تو نہین ملتی، نازنینوں سی نکاح کا پیغام دیتی ھین تو قبول نہین کیا جاتا، غائب رھتی ھین تو تلاش نہین کئی جاتی، حاضر رھتی ھین تو کوئی بات نہین پوچھتا، نہ بیماری مین کوئی عیادت کو آتا ھی، نہ مرنی کی بعد ان کی جنازہ مین شرکت کرتا ھی."

لوگوں نی پوچھا کہ "ایسا کوئی شخص ھم کو کیسی ملی؟" فرمایا کہ "ایسا

---

(۱) جز اول قلمی صفحہ ۲۵۷ (۲) ملوکیت کا یہ درجہ !! (۳) حضرت فاطمہ اور ان کی دونو بیٹی روایات کی مطابق سادات جنت مین سی ھین.

شخص اویس قرنی ہی،» لوگ بولی کہ اویس قرنی کون؟ کہا کہ «وہ بھوری بالوں والا' سرمگین چشم ہی' راستقد' برکشادہ' رنگ مائل بسرخی' تھوڑی سینی سی لگی ہوئی' نظر نیچی' دایاں ہاتھہ بائین پر رکھی ہوئی قران کی تلاوت کرتاہی اور اپنی نفس پر روتا ہی' دو سی تیسرا لباس نہین' ایك گلیمی تہبند' ایك گلیمی رداء' زمین مین گمنام ہی مگر آسمان مین مشہور. اگر وہ الله پر قسم دلائی تو الله اس کو ضرور پوری کردی. ہاں یاد رکھو اس کی مونڈھی کی نیچی ایك چمکتی ہوئی سفیدی ہی. قیامت کی دن جب نیك بندوں سی کہا جائیگا کہ جنت مین جاؤ، اویس کو حکم ہوگا: ٹہر جاؤ اور سفارش کرو. اس کی شفاعت سی ربیعہ اور مضر جتنی لوگوں کو الله بخش دی گا [1]. ای عمر! ای علی! جب تم اس سی ملنا تو درخواست کرنا کہ تمہاری لئی وہ مغفرت کی دعا کری»

یہ دونوں حضرات اس کی بعد بیس سال تك اویس کی تلاش مین رہی' یہاں تك کہ خلیفۂ ثانی نی اپنی زندگی کی آخری سال مین حج کی موقع پر حدود منی قبائل مین جاکر آواز لگائی کہ «ہم مین قبیلۂ مراد کا اویس نامی کوئی آدمی ہی؟» یہ سن کر ایك بڈھا شیخ لمبی داڑھی والا اٹھا اور کہا کہ «ہم اویس کو تو نہین جانتی البتہ میرا ایك بھتیجا اس نام کا ہی لیکن وہ گمنام اور بی مایہ ہی' یہ رتبہ نہین رکھتا کہ امیرالمؤمنین کی پاس اس کا ذکر ہو. وہ ہماری اونٹ چرانی کو لی گیا ہی.» حضرت عمر نی پوچھا «کہاں ملی گا؟» بولا کہ «میدان عرفات مین جہاں پیلو کا جنگل ہی.» یہ سن کر حضرت عمر اور علی دونوں اونٹ پر سوار ہوئی اور تیزی کی ساتھہ وہاں پہونچی. دیکھا کہ وہ شخص ایك درخت کی سایہ مین نماز پڑہ رہا ہی' اور اونٹ ارد گرد چر رہی ہین. [2]

ان لوگوں نی جاتی ہی سلام کیا. اویس نی نماز کو ختم کیا اور جواب

---

۱ ربیعہ اور مضر دو نامی عدنانی قبائل ہین جنکی تعداد بڑی ہی اور جنکی شاخین حجاز سی نجد تك پھیلی ہوئی ہین. فارسی تذکروں مین ہی کہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کی روئین برابر اس امت کی اشخاص کو بخشیدگا کاش یہی صحیح ہو کہ اس سی تقریباً ساری امت کی بخشش ہو جائیگی اس لئی کہ ان قبائل کی پاس کثرت سی بھیڑیں تھین.

۲ تذکرۃ الاولیا مین ہی اسکی اونٹوں کو فرشتہ چرارہا ہی.

دیا «وعلیکم السلام.» ان لوگوں نی پوچھا «تم کون ہو؟» کہا «اونٹوں کا چرواہا، اور اُنکی مالکوں کا نوکر» بولی کہ «ہم نام پوچھتی ہیں.» کہا کہ «عبداللہ.» فرمایا کہ «آسمان اور زمین کی کل چیزیں "عبداللہ ہیں"، ہمکو تمہارا وہ نام درکار ہی جو تمہاری ماں نی رکھا.» کہا کہ «اس سی کیا مقصد ہی؟» فرمایا کہ «نبی صلی اللہ علیہ وسلم نی ہم سی اویس قرنی کی اوصاف بیان کئی تھی جن میں سی بھوری بال اور سرمگین آنکھیں تو ہم دیکھ رہی ہیں، اب تمہاری بائین مونڈھی کی نیچی کوئی چمکتی ہوئی سفیدی ہو تو ہمکو دکھلادو [۱] اگر ہوگی تو تم وہی شخص ہو.» اویس نی مونڈھا کھولکر اُٹھایا، سفیدی نظر آئی. ان دونوں حضرات نی لپک کر اسکو چوم لیا اور کہا کہ «بیشک تم ہی اویس قرنی ہو ہماری لئی مغفرت مانگو، اللہ تمہاری مغفرت کریگا.»

اویس نی کہا کہ «میں استغفار میں کسی کو مخصوص نہیں کرتا نہ اپنی کو نہ اولاد آدم میں سی کسی اور کو بلکہ جمیع مؤمنین و مؤمنات و مسلمین و مسلمات کی لئی خواہ بر میں ہوں یا بحر میں مغفرت طلب کرتا ہوں.» پھر کہا «اللہ تعالی نی میرا حال تو آپ دونوں حضرات پر ظاہر کردیا، اب آپ اپنی بھی تعریف فرمائی» حضرت علی نی کہا کہ «یہ امیر المؤمنین عمر ہیں اور میں علی بن ابی طالب» یہ سنکر اویس سرو قد کھڑی ہو گئی اور سلام کیا اور کہا کہ «ای امیر المومنین، اللہ تعالی آپ کو اس امت کیطرف سی اور ای علی! اپ کو اپنی ذات کیطرف سی جزاء خیر عطا کری.» حضرت عمر نی فرمایا کہ «تم اسی جگہ رہو، میں مکہ میں جاتا ہوں اور تمہاری خرچ کیلئی کچھہ عطیہ اور پہننی کیلئی کپڑا لاتا ہوں. دیکھو! اسی جگہ ملنا.» اویس نی جواب دیا کہ «میں ملنی کا وعدہ نہیں کرتا، اور آج کی بعد پھر آپ کی اور میری ملاقات بھی نہ ہوگی. مجھی عطیہ کی کیا ضرورت ہی اور میں کپڑی لی کر کیا کروں گا، میری جسم پر گلیمی تہ بند اور گلیمی رداء ہی، میری

---

۱ مسلم اور اسدالغابہ میں تصریح ہی کہ یہ برص کا داغ باقی رہ گیا تھا لیکن اردو تذکروں میں اسکی بر خلاف یہ تصریح ہی کہ یہ برص کا داغ نہیں تھا.

پاؤں میں تسمه دار جوتیاں هین، اور چرائی کی مزدوری مین چار درهم بهی ملتی هین، یه کافی هین. ای امیرالمومنین! میری اور نیز آپ کی آگی ایسی پر خطر گهاٹی هی جسکو وهی پار کرسکتا هی جو لاغر میان، سبك بار، اور چست گام هو، اسلئی بوجهه هلکا رکهئی. الله آپ پر رحم کری.

حضرت عمر نی جب یه بات سنی تو اپنا دره زمین پر مارا، اور چلا کر روئی که "کاش عمر کی ماں عمر کو نه جنتی، کاش وه بانجهه هوتی، اور — — —"

اسکی بعد اویس نی کہا که "امیرالمومنین آپ روانه هوں تو مین اسطرف جاؤں" حضرت عمر مکه کی سمت پلٹی، اویس اونٹوں کو هانکتی هوئی ان کی مالکوں کی پاس لیگئی، چرواهی سی معافی چاهی، اور عبادت میں مصروف هوگئی.

ابن سعد نی اسیر بن جابر کا یه بیان لکها هی که کوفه مین ایك محدث کی پاس هم حدیث سننی کیلئی جمع هوتی تهی، جب فراغت هوجاتی تو سب لوگ چلی جاتی، صرف چند آدمی رهجاتی تهی، جن مین ایك شخص تها جو ایسی باتین کرتا تها که دوسروں کی منه سی مین نی نهین سنین. میری دل مین اس کی محبت پیدا هوگئی. ایکبار کئی روز تك مین نی اس کو حلقه مین نه دیکها، اپنی ساتهیوں سی پوچها که "فلاں شخص اس اس صفت کا جو هماری جماعت مین شریك تها وه کہاں هی؟" ایك نی کہا که "مین جانتا هوں، اس کا نام اویس هی." مین نی کہا که "تم اسکی منزل سی بهی واقف هو؟" کہا "هاں." مین اسکی ساتهه گیا، حجره کا دروازه کهٹکهٹایا. وه اندر سی نکلی مین نی کہا که "برادر آپ کیوں نهین حلقه میں آئی؟" بولی که "میری پاس کپڑی نهین هین. مین نی دیکها که ان کی ساتهی انپر آواره کستی اور ان کا مذاق اڑاتی تهی. مین نی ان کو اپنی چادر دی اور کہا اسکو پهن لو جواب دیا که "میری ساتهی جب اسکو میری بدن پر دیکهین گی تو هنسی اڑائین گی اور ستائین گی." مین نی اصرار کرکی وه چادر ان کو دیدی، جب وه نکلی تو انکی رفیق هنسی اور کہا که "آج یه چادر تمنی کہاں سی اوڑائی هی؟" انهوں نی آکر اسکو اتار دیا اور کہا که "تمنی دیکهه نه لیا." مین نی جاکر ان لوگوں کو سختی کی ساتهه ڈانٹا اور کہا

کہ اس مین ہنسی کی کیا بات ہی؟ انسان کبھی برہنہ رہتا ہی کبھی کپڑی پہنتا ہی۔"

اتفاق ایسا ہوا کہ اسی درمیان مین کوفہ سی ایک وفد حضرت عمر کی خدمت مین گیا جس مین ایک شخص ان لوگون مین سی بھی شامل تھا جو اویس سی تمسخر کرتی تھی۔ حضرت عمر نی ان سی دریافت فرمایا کہ "تم مین سی کوئی قرن کا باشندہ ہی؟" وہ شخص جاکر سامنی کھڑا ہوا۔ انھون نی کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نی فرمایا تھا کہ ایک شخص تمھاری پاس یمن سی آئی گا، وہاں اسکی ماں کی سوا اور کوئی اسکا نہ ہوگا اس کا نام ہی "اویس"۔ اسکی بدن مین سفید داغ تھی۔ اللہ سی اسی دعا کی کہ ان کو دور کردی؛ چنانچہ وہ جاتی رہی؛ صرف ایک درہم کی برابر داغ باقی رہ گیا ہی۔ سو تم مین سی جو کوئی اس سی ملی اپنی مغفرت کی دعا کرائی۔"

حضرت عمر نی کہا کہ "جب وہ شخص آیا مین نی اس سی پوچھا کہ "کہان گھر ہی" بولا "یمن" پوچھا "نام کیا ہی؟" کہا "اویس" دریافت کیا کہ "وطن مین کسکو چھوڑا؟" جواب دیا "صرف اپنی مان کو" پوچھا کہ "کیا تمھاری جسم مین سفید داغ تھی جن کو اللہ تعالی نی تمھاری دعا سی دور کردیا؟" بولا کہ "ہاں۔"مین نی کہا کہ "میری لئی مغفرت کی دعا کرو" اس نی پہلی کہا کہ "مجھہ جیسا شخص آپ جیسی بزرگ اورامیرالمومنین کیلئی مغفرت کا طالب ہو؟" پھر میری لئی مغفرت کی دعا کی۔ مین نی کہا کہ "تم میری بھائی ہو، میرا ساتھہ نہ چھوڑنا لیکن وہ غائب ہو گیا۔ اب مجھی معلوم ہوا ہی کہ وہ تمھاری ساتھہ کوفہ مین ہی۔" یہ سنکر وہ شخص جو اویس کی ہنسی اڑاتا تھا امیرالمومنین سی کہنی لگا کہ "ہم مین تو ایسا کوئی آدمی نہین ہی۔" انھون نی فرمایا "ضرور ہی" اسنی جواب دیا کہ "ہاں ایک آدمی اس نام کا ہی؛ لیکن اس سی ہم مذاق کرتی رہتی ہین۔" امیرالمومنین نی فرمایا کہ "اس سی ملنا، مگر مجھی امید نہین کہ تم اس کو پاؤگی۔"

جب وہ شخص کوفہ مین واپس آیا اپنی گھرمین جانی سی پہلی اویس کی پاس حاضر ہوا۔ انھون نی کہا کہ "یہ تو تمھارا دستور نہ تھا" بولا کہ "مین

نی امیرالمؤمنین سی تمھاری نسبت ایسی ایسی باتین سنین اب تم میری لئی مغفرت کی دعا کرو.» اویس نی کہا کہ «بشرطیکه تم میری ساتھه تمسخر چھوڑدو اور جو کچھه حضرت عمر سی سنکر آئی ہو اسکا کسی سی تذکرہ نه کرو.» پھر اُسکی واسطی استغفار کیا.

اسیر بن جابر کہتی ہین که اسکی بعد کوفه مین شہرت ہو گئی. مین اُنکی پاس گیا اور کہا که «یه کیسی عجیب و غریب باتین تمھاری نسبت مشہور ہو رہی ہین؟» بولی که «میری طرف سی تو کوئی بات پھیلائی نہین گئی ہی ہر شخص کو اسکی عمل کا بدله ملیگا». پھر وہ غائب ہو گئی. دوسری سال اشراف کوفه مین سی ایك شخص حج کی موقعه پر حضرت عمر سی ملا. انھون نی اس سی اویس کی بابت پوچھا. کہا که «مین نی انکو اس حال مین چھوڑا تھا که انکی پاس کچھه نه تھا اور وہ بالکل بی مایه تھی.» حضرت عمر نی وھی باتین جو اس سی پہلی لکھی گئی ہین بیان فرمائین اور اس شخص کو ترغیب دلائی که ان سی مغفرت کی دعا کرائی. جب وہ واپس آیا تو اویس سی مغفرت کی دعا کا طالب ہوا. انھون نی کہا که «تم ایك متبرك سفر سی واپس آئی ہو، حق تمھارا ہی که دعا کرو.» پھر اس سی پوچھا که «کیا تم عمر سی ملی تھی؟» اسنی کہا «ہان» اس پر حضرت عمر کی لئی بھی مغفرت کی دعا کی اور اسکی واسطی بھی. لوگون مین اسکا چرچا ہونی لگا، اسوجه سی وہ کوفه سی چلی گئی.

ایك بار قبیلۂ مراد کا ایك شخص انکی پاس آیا. پوچھا که «اویس کیا حال ہی؟» بولی که «اس شخص کا کیا حال پوچھتی ہو که جو صبح ہوتی ہی تو شام کی امید نہین رکھتا اور شام ہوتی ہی تو صبح کی. موت کی یاد مومن کی دل مین کوئی خوشی نہین چھوڑتی اور حقوق الله کی معرفت سی کوئی درہم و دینار اسکی پاس نہین رہتا اور اسکی احکام پر قائم رہنی سی کوئی دوست بھی باقی نہین رہ جاتا، کیونکه امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سی لوگ ہمکو اپنا دشمن سمجھنی لگتی ہین اور نافرمان بندی انکی مدد پر کھڑی ہو جاتی ہین. اسی کی بدولت بڑی بڑی تہمتین انھون نی مجھه

پر لگائیں لیکن پھر بھی میں امر الٰہی کی بجا آوری سی باز رہنی والا آدمی نہین ہوں۔"

ابن زید کہتی ہین کہ اویس کی عبادت بھی غیر معمولی تھی کبھی کہتی کہ یہ سجدہ کی رات ہی اور تمام شب سجدہ گذار دیتی اور کبھی کہتی رکوع کی رات ہی، اور تمام رات رکوع مین رہتی۔ ہر شام کو جو کچھہ کھانا یا کپڑا انکی گھر مین بچتا صدقہ کردیتی، پھر کہتی کہ ای الله اگر کوئی بھوکا مری یا ننگا رہی مجھہ پر اسکا مواخذہ نہین۔

مغیرہ کہتی ہین کہ اویس قرنی اپنی کپڑوں کو خیرات کردیا کرتی تھی یہان تک کہ اپنی حجرہ مین برہنہ بیٹھی رہتی تھی اور کوئی کپڑا انکی پاس نہین بچتا تھا جس کو پہنکر جمعہ شریك ہو سکین۔

حلیةالاولیاء مین یہ مرفوع روایت بھی درج ہی کہ رسول الله صلی الله علیہ وسلم نی فرمایا کہ "میری امت مین ایسی لوگ ہین جو عریانی کی وجہ سی مسجد مین نہین آسکتی بوجہ اسکی کہ وہ فقرا کی سوال پر اپنی کپڑی بخشدیتی ہین ان مین سی اویس قرنی اور فرات بن حبان ہین۔

ہرم بن حبان بیان کرتی ہین کہ "جب مین کوفہ مین پھونچا تو میرا سب سی بڑا مقصد یہ تھا کہ اویس سی ملوں۔ تلاش کرتی ہوئی فرات کی کناری گیا۔ دیکھا کہ اپنی کپڑی دھو رہی ہین مین نی علامات سی پہچان لیا۔ چہرہ گندم گون، گھنی داڑھی، رعب دار صورت۔ سلام کیا اور ھاتھہ بڑھایا۔ انھوں نی مصافحہ سی انکار کیا۔ مجھی انکا حال زار دیکھہ کر رونا آگیا۔ پوچھا کہ "ای اویس تمھارا کیا حال ہی؟" کہا کہ "ای ہرم تمکو میرا نام کسنی بتایا۔" مین نی کہا "الله نی۔ اور آپنی مجھی کیسی پہچان لیا؟ کیونکہ اس سی پہلی کبھی کی شناسائی نہ تھی۔" بولی کہ "میری روح نی تمھاری روح کو پہچان لیا اور میری جان تمھاری جان سی ہمکلام ہوئی۔ جسم کی طرح روح مین بھی جان ہی اور مومنین روح الٰہی کی وسیلہ سی باہم آشنائی رکھتی ہین گو انکی درمیان بعد مکان اور دوری منزل حائل ہو۔"

نی امیرالمؤمنین سی تمھاری نسبت ایسی ایسی باتین سنین اب تم میری لئی مغفرت کی دعا کرو.» اویس نی کہا کہ «بشرطیکہ تم میری ساتھہ تمسخر چھوڑدو اور جو کچھہ حضرت عمر سی سنکر آئی ہو اسکا کسی سی تذکرہ نہ کرو.» پھر اسکی واسطی استغفار کیا.

اسیر بن جابر کہتی ہین کہ اسکی بعد کوفہ مین شہرت ہو گئی. مین انکی پاس گیا اور کہا کہ «یہ کیسی عجیب و غریب باتین تمھاری نسبت مشہور ہورھی ہین؟» بولی کہ «میری طرف سی تو کوئی بات پھیلائی نہین گئی ھی ہر شخص کو اسکی عمل کا بدلہ ملیگا». پھر وہ غائب ہوگئی دوسری سال اشراف کوفہ مین سی ایك شخص حج کی موقعہ پر حضرت عمر سی ملا. انھون نی اس سی اویس کی بابت پوچھا. کہا کہ «مین نی انکو اس حال مین چھوڑا تھا کہ انکی پاس کچھہ نہ تھا اور وہ بالکل بی مایہ تھی.» حضرت عمر نی وھی باتین جو اس سی پہلی لکھی گئی ہین بیان فرمائین اور اس شخص کو ترغیب دلائی کہ ان سی مغفرت کی دعا کرائی. جب وہ واپس آیا تو اویس سی مغفرت کی دعا کا طالب ہوا. انھون نی کہا کہ «تم ایك متبرك سفر سی واپس آئی ہو، حق تمھارا ھی کہ دعا کرو.» پھر اس سی پوچھا کہ «کیا تم عمر سی ملی تھی؟» اسنی کہا «ھاں» اس پر حضرت عمر کی لئی بھی مغفرت کی دعا کی اور اسکی واسطی بھی. لوگون مین اسکا چرچا ہونی لگا، اسوجہ سی وہ کوفہ سی چلی گئی.

ایك بار قبیلۂ مراد کا ایك شخص انکی پاس آیا. پوچھا کہ «اویس کیا حال ھی؟» بولی کہ «اس شخص کا کیا حال پوچھتی ہو کہ جو صبح ہونی ھی تو شام کی امید نہین رکھتا اور شام ہوتی ھی تو صبح کی. موت کی یاد مومن کی دل مین کوئی خوشی نہین چھوڑتی اور حقوق اللہ کی معرفت سی کوئی درہم و دینار اسکی پاس نہین رھتا اور اسکی احکام پر قائم رھنی سی کوئی دوست بھی باقی نہین رہ جاتا، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سی لوگ ھمکو اپنا دشمن سمجھنی لگتی ہین اور نافرمان بندی انکی مدد پر کھڑی ہو جاتی ہین. اسی کی بدولت بڑی بڑی تہمتین انھون نی مجھہ

پر لگائین لیکن پھر بھی مین امر الٰہی کی بجا آوری سی بازرھنی والا آدمی نہین ہون۔"

ابن زید کہتی ھین کہ اویس کی عبادت بھی غیر معمولی تھی۔ کبھی کہتی کہ یہ سجدہ کی رات ھی اور تمام شب سجدہ گذار دیتی اور کبھی کہتی رکوع کی رات ھی، اور تمام رات رکوع مین رھتی۔ ھر شام کو جو کچھہ کھانا یا کپڑا انکی گھر مین بچتا صدقہ کردیتی پھر کہتی کہ ای اللہ اگر کوئی بھوکا مری یا ننگا رھی مجھہ پر اسکا مواخذہ نہین۔

مغیرہ کہتی ھین کہ اویس قرنی اپنی کپڑون کو خیرات کردیا کرتی تھی یہان تک کہ اپنی حجرہ مین برھنہ بیٹھی رھتی تھی اور کوئی کپڑا انکی پاس نہین بچتا تھا جس کو پہنکر جمعہ شریک ہو سکین۔

حلیۃالاولیاء مین یہ مرفوع روایت بھی درج ھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نی فرمایا کہ "میری امت مین ایسی لوگ ھین جو عریانی کی وجہ سی مسجد مین نہین آسکتی توجہ اسکی کہ وہ فقرا کی سوال پر اپنی کپڑی بخشدیتی ھین ان مین سی اویس قرنی اور فرات بن حبان ھین۔

ھرم بن حبان بیان کرتی ھین کہ "جب مین کوفہ مین پہونچا تو میرا سب سی بڑا مقصد یہ تھا کہ اویس سی ملون۔ تلاش کرتی ہوئی فرات کی کناری گیا۔ دیکھا کہ اپنی کپڑی دھو رھی ھین مین نی علامات سی پہچان لیا۔ چہرہ گندم گون، گھنی داڑھی، رعب دار صورت۔ سلام کیا اور ھاتھہ بڑھایا۔ انھون نی مصافحہ سی انکار کیا۔ مجھی انکا حال زار دیکھہ کر رونا آگیا۔ پوچھا کہ "ای اویس تمھارا کیا حال ھی" کہا کہ "ای ھرم تمکو میرا نام کسنی بتایا۔" مین نی کہا "اللہ نی۔ اور آپنی مجھی کیسی پہچان لیا، کیونکہ اس سی پہلی کبھی کی شناسائی نہ تھی" بولی کہ "میری روح نی تمھاری روح کو پہچان لیا اور میری جان تمھاری جان سی ھمکلام ہوئی، جسم کی طرح روح مین بھی جان ھی اور مومنین روح الٰہی کی وسیلہ سی باھم آشنائی رکھتی ھین گو انکی درمیان بعد مکان اور دوری منزل حائل ھو۔"

پهر مین نی کہا کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث روایت کرو، تاکہ مین اسکو یاد رکھون." فرمایا کہ "مجھی دیدار نصیب نہین ہوا، ہان ان لوگون سی ملا جو آپکی صحبت مین بیٹھی تھی اور انکی توسط سی وہ حدیثین بھی سنین جو تم لوگ سنتی ہو. لیکن مین محدث نہین اور نہ قاضی مفتی بننا چاہتا. مجھی میری نفس کا شغل ہی بہت ہی."

مین نی کہا "تو پھر کتاب اللہ کی کوئی آیت ہی سنائی اور کچھہ وصیت فرمائی." انھون نی میرا ہاتھہ پکڑ لیا اور فرات کی کناری چلی اور کہا کہ "میری رب کا قول ہی اور اسی کا قول حق ہی. میری رب کی حدیث ہی اور اسی کی حدیث سچی ہی. میری رب کا کلام ہی اور اسی کا کلام بہتر ہی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ان یوم الفصل میقاتہم اجمعین." یہ پڑہ کر اس طرح روئی کہ مجھکو گمان ہوا کہ انکو غشی آ گئی، پھر انھون نی اسکی آگی کی آیت بڑھی اور میری طرف دیکھا اور کہا کہ "ای ہرم! تیرا باپ مر گیا اور تو بھی عنقریب مریگا، پھر جنت مین جائیگا یا دوزخ مین. آدم بھی مر گئی، حوا بھی مر گئین. ابراہیم خلیل الرحمن بھی، موسی بھی، اور محمد بھی. سب پر اللہ کی سلامتی ہو. ابوبکر خلیفۃ المسلمین بھی مر گئی اور میری بھائی میری دوست اور یار حضرت عمر بھی. ہائی عمر! ہائی عمر! ہائی عمر!"

ہرم کہتی ہین کہ یہ حضرت عمر کی خلافت کا آخری زمانہ تھا. مین نی کہا کہ "وہ تو نہین مری ہین بلکہ زندہ ہین." کہا کہ "نہین مر گئی. اللہ نی انکی موت کی خبر مجھکو دیدی." پھر انھون نی دعا کی، اسکی بعد فرمانی لگی "ای ہرم! مین تمکو کتاب اللہ کی وصیت کرتا ہون اور موت کو یاد دلاتا ہون. اسی کبھی نہ بھولنا. جب واپس جانا تو اپنی قوم کو بھی سکھانا اور اپنی جان پر زحمت اٹھانی مین دریغ نہ کرنا. جماعت کا ساتھہ ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ دین ہاتھہ سی جاتا رہیگا، اور تمھین خبر بھی نہ ہوگی، اور جب تم مروگی توقیامت کی دن دوزخ مین جانا ہوگا. پھر منہ اوپر کو اٹھایا اور کہا کہ "ای اللہ! اسکا خیال یہ ہی کہ یہ میری ساتھہ خالص تیری لئی محبت رکھتا ہی اور اسی وجہ سی ملنی آیا ہی. اسکو جنت مین داخل کرنا کہ وہان

بھی میری زیارت کو آئی۔ اسکو تھوڑی دنیا پر رضامند رکھنا اورعافیت دینا اور نعمتوں کا شکر گزار بنانا۔ ای ھرم! اللہ حافظ۔ آج کی بعد پھر مین تم کو نہ دیکھوں کہ تم میری جستجو میں ھو نہ میری بابت کسی سی سوال کرنا۔ مین تمکو یاد رکھونگا اور انشاءاللہ تمھاری حق مین دعا کرتا رھونگا۔" یہ کہکر وہ میرا ساتھہ چھوڑ کر ایك طرف نکل گئی۔ اسوقت سی پھر نہ مین نی ان کو دیکھا نہ ان کی خبر سنی۔"[۱]

حافظ ابونعیم عبداللہ بن سلمہ کی روایت لکھتی ھین کہ حضرت عمر کی عہد مین ھم آذربیجان کی جنگ مین گئی تھی' اویس بھی ساتھہ تھی۔ واپسی مین بیمار ھوئی ھم نی انکو سواری پر اٹھا لیا۔ آخر وہ گذرگئی۔ جہاں ان کی نعش اتاری وھاں دیکھا کہ ایك قبر کھدی ھوئی ھی اور پانی اور حنوط موجود ھی۔ نہلاکرنماز جنازہ پڑھی اور دفن کردیا۔ جب آگی بڑھی تو خیال کیا کہ ان کی قبر پر کوئی نشان بنا دین' پلٹ کر آئی تو نہ وھاں قبر تھی نہ اسکا کوئی اثر[۲]۔ اسی کی بعد وہ ایك دوسری روایت لکھتی ھین کہ اویس جنگ صفین مین موجود تھی۔

امام ذھبی بھی فضیل بن عیاض سی نقل کرتی ھین کہ حضرت عمر نی جب کہ وہ مقام منا مین منبر پر تھی اھل یمن کو پکارا۔ وہ لوگ جاکر سامنی کھڑی ھوئی۔ پوچھا کہ " کیا تم مین کوئی شخص اویس نامی ھی؟" ایك نی جواب دیا کہ " ایك دیوانہ شخص اس نام کا ھی جو صحرا اوربیابان مین پڑا پھرتا ھی۔ کہا کہ "مین اسی کو پوچھتا ھوں' جب تم واپس جانا تو اسکو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور میری طرف سی سلام پھونچا دینا۔" جب ان لوگوں نی جاکر اویس کو سلام پہنچایا تو انھوں نی کہا کہ " امیرالمومنین نی میری تشھیر کردی " اسکی بعد غائب ھو گئی۔ حضرت علی کی عہد مین

---

۱ حلیۃالاولیاء جلد اول قلمی صفحہ ۲۶۰

۲ میزان الاعتدال مین امام ذھبی نی بھی ایك روایت لکھی ھی کہ اویس نی غزوۂ آذربیجان مین انتقال فرمایا اور ان کی ھمراھی ان کی قبر کھودنی کی لئی ٹوٹی پڑتی تھی۔ اس بیان سی یہ معلوم ھوتا ھی کہ مسلمانوں نی قبر کھودی تھی نہ کہ جنوں یافرشتوں نی۔

ظاہر ہوئی اور جنگ صفین مین ان کی ساتھہ شرکت کی اور اسی مین شہید ہوئی. دیکھا گیا تو جسم پر چالیس سی زیادہ زخم تھی.[1]

ابن سعد نی طبقات مین لکھا ھی کہ اویس ثقہ ھین گو ان سی کوئی حدیث مروی نہین، لیکن امام بخاری نی اپنی تاریخ مین اویس کو باصطلاح محدثین «فی اسنادہ نظر» کہکر مجروح کیا ھی. اسپر امام ذھبی میزان الاعتدال مین لکھتی ھین کہ اویس نی تو کوئی روایت ھی نہین کی ھی جو انکی ثقہ یا غیر ثقہ ہونی کی بحث اٹھائی جائی. اگر امام بخاری نی ان کو ضعفاء مین نہ لکھا ہوتا تو مین قطعاً ان کا ذکر ھی نہ کرتا کیونکہ وہ اولیاء صادقین سی ھین.[2]

مگر حقیقت یہ ھی کہ بخاری جیسی عظیم الشان امام کی نسبت یہ خیال کرنا کہ بلاروایت کی وہ اویس کو معرض جرح و تعدیل مین لائی ھین بدگمانی ھی. یقیناً ان کی مرویات ان کو پہونچی ہونگی. خود حافظ ابونعیم نی حلیۃ الاولیاء مین اویس کی روایت سی ایک حدیث نقل کی ھی.

بعض لوگ ابراھیم بن ادھم کیطرح اویس کی وجود کی بھی منکر ھین، کیونکہ ان کی قوم مراد سی جب اویس کی بابت سوال کیا گیا تو انہون نی اپنی قبیلہ مین کسی ایسی شخص کی وجود سی انکار کیا. امام ابواسحاق اور عمرو بن مرۃ سی بھی جب دریافت کیا گیا تو انہون نی کہا کہ ہم اویس کو نہین جانتی. امام مالک رحمۃاللہ علیہ بھی انکی وجود کی منکر تھی اور فرماتی تھی کہ ایسا کوئی شخص نہین گذرا ھی.

امام ذھبی لکھتی ھین کہ اویس کی اسقدر شہرت ھی کہ ان کی وجود مین شک کی گنجائش نہین. ان کا خیال یہ ھی کہ علم عدم علم پر مرجح ھی ممکن ھی کہ ان منکرین کو ان کی بابت علم نہ پہونچا ہو.

---

١ صحابۂ کرام مین سی حضرت عمار بن یاسر جنکی نسبت نبی صلی الله علیه وسلم کی پیشین گوئی «تقتله الفئة الباغیه» حدیث مین وارد ھی جنگ صفین مین حضرت علی کی ساتھہ تھی ـ اب بروایت زید بن علی اس حدیث سی ثابت ہوا کہ تابعین کی سرتاج اور ولی کامل حضرت اویس بھی شریک تھی ـ جنکی وجہ سی بعض حق پسند شامی کوفیون مین آکر شامل ہوگئی تھی ـ

٢ میزان الاعتدال مین انہین لوگونکا تذکرہ ھی جنپر کسی نہ کسی حیثیت سی جرح وارد ہوئی ھی.

لیکن حقیقت یہ ہی کہ اکثر روایات جو اویس کی متعلق مذکور ہوئین بوجہ ضعف یا مجہولیت رواۃ کی غیرموثق ہین، اور درایتا مجعولیت اور اختلاق کی آثار ابر اسقدر ہویدا ہین کہ کسی برہان یا حجت کی حاجت نہین. صرف اسیر بن جابر والی روایت اصولا قوی ہی، کیونکہ تین طرق سی صحیح مسلم مین مروی ہی، لیکن ائمہ حدیث مین اسکا نام ہی محل بحث ہی کہ اسیر ہی یا یسیر اور ابن جابر ہی یا ابن عمرو، پہر امام ابن حزم نی تصریح کی کہ وہ قوی راوی نہین ہین. اسی حالت مین امام مالك کا انکار کچھہ معنی رکھتا ہی. حاصکر اسوقت جبکہ خود اویس کی قوم بھی انکاری ہی.

صوفیون مین ایك فرقہ اویسیہ تہا جو حضرت اویس کیطرح نبوت کی بلا واسطہ فیض حاصل کرنی کا مدعی تہا. اکثر اس مین صاحب حال ہونی تہی جو وجد مین رقص کرتی تہی، مگر تہوڑی ہی مدت مین یہ طائفہ ختم ہوگیا اور آگی نہ بڑھا.

لاھور کی ملاقاتین

میری استاد مسیو لوئی مسیون پروفیسر کالج دی فرانس نی « لاھور کی ملاقاتین » کی عنوان سی شہزادہ دارا شکوہ اور بابا لعل داس کبیر پنتھی کی دلچسپ مکالمہ شائع کئی ھین. داراشکوہ کو صوفیون اور سنیا سیون سی ملنی کا بہت شوق تھا. سنہ ۱۶۵۳ ع مین جب لاھور گیا تو بابا جی سی ملنی گیا اور اپنی چند شکوك رفع کرنی کی درخواست کی؛ چنانچہ ان مکالمون کا بیشتر حصہ انھین ما بعدالطبعی مسائل اور مذھبی شکوك کی بیان پر مشتمل ھی. باتین ھندوستانی زبان مین ھوئین، بعد مین اسکی منشی چندر بھان پٹیالوی نی انھین قلمبند کرکی فارسی ترجمہ کیا.

دارا شکوہ کی شخصیت اسلامی ھند کی تاریخ مین بڑی اھمیت رکھتی ھی. وہ اور اسکا بھائی « برادر نا مہربان » اورنگ زیب ھندوستانی مسلمانون کی قومی زندگی کی دو مخصوص رجحانون کی بہترین نمایندگی کرتی ھین. مسلمانون کی ھندوستان مین آتی ھی انکی « قومی » زندگی دو مختلف رجحانون مین بٹ گئی. ایك کا منشاء، کیا بلحاظ انکی عقائد و معاشرت اور کیا بلحاظ ان کی فن و ادب کی انھین ان کی اصلیت یعنی ٹھیٹ ھندیت کی طرف مائل کرتا تھا، اور دوسری کی غرض یہ تھی کہ وہ ھندوستان مین بیگانون کی طرح رھین اور مذھبی اصطلاحون کی آڑ مین اپنی قومی وجود سی چشم پوشی کرتی رھین. سب سی پہلی صوفیائی کرام نی ھندوستان کی مسلمانون کی زندگی کی مخصوص حالات کو محسوس کیا اور اپنی روادارانہ رویہ سی ان کی رجعت پسندانہ کٹرپن کی روك تھام کرتی رھی. ساتھہ ساتھہ ھندو شائستگی و تہذیب سی خوشہ چینی مین بھی انھون نی کوئی تامل نہین کیا. اکبر اور اس کی مشیرون نی اس رجحان کی ھمدردانہ سرکاری پشت و پناھی کی اور اسی

ایك مستقل تحریك بنا دیا. داراشکوه اسلامی هند کی اس تحریك کا آخری نماینده هی. اسکی اور اورنگ زیب کی تخت نشینی کی بعد مذهب اور سیاست دونون نی رجعت پسندانه رویه اختیار کیا اور اس کی بعد سلطنت مغلیه کی زوال اور اجنبی حکومت کی قیام نی مسلمانوں کی قومی زندگی کا توازن رها سها جو کچهه تها وه بهی بگاڑ دیا.

بابا لعل داس کی شخصیت بهی دلچسپی سی خالی نهین. یه کبیر پنتهی هین اور دارا شکوه کی طرح یه بهی ایك مخصوص تحریك کی حامی هین. کبیر داس ویشنوی اصلاح کی تحریك کا علمبردار تها. اس تحریك کی بنیادین بهگتی کی فلسفه پر قائم هین لیکن جیسا که خود کبیرداس کی کلام سی ظاهر هی ان کی خیالات بڑی حد تك اسلامی اصول کی رهین منت هین. غرضکه اس مکالمه کی دونون شخصیتین ایك خاص اهمیت اور دلچسپی رکهتی هین.

یوسف.

یه متن بڑی حد تك نسخه الف (نادر المکات، اکسفورڈ بوڈلین ۱۲٤۱، تقسیم اوسکی فارسی، فولیو ۱۵۳ ب، ۱٤۵ الف) پر مبنی هی، دوسری نسخی جنسی مقابله کر کی بعض جگه اضافه کیا گیا هی یه هین. ب (انتخاب، لندن برٹش میوزیم ۱۸٤۰٤—فولیو ۲٤۸—۲۵۹) اور د (برلن ۱۰۸۱—۱۰۸۲ اسپرنگر ۱٦۵۹—فولیو ۱۷٦ب—۱۸۳ الف).

لکهنؤ کی ایك نسخه مین اور نسخوں سی اتنی عبارت آخر مین اور زیاده هی: «بسمله، سوالات دارا شکوه شاهزاده جواب گوسائین بابا لال ساکن کیتل محران رائی چندر بهان برهمن منشئی شاهزاده، سه سه روز دو مجلس شده و سابق رائی جادو داس در بیاض خاص نوشته بودند در ننولا بعد فتح قندهار باز اتفاق افتاد.»

لوئی مسیون

گوشه[1] بابا لعل و شاهزادهٔ والاگهر دارا شکوه در دارالسلطنت لاهور مجلس شده بود جواب سوال نوشته شد[2]

جواب سوال دارا شکوه هر که بخواند حقایق دنیا معلوم گردد با فقیر صاحب حال در بیان تحقیق بعضی مطالب حقیقت آیندی؟

(۱) سوال عزیز آنکه در ناد و بید چگونه فرق توان کرد؟

جواب کامل آنکه چنانچه پادشاه و حکم پادشاه بمعنی ناد و حکم بمعنی بید است.

(۲) سوال عزیز آنکه در ماهتاب روشنی چیست و سیاهی کیست و سفیدی [از][3] چه باشد،

جواب کامل آنکه ماهتاب بکلی در ذات خود شعاعی ندارد یك چیز محض صاف است که شعاع آفتاب درو می تابد و سفیدی عکس دریا ست و سیاهی عکس زمین است.

(۳) باز عزیز می گوید که اگر عکس باشد چرا درآفتاب نمی نماید؛

باز کامل می فرماید که آفتاب مجموعه مثل آتش است و ماهتاب مجموعه آب عکس درآب می پذیرد نه در آتش.

(٤) سوال عزیز آنکه هرگاه بنده بندگی بکند قبول و ناقبول چه طور دانسته شود؟

جواب کامل آنکه که اگر ریاضت کننده بر خود مغرور شود و بگوید که ریاضت من خوب نشده است باید دانست که چیزی کرده باشد و شخصی که ریاضت کند و بر خود اعتبار گیرد و غرور کند و بگوید که من ریاضت خوب کرده ام باید دانست که کردهٔ او در پیش است[4] بر منظور قبول نیفتاده.

---

(۱) نسخهٔ (الف) مین «گوشت» هی. گوسائیں یا گوشه گیر.

(۲) نسخهٔ (د) مین یه عبارت اور زیاده هی؛ «آنرا اهل فراست چندر بهان برهمن از زبان هندوی بلسان فارسی نمود»

(۳) نسخهٔ (ب)

(٤) نسخهٔ (ب) مین «اوست» هی.

(٥) سوال عزیز آنکه فقر را با قید از چه رهگذر توان گفت؟
جواب کامل آنکه وجود از خوردن و نوشیدن و دیدن و شنیدن و خواب کردن عادت دارد در قید اوست، هر که پائی‌بند این قسم چیزها شود و محتاج اینها باشد و لی اینها بفراغ بگذراند نه قید است.
(٦) سوال عزیز که بت برستی در عالم هند چسب و فرمودهٔ کیست؟
جواب کامل که این معنی را برائی استحکام دل مقرر کرده اند، شخصی که از معنی خبردار باشد در صورت از این معنی معدود است که هرگاه که از باطن آگاه هستند در صورت وابستهٔ صورت است. چنانچه دختران کدخدا صورت [لعبت][1] بازی دارند بعد ازان که کدخدا شدند همان کار نمی کنند، این کار قسم بت پرستی است تا آنکه از باطن آگاه بست در صورت هرگاه که از باطن آگاهی یافت از صورت خواهد شتافت.
(٧) سوال عزیز آنکه طریقهٔ اهل عالم از خوردن و نوشیدن و دیدن و شنیدن و خواب کردن و جمیع اعضا بکار بردن قوائی عنصر یافتن است صافی نهادان نیز اگرچه موافق این جماعه هستند اما کم و زیاده بکار می برند. پس فرق در طریقهٔ عالم و صافی نهادان چه فرق توان گفت؟
جواب کامل آنکه کار با دل است صافی نهادان نگهبانی دل دارند و عالم از دست برباد داده است چنانچه طفل و جوان در خوردن و نوشیدن و دیدن و شنیدن و خواب کردن برابر اند اما طفل را اگر زن بیگانه در بغل گیرد عیبی نیست جوان بیگانه اگر نگاه کند صد عیب دامنگیر او می شود. همچنان صافی نهادان مانند طفلان می‌گذرانند و عالم در طریقهٔ عالمیان است.
(٨) سوال عزیز آنکه که بعضی می گویند پیر من خس است اعتقاد من بس است.
جواب کامل که این حرف (نقیصه[2] تعلق دارد)[3] عالم غلط فهمیده است

(١) نسخهٔ (ب) مین لفظ «لعبت» موجود نہین،
(٢) مسیو هوار کی رائی هی که یه لفظ «نقصه» هی،
(٣) نسخه (ب) مین موجود هین،

هرگاه پیر خسی خواهد بود مرید بمراد از کجا خواهد رسید، چنانچه عورت با مرد صحبت خواهد داشت اطفال بهم خواهد رسانید و اگر با خواجه سرائی و از قسم دیگر الفت داشته باشد محروم است، «او خویشتن گم است کرا رهبری کند.»

(۹) سوال عزیزکه مرید [تا][1] در خدمت پیر بی بهره مند است وطبع برخلاف می ورزد بعد ازاں که خدمت پیری رسد فائق گردد؛ از چه رهگذر؟

جواب کامل که، چنانچه عورت تا کد خدا ازهیچ یکی شرم نه دارد بی محابا جانب هرکس نگاه می کند. هنگامی که کد خدا شده وصحبت مرد یافت برقع شرم برو غالب آمد و سرنگوں شد.

(۱۰) سوال عزیز که مرشد باستصواب[2] مرید خود می کند به نسبت مریدی همه مریداں خود را برابر می داند؛ بعضی ازاں بسخن مرشد کامل به نشاء معرفت الهی رسده بهره ور می شوند؛ بعضی محروم و مرشد کامل را بهیچ دوی درمیان نیست مریداں همه برابرند. چوں فرق در افتاد؟

جواب کامل آنکه مریدی که باعتقاد باطن خدمت پیر می کند و شبد یعنی سخن مرشد را از خلوص عقیدت و راستی برلوح دل نقش کرده مطابق امر بجا می آرد، باندك زمانی کشتی مقصود او بساحل مراد می رسد. ابیات:

راستی آور که شوی رستگار راستی از تو ظفر از کردگار
از کجا افتی بکم و کاستی ار همه غم رستی اگر راستی

و آنکه بر سخن مرشد قایم و ثابت نمی باشد و مائل خواهشهائی نفس بوالفضل شده بخواهشهائی می پردازد؛ محروم می نماید.[3]

مصرعه:

«در نیام راست نآید گر بود شمشیر کج.»

دوهره:

جنکی انتر باسنا بهجن دهری نه دهیان تن کون گوبند ناملی انت هوت هی هان[4]

---

۱ نسخهٔ (ب) مین هی.
۲ نسخهٔ (ب) اور (د) مین لفظ «باستر صائی» هی.
۳ نسخهٔ (ب) مین «می ماند» هی.
٤ نسخهٔ (ب) مین یه دوهره موجود نهین نسخه ی) مین یون هی:
جهکی انتر باسنا تاهی دهری دهیان تهکو گوبند نا ملین انرت هوت هی هان

مثل دیگر آنکه «دوك كج ریسمان نمی بافد» هرگاه اهل باف دوك كج را پیش آهنگری برد، باندك ضرب نیكو راست می کند ، همان دستور ریسمان می بافد، همین قسم مرید و مرشد است، اگر مرید خود را بمرشدی سپارد کجی یعنی گمراهی بضرب سخت دور نموده بمراد می رساند، رباعی

تا بست نگردی ره هستت نه دهند   این مرتبه در همت پستت ندهند
چون شمع گداختن اگرتن ندهی   سر رشتهٔ روشی بدستت ندهند

(۱۱) سوال عزیز آنکه در خالق و خلق چه فرق توان کرد، نیز از شخصی پرسیده بودم او در جواب اظهار ساخته که چنانچه درخت است و تخم درخت. اما همچنان است یا چه طور ؟

جواب کامل که خالق مانند دریا و خلق کوزهٔ آب، اگرچه در و آب یکیست در آبدان تفاوت کمال دارد. همچنان خلق خالق است و خلق خلق.

(۱۲) سوال عزیز آنکه پرم آتما جیو آتما چگونه باشد و باز پرم آتما چگونه شود؟

جواب کامل آنکه چنانچه از آب شراب شده و هرگاه در زمین ریزد و آلایش (و)[1] مستی و جنب را بر زمین می گذارد و آب خالص در زیر زمین رود باز آب است، همین قسم آدم که جیو آتما باشد، هرگاه آلایش مستی حواس خمسه وجود گذارد بحق[2] پیوندد.

(۱۳) سوال عزیز که در آتما و پرم آتما چه تفاوت باشد ؟

جواب کامل آنکه هیچ تفاوت نیست.

سوال عزیز که [اگر تفاوت نیست[3]] پس در صورت [ثواب و[4]] عذاب چون در آید ؟

جواب کامل که تاثیر قلب است چنانچه گنگ و آب گنگ.

۱۵ باز عزیز می گوید که درین چه تفاوت توان کرد ؟

کامل می گوید تفاوت بسیار است و از حد بی شمار چرا که آب گنگ

(۱) نسخه (ب) مین موجودنهین.
(۲) نسخه (ب) مین «بهرمانبان» هی.
(۳) نسخهٔ (س) مین هی.
(٤) نسخهٔ (س) مین هی.

اگر درکوزه در آید و یك قطرهٔ شراب دروافتد حکم شراب دارد واگر در کنگ صد هزار کوزهٔ شراب افتد همه کنگ استدرین صورت پرم آتما خالص است و مخاص آتما در تقید وجود هرگاه وجود گذارد پرم آتما می شود و تا در وجودست آتماست.

(١٦) سوال عزیز آنکه جوگبشر را عبارت از فقیر کامل است کجا توان دانست؟

جواب کامل آنکه درجائیکه آغاز نشاء خواب و بیداری ندانند چگونه که[1] تمام عالم را خواب می گیرد اما از هنگام آغاز آن واقف است که در چه وقت گرفته وقتیکه این حالت روئی دهد وندانند سده توان دانست.

(١٧) سوال عزیز آنکه تریا [اوشها][2] که [عبارت از][3] لاهوت است در کدام جا ظهور دارد؟

جواب کامل سر جادر سده اول مهاپورکهه که بعد ازکسب کمال مرتبهٔ کشف معنوی دست داده باشد، دویم در طفل، سویم در شراب خور غلطان.

(١٨) بارعزیز می گوید که درسده اظهرمن‌الشمس است اما در طفل و شراب خور چگونه اعتماد توان کرد؟

باز کامل می فرماید که[4] تریا دراصل ازخودگذشتن است و این بهر سه کس می باشد غائب در سده مهاپورکهه حسین سده که بیهوش است در همه جا ظهور دارد و کار می کند و هیچ جائی نیست و در طفل و مخمور برائی ممعل و لعل[5] دارد و الا خواهشها در و پوشیده اند بعد ازخمار برمی اید جو گیشر همیشه در خمار می ماند اما شبد برهم ازهر سه واقع است غایب از مهاپورکهه تاثیر می کرد از آنها هم اثر کنند اما ندانست قدرت ندارد.

(١٩) سوال عزیز آنکه در کتب هندوی خبر می دهند که هر کس در

---

(١) نسخهٔ (الف) مین «که در» هی.

(٢) نسخهٔ (ب) مین هی.

(٣) نسخهٔ (ب) مین هی.

(٤) نسخهٔ (الف) مین «که در» هی.

(٥) نسخهٔ (ب) مین «تمثیل» هی؛ اور نسخهٔ (د) مین «تمثیل بعمل» هی.

کاشی رحلت می کنند بیشك مکت می یابد ازین معنی تعجب می آید که احوال زاهد و معصیت کننده مساوی باشد؟

جواب کامل آنکه در اصل کاشی وجود را قرار داده اند. هر که در وجود بمیرد بیشك مکت می یابد.

(۲۰) باز عزیز می گوید که در وجود تمام عالم می میرد پس همه را مکت می شود.

جواب کامل که غیر از مهاپورکهه در وجود هیچ کس نمی میرد و در خواهشها می میرند. خواهش از وجود علاحده است خواهش بخواهش می رساند. از مکت محروم می ماند.

(۲۱) سوال عزیز آنکه در کتب هندوی آگاه نموده اند که اوتار برائی رفع فاسدان و قطع ظالمان و محافظت صافی نهادان و استحکام حق برحق می شود، خصوصاً درست جگ تمام صواب بود ز در ترتا جگ سه حصه صواب و یك حصه عذاب و در دواپر جگ قرار بالمناصفه و در کلجگ یك حصه صواب و سه حصه عذاب. در آخر دواپر جگ که اوتار سری کشن صد واقع شده محقق[1] برائی منافع آدمیان و عالمیان و رافع ظالمان و نگاه بانی صافی نهادان وارد گشتهٔ و صافی نهادان که سابق برعالم بودند آنها را همراه برده و طریق عالم براستی نمانده چنان خیال بر چه توان کرد؟

جواب کامل که اوتار محض برائی این می شود که طریقه جگ گذشته ازو منسوخ سازد و آینده دورحان را استحکام دهد محافظت صافی نهادان در صورتی بود که همراه بردند طریقهٔ عالم که مرتبه چهارم آخریست موافق همان برین نشود.

(۲۲) سوال عزیز آنکه صافی نهادان در مقام کجا می نمایند و در عالم کجا؟

جواب کامل آنکه صافی نهادان در مقام جبروت که سکهوپت است استقامت

---

(۱) مسیو هوار کی رائی هی «محقق» کی بجائی «محض» زیاده موزوں هی.

می ورزند عالم در [ناسوت که]¹ بی هوش است از بیداری و خواب محروم است و از جبروت هم محروم پس شخصی که به بیداری هوشیار است در خواب همان روبکار و آنکه در بیداری غفلت ورزد در خواب همان دیدار .

(۲۳) باز عزیز می گوید هرگاه عالم در بیهوشی رفته یعنی در خواب و خراب که بعد از بیداری یقین می شود چه توان دانست ؟

جواب کامل که در خواب جمال و جلال که ساتك و راجس و تامس باشد جائی دارند، پس هرچه که راجس و تامس ظهور می انجامد باطل است و آنچه که ساتك می پزیرد در بیداری ظاهر .

(٢٤) سوال عزیز آنکه جوگیشر را از ممر خواهش تبدیل مکان که در معنی اوتار باشد دست می دهد. جوگی کامل والی سلطنت عظیم می شود، چون در جائیکه ریاضت جوگبست اصلاد هشت در میان نیست و بعدازآن که در صورت سلاطین می شود تدبیر او بندوبست کردن و کشتن در میان می آید هرگاه که درآنوقت راه این معنی نبود الحال باین همه از کجا بهم رسند ؟

و جواب کامل آنکه فی‌الواقع چنان است اما قیاسی باید کرد و حشمت جنگ و جدل روبداد برابر جوگی هیچکس ندارد که در معنی روز و شب با خواهش حس ر آورد و هر روز جنگ تازه درمیان است در همین آشنائی خواهش بیائی دنیاوی می رساند در امور انصاف در هر جا که کذب و دروغ است نا شایسته خواهش می باید دشمن قوی خود دانسته تدبیر می کنند .

(٢٥) سوال عزیز آنکه چون ظاهر می سازد که در راج جوگ می شود چگونه اعتبار توان کرد که راج خالی از مشغله آرایش ترتیب نیست ؟

جواب کامل آنکه در راج جوگ بواقعی می شود ازین سبب که هرگاه که میل صحبت اهل دنیا باشد چرا که خالص از دنیا جوگ است و قید دین دنیاست پس قیاس باید کرد که ساعتی و لمحه که خواهش صحبت اهل‌الله باشد دنا را در آن وقت دخل نمی شود همه قدر جوگ است .

(٢٦) سوال عزیز آنکه چون ظاهر می سازد که اکثر فقیر را خواهش

---

(١) نسخه (ب) مین هی.

در خاطر است مردم برائی افزونی عزت خود لباس درویشاں می آمیزند آخر حقیقت اینها ظاهر می شود ازیں معنی خاطر نہایت مکدر می گردد ملك می خواهد که احتراز دارد؟

جواب کامل آنکه ایں راه را هرگز بند نخواهند کرد که اهل الله از همین گذر وارد می شود چنانچه اگر کسی سنگ را از همین ملاحظه جمع می کرده باشد سنگ پارس بدست می افتد و نیز از درویش که از لبسی به مجلس در می آید ایشان ثواب عظیم است که هرگاه او ازیں بر آمده بمقام خود فرو می رسد مردم خدمت پرستش او بسیار می کنند ثواب بیشمار است

روزی چند مکرر ہم سوال کرد بر جواب حاضر بود از آنجا که گفتن به کردار تعلق دارد بعد از استفسار ایں مقدمات کامل خاموش ماند عزیز از بیٔی سوال تازگی در آمد دریں صورت سخن کرد که اگر گفتار را در همیں سوال و جواب فی البدیه گفته شود تا بجا شود که در جمع کتب مذکور درمیان است دست آخر هماں و اکثر در باش دست غایب تا لذتی ہم می رسد ساعتی بر او توقف باید داشت که دل درمیان است دست سودگی گیرد و مزه[1] برائی خود بہم می رساند و مطالب درآید فائض بهره مند شود.

(۲۷) سوال عزیز آنکه ظاهرا در کتاب راماٸن مذکور است هنگامی که سری رامچند لنکا را فتح نمود لشکر بسیار از هر طرف به قتل رسید که [از صفا][2] بعد ازاں که فراغ آں تا آب حیات کردند از طفیل آں لشکر رام چند تمام برخاست و زنده شده و لشکر راون که بفنا رفته بود بر نخاست چه توان گفت والا تاثیر آب حیات است بر هر مرده رسد زنده شود دوم سری رام چند را یگانگی و بیگانگی با هیچ کس نبود زنده شدن یك طرف و مردن طرف دیگر چه معنی دارد؟

جواب کامل آنکه از آنجا که هنگامهٔ راون شد و لشکر راون روز و شب خیال رام چند داشتند پس فائده آں است به تصور خالص صافی نهاداں

---

(۱) نسخهٔ (د) میں «مزه» کی بجائی لفظ «مسرت» استعمال کیا گیا هی

(۲) نسخه (ب) میں موجود نہیں .

آدم زاد که مکت بابد بار بقید قالب در نمی دهند چرا که در جنگ بکار آمده بودند ازین جهت که خیال رام چند در دل داشتند لشکر راون مکت یافتند بقید قالب نیامدند

(۲۸) سوال عزیز آنکه هرگاه راون سیتا را بخانه برد ازو چون محروم ماند؟

جواب کامل آنکه در اصل سیتا دهرم بود با دیو نسبت نداشت.

(۲۹) باز عزیز می گوید دیو هر صورتی که خواهد می کند چرا صورت رام چند نکرد؟

جواب کامل که سیتا با صورت رام چند الفت داشت ازو عذاب نمی شد هرگاه بصورت اصلی خود در می آمد که صورت رام چند می شناخت خاصیت رامچند درو اثر کرد.

(۳۰) سوال عزیز آنکه هرگاه راون سیتا را بخانه برده یقین که سیتا ازو دهشت بسیار خورده باشد چرا راون را از آتش دهرم خود نسوخت.

جواب کامل آنکه سیتا در اصل [صورت دهرم][1] است [ستی بود د][2] و ساتك بود هرچند غصه را طلب می کرد پیش او حاضر نمی شد

(۳۱) سوال عزیز در کتب هندوی مذکوراست که در جگ ترتیا ده هزار سال عمر آدم بود راجه جسرتهه که نه هزار سال عمر خود را بسر برد باعث آن چه باشد و سری رام که یازده هزار سال عمر خود بکار برده چه موجب شد سیتا که یك هزارسال بن باس کرد و از راون باوچه نسبت بود مگر سری رامچند این قدر قدرت و قوت نداشت که آن را تواند نگاه داشت؟

جواب کامل که راجه جسرتهه را از سبب کشتن سرون تد دعا سراب بود ازین سبب یك هزارسال از عمر خود کمین شده و سری رام چند که یك هزار سال عمر زیاده کسری معتاد جگ ترتیا بکار برد آن همه عمر پدر را

---

۱ نسخهٔ (د) مین موجود هی.

۲ نسخهٔ (ب) مین یون هی.

برام چند رسیده بود و درعمر پدر سبنا الفت [تاطف][1] نداشت برائی همین
بنوباس داده مقدمه [ده سر][2] درمیان آورده

(۳۲) سوال عزیز آنکه در مذهب هندوان رسمی است که در برج[3]
صورت خاص سری صو و گوپیان می نمایند ظهور این معنی مناسب هست یا نه ؟

جواب کامل راست کردن آن باهل دنیا مناسب ندارد و چرا که در
آن صورت خاص اگر نگاه باشد بکار رود در ثواب او نداب می شود
مفعل آوردن آن مردم فقرا که خواهش را در وجود خود سوختة اند و از
هیچ وجه دل ایشان حرکت ندارد اگر نکنند گنجایش دارد.

(۳۳) سوال عزیز آنکه حال برهم چگونه از همه وجه دل ایشان
توان گفت ؟

جواب کامل که ازین معنی درهمه جا دانست معلوم نیست که از آنجا که
می آید آگاه نیست که در کجا استقامت می ورزد صورت ندارد رنگ ندارد
همه رنگ است چنانچه مثل مهاپورکهه بطفل می دهانند.

(۳٤) سوال عزیز آنکه هرگاه آفرینش از ملت قدرت است پس
استهاور و جنگم تفریق چرا افتاد که آن را استهاورو جنگم بریهوش و هوشمار
واقع است بعضی بخودی ازان بالاتر اوتار و برهمان و بشن و مهیش زیاده
از آن پس درین صورت در آفرینش چون فرق افتاد ؟

جواب کامل چون استهاور از زمین پیدا می شود و تخم آن زمین است و جنگم
تخم آب است و آب در زمین غالب آمد ازین معنی جنگم را براستهاور
زور می پندارند ؛

(۳۵) باز عزیز می گوید که جنگم هم آدم و هم حیوانات پس آدم بر
حیوانات چون غالب است ؟

بار کامل می فرمایند که آدم از عالم[4] عین است و حیوانات ازعالم جدید

(۱) نسخهٔ (ب) میں ہی۔
(۲) نسخهٔ (ب) میں «ده سر» کی بجائی «راون» ہی۔
(۳) نسخهٔ (د) میں «متهرا جیولا» ہی۔
(٤) نسخهٔ (ب) میں «علم» ہی۔

که عبارت از بیهوشی است، آدم در جماعت یکدیگر مقابل می باشد، ازین ممر بیهوش است و حیوانات پیش و پس او از مقابل خلق شده هوش پیوست و این از مقابل پس و پیش سهوش گشت که مزه باشد ازین جهت آدم بر حیوانات غالب است و استهاور از تخم زمین که جنبش ندارد قایم شده و جنگم چون از آب است و آب همیشه جنبش دارد در گردش است و ناآدم محتاج دبوتها است و آنها از باد است بازسده غالب آمد سده اوبکار روپ[1] است.

(۳۶) سوال عزیز آنکه فقیر را کلمه چه باید کرد؟ دربن صورت کامل جواب ندارد، بار عزیز درخواست جواب نمود: همین خاموشی. سوال یعنی طالب محرم از حالت نگاه بود گفت که ایشان جواب دادند که برسید چه گفت؟ خاموش.

(۳۷) سوال عزیز آنکه در توحید و حالت چه فرق است.

جواب کامل آنکه خاموشی را راز حق توحید است و آغاز سخن حال نه طاقت گفتاری ماند.

(۳۸) سوال عزیز آنکه دهان چیست و سهاده چه شد؟

جواب کامل که دهان گرفتن وسهاده گذاشتن از چه رهگذر که دل مانند آهو صحراست هنگامی که در دامی آید بیتابی بسیار می کند بعد ازقید که از حبس مست می گردد گوشت صحرا نیرا گذاشته ناتوان می شود بازهوشناك از دانه و کاه[2] چراه گاه گرفته آسوده می کند و ازجنگل آسوده تر می شود هوشناك از دانه و کاه خبر دارد و ریسمان در می گذارد [مراتب عقل را][3] نمی گذارد همان قسم دل در گرفتن بیتاب بعد ازین که شتاب می آید در حکم حاضر است پس گرفتن دهیان و گذاشتن سهاده است.

(۳۹) سوال عزیز آنکه بعضی جا اظهار می نماید که در وصال ذات می شود آن وصال چگونه اعتبار توان کرد که ذات میگردد؟

جواب کامل آنکه آهن را در آتش تاب می کند وقتیکه رنگ آتش گرفت کار آتش می کند.

(۱) نسخهٔ (الف) میں «نکاروپ» هی.
(۲) نسخهٔ (د) میں هی.
(۳) نسخهٔ (د) میں «و این عقب او» هی.

(٤٠) سوال عزیز آنکه داں عبارت ازخیرات باشد، گفته اند که فائدهٔ خیرات بهرکس می رسد بعد ازآن که شخصی در حین حیات خود خیرات می کند از پائی بند هرگز دار[1] در قلوب دیگر داخل شود و بعضی چیزها فقیر بآدم تعلق دارد باو چه طور می رسد؟

جواب کامل که در اصل اوقات آدم در سه گون ارادت می کند و اگر آنرا بساتك کرده بساتکی و براجس کرده براجسی و اگر بتامس کرده است بتامسی پس در حوادات ساتك و راجس و تامس چگونه بند است ساتك چیزیست که بی سعی بازو و بی محنت و بی گردش باو می رسد و راجس چیزیست چنانچه آدم را برائی حیوان نگاه می دارد و تامس چیزیست که کوتك زده می خورد.

(٤١) سوال عزیز آنکه مقرر است که مسلمانان را بعد از فوت دفن می کنند و هندو را می سوزند، درویشی که در برقعه هندوست هرگاه او فوت می شود آنرا چه می کنند؟

جواب کامل آنکه در اول دفن کردن و سوختن بوجود تعلق دارد و درویش ازآن متعلق نیست بلکه از وجود خود گذشته در بحر نشاء معرفت الهی باشد از هستی در گذشت در نیستی پیوست سربلند گشت آنرا مادیست چنانچه مار پوست خود گنجور را گذاشته در سوراخ در می آید آنرا به دوست تعلق نمی ماند هرچه داند کند.

(٤٢) سوال عزیز آنکه شخصی می گفت که کم آزار باشی گفتم معنی کم آزار چه باشد گفت اندك آزار گفتم آزار داده باز آزار است چگونه دانسته شود؟

جواب کامل آنکه هرکه بر خود بزرگ و زورمند باشد دست آزار برو نمی رسد و آنکه همقران برابر است بشدت او برابرش می آید اما شخصی که از خود کم باشد آنرا آزار نباید داد کم آزاری همین است.

---

(۱) نسخهٔ (د) میں «کردار» هی.

(۴۳) سوال عزیز آنکه فعل مختار معبود حقیقی است و نیز مذکور است که فعل مختار همان[1] کامیاب است چه طور اعتبار توان کرد؟
جواب کامل آنکه فعل مختار خدائی عز وجل سلطانه است و موجودات نیز.
(۴۴) باز عزیز می گوید که هر دو وجه چه طور یقین شود؟
کامل می فرماید وقتیکه اطفال در رحم مادر بود در آنجا فعل مختار در و پروردگار بود که به جمیع وادی در امان داشته پرورش می کرد و در آن هنگام کسی دیگر نبود چون اطفال بعرضه ظهور آید نصف فعل مختار همان شد که از راه عنایت و بنده نوازی قوت او در پستان مادرش پیدا کرد و نصف همه اطفال چگونه که هرگاه طفل گریه کرد مادرش مطلع شد شیر داد چون کلان شد و بخواهشهائی نفس الفت گرفت و بر نیك و بد اشتغال ورزید در این معنی خود فعل مختار است چرا که الله تعالی از نیك و بد منزه است چنانچه معصوم از خواهشهائی معذور است بحرم خانه مستورات در آید پستان مادر و غیر آن می مکد احدی بد نمی برد و به الفت شیر می دهد هرگاه جوان شد راه نمی یابد تا که بیهوش بود و خواهشهائی نمود نمی از پرداخت آن خدائی تعالی مختار بود چون بهوش آمد خود در نیك و بد اختیار دارد
(۴۵) الف: سوال عزیز آنکه در کتب فارسی مذکور است که باز هیچ جنم نیست.
جواب کامل آنکه در آن مکان کتب چنین مذکور کرده اند فی‌الواقع آنها را هیچ نیست چرا که ایشان از آن سبب که باز در قید تعین آید آنرا بربند فارغ شدند پس ایشان را هیچ جنم نیست[2].
(۴۵) ب: مذکور است که باز جنم که عبارت از تناسخ باشد در کتب

---

(۱) سب نسخوں میں یہی ہے۔
(۲) نسخہ (الف) میں اس جگہ شہزادہ دارا شکوہ اور بابا لعل داس کی ان ملاقاتوں کی ختم ہونیکی تاریخ یہ حسب ذیل نوٹ ہی:—
«جواب و سوال شاهزاده والا گهر محمد دارا شکوه بابا لعل داس تمام شد بروز جمعه یازدهم شهر رمضان المبارك سنه ۱۱۹۸ هجری تحریر یافت بخط موهن چند امالعاط»

هندوی گفته اند باعتبار فارسی باطل است.

جواب کامل آنکه مصنفان کتب فارسی اکثر صاحب کمال بوده اند و هر که صاحب کمال است دل خود را از آلودگی نفس پاك داشته پیش از مرگ خود را فانی ساخته برائی او جنم باعتبار هر دو نداشت بلك حال دارد که باز قید وجود نه پذ برد که اهل هند آنرا مکت نامند باس مرتبه که دست دهد قبول بود برائی استحکام اساس نکو کاریست چنانچه اسار گندم که اگر ازآن قدری در زمین ریزد بار روید و اگر اندك در آتش بریان کرده بکارند روئیدن آن ممکن نیست.

(۴۶) باز عزیز گوید که در تناسخ جامعهٔ اصلی معتبر نیست از آدم حیوان و از حیوان آدم باشد و از گندم جو بر می آید.

جواب کامل آنکه شخصی که صحبت اهل الله بشوق دریافت کند و حقیقت حق در یابد و از برائی هستی بکتم عدم شتابد باز در حلقهٔ آدم وجود یافته کامیاب صافی نهادان می گردد که لیاقت دریافت حقیقت حق در وجود انسان است نه در حیوان، شخصی که از آلودگی نفس و خواهش حواس خمسه می مرد در تناسخ تبدیل لباس می کنند در جمیع کائنات مساوی است چنانچه گندم هم تبدیل می شود که هنگام تخم ریزی گندم می کارند و در وقت در و جو نه درویدتا او میان دانه گندم کرم پیدا شود

(۴۷) سوال عزیز آنکه در کتب فارسی مذکور است وقتیکه حق سبحانه تعالی بقدرت کامله خویش آفرینش پیدا کرد وجود آدم از اربع عناصر که خاك و باد و آب و آتش باشد فراهم آورده و در کتب هندی مذکور است که وجود آدم از پنج چیز آراسته شده پنجم چه طور دانسته شود؟

جواب کامل آنکه الحق آدم از پنج چیز آراسته شد اول از پریت یعنی از خلاصه خاك که آنرا شامه گویند که بمدد او بوئی نیك و بد زمین دریافته شود دوم آب که زبان مخصوص است و آنرا ذائقه گویند

که از تاثیر آب همیشه سیراب می باشد و از اندر آن در نمی گذرد سوم آتش که باشد چشم است آنرا باصره خوانند که این همه روشنی دارد و جمیع صورت می بندد چهارم باد باشد که وجود است که آنرا لامسه گویند از رسیدن وجود گرم بر او معائنه دارد پنجم اکاس که عبارت از گوش باشد و آن را سامعه گویند یعنی قوت شنوائی بطرف جمع نیک و بد هادی است طریق سبحانه و تعالی همین گوش است اگر گوش نباشد آدم بصفات پاك بهره نباید پنج خاصیت علحده علحده همین است.

(٤٨) سوال عزیز آنکه بعضی در خدمت فقرا حاضر و غیر حاضر می گویند، بیان این چیست؟

جواب کامل آنکه هر که در ظاهر است و دل خود مشغول حظوظ[1] نفسانی دارد او غیر حاضر است و اگر از صورت دور است او باطن خود از دهیان و سخنان مرشد کامل هشیار دارد و جویائی مرضیات الهی است غیر حاضر حاضر است:

گر در یمنی، بامنی پیش منی ور پیش منی بی منی در یمنی

چنانچه مرغ آتش خوار که بر زمین میماند و چون دل خود را بمهتاب سپرده آتش میخورد هرچند از ماه دور است اما از سردی ماهتاب که در دل او جا دارد نمی سوزد و زغن هرچند در هوا نزدیك بآفتاب میرسد لیکن چون خلاصهٔ او مایل به لاشهٔ مردار است گرمی آفتاب باو نمی رسد همین طور حاضر و غیر حاضر است.

(٤٩) سوال عزیز الله تعالی سر است و ذره از انوار الهی که بعینه وجود آمده در باز پرس محاسبه اعمال نیك و بد گرفتار شد، موجب چه بود[2]؟

جواب کامل آنکه پادشاه بالوازم سلطنت بر مسند کامرانی می نشیند بر عالم و عالمیان حکم او جاری است امدی را قدرت نیست که از حکم جهان مطاع او انحراف نماید و اگر همان پادشاه در شب تاریك تنها بر آید عسس شهر که نشاندهٔ

---

(١) نسخهٔ (د) مین «لذائذ» هی.

(٢) یه پورا فقره صرف نسخهٔ «د» مین هی.

اوست بدزدی میگیرد و اگر نگوید که من بادشاه ام اصلا نمی شنود و نمی گذارد بلکه تنبیه میکند، همین قسم ایزد لی همتا پاك و منزه است بخواهش خود در قید وجود آمده عاجز و گرفتار است با وجود این تقید به شبد یعنی سخن مرشد کامل خود را بشناسد که من جزوی از آن کل ام و مایل خواهشهائی نشود و باز پرس نیست محض پاك است و الا از صحبت وجود باین همه خواری به سیا ستی[1] دیگر گرفتار خواهد شد[2].

(٥٠) سوال عزیز آنکه از ورد کلمهٔ شریف آدم در بهشت داخل میشود؟

جواب کامل آنکه فی الواقع ورد کلمهٔ معظم همه قسم است اما شخصی که میانهٔ او قلب باشد چنانچه نترهٔ پاك را طرف نگاه میدارد و قلب را می اندازد، سکه بر هر دو واقعه است.

(٥١) سوال عزیز آنکه در وجود چند نظر است؟

جواب آنکه سه نظر، یکی جرم نظر که آنرا در هندوی جرم دشت می گویند دوم نظر عالم که آنرا در هندوی آتم دشت می نامند و جرم نظر آنست که مثل آدم وغیره در حضور خود بنظر آید نظر عالم آنرا می گویند که آنچه تماشا و کیفیت ملك و شهرها هر چه بخواهد در یکجا نشسته به بیند و ارواح نظر آنست که دل و جان وجود خود را نشناسد.

(٥٢) سوال عزیز آنکه که در وجود دل کجا می ماند؟

جواب کامل که در سه جا، عرض کرد که آن سه جا کدام است؟ فرمود یکی نظرگاه بیداری که آنرا در هندوی جاگرت می گویند و دوم خواب دیدن که آنرا در هندوی سپن گویند سوم آرام خواب که آنرا در هندوی سکهوپت می گویند نظرگاه بیداریست و سپن دیدن و خواب آرام آنرا می گویند که هیچ چیز در خواب نه بیند به آرام خواب نماید در وجود این سه جا دل مقام دارد.

---

(١) اس لفظ کی صحیح هونی مین شبه هی۔

(٢) نسخهٔ (د) یهین ختم هو جاتا هی۔

(٥٣) سوال عزیز آنکه معنی دل چیست ؟

فرمودند که معنی دل من و شما گفتن یعنی دوئی از دو ست چرا که دل ارواح را بهر جانب ما مادر و پدر و برادر و عزت و فرزند وغیرها می کشند و الفت می گیرد باید دانست که این الفت دوئی از دل است.

(٥٤) سوال عزیز آنکه صورت دل چیست که در نظر نمی آید ؟

فرمودند که صورت دل مانند باد است.

(٥٥) عرض کرد که دانسته چه طور شود ؟

فرمودند چنانچه درختان را از بیخ بر می کند و صورت آن در نظر نمی آید آن چنان دل حواس خمسه را برهم می سازد و در وجود است بنظر نمی آید باید دانست که صورت دل مانند باد است.

(٥٦) سوال عزیز آنکه دل چه می کند ؟

فرمودند که دل دلالی ارواح میکند.

(٥٧) عرض کرد که از چه باید دانست ؟

فرمودند که از دوکان حواس خمسه که آنرا در هندوی اندریان میگویند، لذات دنیاوی گرفته به ارواح میرساند و به گناهان آن لذت ارواح گرفتار می شود چنانچه که دل سودائی به خریدار از دوکان میدهاند کمی و اضافه به خریدار و فروشنده رسد، خود دلالی گرفته علحده میشود، این طور دلالی میکند و در این است.

(٥٨) سوال کرد خیال دل از چیست ؟

فرمودند چنانچه آهنگر آتش را از ما میان میدمد و آتش روشن میشود، وقتیکه آهنگر میان میگذارد آتش می مرد، مراد دل آتش است و دل نیز زنده است از آن بداند که خیال دل از دم است.

(٥٩) سوال کرد خیال دم از چیست ؟

فرمودند که خیال دم از دل است.

(٦٠) عرض کرد دانسته چه طور شود ؟

فرمودند که خود نگاه داشته در خواب رفت چنانچه شخصی آمده

آں چیزها را برداشته برد و در آں وقت دم حاضر بود دم را خبر نشد. دل در وقت خواب خیال می کرد و بس. باید دانست که حال دم از دل است گویا که دم بغیر از دل مرده است.

(٦١) سوال کرد که خواب کرا میگویند که آں را در هندوی ند می گویند؟

فرمودند که خواب آن را می گویند که با طلب حرص دنیا در خواب رود، بهمان حرص بر خدرد با ماء و می می میرد، باز بیدار می شود چنانچه گفته اند محبت از دل فقرا نمرد هرگز، چو میرد مبتلا میردچو خیزد مبتلا خیزد.

(٦٢) سوال نمود که فقرا کرا میگویند؟

فرمودند که حرص دنیا را گذاشته فارغ از ما و تو شده درخواب رود و هیچ چیز دنیاوی در خواب نه بیند و شاید خواب فقرا را در هندوی جوك ند میگویند که او را از آمد و رفت دنیا فارغ میشود موکش است.

(٦٣) سوال کرد که بیداری آں تمام حیوانات و نباتات و جمادات وغیرها را چهار وقت میگزرد، آں بیداری چیست؟

فرمودند که آں را گردش فلك میگویند که سر آں شمال یعنی اوتر و پائی آں جنوب یعنی دکهن و چشم آں آفتاب و ماهتاب است و استخوان او کوه و سنگ و پوست زمین و نبض های او دریاها خون او آب دریا و چاه و آنچه درخت از خس و خاشاك از تن مانند است همه موی برتن اوست و گوش آں آسمان

(٦٤) عرض کرد که گوش دواند آسمان یکی؟

فرمودند هر دو گوش یك سخن میشنود بر چهار وقت آدم وغیرها را در بیداری آں گردش فلك میگذارد وقتی که او در خواب خواهدآمد قیامت برپا خواهد شد که نام آں را در هندوی بمیراث پورکهه می خوانند

(٦٥-٦٦) سوال کرد وقتیکه آدم وجود می گذارد آں وقت بیداریست،

در آں وقت بی خبری نمی شود، عرض کرد که دراں وقت بیداری در نظر نمی آید ؟

فرمودند که اگر در آں وقت بی خبری باشد دست و پا نزند خواب با آرام نماند در آں وقت گذاشتن وجود آرام نیست بلکه در تمام وجود آزار است چنانچه کوتوال دزد را گرفته بحضور صاحب صوبه می برد و دزد می داند که مرا بدار خواهند کشند یا سزائی دیگر خواهند داد از سهم آن دل بطرف مردم خانه و مادر و پدر و فرزند وغیرها نمی آید و فکر جان خود می افتد نظر و دل او بجانب کوتوال و صوبه است که در باب ما چه خواهد شد از آں طرف خبردار است و ازیں سو بی خبر از آں باید دانست که در آں وقت بیداریست که آں را خواب بیداری میگویند.

(٦٧) باز سوال کرد که در واصل فرق چه می ماند ؟

فرمودند که در واصل هر چه وجود فرق می ماند.

(٦٨) عرض کرد دانسته چه طور شود ؟

فرمودند جائی که واصل است آنجا دل واصل می شود، تن در آنجا نمی رسد، بنا بریں وجود آنجا فرق است که در وجود واصل و نا واصل فرق است.

(٦٩) عرض کرد که چگونه فرق است ؟

فرمودند که وجود واصل مانند آئینه است.

(٧٠) عرض کرد که از یك جانب روشن و یك جانب نابینا ؟

فرمودند که از جانبی که روشن است دل او بجانب خداست و ازجانب نابینا تن او در ایں جا گویا که بطرف دنیا پشت داده، وجود نا واصل مثال هندوی است از هر دو جانب سیاه، بنابرآں با واصل سراسر فرق است نه از دیں خبر دارد نه از دنیا، درمیان واصل و نا واصل ایں قدر فرق است[1]. لوئی مسبون

نوٹ—[مترجم کی فارسی عبارت مین اکثر جگه سقم هی اور کهین کهین معلوم هوتا هی نقل مین غلطی هوئی هی. مدیر]

---

(١) نسخهٔ (الف) ایکدم سی اس طرح ختم هو جاتا هی لیکن نسخهٔ (ب) مین آخر مین اتنا اور زیاده هی:

«تمام شد انتخاب جواب و سوال بابا لعل داس و بادشاه حق پرور داراشکوه»

شمس العلماء

مولوی محمد حسین آزاد

از سیر المصنفین جلد دوم (غیر مطبوعه)[1]

پیدائش اور ابتدائی تعلیم .

آزاد کی صحیح تاریخ ولادت کا کچھ پته نهین چلتا. البته اس امر سی که وفات کی وقت انکی عمر ستر سال کی تهی . یه کها جا سکتا هی که وه یقیناً سنه ۱۸۳۲ عیسوی یا ۱۸۳۳ مین به مقام دهلی پیدا هوئی، جو ان کا آبائی وطن هی. آپ کی والد مولوی محمد باقر تهی جو شیخ محمد ابراهیم ذوق کی دلی دوست تهی اور هندوستان مین اردو اخبار نویسی کی موجد[2] کهلائی. حضرت آزاد نی استاد ذوق کی سایهٔ عاطفت مین ابتدائی تعلیم حاصل کی اور نکات عروض و فن سخن انهین کی فیض سی حاصل کئی

دهلی کالج کا داخله :

بعد ازاں دهلی کالج مین داخل هوگئی اور آپ اس کالج کی مشهور ترین طلباء مین سی شمار کئی جاتی هین . آپ نی علوم مروجه مین اسی درسگاه سی اچهی استعداد حاصل کی تهی.

---

(۱) یه حالات «ادیب» الهآباد سنه ۱۹۱۰ع اور «خمخانهٔ جاوید» مؤلفه لاله سری رام سی ماخوذ هین ؛ تنها .

(۲) بعض لوگ ڈاکٹر اسپرنگر کو اردو اخبار نویسی کا موجد قرار دیتی هین ، تنها.

مشاعروں کی شرکت :

آپ کو اپنی استاد کی بدولت اکثر نامی گرامی اشخاص سی ملنی جلنی کا موقع ملا، اور معرکوں کی مشاعروں مین شرکت کی. اس مین کوئی شك نہین که جو کچهه ان کو کمال حاصل هوا وه حضرت ذوق کی فیض صحبت کا نتیجه تها. آزاد جو کچهه اپنی استاد سی سنتی تهی یا ان کی صحبت مین دوسری بزرگوں کی زبان فیض ترجمان سی ادا هوتا تها اپنی حافظه مین محفوظ رکهتی جاتی تهی. جب غدر کی هنگامه کا خاتمه هوا اور آزاد کو اطمینان نصیب هوا تو لاهور مین بیٹهه کر بفراغت تمام اگلی پچهلی باتوں کو از سر نو یاد کیا اور ان صحبتوں کو صفحهٔ قرطاس پر دوهرایا. کچهه اپنی بیتی تهی، کچهه جگ بیتی، غرض وه کہانی سنائی که جسکو سنکر هر که و مه اسکا والهٔ و شیفته هوگیا اور دوسو برس سی لیکر اس وقت تك شعرا کی جتنی محفلین قائم هوئی تهین اور به فلك تفرقه پرداز ان کو درهم و برهم کرتا رها تها، سب کا نقشه اس خوبی سی کهینچ کر دکهلا دیا که وه تمام بزرگ چلتی پهرتی تصویروں کی طرح نظر آنی لگی. اس مرقع کا نام آب حیات هی جسنی نه صرف اگلی جلسون کو تازه کردیا اور ان مٹی هوئی صورتوں مین جان ڈال دی بلکه مصنف کا نام بهی زندهٔ جاوید بنادیا اور زمانه نی ان بزرگوں کی طفیل مین آزاد کو بهی خلعت بقائی دوام عنایت فرمایا.

کلام ذوق کی ترتیب :

آپ نی حضرت ذوق کی وفات کی بعد بڑی سرگرمی اور تندهی سی ان کی کلام کی ترتیب کا اهم کام شروع کیا تها لیکن افسوس که هنگامهٔ سنه ۱۸۵۷ عیسوی نی کئی سال کی علی الاتصال محنتوں اور مشقتوں پر پانی پهیر دیا اور وه تمام مجموعه دهلی کی تباهی کی ساتهه ساتهه برباد و تاراج هوگیا اور حضرت خاقانی هند کی صلبی فرزند کی ساتهه روحانی اخلاف بهی واصل رحمت الهی هوئی. چونکه آزاد کی تصانیف

مین سی کوئی مجموعۂ نظم ١٢٦٤ هجری سی پیشتر کا دستیاب نهین هوتا اور جو چند غزلین کلام آزاد مین طبع هوئی هین وه غدر کی بهت بعد کی کهائی هین. اغلب یه هی که وه اپنا پراہ ذاتی سرمایه بهی غدر کی نذر کر بیٹهی.

حکیم آغا جان عیش سی استفاده:

حضرت آزاد نی استاد ذوق کی وفات کی بعد حکیم آغاجان عیش سی بهی جو دربار شاهی مین بزمرۂ اطبا منسلك تهی استفاده کیا. اگرچه حکیم صاحب ذوق کی همپله نه تهی تاهم وه بهی صاحب کمال تهی. ایك هی طرح مین، ایك قافیه پر دونون صاحبان نی فکرسخن کی هی اور حق یه هی که اپنی اپنی موقع پر دونوں شعر بهت اچهی هین. مشاعره مین عیش نی پهلی اپنی غزل پڑهی تو ذوق هم قافیه شعر کی پڑهنی مین مترددد هوئی، لیکن آزاد کی والد ماجد نی باصرار کها که ضرور پڑهئی تاکه معلوم هو که استاد اس مضمون کو اس طرح باندهتی هین. چنانچه عیش کهتی هین:

ای شمع، صبح هوتی هی، روتی هی کس لئی
تهوڑی سی ره گئی هی اسی بهی گذاردی

اور ذوق فرماتی هین:

ای شمع عمر تیری طبیعی هی ایك رات
هنس کر گزار یا اسی رو کر گزار دی

آزاد وطن مالوف کو خیر باد کهتی هین:

جب هنگامۂ غدر مین آزاد کی والد بزرگوار نی شهادت کا درجه پایا تو آخر سال ١٨٥٧ عیسوی مین آزاد اپنی عیال و اقربا کی همراه اسی شهر کی طرف گام زن هوئی جو محمد شاه رنگیلی کی بعد سی دهلی کی بجائی اهل کمال کا ملجاؤ ماوا تها اور مرجع خلائق تها، لیکن یهاں ایك سال

قبل ھی سی خاك اڑ رھی تھی اور وہ خاندان جو اھل کمال کو اپنی سایۂ عظمت مین جگہ دیتا تھا زمانہ کی دست برد سی خود بھی محفوظ نہ رہا تھا اور جہاں عیش و نشاط کی محفلین گرم تھین اب وھاں ھو کا عالم تھا. یہی لکھنؤ اب وہ لکھنؤ نہ تھا جب میر تقی میر اور مرزا رفیع السودا اور سید انشاءاللہ خان جیسی صاحب علم و فن وھاں پہنچی تھی. اس وقت وہ خود اپنی حال پر نوحہ خوانی کر رھا تھا بیچاری آزاد کی غم مین کون درد شریك ھوتا. پس حضرت آزاد چندی وھاں کی مشاھیر سی ملتی جلتی رھی اور کچھہ عرصہ تك اطراف و جوانب مین سفر کرنی بھری بعد ایك مدت ١٨٦٤ عیسوی مین تقدیر راہ پر آئی اور آزاد لاھور پہنچی. یہاں آ کر آپ سرکاری ملازمت مین داخل ھو گئی.

لاھور کا قیام اور سکوت:

آپ کی بابرکت زندگی کا بڑا حصہ لاھور ھی مین گزرا ھی. انجمن پنجاب کی جلسوں کا بانی اگر آپ کو کہا جائی تو بیجا نہین. انھین کی کوششوں سی حکام بالا کی عموما اور افسران تعلیم کی خصوصاً زبان اردو کی نشو نما اور ترقی کی طرف خاص توجہ مبذول ھوئی. یہ بھی آپ ھی کی کوشش کا یادگار نتیجہ تھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب کی قدوم میمنت لزوم سی انجمن پنجاب مین مشاعرہ کی بنیاد پڑی. حضرت آزاد کچھہ عرصہ تك اسسٹنٹ سکریٹری رھی اور یونیورسٹی کالج کی صیغۂ علوم مشرقی مین بعہدۂ پروفیسری مدتوں کام کیا. اسی اثناء مین تعلیمی کاموں کی علاوہ ملکی خدمات بھی وقتاً فوقتاً کمال لیاقت کی ساتھہ انجام دیتی رھی. سنہ ١٨٦٥ عیسوی مین بکار سرکار کلکتہ کا سفر کیا بعد ازاں پنڈت من پھول کی ھمراہ کابل و بخارا گئی. ١٨٨٣ عیسوی مین دوبارہ ایران گئی. آزاد کو خدمات ماضیہ کی صلہ مین گورنمنٹ سی ٧٥ روپیہ ماھوار پنشن ملتی تھی، لیکن حضرت موصوف نی اپنی تصانیف اور کفایت شعاری سی خاصا سرمایہ جمع کرلیا تھا. یہ امر بھی قابل لحاظ ھی کہ آزاد کو

منشی ان کی خدمات ملازمت کی وجہ سی ملی گورنمنٹ نی اپنی سرکاری کاموں کا کوئی صلہ نہین دیا۔

آزاد کس طرح چھوٹی تنخواہ سی بڑی درجہ پر پہنچی ہین:

جب آزاد وارد پنجاب ہوئی تو اول اول مولوی رجب علی صاحب کی پاس جگراوان مین مقیم رہی، پھر مولوی صاحب کی ذریعہ سی پنڈت من پھول صاحب میر منشی لفٹنٹ گورنر صاحب کی پاس آئی اور میر منشی صاحب کی سفارش سی لاہور مین آئی۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کی دفتر مین ۱۵ روپی ماہوار کی ملازم ہوئی، ادنی عہدہ کی وجہ سی انہین ایسا موقع نہ ملتا تھا کہ اپنی لیاقت و استعداد کو اعلی افسرون پر ظاہر کرین، اس کی علاوہ میجر فلر صاحب ڈائرکٹر اگرچہ عربی، فارسی کا مذاق رکھتی تھی، علم دوست تھی مگر اجنبی کیلئی ان کا ظاہری رعب و داب ان تک پہنچنی مین سد راہ تھا۔ اتفاق سی اسی زمانہ مین رائی بہادر ماسٹر پیاری لال[1] صاحب

---

(۱) ماسٹر پیاری لال آشوب ۱۸۳۸ع مین بمقام دھلی پیدا ہوئی جو تین سو برس سی ان کی بزرگون کا مسکن رہا ھی۔ ان کا نسبی سلسلہ شہنشاہ اکبر کی مشہور وزیر راجہ ٹوڈر مل تک پہنچتا ھی۔ آپ پرانی دھلی کالج کی تمام درجہ طی کر کی ۱۸۵۷ع مین تکمیل علم کی لئی آگرہ کالج مین داخل ہوئی اور وھان کی سند حاصل کرنی کی بعد ۱۸۵۸ع مین بریلی جا کر سرکاری ملازمت اختیار کی، مگر ایک سال کی بعد پنجاب چلی آئی تھوڑی عرصہ تک گوڑگانوان اور دھلی مین ھڈ ماسٹر رہی۔ ۱۸۶۴ع مین دھلی سی تبدیل ہو کر لاہور پہنچی اور وھان کیوریٹر کی نازک عہدہ کی اھم فرائض کو پندرہ سولہ برس تک نہایت ہوشیاری اور دیانت سی انجام دیا۔ ۱۸۸۴ع مین انسپکٹر مدارس ہوگئی اور ۱۸۹۵ع تک اس عہدہ پر فائز رہی۔ قیام لاہور کی زمانہ مین کئی برس تک سرکاری اخبار کی اڈیٹر رہی۔ میجر فلر صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ان سی بہت خوش تھی۔ ان کی پاس کلکتہ یونیورسٹی سی سوال آیا کرتی تھی، اور وہ ان کی جواب مین اکثر رائی بہادر سی مشورہ لیا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ

کسی سرکاری کمیٹی مین شریك ہونی کی غرض سی لاہور تشریف لائی. چونکہ فلرصاحب ماسٹر صاحب سی از حد مانوس تھی، اس موقع پر حضرت آزاد نی ماسٹر صاحب سی کہا کہ ہمکو میجر صاحب سی ملادیجی. ماسٹر صاحب نی ان سی وعدہ کر لیا اور موقع کی منتظر رہی. کمیٹی سی فارغ ہوکر میجر صاحب سی ملاقات ہوئی تو صاحب نی ایك تحریر ماسٹر صاحب کو دکھلائی، اس مین صاحب بہادر نی لفظ ایجاد کو مؤنث لکھا تھا، ماسٹر

کلکتہ یونیورسٹی سی یہ سوال آیا کہ مسجع اور مقفی عبارت مین کیا فرق ہی مع مثال بیان کرو. حسب معمول یہ سوال بھی رائی صاحب کی پاس بھیجا. رائی صاحب نی بجنسہ مرزا غالب کی پاس بھیجدیا، جن کی خدمت مین رائی صاحب کو نیاز حاصل تھا اور مرزا صاحب ان پر بہت مہربانی فرماتی تھی. انہون نی اس کا جواب مع امثال نظم مین لکھکر دیا جس کا آخر شعر یہ تھا:

تحریر ہی یہ غالب یزدان پرست کی
تاریخ اس کی آج نوین ہی اگست کی

سنا ہی پروفیسر آزاد اور مولانا حالی کو نیچرل شاعری کا شوق اور خیال آپ ہی کی صحبت مین ہوا اور آپ ہی سی اس کی متعلق معلومات حاصل کین، لیکن ہماری نزدیك جو کچھہ شوق ہوا کرنل ہالرائڈ ہی کی تحریك اور امداد سی ہوا، اب جو چاہی اپنا نام کرلی.

آپ نی «رسوم ہند» کی پہلی تین باب، «قصص ہند» حصہ اول وسوم، اردو کی تیسری کتاب لکھی اور ترجمہ تاریخ انگلستان کلاں کیا، نیز رسالہ «اتالیق پنجاب» کی مضامین لکھی، ترجمہ دربار قیصری ۱۸۷۷ع مؤلفہ مسٹر و بلر شستۂ و بامحاورہ بلکہ برجستۂ و دل آویز کیا اور اس کی صلہ مین آپ کو ایك تمغہ اور ایك جلد «مطلا و مذہب» مرحمت ہوئی. ۱۸۹۲ع مین آپ کو رائی بہادری کا خطاب ملا اور ۱۸۹۵ع مین ۳۶ سال کی ملازمت کی بعد پینشن لی. آپ ایك علم دوست آدمی تھی، عرصہ ہوا کہ انتقال ہوچکا ہی مگر افسوس ہی کہ صحیح تاریخ وفات معلوم نہین ہوئی: تنہا.

صاحب نی دیکھکر اعتراض کیا کہ یہ لفظ مذکر بولا جاتا ھی، صاحب نی جواب مین کہا کہ مولوی کریم الدین صاحب سررشتہ دار کو یہ تحریر دکہائی ھی اور وہ اس عبارت کی صحت کی ذمہ دار ھین. مولوی صاحب بلائی گئی. میجر صاحب نی ماسٹر صاحب کا اعتراض بیان کیا، مولوی صاحب نی جواب مین سند چاھی، ماسٹر صاحب نی حضرت آزاد کی لئی یہ موقع مناسب خیال کر کی میجر صاحب سی کہا آپ کی دفتر مین ایک شخص محمد حسین آزاد دھلی کی رھنی والی ھین، انھین ھزاروں کی ھزاروں شعر یاد ھین یہ سنتی ھی آزاد صاحب طلب کئی گئی اور فلر صاحب بہادر نی ان سی دریافت کیا کہ لفظ ایجاد مؤنث ھی یا مذکر. آزاد نی جواب مین عرض کیا کہ مذکر. صاحب نی سند مانگی. انھوں نی برجستہ سودا کا یہ شعر پڑھ دیا.

ھائی کس بھڑوی کا یہ ایجاد ھی   نسخی مین معجون زر اندباد ھی

اس وقت سی فلر صاحب کی خدمت مین حضرت آزاد کی رسائی ھوگئی اور کچھہ ترقی بھی ھوئی. اس کی بعد کرنل ھالرائڈ صاحب نی ان کی قدر دانی فرما کر ۷۵ روپیہ تنخواہ کردی اور ان کو سب اڈیٹر مقرر کردیا. جس اخبار کی یہ سب اڈیٹر ھوئی، اس کی اڈیٹر رائی بہادر ماسٹر پیاری لال صاحب آشوب تھی، اخبار کا نام « اتالیق پنجاب » تھا. یہ اخبار سرکاری تھا، سالانہ قیمت دیگر اخبارات سی نسبتاً کم نھی. کچھہ تو اسوجہ سی کہ یہ اخبار سرکاری تھا اور کچھہ اس سبب سی کہ اڈیٹر و سب اڈیٹر دونوں قابل اور لائق تھی یہان تک مقبول خاص و عام ھوا کہ اپنی ھمعصر اخبارون سی گوئی سبقت لیگیا.

«اتالیق پنجاب» کی جگہ « پنجاب میگزین » کا اجراء :

«اتالیق پنجاب» کی مضامین کی خوبی، عبارت کی برجستگی اور خوش اسلوبی نی اس کو ھر دل عزیز بنادیا. یہ کیفیت دیکھہ کر ھندوستانی اخبارون نی گورنمنٹ سی درخواست کی کہ گورنمنٹ کا رعایا کی مقابلہ مین

---

(۱) اس شعر سی لفظ ایجاد کا مذکر ھونا ثابت نہین ھوتا کیونکہ « کا » کی جگہ « کی » بھی پڑھا جا سکتا ھی. آجکل ایجاد کو زیادہ مؤنث ھی لکھتی اور بولی ھین: تنہا.

اخبار شائع کرنا در پردہ ملک کی لوگوں کو نقصان پہنچانا هی. گورنمنٹ نی یہ معقول عذر تسلیم کرکی اخبار مذکور کی جگہ ایك رسالہ "پنجاب میگزین" کی نام سی جاری کردیا. حضرت آزاد کی بعد جب وہ پروفیسر هوگئی تو خواجہ حالی نی بھی کچھہ دنوں "اتالیق پنجاب" کی سب اڈیٹری کا کام انجام دیا تھا. در اصل یہ سب اڈیٹر نہ تھی بلکہ یہ دونوں صاحب ان مضامین کی جو انگریزی سی ترجمہ کئی جاتی تھی، زبان کی اصلاح و درستی پر مامور تھی.

شکل و صورت اور شمائل:

آزاد قدرت کی ظاهری محاسن مین بڑی حصہ دار نہ تھی میانہ بلکہ چھوٹا قد، گندمی رنگ، چھریری بدن کی آدمی تھی. مزاج کی طرح وضع اور لباس مین بھی سادگی تھی، اکثر چغہ پہنتی اور هندوستانی فیشن کا عمامہ باندھا کرتی تھی. چھری سی ذکاوت و فطانت ٹپکتی تھی. بشرہ سی کشادہ پیشانی، هنس مکھہ، نکتہ رس اور همدرد و رحمدل معلوم هوتی تھی تالیف قلوب کا یہ عالم تھا، زبان مین یہ جادو اور خیالات مین یہ اثر تھا کہ جو شخص ایك گھنٹہ بھی آپ کی صحبت مین بیٹھہ گیا آپ کا کلمہ پڑھنی لگا. بذلہ سنجی کا یہ عالم تھا پھول جھڑتی تھی. آج کل کی اسکول اور کالجوں، شاگرد اور استادوں مین عقیدت اور یگانگت کا وہ رشتہ پیدا نہین هوتا جو پہلی شاگرد اور استاد مین هوتا تھا، مگر صدھا نوجوان جن کو گورنمنٹ کالج لاهور مین مولانا آزاد کی سامنی زانوئی ادب تہ کرنی کی خوش نصیبی میسر آئی، ان کو اسی نظر سی دیکھتی تھی جس نظر سی کہ تفتہ مرزا غالب کو، شیفتہ مومن خان کو دیکھتی تھی. ان کی شفقت بزرگانہ یہان تك تھی کہ اکثر شاگردوں کو فارغ التحصیل هونی کی بعد حصول معیشت مین انھوں نی بڑی امداد دی.

علمی استعداد:

مولانا آزاد فارسی کی عالم متبحر اور عربی کی اچھی عالم تھی اور تمام علوم پر عبور رکھتی تھی جو ان زبانوں مین متضمن هین. بھاشا اور

ہندی کی نکات اور خوبیوں سی پوری آگاہ اور انگریزی علم ادب کی خصوصیات سی واقف تھی، اگرچہ انگریزی نہین جانتی تھی: صرف و نحو، عروض اور صنائع و بدائع مین بد طولی رکھتی تھی، فارسی اسی سلیس اور با محاورہ بولتی تھی اور لب و لہجہ ایسا تھا کہ ان مین اور اہل ایران مین تمیز کرنا غیر ممکن تھا

اردو کی ترقی مین آزاد کا حصہ

اردو پر آزاد کی احسانات عظیم ہین. نہ صرف یہ کہ تمام صوبۂ پنجاب خاص اردو کی واقفیت کی لئی اسکا ممنون ہی بلکہ پنجاب کو اردو سکھانی کی لئے جو تصنیفات و تالیفات انہوں نی کین، اسوقت اردو زبان کو انکی اشد ضرورت تھی پرانی سلسلی مین اردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتابین، اردو کا قاعدہ، قصص ہند کا دوسرا حصہ، جامع القواعد اور نئی سلسلی کی بھی کئی درسی کتابین مولانا آزاد ہی کی تصانیف سی ہین. فارسی مین بھی انہون نی کئی مستند کتابین لکھین اور انہوں نی ہمکو زندہ فارسی سکھائی. ایران کی روزمرہ کی تعلیم دی. جو کچھہ انہوں نی لکھا، جو محاورہ اور روزمرہ انہوں نی ہم کو سکھائی وہ قدما کی تصانیف کی مطالعہ کی بعد ان کی مروجہ زبان کی ذاتی تحقیق و تلاش کا نتیجہ تھا. ایران اور تاتار وغیرہ ممالک مین جہاں فارسی بولی جاتی ہی ان کی سیاحت موجودہ زبان کی تحصیل میں بہت معاون ہوئی.

محاورہ کی صحت استعمال کا ذکر:

دوسری مرتبہ مولانا آزاد جب ایران کی سفر سی واپس آئی تو ایك پشتارہ نوٹوں، مسودوں، یادداشت اور تحقیقات کا اپنی ساتھہ لائی تقریباً سنہ ۱۸۸۷ عیسوی مین وہ کتب خانۂ آزاد کی عمارت تعمیر کرا رہی تھی. ایك کمرہ بن چکا تھا اور فرط اشتیاق سی اس مین چند الماریوں کی ترتیب اور خانہ پری مین مصروف تھی. اتفاق سی محاوری کی صحت

استعمال کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمانی لگی که ایك غیر زبان کی محاوری کو صحیح اور باموقعه استعمال کرنا بهت مشکل هی اور یه دلچسپ روایت بیان کی که ایك دن مین ایران کی ایك صاحب خانه کا مهمان تها، کهانا پك رها تها، ماں دس باره برس کی لڑکی کو چولهی کی پاس چهوڑ کر آپ اسر کی دالان مین کوئی کام کرنی لگی اور لڑکی سی کهتی گئی که دیگچی کا خیال رکهی تا که کهانا جوش کها کر ابل نه پڑی. رفته رفته آنچ تیز هوتی گئی. اب مین نی سوچا که چاول ابل کر باهر نکل پڑینگی، دیکهوں تو اس کیفیت کو یه لڑکی کن الفاظ مین ظاهر کرتی هی. اور فرمایا که مین اپنی فارسی کی لغات اور زبان دانی کی دفترون کو اپنی ذهن مین دوهراتا تها اور اس خیالی کیفیت کی مختلف اظهار گهڑتا تها که شاید یه کهیگی، یه کهیگی، که وه وقت آپهنچا اور میری تمام خیالی دفتر خیالی پلاؤ ثابت هوئی. جوں هی دیگچی مین چاول جوش کهانی سی اسکا ڈهکنا ایك طرف سی ایك آده انچ اوپر کو اٹها که لڑکی چیخی: «اماں! اماں! دیگچه سر کرده.» یه لفظ گو یا میری کانوں مین الهامی کلمه کی طرح پڑی اور میری آنکهین کهل گئین.

جس شخص کو زباندانی سی یهاں تك مذاق هو، جو شخص اتنا نکته رس اور صاحب تلاش هو، جسنی غیر زبانوں کی تحقیق مین اسدرجه کاوش اور کوشش کی هو وه خود اپنی زبان مین کیا کچهه نه کر دکها تا اور حق الامر یه هی که اردو مین آزاد نی وه کچهه کر دکهایا جسکی ان جیسی شخص سی توقع کی جاسکتی تهی.

قدیم شاعری کی کساد بازاری:

جب آزاد لاهور پهنچی هین، اسوقت بازار علم مین دهلی اور لکهنؤ کی ٹکسالی شاعری کی کساد بازاری هو چکی تهی اور چونکه کسب معاش علوم مغربی کی تحصیل پر موقوف تها اسلئی قدیم شاعری کی بیقدری هو گئی تهی. چنانچه ایك جگه آزاد لکهتی هین:

« اس سی بڑهکر یه هی که بعض طبائع شعر سی متنفر پائی جاتی هین

اور دلنا، اس کی نہ پیش کرتی ہین کہ اس سی کچھہ حاصل نہین۔»

نیچرل شاعری:

ان حالات سی متاثر ہوکر اور دیگر زبانون سی اپنی زبان کی شاعری کا موازنہ کرکی آزاد کی جدت طبیعت نی اردو مین ایک نئی طرز یا نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ پہلی خود کئی نظمین لکھین، نئی حکیمانہ مضامین اس ایجاد کی حمایت مین لکھی اور پھر ایک مشاعرہ قائم کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی اپنی کتاب «مجموعۂ نظم حالی» کی دیباچی کی شروع مین اس واقعہ کا اس طرح ذکر کرتی ہین

«سنہ ۱۸۷٤ع مین جب راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سی متعلق اور لاہور مین مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سرشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سی انجمن پنجاب نی ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینی مین ایک بار انجمن کی مکان مین منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہوگئی ہی اسکو جہان تک ممکن ہو وسعت دی جائی۔»

اس مشاعرہ مین مطالب تجویز کئی جاتی تھی اور دیگر محفل مشاعرہ کی طرح کوئی مصرعۂ طرح نہین دیاجاتا تھا۔ برسات، حب وطن، تعصب و انصاف پر مولانا حالی کی بینظیر نظمین موجود ہین۔ وہ اس یادگار مشاعرہ کی یادگار ہین، بہر حال اس نئی شاعری کی لئی مولانا آزاد نی ملک کو پہلی ہی سی تیار کررکھا تھا، انجمن کی اکثر جلسون مین وہ اردو ادب اور نظم کی شقوں پر مبصرانہ اور نقادانہ لکچر دیا کرتی تھی، انجمن کی ایک جلسہ مین جو ماہ اگست ۱۸۶۷ع مین منعقد ہوا تھا، آپنی ایک بسیط مضمون «نظم اور کلام موزون کی باب مین خیالات» پڑھا، اس مین سی چند سطور پیشکش ناظرین ہین:

«شاعر اگر چاہی تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائی،

نیچر کو گویا کردی، درختان یا در گل کو رواں کردی، ماضی کو حال، حال کو استقبال کردی، دور کو نزدیك کردی، زمین کو آسمان، خاك کو طلا، اندھیری کو اجالا کردی . . . . روشن دلان اھل درد کی نزدیك طلوع و غروب آفتاب اور انقلاب صبح و شام ھزاروں باغ نو بھار قدرت الہی کی شگفته کرتا ھی اور تیره دلان بیخبر کی نزدیك کار گاه عالم ایك خراس یا دولاب ھی که دن رات چکر مین چلاجاتا ھی . . .

. . . . اس سی بڑه کر یه ھی که اکثر اشخاص علی العموم فن شعر کو گمراھی خیال کرتی ھین اور فی الحقیقت حال ایسا ھی ھی . . . . اسی طرح شاعروں کی بد زبانی و بد خیالی سی شعر بھی تہمت کفر سی بدنام نہین ھوسکتا، درحقیقت ایسی کلام کو شعر کہنا ھی نہین چاھئی، کیونکه شعر سی وه مراد ھی جو جوش و خروش خیالات سنجیده سی پیدا ھوا ھی اور اسی قوت قدسیهٔ الہی سی ایك سلسله خاص ھو، خیالات پاك جوں جوں بلند ھوتی جاتی ھین، مرتبهٔ شاعری کو پہنچتی جاتی ھین . . . . ابتداء مین شعر گوئی حکماء اور علمائی متبحر کی کمالات مین شمار ھوتی تھی اور ان تصانیف مین اور حال کی تصانیف مین فرق بھی زمین و آسمان کا ھی»

مئی ۱۸۷٤ع مین آپ نی اس طرز جدید کی مشاعری کا پہلا جلسه منعقد کیا اور اپنی افتتاحی تقریر مین ایك پر مغز اور ادیبانه تقریر کی اس مین اردو شاعری کی متعلق نہایت عمده خیالات ظاھر فرمائی. امید ھی که ذیل کی اقتباس سی موجوده اور آئنده اردو نظم کی حالت کا صحیح اندازه ھوجائیگا: بیشك مبالغه کا زور، تشبیه اور استعاری کا نمك زبان مین لطف اور ایك طرح کی تاثیر زیاده کرتا ھی. لیکن نمك اتنا ھی چاھئی که جتنا نمك، نه که تمام کھانا نمك . . ھمین چاھئی که اپنی ضرورت بموجب استعاره اور تشبیه اور اضافتوں کی اختصار فارسی سی لین، سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سی سیکھین، لیکن پھر بھی قناعت جائز نہین، کیونکه اب رنگ زمانه کا کچھه اور ھی، ذرا آنکھین کھولینگی تو دیکھین گی که فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانه کھلا ھی جس

میں یورپ کی زبانیں اپنی تصانیف کی گلدستے ، ہار ، طرے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں ، اور ہماری نظم خالی ہاتھ آنکھ پھیری منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے ۔ »

آگے چل کر اسی مضمون میں فرماتے ہیں :

«ای میری اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور ، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان تمہاری بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں ، کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محصور ہو گئی ہے وہ کیا ؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف ، بہت سی حسرت و ارمان ، اس سے زیادہ ہجر کا رونا ، شراب ، ساقی ، بہار ، خزاں ، فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں ۔ بعض دفعہ اسی دور کے استعاروں میں ادا ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی ۔ وہ اسی خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں ، اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں ۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے ، یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطالب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بد مزہ ہو جاتے ہیں ۔

«ای میری اہل وطن ! ہمدردی کے آنکھیں آنسو بہاتی ہیں ، جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہیگا ۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ بد سبب بیقدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہونگے ، کئی پرانے مورتیں باقی ہیں ، وہ چراغ سحری ہیں ۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہو جائیگی اور اردو میں نظم کا چراغ گل ہو جائیگا ۔ »

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب قدیم طرز کا بھی کوئی با کمال کہنے والا نظر نہیں آتا ، وہ پرانی مورتیں جنکی نسبت آزاد نے چراغ سحری کہا ہے

مدت ہوئی کہ خاک کی ڈھیروں کی تلی چھپ گئین اور ان کی ہڈیان بھی زیر زمین گل کر مٹی ہو گئین. آجکل جو لوگ نیچرل شاعری مین گام زن ہیں وہ آزاد اور حالی کی طفیل مین کچھہ کھہ لیتی ہین ورنہ درحقیقت نظم اردو کا چراغ گل ہو گیا، اب نثر کا دور دورہ ہی:

«زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز»

کھی گئی لئی ڈاکٹر اقبال جو اب سر اقبال ہو گئی ہین اپنی بلند خیالات کی لحاظ سی ضرور اعلی درجہ پر ہین لیکن ان کی یہاں صحت و سقم الفاظ کا خیال کم ہی، جسکی وجہ سی وہ بلحاظ فن اس درجہ پر نہین پہنچی جس پر شاعر مسلم الثبوت استاد ہوجاتا ہی. ہان، اس سلسلہ مین سید اکبر حسین صاحب (سابق جج) الہ آبادی نی اپنا سا رنگ نکالا اور وہ اس درجہ مقبول ہوا کہ اکبر ملک سخن کی بادشاہ تسلیم کئی گئی اور ہر شخص ان کی اشعار بڑی ذوق وشوق سی سنتا ہی اور ان سی لطف اٹھاتا ہی. لیکن اب وہ بھی نہ رہی.

تصنیفات و تالیفات:

آزاد کی تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہین.

«آب حیات»، «نیرنگ خیال» (دو حصہ)، «سخندان فارس»، «نگارستان فارس»، «دربار اکبری»، «جانورستان»، «مجموعۂ نظم اردو»، «قصص ہند» کا دوسرا حصہ، ابتدائی درسی کتب اردو، «نصیحت کا کرن پھول» «قند پارسی»، فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب، «جامع القواعد فارسی»، «قواعد اردو»، «دیوان ذوق»، ان کی علاوہ اور بہت سی نظمین اور مضامین جنوں کی زمانہ کی سیاہ و تباہ مزید برآن.

آزاد کی تصنیفات پر ایک عام رائی:

آزاد کی ہر کتاب مین ایک خاص وصف ہی اور وہ یہ کہ تلاش اور جستجو کا مادہ ان کی ہر تصنیف مین پایا جاتا ہی. جو کتاب لکھی ہی نہایت سلیقہ

کے ساتھ اور اپنی تلاش اور جستجو کی داد دی ھی۔ زبان جو اختیار کی ھی اس کا ذکر ھی کیا ھی، جو شیرینی اور گھلاوٹ ان کی زبان مین ھی، جس قدر اس کی تعریف کیجائے وہ کم ھی، تشبیہات و استعارات بکثرت پائی جاتی ھین اور ان کو اس قدر سی سجایا ھی کہ بے اختیار زبان سی سبحان‌اللہ اور واہ واہ کی نعری نکل جاتی ھین۔ ان کی نظمین بھی بجائے خود اچھی ھین لیکن در اصل وہ اقلیم سخن کی بجائے اقلیم نثر کے بادشاہ ھین۔ اور جو طرز خاص ان کا ھی وہ کبھی دوسری مصنف کو نصیب نہین ھوا۔ یہ اور بات ھی کہ کوئی شخص ان کی تقلید مین دوچار صفحی لکھدی، لیکن کتاب لکھدینا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ھی۔ قدرت نی ان کی انداز تحریر مین وہ دلکشی پیدا کی ھی کہ دوسری مصنف کو مشکل سی نصیب ھوگی۔ البتہ ان کا قلم جنبہ داری ضرور اختیار کرتا ھی۔ یہ ھندو مسلمانون کی معاملات مین بی‌تعصب سھی اور اکثر صاحب قلم اھل ھنود اس کا اعتراف بھی کرتی ھین لیکن دھلی اور لکھنؤ کی معاملہ مین ضرور انھون نی لکھنؤ کی بعض با کمال اصحاب کو اپنی کتاب «آب حیات» مین نظرانداز کردیا ھی۔ مولوی عبدالحلیم شرر نی اپنی ایک مضمون «اردو لٹریچر» مین اسکی سخت شکایت کی ھی اور ایک حد تک صحیح ھی، اگرچہ یہ بھی سچ ھی کہ جن بزرگون کا ذکر «آب حیات» مین کیا گیا ھی ان کی پہلو بہ پہلو وہ اصحاب جنکو نظرانداز کیا گیا ھی، بمشکل بیٹھہ سکتی تھی۔ البتہ اسی «آب حیات» مین آزاد نی اپنی استاد ذوق کو بحد آسمان پر چڑھایا ھی اور جا و بیجا ان کی مداح سرائی کی ھی، حالانکہ آج زمانہ نی وقت الٹ کر ثابت کردیا ھی کہ وہ ھرگز اس تعریف کے قابل نہ تھی جسکی برچھاڑ انپر کی گئی ھی۔ الحاصل آزاد فن تنقید سی در اصل نا آشنا نہ تھی لیکن اپنی محسن استاد کی تعریف مین رطب‌اللسان ھونا ھی وہ جوھر شرافت جانتی تھی اور نہ یہ سمجھتی تھی کہ اپنی ممدوح کو فرشتہ بنادینا آسان ضرور ھی لیکن وہ جوھر بشریت سی معری ھوا جاتا ھی اور اس کی تمام محامد اس کو انسانیت سی خارج کئی دیتی ھین۔

آزاد کو اگر ہم کسی انگریزی مصنف سی تشبیہ دیں تو کہہ سکتی ہیں کہ وہ اپنی وقت کی لارڈ میکالی تھی. اور اگر اردو زبان کی بی بضاعتی پر خیال کریں تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتی ہیں کہ ان کی تصنیفات نی اردو کی خالی خزانی کو مالامال کردیا اور جب تک یہ زبان اور اس کی بولی والی قائم رہینگی "آب حیات"، "دربار اکبری"، "نیرنگ خیال"، زندہ رہینگی اور اپنی دلفریبیوں سی سب کو اپنا گرویدہ کرتی رہینگی. چونکہ اردو زبان جلد جلد ترقی کی مدارج طی کررہی ہی اس لئی بعض الفاظ جو آزاد کی یہاں پائی جاتی ہیں اب وہ متروک ہوگئی ہیں لیکن اس سی ان کی انشا پردازی کمال پر کوئی حرف نہیں آتا. آزاد کی شہرت ان کی علمی کارناموں کی وجہ سی ہوئی.

آزاد حقیقتاً آزاد تھی. نہ کسی ایسوسی ایشن کی ممبر تھی، نہ وہ کسی کانفرنس میں شریک ہوئی اور نہ وہ کسی ملی و ملکی تحریک کی بانی ہوئی. ان کو شروع سی اپنی زبان کی تحفظ کا خیال تھا، اسی کو دلچسپ اور ہر دلعزیز بنانی میں انھوں نی اپنی تمام عمر صرف کردی، پس ان کی شہرت کا آفتاب بھی سوشل یا پولیٹکل پلٹ فارم کی افق سی نمودار نہیں ہوا، بلکہ ان کی کلام کی مقبولیت محض اپنی اصلی معیار اور جوہر ذاتی کی وجہ سی ہوئی، ورنہ وہ نہ کسی دربار کی مدح خواں تھی نہ کسی مدون جماعت کی آرگن. قلم انکی چوب تھا اور کاغذ ان کا نقارہ، اور انھیں سی ان کی شہرت کا آوازہ ساری ہندوستان میں گونج اٹھا.

شمس العلماء کا خطاب:

مولانا آزاد کو گورنمنٹ نی شمس العلماء کا خطاب ۱۸۸۷ ع کی جوبلی پر دیا تھا.

آزاد کی بعض کتابوں پر رائی:

"نیرنگ خیال" کی نثر ہزار نظموں پر فوقیت رکھتی ہی، رنگین بیانی کا

ایك دلفریب مرقع هی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایك پخته کار دستورالعمل هی، پند و نصائح کا ایك دفتر هی. استعاری اور تمثیل مین وہ وہ مطلب کی باتین بتا گئی هین که پڑهنی والا شسته خیالات سی مالا مال هوجاتا هی اس کتاب نی اردو نثر کی نئی طرز قائم کی اگرچه اس مین کوئی شبه نهین که اس کتاب مین زیاده تر انگریزی روش کا پرتو هی جس مین مضمون نو بهی کی جدید طرز کا چربه اتارا هی.

«آب حیات» طرز بیان، سلاست زبان، شستگی الفاظ، برجستگی، بیساختگی، اور روشن خیالی کا اعلی نمونه هی. یه تذکره تمام تذکرون سی هر طرح فائق و ممتاز هی، اسلئی که حتی المقدور محققانه طریقه سی هر ایك شاعر کا حال قلمبند کیا هی. آزاد نی سیدهی سیدهی، صاف اور سادی بیان مین جابجا رنگینی طبع کی ایسی جد ولین کهینچی هین که واه واه! بعض اوقات وه سیدهی بات کو پیچدار الفاظ مین بیان کر جاتی هین مگر کیا مقدور که پڑهنی والی کو مطلب سمجهنی مین ذرا بهی دقت یا رکاوٹ هو. حضرت آزاد نی اردو نثر کی باغ مین نئی گل بوٹی لگائی، نئی کیاریان اور نئی روشین نکالین اور اس کی بوسیده جسم مین نئی روح پهونکی. ایجاد اور نو آئینی ایسی کهتی هین که انهدام کی ساتهه تعمیر بهی هو، سادگی کی ساتهه رنگ آمیزی بهی هو، پرانی ملبه مین ایك اینٹ بهی کام کی هوئی تو انهائی اور نئی چونی سی نئی عمارت مین چن دی، ماضی کی عزت، حال پر شفقت، مستقبل کی فکر، یه طرز عمل اس مصلح کا رها هی اور حق یه هی که اردو ادب مین یه اختراع و اصلاح کر کی مولانا آزاد نی زبان دانان ملك کی لئی ایك شاه راه بنادی هی خواه کوئی اس پر چلی یا نه چلی.

آزاد نی «آب حیات» لکهکر، احیائی قدامت کیا هی. اردو نثر کو نظم کا همپایه بنادیا هی، اور اردو زبان کو تاریخی حیثیت بخشی هی. پہلی شعراء یا نثاروں کی کلام پر تقریظین یا تعریفین هوتی تهین. آزاد نی کسی قدر تنقید سی بهی کام لیا هی، لیکن جو تنقید کا حق تها اسی وه ادا نهین کر سکی. یا تو ان بزرگون عزت دل پر اس قدر احاطه کئی هوئی

تھی (جن کا حال انھوں نی حوالۂ قلم کیا ھی) کہ کھاں کران پر حرف گیری کرتا ان کی بس میں نہ تھا، با زمانہ ان کزوری مگر سچی باتوں کی گھونٹ اپنی حلق سی اتارنی کی لئی آمادہ نہ تھا اور اس لئی انھوں نی استعارات و تشبیھات کی قند ملاکر ان کو لوگوں کی گلی سی اتارا۔

« آب حیات » کی ابتدائی صفحات « تاریخ زبان اردو » کی لئی وقف کی گئی ھین. اور حق یہ ھی کہ خوب داد تحقیق دی ھی. آجکل بعض لوگوں کی رائی میں کتاب کا سب سی ناقص حصہ یھی ھی. جس کی وجہ یہ ھی کہ آزاد نی ولی کو اردو نظم کا آدم مانا ھی اور ادھر نثر میں میر فضل کی کتاب « دہ مجلس » کو اردو نثر کی سب سی پہلی کتاب کہا ھی جو ۱۱٤٥ ھجری کی تصنیف ھی، حالانکہ اب جدید دلدادگان تحقیق و تدقیق نی اس امر کا سراغ لگا لیا ھی کہ سلطان قلی قطب شاہ ولی سی بہت پہلی اپنا دیوان مرتب کرچکا تھا اور نثر میں شیخ عین الدین « گنج العلم » اپنی اردو رسالی آٹھویں صدی ھجری میں تصنیف کرچکی تھی. « آب حیات » سی بیشتر، اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اردو شعراء کی دس بیس تذکری ضرور لکھی گئی. کوئی تذکرہ قطب شاہ کی شاعری کا معترف نظر نہیں آتا اور جو تذکرہ نویس بھی اردو شاعری کو شروع کرتا ھی وہ ولی ھی سی اسکی ابتدا کرتا ھی اور شمالی ھند میں واقعہ بھی یہی ھی کہ ابتدا سی ولی ھی کی کلام کو مقبولیت عامہ حاصل ھوئی. ان حالات کی ھوتی ھوئی اگر آزاد نی ولی کو اردو نظم کا آدم مانا تو کیا برا کیا ؟ کیا ان کو چاھئی تھا کہ وہ برسوں دکن کی خاک چھانتی ؟ اگر وہ ایسا کرتی تو بھی گوھر مقصود شاید ھی ان کی ھاتھہ آتا جو اب حسن اتفاق سی دلدادگان تحقیق کی ھاتھہ آگیا ھی؛ جس کی بنا پر انھوں نی آزاد کو سرتاسر غلط کہنا شروع کردیا ھی. ھم تو باوجود ان کی اس تحقیق کی اب بھی حضرت آزاد کو حق بجانب سمجھتی ھیں کہ انھوں نی ولی کو اردو شاعری کا آدم مانا ھی. ذرا شاہ کی کلام کو ولی کی بالمقابل رکھکر دیکھئی کہ کس کلام کو اردو کا کلام کہا جائی. سلطان محمد قلی قطب شاہ فرماتی ھیں :

رکھہ ایك ھی ھر ایك ھی کدھن لاکھہ چن ھی

لکھہ جوت ھی ھر نھار ولی نت رتن ھی

پیاباج پیالا پیا جائی نا پیاباج یکتل جیا جائی نا

ولی کا ارشاد ھی:

خوبی اعجاز حسن یار اگر افشا کرون

بی تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کرون

اگر کچھہ یہ کچھہ کہنا ھی مغائی اردو شاعری ھی تو کہینگی کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ سی بہت بیشتر امیر خسرو اردو کی شاعر ہوئی ھین اور انکی کتاب «خالق باری» جو ہر وقت تصنیف ایك ضخیم کتاب تھی کیون یہ نظم کی پہلی کتاب مانی جائی، جس کی مقبول و مشہور ہونیکی یہ ادنی دلیل ھی کہ انیسوین صدی عیسوی کی آخر تك مکتبون مین مبتدی طلباء کو پڑھائی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ھی کہ اعتراض کرنا بہت آسان کام ھی لیکن تمام باتون پر نظر ڈالکر صحیح رائی قائم کرنا دوسری شی ھی آزاد نی فارسی زبان کی تحقیق مین ایك عمر صرف کی تھی اور اردو زبان کی متعلق بھی کاملین فن کی صحبت انھائی تھی وہ خوب جانتی تھی کہ کسی زبان کی ابتدا مین کیا حالت ہوتی ھی، اور رفتہ رفتہ قالب بدلتی بدلتی کس وقت اس قابل ہوتی ھی کہ اسی زبان کہا جائی اگر معترضین کی نظر کسی کی ارتقائی حالت پر پڑی ہوتی تو وہ ہرگز یہ رکیك الزام آزاد پر نہ لگاتی کہ انھون نی چونکہ ولی کی بجائی قطب شاہ سی اردو شاعری کا دور قائم نہین کیا اور اردو نثر مین شیخ عین الدین گنج العلم کی رسالون کو اردو نثر کی پہلی کتابین نہین قرار دیا لہذا تصنیف «آب حیات» پایۂ اعتبار سی گری ہوئی ھی اور وہ تحقیق و تدقیق سی کام نہین لیتی۔ ذرا معترضین آزاد کی تاریخ وفات اگلی صفحون پر ملاحظہ فرمائین تو معلوم ہوگا کہ مولانا حالی جو ان کی ہم عصر تھی اور جو ہم لوگون سی زیادہ بہتر جانتی تھی وہ آزاد کی نسبت کیا رائی رکھتی ھین۔ اور یہ بھی ظاہر ھی کہ مولانا حالی

حقیقت نگار تھی. اگر فی‌الواقع ان کی یہ رائی نہ ہوتی تو وہ ہرگز آزاد کو اپنی اشعار مین محقق نہ فرماتی.

بعض صاحبان اردو شعراء کی حالات مین حوالہ اور ماخذ چاہتی ہین کہ آزاد نی یہ باتین کس سی سنین یا کن کتابون سی اخذ کین. میری نزدیک یہ سراسر غلط ہی کہ دو صدی کی بعد جن بزرگون کی سوانح لکھی جائین، ان کی حالات کا حرف حرف تاریخ کی طرح حوالہ جات سی مستند کرایا جائی ورنہ عدم حوالہ جات کی صورت مین ان واقعات سی انکار کیا جائی. اول تو شاعرون کا تذکرہ کوئی تاریخ نہین ہوتا جس کی صحت و عدم صحت سی کسی قسم کا اثر مترتب ہو. دوسری آزاد نی اپنی کتاب اس وقت لکھی تھی جب کہ ماخذون کا ذکر کرنا ضروری نہین سمجھا جاتا تھا جیسا کہ آجکل لازمی ہوگیا. پس جسوقت تك کوئی واقعہ غلط نہ ثابت ہوجائی، اسوقت تك ہمین کوئی حق حاصل نہین ہی کہ ہم کسی امر کی خواہ مخواہ تکذیب کر بن اور ایك واقعہ غلط ہونی پر تمام کتاب کو لغو قرار دیں. بلکہ مین تو یہ عرض کرون گا کہ شاعرون کی حالات جس دلچسپی کی ساتھہ وہ بیان کئی گئی ہین اسی دلچسپی سی تنقن کی ساتھہ پڑھی جائین تو بہتر ہی، کہ اس سی لطف دوبالا ہوتا ہی اور ہمکو کوئی نقصان نہین پہنچتا، اگرچہ ہم یہ بھی تسلیم کرلین کہ جو واقعات ہمنی پڑھی ہین وہ دراصل وقوع مین نہین آئی. علاوہ ازین آزاد کی نسبت میرا یہ خیال ہی کہ انھون نی شاعرون کی تمام حالات یا حضرت ذوق اور ان استادون سی سنی تھی جن سی ان کو دوچار ہونیکا موقع ملا یا انھون نی مختلف تذکرون سی جمع کئی ہین. وہ ایسی آدمی نہین معلوم ہوتی کہ خوامخواہ انھون نی حالات کو دلچسپ بنانی کیلئی واقعات تراشی ہون. یہ ممکن ہی کہ جو کچھہ انھون نی سنا ہو اس کا اکثر حصہ کچھہ ردوبدل ہوکر ان تك پہنچا ہو. بہرحال ہم تو «آب حیات» کو ہر لحاظ سی ایك لاجواب کتاب سمجھتی ہین، موجودہ دور کی مصنفین جب اس سی بہتر کتاب لکھینگی تو ہم ان کی تحقیق کو مان لینگی اب تك تو باوجود دو تین تذکرۃالشعراء لکھی جانی کی « آب حیات » اپنی آپ نظیر ہی.

"دربار اکبری" بھی اپنی عبارت کی رنگینی کی اعتبار سی آزاد کی بہترین تصنیفات میں سی ھی. اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظر ثانی کی بعد نہ چھپوا سکی کیونکہ عرصہ سی وہ پیرانہ سالی اور بعض امراض میں مبتلا تھی، اور ان کی دماغ کی حالت خراب ہوگئی تھی، تاہم کتاب کی دلاویز ہونی میں کوئی شک نہیں. "دربار اکبری" کی عبارت دیکھکر انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو ضرور لارڈ میکالی کی تاریخ نویسی یاد آجاتی ھی. جو لطف انگریزی میں لارڈ موصوف کی تحریر سی پیدا ہوتا ھی بعینہ آزاد کی تحریر اردو میں دل پر وھی اثر کرتی ھی. اور جس طرح لارڈ میکالی کی تاریخ انگلستان ناقابل اعتماد ھی بعینہ یہی حال ایک حد تک "دربار اکبری" کا ھی. کیونکہ آزاد نی اپنی آراء اور جذبات کو ھر جگہ نمایاں کرنی کی کوشش کی ھی اور یہ امر فن تاریخ نویسی کی بالکل خلاف ھی، اگرچہ اکثر مورخ اسی دام میں پھنس جاتی ھیں.

تعلی و خود بینی:

آزاد طبع حضرت آزاد کی مزاج میں کچھہ تعلی و خود بینی کا مادہ بھی موجود تھا، اسوجہ سی اکثر اپنی معاصرین سی علمی نوک جھوک اور مخالفت رہا کرتی تھی. پروفیسر آزاد کا خاندانی مذھب امامیہ تھا مگر بعض بعض باتوں میں اپنی ذاتی رائی خاندانی مذھب سی الگ رکھتی تھی.

جنون کی آثار پیدا ہونا:

جناب آزاد کی صحت عرصہ سی فرسودہ ہوگئی تھی، اپنی صاحبزادی کی انتقال کا صدمہ، جس کو انھوں نی ایسی اعلی تعلیم دی تھی کہ وہ ان کی تصانیف کی نظرثانی کیا کرتی تھی، ان کی دل پر ایسا ھوا کہ اس حادثۂ جانکاہ کی بعد پھر ان کی طبیعت کبھی بحال نہ ھوئی، اسپر ایران کی دوسری سفر کی تکالیف اور زیادہ ھوئیں. ان سب واقعات نی دماغی مصروفیت کی انتہائی کثرت کی ساتھہ ملکر ان کی دماغی تر و تازگی کو خشک اور

پریشان کردیا اور اگست ۱۸۸۹ع سی جنون کی آثار پیدا ہو گئی . رفتہ رفتہ یہ مرض پختہ ہو گیا اور آخر دم تک ان کا ساتھہ نہ چھوڑا .

الہیات کا شغل :

عالم جنون میں ان کا شغل الہیات تھا ، اسی کا ذکر اذکار ان کی زبان پر رھتا تھا . انہیں ایام میں ایك مرتبہ آپ رائی بہادر ماسٹر پیاری لال سی ملنی آئی . دو تین گھنٹی کی قریب ملاقات رہی ، لیکن بار بار یہ الفاظ ان کی زبان سی نکلتی تھی :

« رائی صاحب ! آپ اس شعر کو پڑھا کیجئی ، اسکی معنی آپ جو چاھیں سمجھہ لیں :

پردہ در کعبہ سی اٹھا دینا ھی آسان
در پردۂ رخسار صنم اٹھہ نہیں سکتا

حالت جنون کی تحریر :

حضرت ممدوح نی اپنی ذاتی تالیفات و تصنیفات کی علاوہ اپنی استاد ذوق کا حق شاگردی بھی کما ینبغی ادا فرمایا ھی یعنی استاد ذوق کا ایك دیوان خاص اپنی اهتمام سی مرتب کیا ھی جس میں ان کی سوانح عمری اور اوائل عمر سی بالترتیب کلام جمع کر کی دکھایا ھی کہ فلاں غزل ، فلاں قطعہ ، فلاں محل اور موقع پر کہا تھا یہ دیوان چھپ گیا ھی . بعض لوگوں کا اسکی نسبت خیال ھی کہ آپنی اس میں جا بجا تصرف کیا ھی بہر حال مجموعی حیثیت سی یہ امتیاز ضرور ھی کہ سابقہ مرتب دیوان سی اس کا کلام زیادہ صحیح ھی . «دیوان ذوق» چھپنی کی بعد جب ایك کاپی ان کی سامنی رکھی گئی اور خاتمہ لکھنی کی درخواست کی گئی ، کئی دن تك انکار کرتی رھی ، ایك دن خود ھی دوات قلم لیکر ایك صفحہ لکھدیا ، جو «دیوان ذوق» کی خاتمہ پر درج ھی . اس میں اور حالت صحت کی تحریر میں کچھہ فرق نہیں . البتہ اس میں بھی تصوف اور الہیات کی بو آتی ھی . بقول مؤلف «خمخانۂ جاوید» اس بگڑی ہوئی

حالت مین بھی جب کبھی قلم دوات کی نصب کھل جاتی تو عجیب عجیب گل افشانیاں کرتی که اب کوئی ذی ہوش بھی ایسی گلکاریاں نہین دکھا سکتا.
ان کی حال پر خود آزاد ھی کی شعر کا مضمون صادق آتا ھی:

اگر مین ہوش مین ہوتا تو پھر کیا جانی کیا ہوتا
فروغ دیدۂ عالم ھین به مد ہوشیان میری

یه قابل زیارت پروفیسر لاھور موچی دروازه مین رھتی تھی. اگرچه دماغی عارضه کی سبب ان کا عدم و وجود برابر تھا، تاھم علم دوست طبیعتون اور نگاھون کیلئی ان کا شربت دیدار مسرت افزا تھا اور یه شعر ان کی حسب حال تھا:

میری دانائی کی قائل تھی سب افلاطون منش
شاعری نی کردیا ای داغ سودائی تجھی

آخراس حالت بیخودی مین بعمر ستر سال ۲۲ جنوری سنه ۱۹۱۰ع مطابق ۹ محرم‌الحرام ۱۳۲۸ ھجری کو حضرت آزاد اس قید ھستی سی آزاد ہوگئی اور لاھور مین دفن ہوئی. مولانا حالی نی جو تاریخ وفات لکھی تھی اس کی اشعار یہاں درج کئی جاتی ھین:

آزاد وه دریائی سخن کا در یکتا
جس کی سخن آرائی په اجماع تھا سب کا
ھر لفظ کو مائینگی فصاحت کا نمونه
جو اس کی قلم سی دم تحریر ھی ٹپکا
ملکون مین پھرا مدتون تحقیق کی خاطر
چھوڑا نه دقیقه بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نه سنا ایسا کہین اھل قلم مین
تصنیف کا، تدوین کا تحقیق لپکا
صحت مین، علالت مین، اقامت مین، سفر مین
ھمت تھی بلا کی تو اراده تھا غضب کا

فرض اپنا ادا کرکی کئی سال سی مشتاق
بیٹھا تھا کہ آئی کہین پیغام طلب کا
آخر شب عاشور کو تھی جس کی تمنا
آ پہنچا نصیبون سی بلاوا اسی رب کا
تاریخ وفات اوس کی جو پوچھی کوئی حالی
کہدو کہ «ھوا خاتمہ[1] اردو کی ادب کا»

(اس کی بعد اصل کتاب مین پروفیسر آزاد کی کتابون سی چند اقتباسات درج کئی گئی ھین جو بوجہ طوالت نظر انداز کئی جاتی ھین۔ تنہا)

---

(۱) اس تاریخ سی سنہ ۱۳۲۷ ھجری نکلتا ھی۔ حالانکہ آزاد کی وفات سنہ ۱۳۲۸ ھجری مین واقع ھوئی ھی لیکن سنہ ۱۳۲۸ ھجری مین صرف دو دن زیادہ ھوئی تھی لہذا اس قسم کی تاریخ جائز ھی۔ تنہا

عربی رسم الخط

(مقتبس از دائرة المعارف اسلام)

عربی رسم الخط اگرچہ باعتبار زمانہ بہت زیادہ قدیم نہیں لیکن جغرافی اعتبار سی بھی ایك رسم الخط ھی جسی رومی رسم الخط کی بعد سب سی زیادہ اھمیت حاصل ھی حدودِ چین سی لیکر شمالی افریقہ کی مغربی سواحل اور قسطنطنیہ سی لیکر جزائر ملایا تك تمام زبانین عربی حروف مین لکھی جاتی ھین . یون بھی دنیا کی ھر حصہ مین اس کی جاننی والی موجود ھین اور اسکا تھوڑا بہت استعمال ھر جگہ ھوتا ھی .

گذشتہ صدی تك برابر یہ خیال چلا آتا تھا کہ عربی رسم الخط کی ابتدا خط کوفی سی ھوئی ، قدیم عربی دستاویزین ، قرآنی آیات ، سکی اور سنگی کتبی سب اسی خط مین ملتی ھین ، لیکن پچھلی صدی مین جب سی متعدد پیپرس (Papyrus) دستیاب ھوئی ھین یہ خیال باطل ھوگیا ھی . اس سی بھی تعجب خیز امر یہ ھی کہ ابتدا مین عربی رسم الخط کی جو صورت تھی وہ خط نسخ سی کچھہ بہت زیادہ مختلف نہین تھی . خط کوفی سی مشابہ صرف دو کتبی ملتی ھین ، ایك زبد[1] کا کتبہ (۵۱۲ع) جو عربی ، سریانی اور یونانی تین زبانون مین ھی اور دوسرا حرانی کتبہ [2] جس کا زمانہ ۵٦۸ع ھی اور جو یونانی اور عربی دو زبانون مین ھی .

یہ کتبی بجائی خود ان کتبات سی مشابہ ھین جو جزیرہ نمائی کنعان مین دستیاب ھوئی ھین . ان دونون خطون کی درمیان جو مشابہت پائی جاتی ھی اس سی علما قدرتاً اس نتیجہ پر پہنچی کہ دونون مین سی کوئی ایك دوسری سی ماخوذ ھوگا . کنعانی کتبون کی زبان نبطی (آرامی کی

---

(۱) یمن کا قدیم شہر.

(۲) حران ، « الجزیرہ » کا مشہور شہر جو نسطوری علم و حکمت کا مرکز رہا ھی .

'ملك شاخ) هی. لیکن اس رسم‌الخط کا زمانہ ان بطی کتبوں ی متاخر هی جو دمشق سی لیکر مدینه تك هر جگه ملتی هین اور جنکی قدامت ولادت مسیح (علیہ السلام) تك پہنچتی هی[۲] باس همه ان کتبوں کی قدیم اور متروك خط مین بهی عربی رسم‌الخط کی اکثر اجزاء موجود هین.

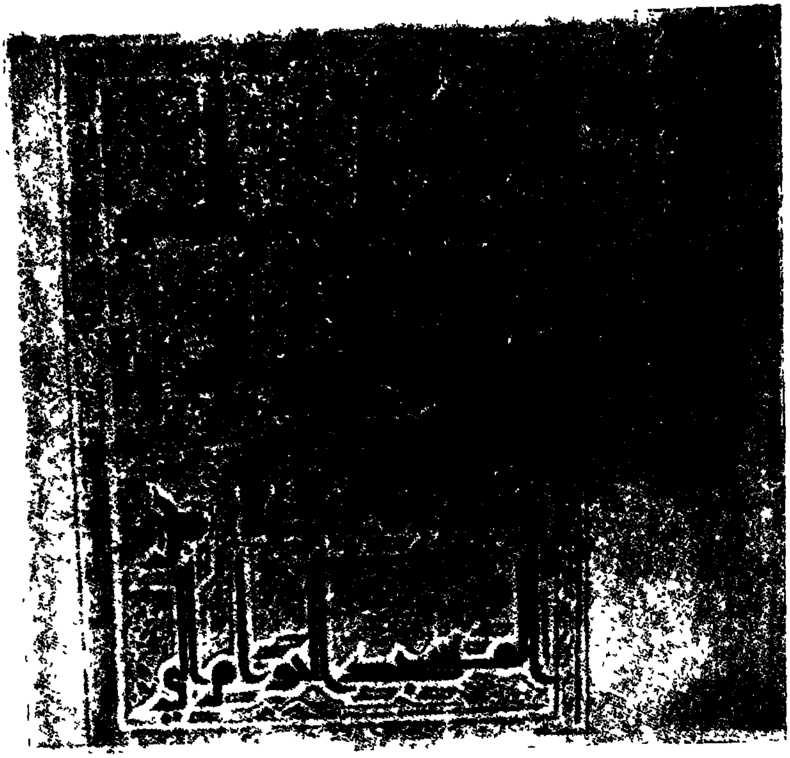


دمشق کا ایك قرآن، ۲۶۰ - ۲۵۶ هجری

لسانی اور تاریخی اعتبار سی کتبات کچھه بہت زیاده اهم نہین هین ان مین اس نبطی خط کی نقل کی گئی هی جس کا دوسری صدی کی آخر اور تیسری صدی کی آغاز مین نبطی دار السلطنت بطرا[۲] مین رواج تها. آخری سی آخری کنعانی کتبات کا زمانه ۲۳۰ - ۲۱۰ع هی اور قدیم سی قدیم عربی کتبوں کی ابتدا ۵۶۸ - ۵۱۲ع سی هوتی هی. نیماره کا عربی کتبه[۳] جسکا زمانه ۳۲۸ع هی نبطی خط مین لکھا گیا هی؛ لیکن اس مین بهی ایك

(۱) نبطی تقریباً ۴۰۰ ق م سی ۱۰۶ع تك شمالی حجاز کی حاکم رهی.
(۲) بطرا (Petra) جس کا دوسرا نام الرقیم هی شمالی حجاز مین واقع هی.
(۳) امرأ القیس بن عمرو کی قبر کا کتبه جس کی الفاظ یه هین: «عربوں کا بادشاه جس نی تاج پہنا اسد اور طی پر حکومت کی.»

جدید رسم الخط کی آغاز کی علا میں موجود ہیں ، مثلاً حرف کا ملانا
• کی صورت ا و ر حرف سامك ۱ کی عدم موجودگی



قرآن مجید مرصع کوفی خط میں تحریر ا وبکر غزنوی ۰ ٦٦ھ ہجری

لهذا خیال یه هی که نبطی رسم الخط نی چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی مین عربی رسم الخط کی صورت اختیار کرلی هوگی؛ لیکن اس مسئله کی حل کی لئی که آیا یه تغیر بطرا مین رونما هوا یا نوخیز غسانی ریاست مین جو بطرا کی نواح مین قائم هوئی همین مزید تحقیقات کا انتظار کرنا چاهئی . اعداد کی اعتبار سی عربی رسم الخط کی موجوده ترتیب قدیم ترتیب سی بالکل مختلف هی ' نبطی حروف تہجی مین ت = ۴۰۰ سب سی آخری حرف هی. اسی اعتبار سی عربی رسم الخط مین حروف ث = ۵۰۰ ' خ = ۶۰۰ '

---

(۱) ایك نبطی حرف ، مفصل بحث کی لئی ملاحظه هو جرنل رائل ایشیائك سوسائٹی .

ذ = ۷۰۰ ، ض = ۸۰۰ ، ظ = ۹۰۰ اور غ = ۱۰۰۰ کا اضافہ ہوا . یہ حروف بطی خط میں موجود نہیں .

عربی حروف تہجی کی موجودہ ترتیب غالباً اس خیال پر مبنی ہی کہ یکساں حروف کو ایک ساتھہ لکھہ لیا جائی ، لیکن اس اصول پر بھی پوری طور پر



قرآن مجید مرصع کوفی خط میں . بحریر ابوبکر غزنوی ۵۶۰ ہجری

عمل نہیں ہوا ، موجودہ ترتیب میں حرف ی کو ب ت ث کی ساتھہ نہیں بلکہ سب سی آخر میں لکھا جاتا ہی ، شاید اس لئی کہ آخر میں اسکی شکل بالکل بدل دی

گئی ھی(ط ں) . قدیم خط مین ف اور ق کی آخری حصی باھم مشابہ نہین تھی بایںھمہ ان دونوں کو ساتھہ ساتھہ لکھا گیا .

غالباً حروف تہجی کی موجودہ ترتیب اسلام سی قبل مکمل ھوچکی تھی. یہ امر یاد رکھنی کی قابل ھی کہ مغربی (افریقی) خط جسکا آغاز دوسری صدی ھجری مین ھوا باعتبار ترتیب ایك حد تك ببطی خط کا پابند ھی. بہرکیف عربی رسم الخط کی ابتدا اطراف ریاست غسان جہان کہین سی بھی ھوئی رفتہ رفتہ اس کا حلقۂ اثر وسیع ھونا شروع ھوا . اس کا اصلی سبب عرب کی وہ تجارتی سرگرمیان ھین جنکا سلسلہ جنوب سی لیکر شمال تك پھیلا ھوا تھا ، جس طرح چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا مین اس کا رواج شام مین ھوا ٹھیك اسی زمانی مین اس کا اثر جنوب مین بھی پہنچا . ایك سو برس کی بعد اسلام کا ظہور ھوا اور مشرق و مغرب مین ھر جگہ اسکا دور دورہ تھا .

کہا جاتا ھی کہ آنحضرت (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) کی زمانہ مین مکہ مین صرف سترہ آدمی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتی تھی ، ان کی علاوہ کچھہ عورتیں بھی تھین . غالباً یہ روایت صحیح نہین اس لئی کہ آنحضرت (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) کی کاتبوں[۱] مین ۵ سی لیکر ۱۰ آدمی کام کرتی تھی ، علاوہ ازین مصریون کی طرح اھل مکہ بھی کتابت کی شوق مین ھر طرح کا سامان ترقیم استعمال کرتی تھی اور مکہ ایسی تجارتی شہر مین یہ امر کچھہ بھی تعجب خیز نہین . گمان غالب یہ ھی کہ اسوقت بہت کافی لوگ لکھنا پڑھنا جانتی تھی ، اندرین حالات عربوں کا یہ خیال کہ اس کی بعد عراق زبرین کی لخمی ریاست حیرہ مین لکھنی پڑھنی کا رواج ھوا غلط معلوم ھوتا ھی . ویل ھاؤزن کا خیال ھی کہ یہاں لکھنی پڑھنی کی ابتدا عیسائیوں کی بدولت ھوئی . بہرکیف یہ امر یقینی ھی کہ طرفہ کی زمانہ مین (چھٹی صدی عیسوی کا آخری نصف) یہاں عربی رسم الخط کا رواج ھوچکا تھا .

اسلام کی بدولت فن کتابت کو از سرنو تحریك ھوئی . ۶۲۲ع مین بھی

---

(۱) یعنی کاتبان وحی.

قرآنی عبارات قلمبند ہوچکی تھیں اور پھر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی زمانی مین جب قرآن کا ایك نسخہ سرکاری طور پر معین کرد یا گیا تو اسکہذ پڑھنا عام ہوگیا .

عربی رسم الخط کی قدیم تر نمونی جنکا تعلق اسلامی عہد سی ہی یہ ہین :

(۱) متعدد سکی جنکا زمانہ ٦٤١ ع ہی .

(۲) بعض کتبی : قبة الصخرہ (قدس) کا کتبہ (۹۲ - ۶۹۱ ع) ۷۲ ہجری؛ خلیفہ عبدالملك کی تین سنگهائی میل جنپر کوئی تاریخ نہین دی گئی . قصر خرانی کا کتبہ (۷۱۰ — ۱۱ ع) ۹۲ ہجری. مناسب معلوم ہوتا ہی کہ یہاں دوسری صدی ہجری کی کتبات کا تذکرہ بھی کردیا جائی : (۱) کتبۂ قصر الاخوین (تدمر کی شمال مشرق مین) ۱۱۰ ہجری اور (۲) کتبۂ قصر الحائر (تدمر کی جنوب مغرب مین) جنہین خلیفہ ہشام نی طیار کرایا تھا ؛ (۳) کتبۂ مصر بالائی؛ (٤) کتبۂ معسکر جبراش؛ (٥) کتبۂ مسجد عسقلان؛ (٦) کتبۂ حوض رملہ؛ (۷) عہد ہارون رشید کا اشمنی کتبہ جو سرحد کی پتھر پر کندہ تھا اور اس وقت راقم الحروف[۱] کی پاس موجود ہی؛ (۸) مقابر مسطاط کی بعض کتبی .

(۳) متعدد دستاویزیں جو پیپرس (Papyrus) پر لکھی گئی ہین اور جنکا زائد حصہ ساتویں صدی کی آخری زمانی سی تعلق رکھتا ہی .

عربی رسم الخط نی جو سادہ صورت اختیار کی اس میں اکثر حروف بالکل یکساں تھی. لہذا سریانی طرز تحریر کی تتبع مین ان مین سی بعض پر نقطی لگادئی گئی . ان کا آغاز غالباً ظہور اسلام سی پہلی ہی ہوچکا تھا ، البتہ سب سی آخر مین جس حرف پر نقطی لگائی گئی (دوسری صدی ہجری) وہ ۃ ہی . اسی ہی ف اور ق کی صورت مین بھی کافی تبدیلیاں ہوئی ہین . ابتدا مین ف کو ب اور ق کو ف لکھا جاتا تھا ، چنانچہ مغرب مین اب بھی ان حروف کی پرانی شکل قائم ہی .

---

(۱) یعنی B. Moritz جنہوں نی اس مضمون کو لکھا ہی .

اعراب کی ابتدا بھی زمانۂ قدیم ھی مین سریانی کی تقلید مین ھوئی. شروع شروع مین ان علامات کی لئی بھی نقطی استعمال کئی جاتی تھی. لیکن اس خیال سی کہ ان مین اور حروف کی اصلی نقطون مین تمیز ھوسکی ان کی لئی سیاھی کی بجائی سرخ یا نیلا یا کوئی اور رنگ استعمال کیا جاتا تھا البتہ بعض دستاویزون مین نقطون کی بجائی دائری استعمال ھوتی ھین یہان تک کہ دوسری صدی ھجری مین اعراب نی موجودہ صورت اختیار کی. عربون کا بیان ھی کہ انکا موجد مشہور نحوی خلیل (م ۱۷۰=۷۸٦) تھا ظاھر ھی کہ اعراب کی موجودہ صورت جیسا کہ ضمہ (پیش=جزم) سی فورا معلوم ھوجاتا ھی. حروف علت سی مستخرج ھی

ھمزہ اور تشدید کی ایجاد بھی خلیل کی طرف منسوب کی جاتی ھی اگرچہ ان کی ابتدا کا زمانہ متعین نہین پھر بھی یقین ھی کہ انکا آغاز فتحہ، کسرہ اور ضمہ سی مؤخر ھی فتحہ و کسرہ کی طرح ھمزہ کی صورت مین بھی کافی تغیر و تبدل ھوتا رھا. قرآن مجید کی قدیم ترین نسخون مین اس کی لئی دو سرخ نقطی استعمال ھوئی ھین. آگی چل کر دو نقطون کی بجائی الف یا ی کی نیچی نیلی رنگ مین ایک نقطہ یا ایک دائرہ بنادیا جاتا تھا.

مناسب معلوم ھوتا ھی کہ یہین قدیم سامان ترقیم کا تذکرہ بھی کردیا جائی.

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی زمانی مین تمام تحریرین چمڑی پر لکھی جاتی تھین. اکثر اس چمڑی کو سرخ رنگ لیا جاتا تھا.

(۲) عسیب یعنی کھجور کی چھال.

(۳) عظم، اونٹ کی ھڈی. بالعموم پسلیون اور کاندھون کی چوڑی ھڈیان استعمال کی جاتی تھین

(٤) خذف یا شقف (ٹھیکری) مختصر تحریرین انھین پر لکھی جاتی تھین. یونانی قبطی دور اور زمانۂ قدیم مین یہ چیز عام طور

پر لکھی کی لئی استعمال ہوتی تھی.

(۵) لخاف یعنی چپٹی سفید پتھر غالباً یہ چونی کی پتھرکی چھوٹی چھوٹی ٹکڑی ہوتی ہونگی. افسوس سی کہنا پڑتا ہی کہ ابھی تك انکا کوئی نمونہ دستیاب نہین ہوا.

(٦) غالباً لکڑی کی تختاں بھی استعمال ہوتی تھین. کتبخانۂ خدیویہ مین ایك لوح موجود ہی جسکی ایکطرف سورۂالفجر مرقوم ہی.

(۷) رقعہ (یا جلد یا فلجان (Parchment) یہ چیز نہایت گراں تھی.

(۸) قرطاس، یا قرطاس مصری Papyrus.) زمانہ قدیم ہی سی مصر اس کی ساخت کی لئی مشہور ہی. جب تك کاغذ کا رواج نہین ہوا اسی کا استعمال ہوتا تھا.

دوسری صدی ہجری مین کاغذ کا رواج ہوا

عربی رسم الخط کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کی متعلق عربی روایات سی کچھہ مدد نہین ملتی. بلاذری کا خیال ہی کہ اس کا آغاز ریاست لخم مین ہوا. ابن خلدون اور ابن خلکان نی بھی یہ کہکر کہ عربی خط حیرہ و انبار سی آیا بلاذری کی تائید کی ہی. البتہ صاحب الفہرست[1] نی ہشام الکلبی (م-۲۰٤) کی سند پر یہ روایت نقل کی ہی کہ سب سی پہلی جن لوگوں نی عربی خط تحریر کیا وہ ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون، صعفض اور قریسات تھی. یہ مدین کی پادشاہ تھی جو وہاں کی مشہور زلزلہ کی نذر ہوگئی[2]. اس روایت سی پتہ چلتا ہی کہ عربی خط دراصل نبطی خط سی ماخوذ ہی اور جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہی وہین اسکی ابتدا ہوئی. ابو(ابن) ندیم ابن ابی سعدد نی ایك اور روایت مین ان پادشاہون کی نام زیادہ صحیح شکل مین یوں بیان کئی ہین:

ابجاد، ہاوز، حاط، کلمان، صاع نض، قرست.

---

(۱) ابن الندیم.

(۲) ظاہر ہی کہ ان پادشاہوں کی نام فرضی ہین. مدین شمالی حجاز مین ساحل بحر پر آباد ہی.

اگر ان مین سی الف کو حذف کردیا جائی تو باقی مانده حروف سی اصلی خط کی ترتیب ظاهر هوجائیگی سوائی اس کی که متروك نبطی حرف سامك کی بجائی س اور ص کی بجائی ض کا اضافه هوا.

اسلام کی پہلی ۵ صدیون کی علوم و فنون کی ترقی کی ساتهه رسم الخط کو بهی غیر معمولی فروغ هوا، لیکن شروع شروع مین تمامتر توجه اسکی جمالی پہلو پر رهی. صاحب الفهرست نی ان مین سی بہت سی خطون کا تذکره کیا هی؛ لیکن چونکه موجوده زمانه مین ان کا کوئی مستند نمونه باقی نہین اس لئی یه کہنا مشکل هی که ان مین سی هر خط کی صورت کیا تهی. امتداد زمانه کی ساتهه یون بهی بہت سی خط ناپید هوگئی هونگی.

عباسیون کی عهد کی بڑی بڑی خوشنویسون مین علی بن عبیدالریحانی (م ۲۱۹ هجری) کا نام خاص طور سی مشهور هی. علی الریحانی ایك قسم کی آرائشی خط، خط ریحانی کا موجد هی. ابن مقلا (۲۷۲–۳۲۸) اور اس کا بهائی ابو عبدالله الحسن (۲۶۸–۳۲۸) بهی مشهور خوشنویس هین، لیکن انهون نی فن کتابت مین جو کمال پیدا کیا اس کی متعلق همین کوئی علم نہین. آخری عباسی خلیفه مستعصم بالله کا درباری خوشنویس یاقوت المستعصمی اس زمانی کا نہایت مشهور کاتب تہا. خوش قسمتی سی اس کی هاتهه کی لکهی هوئی قرآن مجید کی دو نسخی ابتك موجود هین. یاقوت بجائی خود ایك جداگانه طرز تحریر، خط یاقوتی، کا بهی موجد تها.

بغداد کی بعد اسلامی علم و حکمت کا دوسرا مرکز قاهره تها، جسی فاطمیون کی زمانی مین غیر معمولی فروغ هوا. فاطمیون کی بعد ایوبی اور ایوبیون کی بعد ممالیك مصر کی حاکم هوئی. فاطمیون کی عهد مین خط نسخ کو غیر معمولی ترقی هوئی. ایوبیون کی زمانی مین جیسا که سلطان صلاح الدین کی سنگی کتبون کی دیکهنی سی معلوم هوتا هی، اس نی ایك خاص مگر متناسب صورت اختیار کی. هم اس خط کو خط ایوبی کہه سکتی هین. خط نسخ نی انتہائی خوبصورتی ممالیك کی عهد مین حاصل کی. مملوك پادشاهون نی کاتبون اور خوشنویسون پر عباسی شہنشاهون

سی کچھه کم توجه نہین کی. قلقشندی نی اپنی کتاب کی دوسری حصی مین اس عہدکی مختلف خطوط پر تفصیل سی قلم اٹھایا هی. اس زمانی کی سنگی کتبون سی بھی ایك نہایت درجه خوبصورت اور متناسب طرز تحریرکا پته چلتا هی.

ممالیك کی زوال کی بعد عثمانی ترك اسلامی تہذیب کی رهی سہی یادگارون کی مالك هوئی. انہون نی بھی فن خوشنویسی کو بہت کافی ترقی دی. کہا جاتا هی که ایك زمانی مین دولت عثمانیه مین تیدس قسم کی خطوط رائج تھی. حمدالله (م ۹۳٦ھ = ۱۵۳۰ع) اورحافظ عثمان (م ۱۱۱۰ھ = ۱٦۹۸ع) مشہور ترکی خوشنویس هین.

اوپر بیان هوچکا هی که عربی رسم‌الخط کی قدیم ترین نمونی چھٹی صدی مسیحی کی دو کتبی هین. انکا طرز تحریر خط کوفی سی مشابه هی، سوال یه هی که آیا اس زمانی مین صرف اسی ایك خط کا وجود تھا یا اس زمانی اس مدور خط کا رواج تھا جس نی بعد مین خط نسخ کی صورت اختیار کی. اب تك همکو جو بات وثوق سی معلوم هوئی هی وه یه هی که پہلی صدی هجری مین دو قسم کی خط موجود تھی، ایك نوکدار اور دوسرا مدور اور اس اختلاف کی وجه غالباً سامان کتابت کا باهمی فرق تھا.

دوسری صدی هجری مین ان دونون خطون مین سی ایك نی زیاده نوکدار صورت اختیار کی. زمانۂ قدیم هی سی مؤخرالذکر کا نام خط کوفی چلاآیا هی. اس مین کوئی شك نہین که یه خط کوفه کی بنا سی ایك صدی پیشتر عراق مین موجود تھا، لیکن سب سی پہلی اسی کوفه هی کی بدولت جو بغداد سی قبل اسلامی تہذیب کا مرکز تھا، شہرت هوئی.

یہین یه خط سرکاری تحریرون مین استعمال کیا گیا اور پھر بعد کی زمانۂ عروج مین دنیای اسلام کی هر حصی مین اس کا رواج هوگیا. غالباً خط کوفی کی اصطلاح کی ابتدا بھی بغداد مین هوئی. اس کا سب سی قدیم تذکره همین الفہرست مین ملتا هی، جسکی مصنف نی تین اور خطون یعنی خط مکی، خط مدنی اور خط بصری کا بھی ذکر

چکا ہی۔ عجیب بات ہی کہ بصرہ اور کوفہ مین تو باوجود معمولی مسافت کی دو جداگانہ خطوں کا رواج ہو اور شام جو پون صدی تک سلطنت اسلامی کا مرکز رہا اور مصر کی طرف جہاں کساب کا ہمیشہ رواج رہا کوئی خط منسوب نہ ہو۔

تقریباً پانچ صدیوں تک قرآن مجید کی نسخی صرف خط کوفی مین لکھی جاتی تھی لیکن امتداد زمانہ کیساتھہ اسکا رواج کم ہوتا گیا۔ عام خط و کتابت کی لئی اس زمانی مین بھی بالعموم مدور خط کو استعمال کرتی تھی، اس لئی کہ خط کوفی مین کچھہ لکھنا تکلف سی خالی نہ تھا۔

خط کوفی کی تین طرز اختیار کئی۔

(۱) قدیم، سادہ کوفی طرز جس کا رواج تیسری صدی ھجری تک رہا۔ اس مین بعض حروف کی بالائی حصوں کو موڑ دیا گیا ہی۔ اس سی پتہ چلتا ہی کہ اس رسم الخط کو آرائشی صورت دینی کا آغاز ہوچکا تھا۔

(۲) کوفی خط کا وہ دور جس مین حروف کی تزئین و آرائش کی خیال سی ان مین نقش و نگار کی صورت دی گئی تھی۔ فاطمیوں کی عہد مین اس طرز کو بیحد فروغ ہوا۔

(۳) پانچوین اور چھٹی صدی مین عراق اور شام کی کوفی خط مین حروف کو نہایت خوبصورتی سی ایک دوسری مین الجھادیا گیا ہی، لیکن بالاخر جیسا کہ عیسائیوں کی آخری سکوں کی دیکھنی سی معلوم ہوتا ہی اس خط نی نہایت قبیح صورت اختیار کرلی۔

اس غیر طبیعی اور تکلیف دہ خط، یعنی خط کوفی، کی خلاف چھٹی صدی ھجری مین ایک رد عمل شروع ہوا یہ سوال کہ آیا اسکی ابتدا ایران کی اس سنی تحریک سی ہوئی جو پانچوین صدی ھجری مین فاطمیہ مصر کی خلاف پیدا ہوئی یا اسکا رواج مغرب سی مشرق مین پھیلا ابھی تک زیر بحث ہی۔ بہر کیف یہ امر یقینی ہی کہ مدور خط کا سب سی پہلا نمونہ علی بن یوسف ابن تاشفین (۵۰۰—۵۲۷) سلطان مرابطین کی سکون سی ملتا ہی۔ دولت موحدین کی ابتدا (۵۲٤) کی

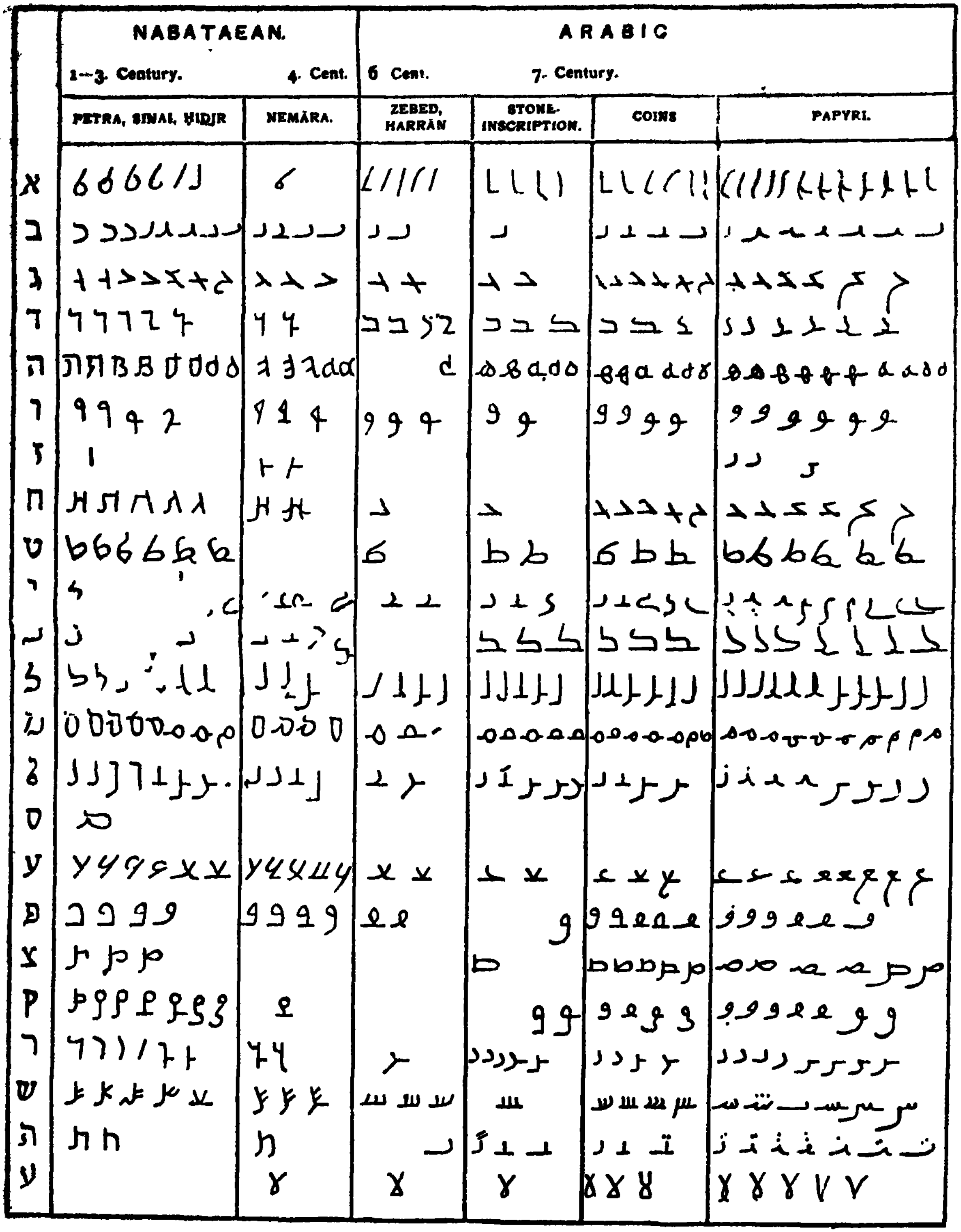
ساتهه اسکی رواج مین اور بهی اضافه هوا: موحدین کی سب هی سکی اسی خط مین ملتی هین. کوفی خط کا آخری کتبه جو مصر مین ملا هی ۵۵۵ هجری (۱۱۳۰ع) کا هی، لیکن مدور خط کا رواج اس سی ایك صدی پیشتر المستنصر[1] (۴۸۷–۴۷۶ = ۱۰۹۴–۱۰۳۶) کی زمانی سی هوچکا تها. رفته رفته اسکا رواج شام مین پهیل گیا. خط نسخ کا پهلا صحیح نمونه افضل والئی دمشق (۵۹۲ = ۱۱۹۶) کی ایك درهم سی ملتا هی. ۶۲۲ هجری (۱۲۲۵) کی بعد خط نسخ کا رواج سلاجقه روم مین هوا، چنانچه ساتوین صدی هجری کی بعد ایشیائی کوچك کی تمام کتبی اسی خط مین ملتی هین. کهین کهین خط کوفی کا بهی کوئی نمونه ملتا هی لیکن محض آرائش کی لئی.

البته الجزیره کی مشرقی حصص اور ایران مین خط کوفی کا رواج دیر تك قائم رها. دولت عباسیه کی آخری یادگارون اور ایران کی تمام عمارات مین اگرچه هلاکو اور هلاکو کی بعد تیمور کی هاتهون ایران کی تمام اسلامی یادگارین برباد هوگئین، تاهم ۶۲۰ (۱۲۲۳) تك اسی خط کا استعمال هوتا رها.

جن جن ممالك پر عربون کا قبضه هوتا گیا ان مین تهوڑی بهت ترمیم کی ساتهه عربی رسم الخط کا رواج پهیل گیا. اس اعتبار سی مغربی رسم الخط سب سی قدیم هی. روایات سی پته چلتا هی که سب سی پهلی اس خط کا آغاز قیروان مین هوا، جو ۵۰ هجری (۶۷۰) مین آباد هوا اور مغرب مین اسلام کا سب سی پهلا سیاسی مرکز هی، اور پهر ایك صدی بعد جامع قیروان کی بنا کی ساتهه مسلمانون کا علمی مرکز بن گیا. دوسری صدی هجری کی آخر مین جب دولت اغلبیه[2] کی ساتهه مصر همیشه کی لئی مغرب سی علیحده هوگیا تو قیروان کی اهمیت اور بهی بڑه گئی. قیروان دولت اغلبیه کا مرکز تها. یهین اس نئی خط (خط قیروان) کی

---

(۱) ابو تمیم معد المستنصر بالله، آٹهوان فاطمی خلیفه.
(۲) ۱۵۰ — ۲۹۶ هجری.



عربی اور نبطی رسم الخط

بنا پڑی۔ اوپر بیان ہوچکا ہی کہ خط مغربی اور خط مشرقی مین سب سی نمایان فرق ف اور ق کی تحریر کا ہی۔ حروف کی ترتیب مین بھی مغربی خط قدیم نبطی خط اور جدید عربی خط کی بین بین ہی۔ مثلاً:

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز ط ظ ك ل م ن ص ض ع غ ف ق س ش ه و ی لا

باینہمہ خط مغربی خط کوفی ہی سی ماخوذ ہی۔

زوال قیروان کی بعد جب اندلس اسلامی علم و حکمت کا مرکز بنا تو ایك نئی خط (خط اندلسی یا خط قرطبی) کی ابتدا ہوئی۔ ابن خلدون نی اپنی مشہور "مقدمۂ تاریخ" مین لکھا ہی کہ جب شمالی افریقہ مین خط قیروان (یا خط مہدیہ[۱]) کا رواج باقی نہ رہا تو افریقہ مین ہر جگہ خط اندلسی پھیل گیا اور زوال[۲] موحدین تك اسی کا دور دورہ رہا۔ بنی مرین[۳] کی عہد مین ایك تیسری خط (خط فاسی) کی بنا پڑی۔ ابن خلدون کا خیال ہی کہ فاس (فیض، دارالحکومت مراکش) کا رسم الخط نہایت بدنما تھا، لیکن اسکی یہ رائی مبالغہ سی خالی نہین۔

ساتوین ہجری کی بعد وسطی افریقہ مین بہت سی اسلامی ریاستین قائم ہوئین۔ ان سب کا مرکز تمبکٹو تھا، جو ۵۹۰ھ (۱۲۱۳) مین آباد ہوا اور اپنی مشہور مدرسی کی بدولت افریقہ کا چوتھا علمی مرکز قرار پایا۔ تمبکٹو کی شان و شوکت دسوین صدی ہجری تك قائم رہی۔ یہین افریقہ کا چوتھا رسم الخط (خط سودانی) وجود مین آیا۔

موجودہ زمانہ مین مغرب میں چار خط رائج ہین:

(۱) خط تونسی جو سوائی ف اور ق کی طرز تحریر کی خط مشرقی سی مشابہ ہی۔

(۲) خط الجزائری: یہ خط زیادہ تر نوکدار ہی اور اُس کا پڑھنا بھی کسی قدر دقت طلب ہی۔

---

(۱) مہدیہ کی بنا ۳۰۳ ہجری مین عبداللہ مہدی بانی دولت فاطمیہ نی رکھی، جب تك مصر فتح نہین ہوا مہدیہ فاطمیوں کا پایۂ تخت رہا۔

(۲) دوسری بربر سلطنت جو مرابطین کی بعد افریقہ اور اندلس کی حاکم رہی۔

(۳) مراکش کا مشہور خاندان جسنی موحدین کی بعد اپنی حکومت کی بنا ڈالی۔

(۳) خط فاسی زیادہ تر مدور ھی.

(٤) خط سودانی: یہ خط کسی قدر موٹا اور بھدا ھی. خط سودانی اشاعت اسلام کیوجہ سی بحر اطلانطك کی سواحل تك جہان لاگوس اسلام کا ایك نیا مرکز بن گیا ھی، پھیلا ھوا ھی.

ھم او پر لکھہ آئی ھین کہ ساتوین صدی ھجری عربی رسم الخط کا عہد انقلاب ھی. اسی زمانہ مین خط کوفی کا خاتمہ ھوا اور خط نسخ اپنی انتہائی نشو نما کو پہنچا. معلوم ھوتا ھی کہ خط تعلیق کو بھی اسی زمانی مین ترقی ھوئی، اگرچہ اسکی ابتدا بہت پہلی ھوگئی ھوگی.

خط تعلیق یقیناً پہلوی اثر سی ظہور مین آیا. اسپہبدان طبرستان[1] اور وھان کی عربی عمال کی قدیم سکی بھی جن کا زمانہ ۱٤۰ھ (۷۵۷) ھی اسی خط مین ملتی ھین. اس کی دو صدی بعد الفہرست کا مصنف پہلوی خط کی متعلق لکھتا ھی کہ اسمین گوشت کو بسرا لکھتی ھین، لیکن گوشت پڑھتی ھین، اسیطرح روٹی کو لھما یا لحما لکھتی ھین اور پڑھتی نان ھین. اس سی پتہ چلتا ھی کہ اس زمانی مین بھی علما پہلوی رسم الخط سی واقف تھی. اسکا مزید ثبوت مشہور بویھی سلطان عضدالدولہ کی کتبۂ اصطخر (۳٤٤ = ٦ ٥ — ۹ ٥ ٥) سی بھی ملتا ھی، جس مین بیان کیا گیا ھی کہ جب سلطان نی اصطخر کی آثار کو ملاحظہ کیا تو دو آدمی اسی پہلوی کتبہ کا ترجمہ سناتی جاتی تھی. صاحب الفہرست نی یہ بھی لکھا ھی کہ ایرانی رسم الخط ایك خاص قسم کی خط سی ماخوذ ھی جو قرآن مجید کی نسخون کی لئی استعمال ھوتا تھا اور قیراموز کہلاتا تھا. لیکن افسوس ھی کہ نہ ھم یہ جانتی ھین کہ قیراموز کی کیا معنی ھین اور نہ ھمین اس رسم الخط کا کوئی نمونہ ملا ھی. قدیم ترین ایرانی تحریر جسی مارگولیتھہ نی جرنل آف رائل ایشیاٹك سوسائٹی مین شایع کیا تھا (۱۹۰۲) ٤۰۱ ھجری (۱۱ — ۱۰۱۰) کی ایك تجارتی دستاویز ھی جس مین خط نستعلیق کی جھلك صاف نمایاں ھی.

---

(۱) طبرستان (نواح بحرۂ کیسپین) کی مجوسی حاکم جو عربون کی ماتحت تھی. اسپہبد ساسانی حکومت مین ایك فوجی عہدہ تھا.

ساتوین صدی هجری مین سب سی پہلی دواوین اشعار اور بعد مین ہر قسم کی علمی اور مذہبی کتابین خط تعلیق مین شائع ہونا شروع ہوئین، اور ایرانیون کی ذوق جمال کی بدولت اسی غیر معمولی ترقی ہوئی. لیکن افسوس ہی کہ اس قدیم عہد کی تحریرین اسقدر شاذ ہین کہ ہم اس عہد کی ایرانی خوش نوسی کی متعلق کوئی رائی قائم نہین کرسکتی. بایںہمہ اس زمانہ کا سب سی مشہور ایرانی خوش نویس نجم الدین ابوبکر محمد راوندی تھا جو چھٹی صدی ہجری کی آخری نصف مین کاشان کی قریب راوند مین پیدا ہوا. کہا جاتا ہی کہ یہ شخص سترہ قسم کی خط لکھہ سکتا تھا.

غالباً اسی عہد کی آخری ایام مین خط نستعلیق (نسخ و تعلیق) کا ظہور ہوا. خط نستعلیق اور خط تعلیق مین کوئی خاص فرق نہین، سوائی اس کی کہ علمائی فرنگ ابتدائی نستعلیق کو تعلیق کہتی ہین. البتہ ایرانیون کی نزدیک تعلیق وہ خط ہی جو توقیع (تحریر فرامین) کی لئی استعمال ہوتا تھا. اسی طرح سی قدیم نستعلیق کی ایک قسم کو جسکا استعمال عام تحریرون مین ہوتا تھا یہ لوگ تحریری کہتی ہین. خط نستعلیق کی ایک دوسری قسم جو عام تحریرون کیلئی استعمال ہوتی ہی خط شکستہ ہی. چونکہ اس خط کا پڑھنا نہایت دشوار ہی اس لئی کوشش ہورہی ہی کہ عام تحریرون کو بھی اسطرح لکھا جائی کہ انہین ہر شخص آسانی سی پڑہ سکی.

ایران سی عربی خط ایشیا کی مشرقی اور جنوبی مشرقی حصص مین پھیل گیا، جہان علما کی خیال مین اسلام کا مستقبل نہایت شاندار رہیگا.

اہل چین کو ابتدا ہی سی اسلام کا علم تھا. یہان اس سی بحث نہین کہ وہان اسلام دوسری صدی ہجری مین پھیلا یا چوتھی صدی ہجری کی وسط مین. کینٹن کی پرانی مسجد کا کتبہ جسکا زمانہ ۷۵۱ ہجری (۱۳۵۰) ہی کوئی بہت زیادہ صاف نہین. علاوہ ازین چینی مسلمانون کی تحریری دستاویزون کا بھی پتہ کچھہ نہین چلتا. چینی مسلمانون نی باوجود کثرت

تعداد کی اپنی ملت کی مذہبی زندگی کی لئی کوئی کام نہین کیا. لیکن حال مین اس قسم کی کوششوں کی ابتدا بھی ہو چکی ھی لیکن کتابت وطباعت کی لئی وہ جن طریقوں سی کام لی رھی ھین نہایت قدیم اور فرسودہ ھین.

مسلمانان ہندوستان ایرانی رسم الخط (نستعلیق) کا تتبع کرتی ھین.

مجمع الجزائر ملایا مین سب سی پہلی ایرانیون اور پھر عربوں کی بدولت اسلام کو فروغ ہوا. ابن بطوطہ کی زمانی مین (۱۲۵۰) جاوا، سماٹرا کی شافعی عربوں کی زیر حکومت تھا. اس سی ایك سو سال بعد جنوبی عربوں نی جاوا مین متعدد ریاستین قائم کین. جزائر ملایا مین عربی تحریر کی قدیم دستاویزین مفقود ھین، لیکن موجودہ رسم الخط کی دیکھنی سی معلوم ہوتا ھی کہ یہ ایرانی کی بجائی جنوبی عربی رسم الخط سی ماخوذ ھی.

مشرقی افریقہ مین بھی جنوبی عربوں کی بدولت اسلام پھیلا، لیکن ازمنۂ متوسطہ مین انہین بہت زیادہ کامیابی نہین ہوئی. البتہ نویں صدی ھجری کی آخر مین عربوں کا ایك دوسرا حملہ شروع ہوا اور پھر تیرھویں صدی مین نیگرو قبائل کی اتحاد کی وجہ سی مشرقی افریقہ کی تمام بڑی بڑی حصون مین اسلام پھیل گیا. عربی رسم الخط یوگانڈا اور کانگو مین پہنچ چکا تھا کہ دول یورپ کی مداخلت شروع ہوئی، اور اسکی ترقی رك گئی.

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ھی کہ قدیم جنوبی عربی رسم الخط (جس مین بہت کم حروف ملائی جاتی ھین اور جو قدیم ترین سامی رسم الخط سی یا تو فلسطینی اثر سی ۱۰۰۰ ق، م کی بعد یا جنوبی الجزیرہ کی بدولت اس سی قبل ظہور مین آیا) کب ناپید ہوا. غالباً جنوبی عربی تہذیب کی خاتمہ کی بعد اسکا رواج بھی قائم نہ رہا، لیکن باوجود عدم استعمال کی اس کی جاننی والی ضرور موجود تھی؛ اسی لئی ابن خلکان وغیرہ کی یہ بیانات کہ ظہور اسلام کی زمانہ مین یمن مین کوئی شخص لکھنا پڑھنا نہین جانتا تھا بالکل غلط ھین. البتہ یہ ضرور ھی کہ اسلام کی اشاعت کی ساتھہ جنوب مین بھی عربی رسم الخط جاری ہوگیا.

قدیم زمانی مین جنوبی عرب سب سی پہلی تجارتی اور پھر سیاسی وجوہ کی

بنا پر جنوبی شام مین آباد ہوئی. العلا کی قریب سبائی کتبی دستیاب ہوئی ہین اور ممکن ہی کہ ارض مدین، فلسطین کی جنوبی حدود، اور دریائی یردان کی مشرق مین مزید کتبی دستیاب ہون.

ان یادگاروں کی علاوہ شمالی عرب مین بھی مختلف زمانوں کی جنوبی عربی کتبی ملی ہین جن میں سی سب سی زیادہ قدیم لحیانی کتبی ہین. انکا اکتشاف زیادہ تر العلا کی ضلع مین ہوا ہی یہ کتبی قدیم سامی اور سبائی طرز تحریر کی درمیانی کڑی ہین.

لحیانی کتبوں کی بعد ان کتبوں کا زمانہ آتا ہی جنکو ابتدائی عربی یا ثمودی کتبات کہا گیا ہی. یہ کتبی سب سی پہلی العلی اور پھر شمال مین دستیاب ہوئی. ان مین سی کچھہ مدین اور کچھہ تبوک کی شمال مغرب مین بھی ملی ہین.

جنوبی عربی خط کا آخری نمونہ ان کتبات سی ملتا ہی جو دمشق سی جنوب مشرق مین ۱۰۰ میل کی فاصلہ پر صفا کی آتش فشانی علاقہ مین ملی ہین. غالباً انکا زمانہ پہلی صدی عیسوی سی دوسری صدی عیسوی تک ہی. یہ کہنا مشکل ہی کہ اس طرز تحریر کا خاتمہ کب ہوا، پھر کیف یہ امر بہات ہی اہم ہی کہ ۳۲۸ع کا کتبہ نیمارہ، خط صفائی کی بجائی نبطی حروف مین لکھا گیا ہی.

جنوبی عربی قبائل کی ہجرت کی بدولت جنوبی عربی خط حبش مین پہنچا اور سب سی پہلی اس کا رواج اکسوم میں ہوا، جو اسوقت حبش کا دارالسلطنت تھا. تھوڑی ہی دنوں مین یہاں عربی اور افریقی قبائل کی اختلاط سی اثوبی اقوام کا ظہور ہوا، جنکی زبان سامی کی ایک شاخ تھی. لیکن عیسائیت کی فروغ کی بعد یہان بہت جلد یونانی اثر کی بدولت ایک انقلاب پیدا ہوا. نہ صرف حروف کی شکل تبدیل ہوگئی بلکہ تحریر کی ابتدا بھی دائین کی بجائی بائین طرف سی ہونی لگی.

نوین اور دسوین صدی عیسوی کی دوران مین اس اثوبی زبان کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ موجودہ حبشی زبان نی لی. موجودہ حبشی رسم لخط کی سب سی آخری شاخ ہی. تین ہزار برس کی بعد اسکی حروف آج بھی ایک دوسری سی جدا رکھی جاتی ہین.

غزل

جانشیں میر و غالب حضرت ثاقب، لکھنوی، مد ظلہ العالی

جھکایا سامنی آھوں کی سر ہر شمع محفل نی
زمانی بھر مین سناٹا سا پیدا کر دیا دل نی

نظر روئی حقیقت پر نہ ڈالی پھر کبھی دل نی
عجب جلوہ دکھایا دھر کی اس نقش باطل نی

مرا دل ھی فقط نقش تصور کا نہیں مجرم
تری تصویر کھینچی آسمان پر ماہ کامل نی

وھی دل قیس کا جس مین نہ ایک دنیا سمائی تھی
اسی ساغر کو اکدن بھر دیا لیلی کی محمل نی

جہان کی مرنیوالوں سی مرا ماتم ہوا پہلی
کسی مقتول کو دیکھا نہ تھا آنکھوں سی قاتل نی

یہ مرگ ناگہانی جو مجھی آئی عجب شی تھی
زمانی کو رلایا عمر لاحاصل کی حاصل نی

ندا دیتی تھی باھم راستی حسن محبت کی
بغیر آنکھوں کی پہچانا یونہی منزل کو منزل نی

کبھی اوٹھا کبھی بیٹھا امید و یاس کی ہاتھوں
بڑی مشکل سی نام عشق کو اونچا کیا دل نی

مین اس ایذا رسانی پر بھی ممنون عنایت ہون
بباھا ساتھه برسوں قید زندان مین سلا سل نی

ہنسی جو درد سی واقف نه تھی لیکن یه روبا کی
ہم ایسوں سی بہت ہمدردیاں کین شمع محفل نی

بہت خوش ہون که اتناك سجده گاه اہل الفت ہی
وه موقع جس جگه میری قدم چومی تھی منزل نی

وفا کی جنس بٹتی ہی جہاں کی ہاتھه پھیلی ہین
وہی تقسیم ہوتا ہی جو چھوڑا تھا میری دل نی

خدا ہی ہی جو پہنچون کعبهٔ مقصود تك ثاقب
قیامت کی برابر پاؤں پھیلائی ہین منزل نی

پتھر

غلام احمد، ایك کھاتا پیتا، نوجوان آدمی، اپنی کمرہ مین پلنگ پر لیٹا چھت کی طرف ٹکٹکی لگائی دیکھہ رہا تھا، اور سوچ مین پڑا تھا.
« مین ھمیشہ پلنگ پر لیٹا کسی سوچ مین پڑا رھتا ھون» اوسنی اپنی آپ سی کہا، «اور کبھی کچھہ نہین کرتا. لیکن مین کرون کیا؟ مجھی ایك نیا مکان تلاش کرنا ھی، یہ تو سچ ھی، لیکن نیا مکان آخر کوئی کہاں ڈھونڈھنا پھری؟ اور اگر مجھی مکان مین سب سی ذلیل کمرہ نہ ملا ھوتا» اوسنی جھلاکر کہا، جب ایك گاڑی پاس سی گذری اور منوں گرد و غبار اوس کی کمری مین جھونك گئی، «تو شاید مجھی یہ تکلیف نہ اٹھانی ھوتی.» اوس کی دماغ مین یہ خیال اوسوقت نہ آیا کہ کمرہ اور کسی کام کی لئی موزون نہین تھا. اوسکا دروازہ سڑك پر کھلتا تھا، اس لئی وہ اوس کی بیوی کی لئی مناسب نہین تھا، اور وہ اتنا بڑا تھا کہ اوسی باورچی خانہ بنانا یا نوکرون کو دیدینا بھی ناممکن تھا.

دوپہر کا وقت تھا، گرمی بہت شدت کی تھی اور دم گھٹ رھا تھا، اس لئی غلام احمد اپنی غصہ کو نہ روك سکا. وہ اوس گرمی پر خفا ھوگیا جو اسی لیٹی لیٹی بھی پسینہ سی بھگو رھی تھی؛ چھت پر، کہ وہ کافی سفید نہین تھی، اون کتابوں پر جو ایك کونی مین پڑی تھین اور جن پر اتنی گرد جم گئی تھی کہ وہ کوڑی کرکٹ کا ڈھیر معلوم ھورھی تھین. اور جب اوسنی نوکر کا خیال کیا جو اتنا سست تھا کہ اوسکا کمرہ سال مین ایك مرتبہ بھی نہین صاف کرتا تھا، اور اپنی بیوی کا جو گھر مین کسی قسم کا انتظام نہین کر سکتی تھی اور جس کی کپڑوں سی پسینہ کی بہت تیز بدبو آتی تھی؛ تو اوسکا غصہ سی بدن کانپنی لگا اور وہ چلا اوٹھا:

« یا خدا، اگر یہی گرمی اور یہی نوکر اور یہی بیوی رہی تو مین پاگل ہو جاؤنگا! »

وہ پلنگ پر اوٹھہ کر بیٹھہ گیا، اس امید مین کہ شاید سے ہی سی کچھہ آرام ملی کچھہ دیر تك وہ زمین کی طرف گھورتا رہا اور اوسکی سمجھہ مین نہین آیا کہ کیا کرنا چاھئی پھر اوس نی آنکھہ اٹھائی، اس طرح سی کہ گویا کوئی اوسی مجبور کر رھا ھی، اور اوسنی وہ کتابین دیکھین جن پر مٹی برسون سی جمی ہوئی تھی، وہ میز جس پر اوسنی بیٹھنا چھوڑدیا تھا اور جس پر اب پرانی اخبار، کتابون کی پھٹی ورق، خالی دوات، نی نب کی قلم، کھی تھی، اور پھر اپنی پلنگ اور اپنی اوپر نظر ڈالی. ھر چیز پر مٹی جمی ہوئی تھی، اور ھر چیز معلوم ہوتا تھا صرف اوسی غصہ دلانی کی لئی کمرہ مین آ گئی ھی.

اس کی آنکھون مین آنسو بھر آئی. اور اسنی عاجز آ کر پھر اپنی آپ سی پوچھا: «یہ سب چیزین آخر کیون میری سامنی آ کر کھڑی ہوگئی ہین اور مجھی غصہ دلا رہی ھین» مین نی آخر کیا جرم کیا ھی؟» اور اسی فکر مین اس کا سر جھك گیا. «شاید اس کی وجہ یہ ھی» اوسی ایکبارگی خیال آیا، «کہ مین بالکل کچھہ نہین کرتاھون. چار پانچ دن سی مین پلنگ پر پڑا ھون، میری پسینہ نکلنا رھتا ھی، اور مین اپنی نکمی پن پر غور کرتا رھتا ھون ---- اگر مین کسی کام مین مشغول ھوتا، تو مجھی اپنی کمرہ اور مکان کی کوئی فکر نہ ھوتی. مین خاموش اور متین اور خوش مزاج ھوتا: مگر سچ تو یہ ھی کہ مین ایك بیکار نکما، کاھل، نالائق، بزدل، بیوقوف آدمی ھون! اگر مین اپنی نوکر پر سختی کرتا تو اوس کی کیا مجال تھی کہ کوئی چیز صاف ستھری نہ ھوتی، اگر مین ٹھیك وقت پر اوسی ھر کام کیلئی حکم دیتا ---- لیکن کبھی مین شرما جاتاھون، کبھی کاھلی سوار ھوتی ھی، ھر کام کو ٹالتا رھتا ھون. اگر مین اپنی بیوی سی کہتا کہ صاف ستھری رھی تو وہ ضرور میرا کہنا مانتی. مگر مین اوس سی کہتا ھی نہین. ھمیشہ انتظار مین

رهتاهون، سمجهتا هون که سب کچهه آپ هی آپ سی هوجائیگا ، اور پهر خفا بهی هوتا هون - - - - - مین بهی کیسا احمق هون! » اور اوسنی اپنا سر تکیه پردی مارا.

کچهه دیر تك وه پلنگ پر ویسی هی پڑا رها ، لیکن اوسی سوچ مین مبتلا هونیکا اچها موقع ملاتها. اوسنی آنکهین بند کرلین، اور اپنی نکمی پن پر غور کرنی لگا. شادی کی بعد جو دو سال گذری تهی، جنهین اوس نی پوری طرح سی ضایع کیا تها، اوسی سب سی پهلی یاد آئی. ان دو سالون مین وه اپنی بیوی سی بالکل تنگ آ گیا تها، اگرچه پهلی وه اوسی بهت پسند تهی؛ اوس نی دنیا سی قطع تعلق کرلیا تها، اور دنیا نی اوس سی؛ اور زندگی مین اوس کی لئی کوئی دلچسپی باقی نهین رهی تهی. پهر اوسی وه دن یاد آئی جب اوس مین جوانی کا جوش باقی تها ، اور زندگی اوس کی لئی بی معنی اور بی لطف دنون اور راتون کا ایك سلسله نهین بن گئی تهی. اوس زمانی مین وه کهیل کود مین شریك هوا کرتا تها اور اپنی کالج کی طرف سی کئی مرتبه هاکی کی ٹورنمنٹ مین بهی کهیلا تها . اوس زمانه مین وه عاشق بهی هوگیا تها. لڑکی خوبصورت اور سلیقه کی تهی، اور اوسی غلام احمد سی امدین بهی بهت تهین. لیکن وه ایکبارگی اوسی چهوڑ چهاڑ کر چلا گیا، اور صرف تهوڑی سی جائداد کی لالچ اور اپنی باپ کی ڈر سی اپنی موجوده بیوی سی شادی کرنی پرراضی هوگیا. مگر وه اس سی نه انکار کرسکتا تها اور نه اسی بهول سکتا تها که اوسنی عشق کی حوصلون کو طبیعت کی کمزوری کی وجه سی چهوڑا تها ، اور اس مین اتنی جرأت نه تهی که اپنی آزادی اور اصل خوشی لڑ کر حاصل کری. اپنی واسطی جو زندگی اوس نی پسند کی تهی وه صرف ایك چهوٹی، کمینی طبیعت کو بهاسکتی تهی.
« هاں مین کمزور هون ، بزدلا هون ، ورنه ابتك ضرور کچهه کردکهاتا. میری بیوی سمجهدار، صاف ستهری هوتی. بجائی اس کٹهل دماغ کی عورت کی جو جانورن کی طرح جدهر هانکی گئی اودهر چلتی هی،

خود بیوقوف هی اور دوسری کو بهی بیوقوف بنادیتی هی. هائی مین کیا نهین کرسکتا تها!»

ایك دل آویز خواب کی مانند اوس کی سامنی ایك محل کی تصویر کهنچ گئی. چاروں طرف شام کا اندهیرا چهایا هوا تها، لیکن محل کی در و دیوار سی ایك ایسی گهری، سچی مسرت نکل رهی تهین که اوسی مایوسی کی هوا تك نهین لگ سکتی تهی ـ ـ ـ ـ ـ اور اوس محل مین ایك میاں بیوی رهتی تهی جن کی عمر دوسروں کی خدمت مین گذر رهی تهی اور جو اپنی بهلائی دوسرون کی خوشی مین پاتی تهی. اوس مکان کی روح روان، اوسی یقین تها، وهی لڑکی هی جس سی اوسی محبت تهی اور جس کی ساتهه اوس نی بیوفائی کی. «وه مجهی هرطرح سی آدمی بنا دیتی، میری طبیعت کو مضبوط کردیتی. لیکن مجهه مین اتنی صلاحیت بهی هی، مجهه جیسی بزدلی کو بهلا کوئی بهادر بنا سکتا هی» ـ ـ ـ ـ مگر اوس زندگی کی تصویر نی جو اوس کی لئی ممکن تهی اوس کی موجوده حالت کو اور نا قابل برداشت کردیا. یه احساس که وه اب ایك بالکل بیفائده، بیمعنی، بی لطف زندگی بسر کر رها هی اوس کی دل مین کانٹی کی طرح چبهی لگا.

اوسنی اپنی آپ کو بهت یقین دلانی کی کوشش کی که اب اوس کی لئی کوئی امید باقی نهین، مگر اوسکی ابتدائی جوانی اور عشق کی یادگاروں نی، باوجود اوس مایوسی کی جو وه اپنی ساتهه لائین، اوسکی تصور مین حوصله پیدا کردیا. ان یادگاروں مین لپٹا هوا ایك اور واقعه اوسی یاد آجاتا تها، جب اوس لڑکی نی جس سی اوسی محبت هوگئی تهی اوس کی حکمت عملی اور همت کی داد دی تهی، اور اوس وقت اوسکا چهره خلوص اور دلی خوشی سی روشن تها. کالج کی سٹاف اور طالب علموں مین کچهه جهگڑا هوگیا تها، غلام احمد کی کوششون سی معامله صاف هوگیا. غلام احمد کو اپنی حرکت پر همیشه تعجب هوتا رها، اور یه اوسکی سمجهه مین کبهی نه آیا که اوسی ایسی معامله مین دخل دینی کی جرأت کیسی هوئی.

لیکن اوس پوری طرح سی کامیابی ہوئی تھی اور وہ در اصل اُس تعریف کا مستحق تھا. غالباً وہ دوسری واقعات کی ساتھہ اُسی بھی بھول جاتا ، لیکن لڑکی تعریف کرنی وقت مسکرائی تھی ، اور یہ مسکراھت اوس کی دل پر ایك نقش بن گئی تھی جو اوسکی مٹائی نہ مٹ سکا. اگر وہ اپنی اوپر لعنت ملامت کرتا ہوتا ، تو اوس مسکراھٹ کی یادگار اوس کی طبیعت نرم کردیتی؛ رنج اور مایوسی کی دنوں وہ ایك ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر اوسی تروتازہ کردیتی.

کبھی کبھی ، جیسی اسوقت ، وہ امید کا پیغام لاتی تھی. غلام احمد کا پسینہ سوکھنی لگا ، اعضا حرکت پر رضامند ہوگئی ، رگوں مین خون دوڑنی لگا ، اور اوسی یقین سا ہونی لگا کہ وہ اتنا کمزور اور بزدلا نہین جتنا کہ وہ سمجھتا ھی ، اور ابھی اوس کی سدھرنی کی اُمید ھی. اوس نی دنیا مین بہت کچھہ کھو دیا تھا ، لیکن اسکی وجہ سی سب کچھہ کھو بیٹھنا لازم نہین ہوگیا تھا. وہ اوسی گھر مین اور اونھین لوگوں مین پھر زندہ ہوسکتا تھا ، یہ بھی نا ممکن نہین تھا کہ وہ اپنی ساتھہ دوسروں مین بھی روح پھونك دی - - - - اوسکا دل نئی جوش سی دھڑکنی لگا ، ھاتھہ پاؤں کانپنی لگی ، جب اوسنی یہ عہد کیا کہ اب ہمیشہ سختی سی اپنی ارادہ پر قائم رہی گا ، اپنی نوکر کو نکال دی گا اگر اوسنی پھر کبھی کسی قسم کی بی تمیزی یا کاھلی کی ، اپنی بیوی کو مجبور کری گا کہ گھر کا انتظام ٹھیك طرح سی کری ، اور کپڑی صاف رکھی ، وہ خود محنت مشقت کری گا ، اور دوسروں کی لئی نمونہ بنی گا - - - یہ عہد کر کی اوسنی ایك ٹھنڈی سانس بھری ، آنکھین مل کر ادھر اودھر اس اطمینان اور خوشی سی دیکھنی لگا کہ گویا اوسکا کمرہ صاف ھی ، اوس کی بیوی شائستہ ، وہ خود محنتی ، چست اور دوسروں کا رھنما اور خادم. اور وہ پھر پلنگ پر لیٹ گیا. دل آرزو کی موجوں سی پھٹا جاتا تھا ، اور وہ اس انتظار مین بیتاب تھا کہ اپنی ارادہ کا امتحان لی ، دوسرون کو اپنی عمل کی ذریعہ سی ایك بہتر زندگی کا پیام دی ، اور جلد سی جلد اس انقلاب کی خبر دنیا تك پہنچائی.

. اسی نہین معلوم تھا کہ وہ کتنی دیر سویا ھی لیکن یہ وہ بغیر آنکھہ کہولی بتا سکتا تھا کہ شام ہوگئی ھی. ھوا نرم تھی اور کسی قدر ٹھنڈی، زمین اب آسمان سی ترحم کی درخواست نہین کر رھی تھی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اطمینان سی بیٹھہ کر بجھی ہوئی دل سی غور و فکر کر رھی ھی اور اپنی بچون سی بھی یہی چاھتی ھی. علاوہ اس کی اوسنی بچون کو اپنی دروازی کی قریب ٹہلتی اور ھنستی سنا. یہ بھی شام ھونی کی دلیل تھی

جب وہ رفتہ رفتہ پوری طرح بیدار ھوگیا تو اسی اپنا ارادہ یاد آیا، لیکن اوسی اس سی تسکین یا تازگی نہین حاصل ھوئی. وہ اب اوسکی دل پر ایک بھاری بوجھہ کی طرح دھرا ھوا تھا اور اوس سی نجات ملنی کی طرف سی بالکل مایوسی تھی. وہ یہ محسوس کر رھا تھا کہ اس ارادی کا پورا کرنا اوس پر فرض ھی لیکن اوسی یقین ھوگیا کہ وہ ایسا نہین کرنی پائیگا. « مین نی کیون بیٹھی بٹھائی یہ ارادہ کرلیا، کیون اپنی سر یہ نئی مصیبت لی لی؟ کیا میرا ضمیر مجھی پہلی ھی سی کافی ملامت نہین کر رھا ھی؟ اب مجھی ھر لحظہ یہ خیال رھیگا کہ مین نی ایک بات کا ارادہ کرلیا ھی اور اس پر قائم رھنا ضروری ھی، ھمیشہ ھر جگہ مین یہی سوچا کرونگا اور دل ھی دل مین شرمایا کرونگا. جو تھوڑا بہت اطمینان قلب مجھی حاصل تھا وہ بھی اب گیا. اب جب کبھی مجھی نیند کی خواھش ھوگی تو مین محسوس کرونگا کہ مجھی جاگتی رھنا چاھئی، جاگتا رھونگا تو یہ خیال ھوگا کہ کچھہ کرون، کچھہ کرونگا تو یہ فکر ھوگی کہ ناکافی ھی ـ ـ ـ اور آخر مین کرون تو کیا کرون؟ اگر مین اپنی بیوی سی کہون کہ صاف رھا کرو تو وہ مسکرادیگی اور کہیگی « اب مین ایسی میلی بھی نہین ھون. » یا وہ نی نہائی دھوئی کپڑی بدل لیگی اور مجھی اسی پر قانع ھونا پڑیگا. لیکن مین نوکر کو کیا کرون؟ اگر اسی نکال دون تو کوئی دوسرا آئیگا جو اتنا ھی کاھل ھوگا بلکہ ممکن ھی کہ اور اوپر سی چور بھی ھو. اور یہ کمبخت

اتنا زبان دراز هی که مین اسکی کاهلی یا کوئی قصور ثابت هی نهین کرسکتا - - - پهر یه که مین اپنی لئی کام کونسا نکالون؟ یونیورسٹی مین دوبارہ داخل هونا تو فضول هی، کیونکه میری عمر بهت هوگئی هی - - - نوکری بهی نهین مل سکتی کیونکه میری پاس کوئی ڈگری نهین. صرف ایك صورت هی، که سیاسی کام شروع کردون. لیکن نه میری پاس روپیه هی، نه اتنا اثر هی. تقریر بهی نهین کر سکتا. پهر وهاں کیا بنا لون گا. لوگ یه سمجهین گی که مین روپیه کمانا یا سطحی شهرت حاصل کرنا چاهتا هون - - - - اراده کرنی کو تو کر لیا، لیکن کوئی کام بهی هو؟»

وہ کلبی فلسفیون کی انداز سی اپنی حالت اور اپنی ارادی پر مسکرایا اور اس سی اسی ایك گونه اطمینان هوا گو وه اپنی دل مین سمجهتا تها که ان دلیلونسی اسی اپنی ارادی سی همیشه کی لئی چهٹکارا نهین ملاهی اور اسکا ضمیر اسی یه اراده یاد دلا کر شرمنده کیا کری گا. لیکن یه وقت اوسی دور معلوم هوتا تها. اس نی لمبی سانس لی اور ایك کروٹ هوکی لیٹ گیا که پهر اونکهه جائی.

نیند کا انتظار کرتی هوئی وه بچون کا اودهم، هنسی اور کالی گلوچ سننی لگا. اوسی معلوم هوگیا که وه کونسی کهیل کهیل رهی تهی، کیا کیا غلطیاں کر رهی تهی، اور اوس نی کوشش کی که کهیل کی رفتار پر غور کرتا رهی. لیکن دفعة سارا اودهم موقوف هوگیا، اور ایسا معلوم هوا که سب بچی گونگی هوگئی. - - - اسنی اپنی نوکر کی بهاری موٹی آواز سنی جو بچون کو گالی دی رها تها اور نکال رها تها. پهر اسنی ایك بچی کی رونی کی آواز سنی اور اپنی نوکر کو گلا پهاڑ کر چلاتی هوئی، جس سی وه آواز دب گئی.

غلام احمد کو بهت غصه آیا. اوسی یوں بهی پسند نه تها که اوسکا نوکر بچوں پرخواه مخواه سختی کری. اور یه تو وه کسی طرح گوارا نهین کرسکتا تها که وه ان مین سی کسی کو مار بیٹهی. وه جانتا تها که اس کمبخت کو جب موقعه ملتا هی تو، سختی اور ظلم سی نهین چوکتا، اور اوسی اس کی ان حرکتوں سی نفرت تهی. اس لئی اسنی قصد کرلیا که

اٹھ کر اسی خوب ڈانٹ کا اور لعنت ملامت کی ایسی بوچھاڑ کری کا کہ نفرت و حقارت کا سارا بخار جو اوس کی دل مین تھا نکل جائی. اوسنی اپنی دل مین کہا: «اسکی یہ حرکت پہلی بار نہین هی بلکہ همیشہ یہی کرتا هی.» اسی یکایک یہ خیال آیا کہ یہ کمبخت همیشہ خود اوس سی اور اسکی بیوی سی بھی بد تمیزی سی پیش آتا هی اور کبھی سیدھی منہ بات نہین کرتا. غلام احمد نی بلند آواز سی کہا «کبھی نہ کبھی تو اس سی سمجھنا هی. آج هی کیون نہ فیصلہ هو جائی.» وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا، اور اپنی نوکر کی آنیکا انتظار کرنی لگا.

لیکن نوکر نہین آیا. وہ اپنی مرضی سی کہین اور چلا گیا غلام احمد اس پر برس پڑنی کو آمادہ بیٹھا تھا کہ اسی اپنی ارادی کا خیال آیا تقدیر نی اسی یہ موقع دیا تھا. «یہی اسی پورا کرنیکا وقت هی، نوکرسی بسم‌الله کرون پھر اپنی بیوی کی خبر لون، پھر اپنی، پھر ساری دنیا کی. بس یہی وقت هی.» اس نی اپنی دانت اور منھیان بھینچ لین اور ابرو پر بل ڈال لیا. لیکن اس سی وہ گبھراهٹ دور نہ هوسکی جو اس پر غالب آرهی تھی اور جس نی اسی شك اور پس و پیش مین ڈال دیا تھا. وہ ڈانٹنی ڈپٹنی کو تیار بیٹھا تھا اور دل کڑا کر کی ایسا کربھی گذرتا. لیکن اصولا یہ کرنا، اسی ایك مستقل دستورالعمل، همیشہ کی لئی بنانا - - - اسی نی اسکی همت پست کردی. اور وہ پھر شك اور مایوسی کا شکار هوکر بستر پر گر پڑا.

عین اسی وقت، گویا واقعات نی غلام احمد کو پیس ڈالنی کی سازش کرلی تھی، یہ سنائی دیا کہ اسکا نوکر کھٹ پھٹ کرتا لمبی نپی تلی قدم رکھتا چلا آرها هی. اور ذرا دیر کی بعد وہ اس کی سامنی کھڑا تھا - - - ایك لمبا بھاری بھرکم آدمی جس کی چھری سی بد تمیزی ٹپکتی تھی اور جس کی لبون پر طنز آمیز مسکراهٹ تھی جسی وہ کبھی دبانی یا چھپانی کی کوشش نہین کرتا تھا.

غلام احمد نی انتہائی کوشش سی کہ اس کی آواز سی اعصابی کمزوری نہ ظاهر هو کہا «تم کہان تھی؟»

اس کی نوکرنی سوال کو دوهرایا «مین کہان تھا»؟ اور غلام احمد کو یہ

محسوس ہوا کہ اسکی ہونٹوں پر معمولا جو مسکراہٹ رہتی تھی وہ پھیل کر زہر خند بن گئی۔

« ہاں ! ہاں ! تم یہین تھی. مین سن رہا تھا کہ تم نی ایک بچی کو مارا. بتاؤ تمنی اسی کیوں مارا ؟ »

«کیوں مارا ؟ مارتا نہین تو کرتا کیا ؟ اگر ان لونڈوں کو نہ مارون تو کل کو گھر مین گھس کر کھیلین گی اور مجھی ان کی چیخم دھاڑ اچھی نہین لگتی - - - - » نوکر جواب دی رہا اور آخر مین اوس کی آواز نی ملامت کا لہجہ اختیار کیا.

غلام احمد نی کمزور آواز مین کہا : « بھلا اتنی سی بات پر کوئی بچی کو مارتا ہی ؟ » اوسی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پلنگ ٹوٹ جائیگا اور وہ نیچی گر پڑیگا.

« مارون نہین تو کام کیسی چلی. گالی سی تو مانتی نہین. سنتی سنتی عادت ہوگئی ہی. ہر کوئی اونہین گالیاں دیتا ہی. مجھی مارنا ہی پڑتا ہی کم سی کم ایک لونڈا - - »

غلام احمد نی سنا تھا کہ وہ لڑکا دوسروں کی بھاگ جانی کی بعد دیر تک روتا رہا. غالباً وہ سب سی چھوٹا تھا، اسی لئی اسی سزا ملی. بہرحال اسی یقین تھا کہ صرف ڈانٹنی سی لڑکی بھاگ جاتی اور نوکر کا اس لڑکی کو مارنا محض ظلم تھا. مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس کمبخت کو دلیل سی قائل نہین کرسکتا اور اس کی اصلاح نہین کرسکتا. پس اس نی اس ذکر کو چھوڑ دیا جس سی اس کی نوکر نی نتیجہ نکالا کہ وہ ہار مان گیا.

غلام احمد نی حتی‌الامکان رعب سی کہا : « اب تم کہان جارہی ہو. »

« بیوی مجھی شہر بھیج رہی ہین. »

«اچھا جاؤ. » غلام احمد نی کروٹ لیلی تا کہ نوکر اسکا چہرہ نہ دیکھہ سکی اور احطیاط کی غرض سی اسی اپنی بازو سی چھپا لیا. نوکر حقارت سی مسکرا کر چل دیا.

غلام احمد نی نوکر کی جانی کی آواز سنی تو اسی کسیقدر اطمینان ہوا. اپنی

ناکامیابی سی اسی مایوسی نہین ہوئی کیونکہ اسنی خود اسکی پیشین گوئی کی تھی۔
لیکن اس کی اضطرابی حالت باقی رہی اور اس کی ساتھہ گہری اندورنی بی چینی۔
اس کی دل سی ایك بوجھہ ہٹ گیا (نو کرسی گفتگو کرنی کی بعد اسکا ارادہ کافور
ہوگیا تھا) لیکن اسکی سیرت پر ایسا دھبہ لگا تھا جسکا مٹنا ناممکن تھا۔ اسی
ایك دھندلا سا احساس تھا کہ کی موجودہ ناکامیابی کی نتائج گہری اور دیر پا
ہونگی اور اگر آگی چل کر اس نی اور اس کی امیدوں نی سر اوٹھایا تو اس
کوشش کی یاد اسی مغلوب کردیگی اور پچھاڑ دیگی۔ گویا اس نی خود داری
اور رفاہ عام کی سیڑھی پر چڑھنی کی کوشش کی لیکن گر پڑا اور اسکی ٹانگ
ٹوٹ گئی۔ اب پھر ایسی کوشش کا کوئی امکان نہین تھا۔ لیکن خدا جانی
کیا بات تھی کہ غلام احمد کو اس خیال سی ایك طرح کا اطمینان تھا۔ اب
آگی چل کر نہ کوئی امید ہوگی نہ کوشش نہ ناکامیابی کی ذلت۔ اگرچہ وہ
اپنی بزدلی کو قابل حقارت سمجھتا تھا تاہم اسکی خیال سی اوسی ایك قسم کی
خوشی ہوتی تھی۔ پرانی افیونی کی طرح وہ جان بوجھہ کر نشی کی گھونٹ چڑھاتا تھا۔
وہ جانتا تھا کہ اسکا کیا نتیجہ ہوگا، اسی اعتراف تھا کہ اس سی بہتر زندگی
ممکن ہی؛ لیکن پھر ایك چسکی لیلیتا، تاکہ اپنی آپ کو یقین دلا دی کہ بہتر
زندگی اس کی قسمت مین نہ تھی

پس وہ بی حس و حرکت پلنگ پر پڑا تھا۔ نیند اب کافور ہوچکی تھی
اور اطمینان قلب بھی۔ کچھہ دیر تك اوس کی خیالات اور تصورات اور جذبات
بی روك ٹوك امنڈتی رہی اور وہ بی پروائی سی ان کی حرکت کا مشاہدہ کرتا رہا۔
وہ جانتا تھا کہ اگر مین چپ چاپ رہون تو یہ طوفان خود بہ خود بیٹھہ جائیگا؛
اور ایسا ہی ہوا۔ جب کچھہ دیر کی بعد اس کی بیوی نی دروازہ کھولا تو اسکا
اطمینان قلب لوٹ آیا تھا، اسکا اضطراب جاتا رہا تھا اور اسکی وہی حالت تھی
جو ہمیشہ رہتی تھی۔

اسکی بیوی نی چپکی سی کہا «مین نوکر سی میوہ منگانا بھول گئی ذرا چلی
جاتی اور لی آتی۔» اسنی کچھہ جواب نہین دیا۔ اسنی اپنی بیوی کی بات سنی لیکن وہ
اسپر غور کررہا تھا کہ اسکا دل اسوقت ایك تاریك خالی فضا کی طرح تھا جس مین

گذری ہوئی باتوں کی یاد بلکہ خیالات بھی تصویروں کی شکل میں نظر آتی تھی.

اسکی بیوی نی پوچھا :

« تم نی سنا ؟ »

« ہان »

« پھر چلی جاؤ نہین تو دوکانین بند ہوجائینگی . »

« اچھا . »

اسکی بیوی چلی گئی . اسکا دماغ اب بھی ایك تاریك خالی فضا تھا اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ اس مین خیالات کو آتی ہوئی دیکھی، لیکن اسی دیر تك انتظار کرنا پڑا اور اسکی آنکھہ لگ گئی .

ایك گھنٹہ کی بعد وہ چونك کر اوٹھا . اندھیرا ہوچکا تھا ، کیا دکانین بند ہوگئی ہونگی ؟ اسکی پاس کوئی گھڑی نہین تھی (حالانکہ اوس کی نوکر کی پاس دو تھین) اسلئی اسی نہین معلوم ہوسکا کہ کیا بجا ہی . اسنی اپنی آپ کو یہ یقین دلانا چاہا کہ اب دیر ہوگئی ہی ، لیکن جیسا کہ کمزور اعصاب والوں کا قاعدہ ہی، اوسکی پس و پیش نی دو حریفوں کی نزاع کی صورت اختیار کرلی جن کی بیچ مین اسکا ارادہ معطل ہو کر رہ گیا . ان حریفوں مین سی ایك نی کہا « بہت دیر ہوگئی ہی . » دوسری نی کہا « پھر بھی کوشش تو کرنا چاہئی .» پہلی نی پوچھا « اس سی کیا فائدہ ؟ » دوسری نی جواب دیا « اگر دوکانین بند بھی ہوگئی ہین تو سیر ہی ہو جائیگی. اس سی ہمیشہ فائدہ ہوتا ہی . علاوہ اسکی سارا دن لیٹی لیٹی گذرا ہی . » پہلی نی اصرار کیا « نہین جی ، فضول بات ہی . اسوقت جانی کی کیا معنی ہین ؟ میلی گلیوں مین سی گذرنا جن مین دھواں بھرا ہی ، ایسی لوگون سی ملنا جن سی کوئی دلچسپی نہین ، مجبوری ہنسنا بولنا ، جب کہ دل خاموشی چاہتا ہی ، وہی بیکار بیٹھنا ، گپ شپ ، ہنسی مذاق ، جس مین نری زحمت ہی ، کچھہ فائدہ نہین . » دوسرا حریف خفا ہو کر چپ ہو گیا اور غلام احمد بدستور بی حس و حرکت لیٹا رہا اور اسکا دل اب تك ایك تاریك خالی فضا تھا .

جب اسکی بیوی نی زور سی دروازہ کھولا تو اسکی دل کو ایك دھچکا

سا لگا . اسی اپنی شوہر کی انداز سی سمجھہ لیا کہ اسی اسکی فرمائش پوری نہین کی ہی، اور وہ اسی برا بھلا کہنی لگی ۔ ۔ ۔ لیکن غلام احمد نی ایك لفظ بھی نہین کہا اور بی خبری مین اسکی ہونٹون کو ہلتی ہوئی دیکھتا رہا . بیوی نی آخر مین کہا کہ کھانا تیار ہی اس سی درخواست کی کہ جلد آئی اور چلی گئی . اب بھی غلام احمد نی حرکت نہین کی، گویا کسی چیز نی اسی بستر سی جکڑ دیا تھا. اسی یہ محسوس ہورہا تھا کہ اسکی زندگی کا اٹل قانون ہی کہ وہ دن رات بی حس و حرکت پلنگ پر پڑا رہی اور صرف کھانا کھانی کیلئی اٹھا کری . اس قانون کا تقاضا ہی کہ وہ کاہل ، بزدل اور نکما بنا رہی اور اپنی ذہنی اور جسمانی جمود سی ، جو اسکی خمیر مین ہی ، لطف اٹھائی .

خیال اور احساس کی ساتھہ اسمین کچھہ حرکت پیدا ہوئی. دقت سی وہ کھسك کر پلنگ کی پٹی پر آ گیا اور اپنا ایك بازو لٹکا دیا . اسکی انگلی ایك پتھر سی لگی جو زمین پر پڑا تھا اور وہ اسی اٹھا کر غور سی دیکھنی لگا. اسنی یہ نہین پوچھا کہ یہ کہان سی آیا، کیونکہ اسی دفعۃ یہ خیال آیا کہ اس مین اور اس مجہول، بی ضرر پتھر مین کتنی مشابہت ہی. دونون کی قسمت مین یہ لکھا تھا کہ جب تك انہین کوئی چیز حرکت مین نہ لائی چپ چاپ پڑی رہین اور دونون اس پر قانع تھی. وہ اپنی پتھر کو انگلیون مین دبائی تھا ، گویا وہ کوئی قیمتی چیز تھی اور دل مین پوچھہ رہا تھا «کیا پتھر مین احساس اور خیال کی قوت ہی ؟ کیا مین احساس اور خیال کرسکتا ہون ؟ شاید کرسکتا ہون، لیکن یہ کونسا بڑا فرق ہی ؟ »

دفعۃ اس نی فتحمندی کی انداز سی ، وجد کی عالم مین اپنی بازو کو گھمایا، گویا مدت کی بعد بڑی بات معلوم کی ہی اور چلا کر کہا «ہان ! ہان ! مین بھی پتھر ہون ، بیشك مین پتھر ہون ! » کسی نامعلوم خوشی نی اسکی بدن مین سنسنی پیدا کردی اور وہ یہ مسرت انگیز خیال دل مین لئی ہوئی کہ وہ پتھر ہی اٹھا اور کھانا کھانی چلا.

اسکی بیوی کو اسکی ہاتھہ مین ایك پتھر دیکھہ کر بہت تعجب ہوا .

سرود مستانه

از مصور فطرت جناب پروفیسر اکبر منیر صاحب
(در شالا مار باغ کشمر گفته شد)

چه خوش روزگاری بود با نگاری ، لب جو یباری بزیر چناری
سر سبزه زاری، بر آبشاری ، به ساقی مه طلعتی، گلعذاری
به خنیاگری رازدان رازداری ، به باغ نشاطی و یا شالا ماری

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جو یباری بزیر چناری

گلاں سر زنند از دل مرغزاراں ، هزاراں سرایند بر شاخساران
لب جو بباراں نشستند یاران ، بخوابند و غلطند بر سبزه زاراں
برقصند و بجهند چوں می گساراں ، بخوانند با نغمهٔ آبشاراں

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جو یباری بزیر چناری

به باغ اندر آیین بساط زمین را ، گل و سبزه و لاله و یاسمین را
بزیر درختاں غزالان چین را ، لب آب غلماں و حوراں عین را
ثنا خوان خدای جهاں آفرین را ، و زاں پس بزن نغمهٔ آتشین را

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جو یباری بزیر چناری

ز هر سو غزالی بباغ انجمن شد ، بساط چمن چوں دیار ختن شد
ز خوباں هزاراں چمن درچمن شد ، چمنها همه پر ز یاس و سمن شد
تو گوئی گلستان بهشت عدن شد ، ز فرط طرب آبها نغمه زن شد

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جو یباری بزیر چناری

سر از خاك زد جلوهٔ آتشینی ، پر از اختران چون فلك شد زمینی
دری باز شد از بهشت برینی ، بخواهم همی پر ز می ساتگینی
که تا بهر درمان قلب حزینی ، چو مستان سرودی زنم با حسینی

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

بجوئی اندر آید ز کهسار آبی ، درخشان چو برقی روان چون سحابی
بدل ماهتابی به تن آفتابی ، همه مستی آرد چو جام شرابی
همه نغمه دارد چو تار ربابی ، همه با بخوانند با این خطابی

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

چه خوش بوستانیست الله اکبر ، بحسرت همی بیندش چرخ اخضر
بآبش قسم می خورد حوض کوثر ، لب جوی بنشین به مینا و ساغر
بزن پشت پا بر بساط سکندر ، برقص و بخوان با بتان سمن بر

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

بیا مطربا زن سرودی نوائی ، که دارم سر ماه گلگون قبائی
همه دلستانی همه دلربائی ، پری چهره، لاله رخی، خوش ادائی
بیا و بزن با حریفان صلائی ، بده ساز این جامهٔ دلکشائی

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

بیا ساقیا ریز باده بجامی ، بگو از حریفان سلامی پیامی
بخواهم مئی آتشین لعل فامی ، که سوزد همی دفتر ننگ و نامی
بده آفتابی به ماه تمامی ، به باده گساران چه صبحی، چه شامی

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

بیا ساقی آر جام شرابی ، که کجا ببینم مه و آفتابی
ویا باز کن نرگس نیم خوابی ، بپندار در ملک جان انقلابی
که تا مست گردم، بگیرم ربابی ، سرایم چو مرغی، برقصم چو آبی

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

بخواهم بخوبان کشمیر رقصم ، به سبزه و گل با بم و زیر رقصم
لب آب جو پا بزنجیر رقصم ، بلغزم، بیفتم، چو نخچیر رقصم
با آتش عذاران به شمشیر رقصم ، بیاد زمان جهانگیر رقصم

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

خوشا آن زمانی، خوشا روزگاری ، که بد مردم هند را شهریاری
خوشا شهریاری خوشا عمگساری ، که در دور او ملك شد لاله زاری
همی خورد مردم می پر شراری ، همی خواند با گلرخان چون هزاری

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

سلامی بخوانم بآن روزگاران ، سلامی فرستم بآب شهر باران
خدایا ز گلزار ماشد بهاران ! ، زابر کرم باز بفرست باران
مرویان بهار از بر کوهساران ، که رقصیم و خوانیم بر جو یباران

چه خوش روزگاری بود با نگاری
لب جویباری بزیر چناری

پیام اتحاد

انجمن اقوام کی « بین‌الاقوامی ادارۂ اتحاد ذهنی » نی ایک کمیٹی اس غرض سی مقرر کی تھی که جتنی بین‌الاقوامی اداری دنیا مین هین اون کی اتحاد عمل کی ممکن صورتون پر غور کرکی ایک رپورٹ پیش کری اس رپورٹ کا خلاصه هماری پاس مع مندرجه ذیل خط کی بغرض اشاعت بهیجا گیا هی.

بین‌الاقوامی اداره اتحاد ذهنی

رو دو مونپانسیی نمبر ۲ (پیلی رویال)
پیرس .

جناب اڈیٹر صاحب ،

اس خط کی ساتهه چند اوراق ملفوف هین جن سی آپ کو معلوم هوگا که کمیٹی اتحاد ادارات بین‌الاقوامی کیا چیز هی اور نوجوانون کی تعلیم و تربیت کی لئی کیا کیا کوششین کر رهی هی. مجهی امید هی که یه اوراق آپ کی پاس حفاظت سی پهونچ جائین گی اور آپ انهین قابل توجه سمجهین گی.

مین بهت خوش هون گا اگر آپ اپنی رسالی کی پڑهنی والون کو اس تحریک سی اور ان اوراق کی مضمون سی واقف کر دیں گی - - -
براہِ مهربانی میری خلوص کی جذبات کو قبول کیجئی .

منجانب ڈائرکٹر .

خلاصه رپورٹ کمیٹی اتحاد ادارات بین‌الاقوامی

خاص خاص بین‌الاقوامی انجمنون نی جنهین نوجوانون کی تربیت اور قیام

امن سی دلچسپی هی باهمی تعلقات قائم رکھنی کی لئی ایك ذریعه کمیٹی اتحاد کی صورت مین پیدا کیا هی. یه کمیٹی بین‌الاقوامی ادارهٔ اتحاد ذهنی کی ماتحت کام کرتی هی اور اس کا وجود بهی اداره مذکور اور انجمن اقوام کی طرح تاریخی ضروریات پر مبنی هی.

حقیقت مین یه اس تنظیمی تحریك کا نتیجه هی جو اب سی تیس چالیس سال پهلی تمام ملکون مین اور تمام طبقون مین شروع هوئی تهی اور جسکا شمار موجوده زمانی کی خصوصیات مین هی.

بین الاقوامی انجمنین جن مین سی متعدد کی اراکین کی تعداد هزارون بلکه لاکهون تك پهونچتی هی صرف اپنی اراکین کی کثرت کی لحاظ سی اهم نهین، بلکه ان کا طرهٔ امتیاز یه هی که تمام بین‌الاقوامی افکار و خیالات کی تنظیم ایك خاص طرز پر ایك معین جد و جهد کی لئی کرتی هین.

اس لئی یهه ضروری بات تهی که یه انجمنین، خصوصا وه جو نوجوانون کی جسمانی اور ذهنی تربیت سی دلچسپی رکهتی هین باهمی تعلق اور تبادلهٔ خیالات کی ذرائع تلاش کرین. اسی ضرورت کو پورا کرنی کی لئی بین الاقوامی ادارهٔ اتحاد ذهنی وجود مین آیا، جس کا ایك شعبه یه کمیٹی هی. یه کمیٹی کوئی انتظامی کمیٹی نهین هی، لیکن اس کی مقاصد مین یه بهی داخل هی که وه تبادلهٔ خیالات مین آسانی پیدا کری؛ مشترکه مطالعه کی ذرائع تلاش کری، اور ان ذرائع کو اختیار کری.

یه واقعه هی که ادارات بین الاقوامی مختلف قسم کی هین، وه طرح طرح کی انسانی خیالات کی نمائندگی کرتی هین. بعض خالص علمی هین اور بعض کا دائره عمل بهت وسیع هی، لیکن یه دیکها گیا هی که باوجود خیالات اور طرز عمل کی گهری اختلافات کی ایك مشترك نقطه هی جس پر یه سب ملتی هین، اسلئی ان مین ذهنی اور عملی اتحاد ممکن ثابت هوا. بین الاقوامی ادارهٔ اتحاد ذهنی نی انهین اس تجربه کا موقعه دیا اور یه کها جا سکتا هی که اب تك یه تجربه

بہت کامیاب ثابت ہوا ہی. کمیٹی اتحاد جس کا پہلا اجلاس ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ کو ہوا اپنا کام باقاعدہ کرتی رہتی ہی. اس کی پانچ عام جلسے ہو چکی ہین، اور اس نی کام کی تقسیم متعدد مستقل سب کمیٹیون مین کردی ہی اس نی اپنی دستورالعمل مین ایك عارضی دفعہ رکھی ہی جس مین بین‌الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی کی ساتھہ مل کر کام کرنی پر زور دیا گیا ہی. بعض بین‌الاقوامی انجمنون نی جو افتتاح کی وقت شریك نہ تہین اس کی بعد ممبری کی درخواست کی، ان مین سی وہ جماعتین جو نوجوانون کی تربیت مین مشغول ہین قدرتی طور پر بہت خلوص کی ساتھہ بین‌الاقوامی اتحاد کی اصول کی حامی ہین، اور انہین خاص طور پر اشتراك عمل کی خواہش ہی. ان کی سبب سی کمیٹی ایك عالمگیر جماعت بن گئی ہی. یہ کمیٹی ملحقہ انجمنون کی منظوری کی شرط پر حسب ذیل اعلان کرنا چاہتی ہی.

اعـــلان

« ہر صحیح نظام تعلیمی کا پہلا اصول یہ ہی کہ ہر بچی کو اس کی فطرتی ماحول یعنی اوس کی خاندان اور اوسکی بنی نوع سی وابستہ کری »

اسکی ضرورت ہمیشہ سی ہی، لیکن اوس شدید زلزلہ کی بعد جس نی انسانی زندگی کی بنیادون کو ہلادیا، ہی پرانی رشتون کو توڑدیا ہی اور انسانون کی دلون مین اور کائنات کی نظام مین انتشار پیدا کردیا ہی یہ ضرورت اور بڑہ گئی ہی.

ایسی وقت مین بچی کی ذہن مین توازن قائم رکھنی کی لئی اور اوسکی عام بہبودی کی لئی یہ ناگزیر ہی کہ اوس کی دل مین احساس فرض پیدا کیا جائی اور اسی یہ سمجھایا جائی کہ اسی مردانہ وار اپنی خاندان، اپنی رفقا، اپنی گاؤن یا شہر اور اپنی قوم کی حقوق ادا کرنا چاہئی. لیکن اوسی یہ بتانا بھی ضروری ہی کہ یہ تعلق اور وابستگی ایك ملك کی حدود کی پابند نہین ہوسکتی اور نہین ہونا چاہئی کیونکہ نوع انسانی

کی مختلف جماعتون مین حقوق و فرائض مشترك هین بلکہ ان کی باهمی تعلقات اس سی بهی زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم هین۔

علاوہ اسکی گهر میں، مدرسی مین اور ان اداروں مین جو مدرسہ کی تعلیم کی تکمیل کرتی هین بچی پر اس بات کی تاکید هونا چاهئی کہ وہ غیر ملك کی لوگوں کی ساتهہ اخلاق سی پیش آئی اور اوسکو شوق دلانا چاهئی کہ اون کی رسم و رواج سی واقفیت حاصل کری، ان کی زبان سیکهی اور اون کی خیالات سمجهی۔

معلمون کو چاهئی کہ وہ تصویروں، فلمون اور جادو کی لالٹین کی ذریعہ، تاریخ، جغرافیہ، تاریخ ادب، عام ادب اور سائنس وغیرہ کی تعلیم اسی اصول پر دیا کریں۔ ان تعلیمی طریقوں کو بی حد موثر بنانی کی تدابیر دریافت کرنا چاهئی اور انهین ابتدائی اور ثانوی مدرسون کی ضروریات کی مطابق بنانا چاهئی۔

یہ بهی مناسب هی کہ جهاں تك ممکن هو مختلف ملکوں کی بچوں اور نوجوانوں کو سیر و سفر، حلقہهائی مطالعہ، خط و کتابت وغیرہ کی ذریعہ براہ راست تعلقات پیدا کرنی کا موقعہ دیا جائی۔

یہ بین‌الاقوامی « تبادلہ » اگر تمام تعلیمی مدارج مین اس طرح کیا جاسکی کہ اسکول اور کالج کی لڑکوں اور پروفیسروں کو باهمی تعلقات پیدا کرنی کا موقعہ ملی تو یہ بچوں کو بین‌الاقوامی اتحاد کا طریقہ سکهانی اور انجمن اقوام کی کام کو فروغ دینی کا بهترین ذریعہ ثابت هوگا۔

تعلیم خواہ وہ خاندان مین هو یا مدرسی مین یا کسی دوسری جگہ، اور تربیت خواہ وہ ادبی هو یا صنعتی، لوگون مین باهمی واقفیت اور ذهنی مفاهمت پیدا کرکی قیام امن کی کام مین بڑی مدد دی سکتی هی۔

[اس کی بعد مختلف ممالك کی فهرست هی جو مندرجہ بالا اعلان کی پسندیدگی کا اظهار کر چکی هین۔]

غزل

از مصور فطرت حضرت صفی صاحب، لکھنوی

شیشوں کی طرح ٹوٹی، توبہ سر مے خانہ
ساقی! پھر اسی کن سے، اک لغزش مستانہ

یہ دل شکنی کب تک، اے جلوۂ جانانہ
سجدے کو تڑپتا ہے، کعبہ ہو کہ بتخانہ

کیا رند بلاکش کا سرمایۂ میخانہ
دُرکا ہوا اک شیشہ، رستا ہوا پیمانہ

یہ سوختہ سامانی، ہے رونق کاشانہ
اک شمع کے چند آنسو، مشت پر پروانہ

ایک اک سے الجھتا، ہے اپنا ہو کہ بیگانہ
پوچھو نہ روش دل کی، دیوانہ تو دیوانہ

ہمت کا زبانوں پر، ہے آج تک افسانہ
کیا کام کیا تو نے، اے تشنۂ مردانہ

اے برق نظر دشمن، اے جلوۂ جانانہ
اک مرتبہ دوہرا دے پھر طور کا افسانہ

اسباب تغیر سے آرائش ہستی ہے
کچھ دن کہیں آبادی، کچھ دن کہیں ویرانہ

کیا سر ہے سر واعظ، کیا دل ہے دل زاہد
ادراک سے مستثنیٰ، احساس سے بیگانہ

روزی ہی جو قسمت کی، کم، بیش، وہ پہونچیگی
دانہ نہ سہی خرمن، خرمن نہ سہی دانہ

پانسی کو پلٹ جاتی، کچھہ دیر نہین لگتی
افسون گری دولت، افسانہ ہی افسانہ

جب قید تعین سی، ای دل ہی بری کوئی
سنگ رہ مقصد ہی، کعبہ ہو، کہ بتخانہ

صحرای محبت مین تیغین بھی اگر برسین
پیچھی نہ قدم سرکی، ای ہمت مردانہ

ہر روز نئی نقشی، بنتی ہین، بگڑتی ہین
اب رسم محبت ہی، بازیچۂ طفلانہ

دور مئی عشرت سی کیا کام صفی ہمکو
جب عمر ہی کا اپنی لبریز ہی پیمانہ

رباعی

از جناب نصیرالدین حسین صاحب نصیر عظیم آبادی مرحوم

تو جان منی وجان جانان هستی ، وز یاد رخ تو بی زبان هستی
در حیطه عقل من نگنجد وصفت ، برتر ز خیال مدح خوانان هستی

دیگر

دل را به فراق یار جانی خستم ، نقش بخیال دوست شب بستم
تا آنکه زدرد دل اثر پیدا شد ، ناگاه ز در رسید حبیب رستم

دیگر

سروی به مثل خوش دیدم بچمن ، گر بخت خزان چو من رسیده بچمن
هر گل که مرا بدید مستت گردید ، تا بوئی کسی دهد دمیده بچمن

دیگر

تیرت چو بمن رسید دل دوز آمد ، صد درد رسید و عشق پر سوز آمد
چون پاك بسوخت جان و تن را یکسر ، دل مطلع نور عالم افروز آمد

دیگر

از روز ازل تراست دلبر بودن ، در قسمت ما سپند و مضطر بودن
سر داری حسن بر تو شد ختم ولی ، در ملك جنون مراست افسر بودن

تنقید و تبصرہ

مثنوی شیرین و خسرو:

سلسلۂ «کلیات خسروی» کی اشاعت مین مسلم یونیورسٹی پرس علیگڈہ نی امسال امیر خسرو دهلوی کی «شیرین و خسرو» شائع کی هی. اصل مثنوی ۲۸۵ صفحون مین هی اور اسکی تنقید ۱۱۸ صفحون مین. طباعت، کتابت اور کاغذ وغیرہ کی لحاظ سی یہ بهی ویسی هی اعلی درجه کی هی جیسی وہ سابقہ مثنویان جو اس سلسله مین پیشتر شائع هوچکی هین.

اسکی تنقید و تصحیح مولوی حاجی علی احمد خان صاحب اسیر مرحوم بدایونی سابق پروفیسر فارسی سینٹ جانس کالج آگرہ نی کی هی.

تصحیح پر جهان تك هم نی سرسری نگاہ ڈالی خاصی محنت کی گئی هی. حاشیه مین کهین کهین مشکل الفاظ کی معانی کی بهی تشریح ملتی هی. تنقید مین بهی مطالب مثنوی اور اسکی اشخاص کی متعلق نقاد نی جو کچهہ لکها هی نهایت کاوش اور کوشش سی لکها هی، اور وہ بهت کچهہ قدر کی قابل هی، لیکن جهان خسرو اور نظامی کا مقابله کیا هی وهان وهی سنت قدیم پیش نظر رکهی هی کہ خسرو کو فضیلت دی جائی. هم نی شروع هی مین اس خیال سی روکا تها، اور اسوقت جو مثنویان اس سلسله مین شائع کی گئی تهین اسکی تنقیدون مین علی الاعلان اس غلطی کا اظهار کردیا تها اور صاف صاف لکهدیا تها کہ مثنوی گوئی مین خسرو کو نظامی پر فوقیت نهین هی. لیکن نواب اسحاق خان مرحوم چونکه امیر خسرو کی شیدائی خاص تهی اور انکو شاعری کا سب سی بڑا هیرو بنانا چاهتی تهی اس لئی جن لوگون سی انهون نی مثنویات خسرو کی تنقیدین لکهائین انهون نی ان کی اس خواهش

کا خاص خیال رکھا۔ اور زیادہ تر یہی کوشش کی کہ نظامی اور خسرو کے اشعار کا مقابلہ کرکے جس طرح ہوسکے خسرو کو ترجیح دیں۔ چنانچہ سلسلہ وار اب تک غلط روی چلی جاتی ہی۔ حالانکہ خود خسرو اپنی آپ کو نظامی کا شاگرد اور پرستار مانتی ہین۔ انکا زیادہ سی زیادہ دعوی صرف یہ ہی کہ نظامی کی چرہ کشی مجھسی بہتر کوئی نہین کرسکتا، چنانچہ کہتی ہین:

زان سکہ کہ مرد پرہنر داشت ، بہ زین نتوان نمونہ برداشت

اہل فن کی نزدیك سلسلہ کتابت خسروی کی نقدون کا یہ جرم کسی طرح قابل معافی نہین، کاش اب بھی اس سی باز آئین، اور اپنی ناواقفی یا ملکی عصبیت سی فن کی چہرہ کو داغدار نہ بنائین۔

اس مثنوی کی نقاد صاحب کو غالباً اردو لکھنی کی کم عادت تھی، یہی وجہ ہی کہ عبارت مین تکلف ہی اور کہین کہین جملی اور فقری غلط ہوگئی ہین۔ کاش چھاپنی سی پہلی اصلاح کرلی جاتی۔

اسکی قیمت کہین درج نہین ہی۔

نظام گزٹ۔

چار منار حیدرآباد دکن یہ گزٹ ہفتہ وار سید وفاء احمد صاحب ایم اے اور محمد حبیب اللہ صاحب رشدی، ایم، اے کی ادارت مین شائع ہونا شروع ہوا ہی۔ ۱۸ جمادی الاول سنہ ۴۶ھ مین اس کا پہلا نمبر نکلا جو ریویو کی لئی موصول ہوا ہی شکل و صورت مین یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی اخبار الہلال کی مشابہ ہی۔ حجم ۱۶ صفحہ ہی۔ قیمت سالانہ چھہ روپیہ۔ تصویرین بھی کبھی کبھی شائع کرنی کا وعدہ ہی۔

نمبر زیر تنقید مین اعلی حضرت نظام کی ایك غزل نعتیہ، اور مہاراجہ کشن پرشاد کا ایك مضمون «پیام اتحاد» مندرج ہی۔ بظاہر اس اخبار کا مقصد تعلیمی، اصلاحی اور معاشرتی معلوم ہوتا ہی، اور یہ اقوام ہند مین مصالحت کا خواہاں ہی۔ قابل مدیرون اور لہجہ کی متانت اور مقاصد کی خوبی کی لحاظ سی ہمکو امید ہی کہ یہ اخبار ترقی کریگا۔

القریش :

یہ ماہوار رسالہ امرتسر سی محمد علی صاحب رونق کی اڈیٹری مین شائع ہوتا ہی، چھپائی، لکھائی، اور کاغذ اوسط درجہ کا، قیمت سالانہ تین روپیہ. مقصد قریش برادری کی اصلاح و ترقی ہی. مضامین نظم و نثر معمولی ہین، اور غیر قریش مسلمانون کی لئی دلچسپی کا سامان اس مین زیادہ نہین ہی.

اسلامی برادری اور اخوت کا دامن بہت وسیع ہی. اس لئی ہم اس قسم کی جماعتی اخبارات یا رسائل کو اسوقت مفید نہین سمجھتی. ہمکو یقین ہی کہ رفتہ رفتہ زمانہ کا تلاطم ان باہمی تفرقون کو خود ہی مٹا دیگا، اور ساری مسلمان بھائی ایک سطح پر آجائینگی اور متفقہ مقاصد کی لئی مل کر کوشش کرنا سکھہ لینگی.

الایمان :

حاجی مولوی محمد مقتدی خان صاحب شروانی منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈہ نی اس نام سی دو رسالونکا مجموعہ حرف شناس مسلمان بچونکی تعلیم کی لئی شائع کیا ہی. پہلی رسالہ مین ایمان کی مجمل کیفیت بیان کی ہی. دوسری مین مفصل، جس مین ان تمام رسولوں کی حالات مختصراً دئی ہین جن کا ذکر کلام مجید مین ہی. نیز آسمانی کتابون کا بھی بیان ہی. قرآن کی نصیحت و حکمت کی آیتین چن کر جمع کردی ہین، اور پیغمبر آخرالزمان یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالات کسی قدر تفصیل کی ساتھہ بیان کئی ہین، اور احادیث سی جوامع الکلم اور دعائین وغیرہ درج کی ہین. غرض یہ کتاب مسلمان بچون کی لئی ہر طرح پر فائدہ مند ہی. چھپائی، لکھائی اچھی، حجم تقریبا پونی دوسو صفحی قیمت ۱۲ آنہ. مصنف موصوف کی پتہ سی مل سکتی ہی.

مطلع انوار :

سلسلہ خسرو کی یہ مثنوی بہ تنقید و تصحیح و تحشیہ مولوی مقتدی خان صاحب موصوف مسلم یونیورسٹی پریس مین چھاپ کر شائع کی گئی ہی. مولوی

صاحب موصوف نی دیگر تنقید نگاران خسروی کی طرح ارکا مقابله نظامی کی ساتھه نہین کیا هی، بلکه اس سی احتراز فرمایا هی. صرف کلام خسروی کی خوبیان اور ان کی اس مثنوی مین جو تعلیمات هین ان کو واضح کرنی کی کوشش فرمائی هی. تصحیح و تحشیه بهی محنت سی کیا هی.

چهپائی حسب معمول اعلی درجه کی هی قیمت به تفاوت کاغذ حسب ذیل هی: قسم اول آٹهه روپیه، قسم دوم چهه روپیه، قسم سوم غیرمجلد تین روپیه. یهی قیمت ان تمام مثنویون کی هی جو اس سلسله مین شائع کی گئی هین. مسلم یونیورسٹی بك ڈپو یا مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈه سی مل سکتی هی.

ا - ج

تائیس :

[اناطول فرانس کا مشهور ناول مترجمه مولوی عنایت الله صاحب بی-ای مجلد حجم ٤٨٠ صفحه، شائع کرده «دارالاشاعت پنجاب» لاهور. قیمت درج نہین.]

اناطول فرانس پچهلی پچاس برس سی فرانسیسی انشاپردازون مین سب سی ممتاز حیثیت رکهتا هی. اس کی تصانیف مین مغربی تمدن کی اوس دور کی جهلك نظر آتی هی جب ساری زندگی پر ثبوتیت کا رنگ غالب تها. تمدنی شعبون مین سب سی اهم علم سمجها جاتا تها اور علم بهی سائنس کا علم. مذهبی عقیده کی کمزوری سی زندگی کا کوئی مرکز باقی نہین رها تها. بظاهر هر پہلو سی ترقی هو رهی تهی، لیکن انسان کی مجموعی شخصیت جو صرف مذهب سی تسکین پاسکتی هی سکون و اطمینان کی لئی تڑپ رهی تهی. اناطول فرانس رومان رولان کی خلاف اپنی عهد کا مصلح نہین بلکه مصور هی. وه اپنی همعصرون کی سرگشتگی دکهاتا هی، رهنمائی نہین کرنا چاهتا، کیونکه راه نه خود اوسی معلوم هی اور نه اوسکی خیال مین دوسرون کو.

«تائیس» مین اس نی موجوده زمانی کی تصویر نہین دکهائی هی بلکه اوس زمانی کی مصر کا مرقع جب عیسائیت کا آغاز تها اور یونانی - رومی

تمدن کا خاتمه هو رها تها. مگر یه عهد غالباً اسی لئی منتخب کیا گیا هی که موجوده عهد سی بهت مشابهت رکهتا هی. اس زمانی مین اسکندریه مغرب اور مشرق ادنی کی ساری تمدنون کا محل اجتماع هی. وهان نوفلاطونی بهی هین، یهودی بهی اور عیسائی بهی؛ سب کی سب علم کی نشی مین سرشار هین، اور عقیدی اور عمل مین ڈانوان ڈول. وه جانتی بهت هین، مانتی کم هین، اور کرتی کچهه نهین. دوسری طرف عیسائی راهب هین جو علم و عقل سی بیزار هین، اور عقیده و عمل کی عاشق. انکا عقیده ضعیف الاعتقادی هی اور انکا عمل ترك دنیا اور نفی زندگی. دنیادار فرقی ادنی جذبات کی غلام هین اور راهب ادنی اور اعلی کل جذبات کی دشمن. اس حالت مین ایك راهب پفنوتوس ایك دنیادار عورت یعنی رقاصه تائیس پر عاشق هوتا هی، اوسی نفسانی پستی سی روحانی بلندی پر پهونچانا چاهتا هی. راهب کی دل پر غرور چهایا هوا هی اور توازن معدوم هی، رقاصه باوجود اپنی بدکاری کی عجز و نیاز کی جذبات رکهتی هی اور فنون لطیفه سی حسن و تناسب سیکهه چکی هی. سب سی بڑی بات یه هی که رقاصه کی دل مین انسانون کا درد هی اور راهب اس سی محروم هی. نتیجه یه هوتا هی که رقاصه راهب کی بدولت توبه کی دروازی سی روحانی مسرت کی بارگاه مین پهونچ جاتی هی اور راهب اپنی خواهشات نفسانی کی هاتهون قعر مذلت مین گر جاتا هی.

مولوی عنایت الله صاحب کا ترجمه اگرچه انگریزی سی کیا گیا هی لیکن اسقدر مکمل هی که غالباً اصل فرانسیسی سی بهی اس سی بهتر ترجمه نهین هوسکتا تها. معلوم هوتا هی که مترجم کی ادبی ذوق نی الفاظ کا پرده اٹها کر شاهد معنی کو بی نقاب دیکها هی، اس لئی اصل اور ترجمی کا فرق ان کی لئی باقی نهین رها. اس ترجمی سی شائد لسانیات کی ماهر کو کوئی شکایت هو لیکن ادیب کو کوئی شکایت نهین هوسکتی. وهی زور، وهی متانت، اور وهی گهری ظرافت کی جهلك جو اناطول فرانس کی طرز ادا کی خصوصیت هی ترجمی مین بهی موجود هی. کتاب کی شروع مین محمد سعید صاحب کا ایك مقدمه هی اور آخر مین مترجم نی تلمیحات کو سمجهانی کی لئی مفصل نوٹ دئی هین:

ان دونوں چیزوں نی کتاب کو علمی حیثیت سی مفید بنا دیا هی. کتاب کی لکھائی حاسی هی کاغذ اور چھپائی قابل اطمینان هی.

سیر گل :

[جلیل احمد قدوائی صاحب بی ـ ای (علیگ) کی مختصر افسانوں کا مجموعه، حجم ۲۰۵ صفحه، قیمت ایك روپیه آٹھه آنه. مصنف سی، مسلم یونیورسٹی علیگڈه، یا "کاشانه" اناؤ کی پته سی مل سکتا هی.]

جدید طرز کی افسانه نگاری کی ابھی اردو میں ابتدا هی، لیکن اس صنف میں اس تھوڑی عرصی میں جتنی کامیابی مختصر افسانوں کو هوئی هی ناول یا ڈراما کو نہیں هوئی. ملك کی متعدد ادیب اچھی مختصر افسانی لکھه رهی هیں جن میں پریم‌چند صاحب، محمد مجیب صاحب اور پنجاب کی بعض اهل قلم کو خاص امتیازحاصل هی. معلوم هوتا هی که هماری ادبی نشو و نما کی پہلی منزل مختصر افسانه هی. جب اچھی مختصر افسانی هماری زبان میں هردلعزیز هوجائیں گی اس کی بعد اچھی ناول اور ڈراما کی پڑھنی کی طرف لوگوں کورغبت هوگی.

ان ادیبوں کی صف میں اب جلیل قدوائی صاحب بھی شامل هوئی هیں. آپ کی کتاب "سیر گل" ۱۳ افسانوں کا مجموعه هی جن میں سی ۷ چیخوف کی افسانوں سی ترجمه کئی گئی هیں، اور چھه خود جلیل صاحب کی تصنیف هیں.

چیخوف کی مختصر افسانی مغرب کی دنیائی ادب میں جواهر کی قیمت رکھتی هیں اور کوئی وجه نہیں که انہیں مشرق میں بھی یہی حیثیت حاصل نه هو جلیل صاحب نی ان افسانوں کا ترجمه روسی سی نہیں بلکه انگریزی سی کیا هی پھر بھی ان میں بہت سی ادبی خوبیاں جوروسی جاننی والی چیخوف کی کلام میں بتاتی هیں موجود هیں خصوصاً گفتگوکی روانی اور بی تکلفی کا ترجمی میں قائم رکھنا قابل داد هی.

خود جلیل صاحب کی افسانوں سی ادب کا سچا شوق اور جذبات قلب خصوصاً غم و الم کی جذبات کا صحیح مطالعه ظاهر هوتا هی. "زوال حسن"

اور « دو آنسو » خاص طور پر تعریف کی مستحق ہین .

افسانون کی زبان مین دلاویزی اور ندرت ہی لیکن یہ ندرت کہین کہین غیر مانوس اور دھندلی لفظون اور ترکیبون کی صورت اختیار کرلیتی ہی . معلوم ہوتا ہی کہ ابھی ہماری نوجوان ادب کی احساسات (خدا کری مطبع والی اسی احتسسات نہ کردین) کی گہرائی قوت اظہار کی قابو مین نہین آئی .

کتاب کی شروع مین خواجہ علام‌السیدین صاحب کا مقدمہ ہی جو ادبی نقطۂ نظر سی مقدمی کا سچا حق ادا کرتا ہی . خواجہ صاحب نی ان چند صفحون مین افسانہ نگاری کی اخلاقی قدر اور چینخوف کی ادبی خصوصیات ' بہت خوبی سی بیان کی ہین اور جلیل قدوائی صاحب کی افسانون پر بھی مبصرانہ اور منصفانہ انداز سی تنقید کی ہی . ایک نئی بات کتاب مین یہ ہی کہ ہر افسانہ کسی دوست یا عزیز کی نام پر معنون کیا گیا ہی جس سی یہ شبہ ہوتا ہی کہ مصنف کو منظور کچھہ اور ہی اور « سیر گل » محض « شوخی بہانی کی . »

کتاب کی لکھائی معمولی ہی ' چھپائی اور کاغذ عمدہ ہی ' مجموعی حیثیت سی یہ کتاب شائقین ادب کیلئی ایک ایسا تحفہ ہی جسی شکرئی اور مسرت کی ساتھہ قبول کرنا چاہئی .

نٹشی :

[سلسلہ دار المصنفین کی انھئسوین کتاب مولفہ ایم ـ ای مگی ' مترجمہ پروفیسر سید مظفرالدین ندوی ایم ـ ای ' حجم ۱۰٦ صفحہ ' قیمت درج نہین .]

ہر تصنیف مین مصنف کی ذات کی تھوڑی بہت جھلک نظر آتی ہی لیکن نٹشی ان لوگون مین ہی جن کی کتابین بالکل ان کی سیرت کا آئینہ ہوتی ہین . نٹشی کی سیرت متضاد عناصر سی مرکب تھی اس لئی اس کی تصانیف مین بھی متناقض خیالات پائی جاتی ہین . اس تضاد مین سی اصلی شخصیت ڈھونڈھ کر نکالنا اور اس تناقض مین سی اصلی خیالات کا تلاش کرنا اسقدر دشوار ہی کہ سوائی جرمنی کی جید فلسفی ریل (Riehl) کی کسی کو اس مین کامیابی نہین

هوئی. یہ چھوٹا سا رسالہ جس کا ترجمہ دار المصنفین شعائر سے شائع ہوا ہی
نتشی کی سیرت لکھنی اور اس کی خیالات پر تنقید کرنی کی ایک ناکام کوشش ہی
نتشی کی زندگی کی حالات صحیح ہین اور اس کی کتابون کا خلاصہ بھی قابل
اعتراض نہین، لیکن نہ تو ان حالات سی آنکھون کو اس کی شخصیت کا کوئی
مکمل نقشہ نظر آتا ہی اور نہ اس خلاصہ سی ذہن مین اس کی فلسفہ کا کوئی
صحیح تصور بندھتا ہی۔'

نتشی کی زندگی اور اس کی افکار کی اصل کنجی دو دھی عناصر کی
کشمکش ہی۔ ایک طرف تو اسپر اپنی زمانی کی اثر سی علم و عقل حمالیات و
تخیل کا رعب بیٹھا ہوا ہی اور دوسری طرف اپنی طبیعت کی تقاضی سی قوت اور
ازادی کا تسلط ہی۔ ان عناصر کو خود اسنی اپالو کا رنگ اور ڈایونیسس کا رنگ
کہکر سمجھانا چاہا ہی، اسکی ساری زندگی اور اسکا سارا فلسفہ ان دو رجحانات
کا جولانگاہ رہا ہی جن مین امتزاج پیدا کرنا اسی آخر تک نصیب نہ ہوا
وہ کتاب جو زیر تنقید ہی اس کشمکش کی دکھانی سی قاصر ہی۔

جو کچھہ کہا گیا وہ اصل کتاب کی متعلق تھا۔ سید مظفر الدین صاحب
کا ترجمہ ہر لحاظ سی نہایت قابل تعریف ہی۔ علمی اصطلاحات کی
لئی عام طور پر بالکل مناسب الفاظ استعمال کئی گئی ہین اور عبارت
مین اسقدر سلاست، روانی اور وضاحت ہی کہ شاید اصل کتاب مین
بھی نہین۔ اگر ہماری زبان مین مستند علمی کتابون کی بھی ایسی ترجمی
شائع ہونی لگین تو اسکا علمی معیار بہت بلند ہوجائی۔

کتاب مین بعض اغلاط بھی ہین جنھین دوسری ایڈیشن مین دور کردینا
چاہئی۔ اشخاص کی نام کو اردو کی قالب مین ڈھالنی مین نہ انگریزی تلفظ کی
مطابقت کی گئی ہی نہ جرمن کی تلفظ کی۔ ہماری زبان مین غالباً وہ سب اصوات
موجود ہین جو مختلف مغربی زبانون مین ہین، اس لئی مناسب ہی کہ ہم
اسمائی معرفہ کی معاملی مین یہ اصول اختیار کریں کہ جس زبان کا نام ہو
اوس کی تلفظ کا پورا تتبع کیا جائی۔ ذیل مین ہم ان اغلاط کی فہرست
دیتی ہین جن کا صحیح کرنا بہت ضروری ہی۔

ص (۳) شوپن‌هار کی جگہ شوپن‌هاؤار ہونا چاهئی .

" والسفه عزم کی جگہ فلسفهٔ اراده هونا چاهئی کیونکه جرمن لفظ Wille سی مراد اراده هی جو علاوه نفس انسانی کی قوت کی ایك مافوق‌الطبیعی وجود کی حیثیت بهی رکهتا هی. اسکی لئی عزم کا لفظ کسی طرح مناسب نهین .

ص (۱۳) فکنی کی جگہ فشئی هونا چاهئی (یائی مجهول سی)

ص (۱٤) شبلر کی جگہ شلر هونا چاهئی .

ص (۱۷) کانتجن کی جگہ کونگن هونا چاهئی .

ص (۱۹) بیل کی جگہ جرمن قاعدی سی مارسل یا فرانسیسی قاعدی سی مال هونا چاهئی .

ص (۲۱) لاپرواهی کی جگہ بی پروائی هونا چاهئی .

ص (۲۱) حادثه کا آغاز کی جگہ المبه کا آعاز هونا چاهئی .

ص (۲۲) کریفولڈ کی جگہ کرائف والڈ هونا چاهئی . ڈورژ پاٹ خدا جانی کس نام کی خرابی هی.

ص (۲۳) ایك هی نام ایك جگہ اسٹراس دوسری جگہ اسزاز هی . صحیح اشتراؤس هی .

ص (۳۰) گیٹی کی جگہ گوئٹی هونا چاهئی . مصنف نی امپڈوکنیس اور هراکلئیس کی ساتهه خدا جانی کیوں گوئٹی کا نام بهی ان لوگوں مین لکهدیا هی جن کی ذهن مین «اشیائی عالم کی اغراض و مقاصد کا خیال تك نهین آتا تها .» یه صریحی غلطی هی .

ص (٤۱) هین کی جگہ هائنی هونا چاهئی .

ص (٦٦) کنٹ کی جگہ کانٹ هونا چاهئی .

کتاب کی لکهائی چهپائی بهت عمده هی اور کاغذ بهی بهت نفیس لگایا گیا هی .

هم سید مظفرالدین صاحب کو اون کی ترجمی پر مبارکباد دیتی هین اور مشوره دیتی هین که فلسفه کی مستند کتابوں کا ترجمه کریں .

ع - ح

شذرات

میری دیرینه کرم فرما اور خامه کی قدیم ناصح مشفق مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نی اخبار « سچ » نمبر ۴۳ مین جو ۴ نومبر سنه ۱۹۲۷ع کو شائع هواهی ملوکیت اور جمهوریت کی بحث کا سلسله جو انهون نی میری «الناظر» والی مضمون پر شروع کیا تها ' میری درخواست پر ختم کردیا . لیکن اس نمبر مین جو طویل مقاله انهون نی لکهه ڈالا هی اسمین اپنی اخبار کی ناظرین کو مغالطه دیکر میری طرف سی بدگمانیون مین مبتلا کرنی کی کوشش کی هی . اس وجه سی ضرورت هوئی که مین ان کو رفع کردون .

خامه کی ساتهه مین نی جو خط انکو لکها تها ' اور جو کم و بیش ایك کالم کا هوگا ' اس کو اگر درج کردیتی تو یه ضرورت باقی نه رهتی ' لیکن بلااس کی درج کئی هوئی اپنی اخبار مین پوری چهه کالمون مین اسکا جواب لکهه ڈالا ' جسکی وجه صرف یه هوسکتی هی که انهون نی دیکهه لیا که اسکو درج کرنی کی بعد جواب کی کوئی صورت ره نه جائی گی — اس لئی قصداً اسکی چهاپنی سی گریز کیا اور بلااندراج اصل تحریر اسکی تردید کرڈالی . اس مین بهی جا بجا جسقدر میری فقری نقل کئی ناجائز قطع و برید سی ان کی مفهوم کو مسخ کر ڈالا .

صحابه کرام کی شان مین انهون نی خود « کوته اندیشی » کا لفظ استعمال کیا هی اور اسکو باریك قوسی خطوط مین لکهکر ناظرین کو اس وهم مین ڈالنی کی کوشش کی هی که یه منقول هی ' حالانکه میری تحریر اس لفظ سی بالکل پاك اور مبرا هی ' اور اس قسم کی گستاخانه لفظ کو سب صحابه مین داخل سمجهتا هون .

پهر اسی مین وه میری نسبت لکهتی هین که مین نی « تاریخ الامت » مین حضرت عثمان کی اخلاق کو « نا پسندیده » اور حضرت علی کی نسبت « تفوق پسندی » « اراده کی کمزوری » « بی صبری » کی الفاظ لکهی .

آج "تاریخ الامت" ملك كى طول و عرض مين پهيلى هوئى هى. هر شخص دیکهه سكتا هى كه مذكورهٔ بالا الفاظ مين سى ايك لفظ بهى اس مين نهين هى. يه مولوى صاحب موصوف نى خود اپنى فهم سى تراش كر ميرى سر تهوپى هين. اس فهم كا نمونه بهى ديكهنى كى قابل هى.

"تاريخ الامت" مين ميرى عبارت يه هى: "حضرت عثمان اكثر امور مين چشم پوشى اور نرمى سى كام ليتى تهى، مگر يه خلق كسى حكيم يا عالم مين هو تو بهت قابل تعريف هى لكن فرمانروا اور خليفه كى لئى پسنديده نهين."

مولوى صاحب نى اس عبارت سى يه نتيجه نكالا كه مين نى حضرت عثمان كى اخلاق كريمانه كو "ناپسنديده" لكهديا. اسكا فيصله مين ناظرين پر چهوڑتا هون. فن مناظره مين علماء نى يه اصول طى كرديا هى كه ايك فريق دوسرى كى عبارت سى جو التزامى مفهوم نكالى وه خود اسى كا قول قرار ديا جائى گا اور فريق مخالف پر حجت نهوگا. كاش مدير "سچ" اپنا اخبار نكالنى سى پهلى سچ اور جهوٹه مين تميز كرنا سيكهه ليتى.

جواب كا سب سى زياده مضحك حصه وه هى جهان خود مجهكو ميرى تحرير نه سمجهنى كا الزام ديا هى. اس پر مجهكو دو شعر ياد آگئى جو امام خليل بن احمد عروضى اپنى ايك ملامت گر كو مخاطب كركى كهتى هين:

لو كنت تعلم ما اقول عذرتنى ، او كنت اجهل ما تقول عذلتكا
لكن جهلت مقالتى فعذلتنى ، وعلمت انك جاهل فعذرتكا

ا - ج

☆

هم كو بهت افسوس هى كه هم حسب وعده تاسيس نمبر شائع نهين كرسكى بلكه اكتوبر كى معمولى نمبر كى اشاعت مين بهى اتنى دير هوئى كه نومبر كا نمبر اس كى ساتهه شامل كرنا پڑا. اسكى وجه يه هوئى كه رسالى كو ٹائپ مين چهپوانى كا تجربه كيا گيا، ليكن بد قسمتى سى همارى مطبع كو اردو ٹائپ كى كمپوز كرنى والى بهت كم ملى، اس لئى مجبوراً كام بهت سست رفتار سى كيا گيا. هم قارئين كرام سى معافى كى التجا كرتى

هین، اب انشاء الله دسمبر کا نمبر لیتهو مین مقرره وقت پر نکلی کا. ٹائپ کی چهپائی کا تجربه هم اسوقت تك نه کرین کی جب تك هماری مطبع مین بڑی مشینین نه آجائی اور کمپوز کرنی والی کافی تعداد مین نه هون. پهر بهی قارئین کرام سی توقع هی که وه اصل سوال کی متعلق اپنی رائی کا اظهار فرمائین کی که اس ٹائپ کی چهپائی اںهین پسند هی یا نهین، اور اگر ساری دقتین رفع هوجائین تو وه جامعه کو ٹائپ مین چهاپنی کا مشوره دیتی هین یا نهین.

☆

همین « بین‌الاقوامی ادارهٔ اتحاد ذهنی » کی طرف سی ایك خط اور ایك رپورٹ ابتدائی اکتوبر مین موصول هوئی تهی. هم دونوں چیزوں کو اس نمبر مین شائع کرتی هین. یه اداره جس کی طرف سی یه خط هی انجمن اقوام کی ماتحت پیرس مین قائم هوا هی. اسکا مقصد یه هی که تمام ملکوں اور قوموں کی درمیان ذهنی تعلقات قائم کئی جائین، تا که باهمی مغائرت اور مخالفت کم هو اور یکجهتی اور اتحاد پیدا هو. اسی کی ماتحت ایك کمیٹی اس غرض سی قائم هوئی هی که دنیا مین اور جتنی انجمنین بین‌الاقوامی تعلقات قائم کرنی کی کوشش کر رهی هین سب کو ایك مرکز پر جمع کرکی اون مین اتحاد عمل پیدا کری. یه رپورٹ جو شائع هو رهی هی اسی کمیٹی کی طرف سی هی، اور اس کمیٹی کی مقاصد سی کوئی سمجهدار آدمی اختلاف نهین کر سکتا. قوموں کی باهمی مخالفت اور عداوت کی سبب سی جو عذاب دنیا پر نازل هو رها هی اس کا ایك منظر هم جنگ عظیم کی صورت مین دیکهه چکی هین. ایسی حالت مین ظاهر هی که دنیا کی سب سی اهم ضرورت اتفاق و اتحاد هی اور یه بهی مسلم هی که اتفاق و اتحاد گهرا اور دیر پا تب هو سکتا هی جب اس کی بنا ذهنی اور عام تمدنی مفاهمت پر هو. پس اگر کوئی جماعت یه مبارك مقصد لی کر اٹهی هی که دنیا کی مختلف قوموں مین ذهنی اتحاد عمل کی کوشش کری تو اصولاً هر شخص کو اوسکی تعریف اور اسکی مدد کرنا چاهئی.

لیکن هر بات مین اصولی پہلو کی علاوہ ایك عملی پہلو بھی ہوتا ہی، دنیا مین اچھی اصولوں کی پردی مین بڑی بڑی برائیاں کی جا چکی ہین، اس لئی احتیاط کا تقاضا یہ ہی کہ ہر معاملی کو، خواہ وہ اصولاً کتنا ہی اچھا کیون نہ ہو، عملی پہلو سی بھی جانچ لیا جائی. اب سوال یہ ہی کہ اس معاملی کی صورت کیا ہی.

✡

ادارۂ اتحاد ذہنی انجمن اقوام کا ایك شعبہ ہی. انجمن اقوام کی متعلق خود یورپ مین عام خیال یہ ہی کہ یہ مغربی یورپ کی سلطنتون، خصوصاً برطانیہ عظمی کی سیاسی مقاصد کی حاصل کرنی کا ایك آلہ ہی. اس لئی اس ادارۂ اتحاد ذہنی پر بھی کسی کو اعتبار نہین ہی اور جب تك یہ ادارہ انجمن اقوام سی الگ نہ ہو جائی یا خود انجمن اقوام آزادی اور اخلاص کا ثبوت نہ دی اسوقت تك سوائی چند سادہ دلون کی کوئی اسکی طرف توجہ نہین کری گا.

✡

جب یورپ مین اس اداری اور اس کی سرپرست انجمن اقوام کی طرف سی لوگون کا یہ رویہ ہی تو ظاہر ہی کہ ایشیا، خصوصاً ہندوستان والی، اسپر اعتماد کرنی یا اسکی ساتھہ اتحاد عمل کرنی سی بالکل معذور ہین، کیونکہ وہ جانتی ہین کہ بہ فرض محال اگر یورپ والون مین یکانگت اور اتفاق ہو بھی جائی تو انکا رویہ ہماری ساتھہ بدستور حاکمانہ، جابرانہ، اور تاجرانہ رہیگا اور ان مین اور ہم مین اتحا دہنی کی صرف یہ صورت ہوگی کہ ہم ان کی خیالات کی پرستش کرین اور وہ ہماری معتقدات اور مسلمات کو ذلیل سمجھین. ایك زمانہ تھا کہ ہم اس پر قناعت کرتی تھی، مگر وہ گیا اور اب انشاءاللہ کبھی نہ آئی گا.

✡

خصوصاً ہندوستان کی لئی جہان مختلف فرقی اور مختلف جماعتین ابھی آپس ہی مین اتحاد ذہنی قائم کرنی سی بہت دور ہین ایسی ادارات سی تعلق پیدا کرنی کا کوئی موقعہ نہین.

✡

ہم ادارہ اتحاد ذہنی کی ڈائرکٹر سی افسوس کی ساتھہ کہتی ہین کہ ہم انکی ادارہ

هندوستان مین هر طلعزیز بنانی مین کوئی مدد نہین دیسکتی اور نہین دینا چاہتی۔

☆

پروفیسر رادھا کرشن نی جو فاضلانہ خطبۂ صدارت اندھرا یونیورسٹی کی جلسہ تقسیم اسناد مین پڑھا تھا وہ تمام اہل علم اور اہل تعلم کی لئی قابل غور ہی۔ پرو فیسر صاحب کی اس قول سی ہر سمجھدار آدمی اتفاق کریگا کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد وسعتِ خیال اور آزادی نظر پیدا کرنا ہی اور اسکی لئی ضروری ہی کہ وہ لوگون کو اپنی تنقید آپ کرنی کی تعلیم دی۔

☆

یہ بھی پروفیسر صاحب نی بالکل بجا فرمایا کہ کسی قوم کی صحیح تعلیم کی بنا اسکی قدیم تمدن کی مطالعی پر ہونا چاہئی، اس غرض سی نہین کہ کل روایات کو آنکھہ بند کرکی قبول کرلیا جائی بلکہ اس لئی کہ ناقدانہ نظر سی اصل اور فرع، جوہر اور عرض مین فرق کیا جائی۔

☆

مگر پروفیسر صاحب کا یہ کہنا کہ ہندوستان کی علمی زبان انگریزی ہی رہنا چاہئی، کیونکہ اسی نی ملک مین قومیت کی جذبات کو ابھارا ہی، عجب طرح کا استدلال ہی۔ اس منطق کی مطابق یہ بھی کہا جا سکتا ہی کہ ہندوستان مین ہمیشہ انگریزون کی حکومت رہنا چاہئی کیونکہ اسی حکومت نی ہندوستانیون مین آزادی کی خواہش پیدا کی ہی۔

☆

اسمین شك نہین کہ قومی زبان کا مسئلہ بہت مشکل ہی اور آسانی اسی مین نظر آتی ہی کہ انگریزی زبان اختیار کرلی جائی۔ لیکن آسان طریقی اکثر بہت خطرناك ہوتی ہین۔ پروفیسر صاحب اس سی انکار نہین کرسکتی کہ انگریزی کا ملك کی آبادی کی ہر طبقی مین پھیلنا ناممکن ہی۔ زیادہ سی زیادہ یہ «اونچی» طبقون کی «علمی» زبان ہوسکتی ہی۔ مگر «اونچی» اور «نیچی» طبقون کی فرق کو بڑھا نی سی قومون کی زندگی مین ایسا انتشار پیدا ہوجاتا ہی جو انہین برباد کئی بغیر نہین رہتا۔ اسی طرح «علمی» اغراض کی لئی اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر کوئی دوسری زبان اختیار کرنی سی خود علم ایك بیجان چیز بن جاتا ہی۔

اگر ہم اب تک اس پر متفق نہیں ہو سکے ہیں کہ دیسی زبانوں میں سے کون سی "قومی زبان" بنائی جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم کاہلی سے مجبور ہوکر اس مسئلہ پر غور ہی کرنا چھوڑ دیں اور انگریزی محض اسلئے اختیار کرلیں کہ اسمیں "آسانی" ہے۔

✻

پروفیسر صاحب نے یونیورسٹیوں کا جو تعلق تحریک آزادی سے، بتایا ہے وہ بھی بالکل یکطرفہ اور ناقص ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم آزادی کی ظاہری علامات پر حد سے زیادہ زور دیتے ہیں اور اس کی باطنی عناصر کی طرف سے غافل ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم پہلے اتحاد اور تنظیم، اجتماعی زندگی اور یکجہتی، تعلیم اور انضباط پیدا کریں، اس کے بعد آزادی کا نام لیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ یہ چیزیں صحیح آزادی کی لئے ناگزیر ہیں لیکن ہم پروفیسر صاحب کو اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ آزادی کی ظاہری علامات بھی اس واقعی دنیا میں اتنی حقیر نہیں جتنی ان کی فلسفے کی خیالی دنیا میں ہوں گی۔ ان ظاہری علامات کی اصل قوت ہے جس سے ہماری مراد کوئی نفسیاتی اصطلاح نہیں بلکہ وہ واقعی اور محسوس سیاسی قوت جو اگر ہمارے ہاتھ میں ہو تو اتحاد و تنظیم وغیرہ پیدا کرنے میں مدد دے سکتی ہے اور اگر ہمارے مخالفوں کے ہاتھ میں ہو تو اسمیں رکاوٹیں ڈال سکتی ہے۔

✻

اس حد تک ہم بھی پروفیسر صاحب کے ہم زبان ہیں کہ یونیورسٹیوں کو اپنی توجہ کا مرکز "باطنی آزادی" کو بنانا چاہئے، لیکن ہماری خیال میں دل و دماغ کی آزادی اسوقت تک ہرگز مکمل نہیں ہوسکتی جب تک دست و بازو بھی آزاد نہ ہوں، پروفیسر صاحب کو خدا جانے کہاں سے یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں "ظاہری" آزادی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ہماری علم میں تو یونیورسٹیاں اور ان کی اساتذہ اس معاملہ میں ہمارے پروفیسر صاحب سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

رسالہ

جامعہ

زیرِ ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

نمبر ۶	بابتہ ماہ رجب ۱۳۴۶ھ ۔ ۔ ۔ ماہ بہمہ ۱۹۲۷ء	جلد ۹

فہرست مضامین

وائے براؤن!

(۲)

"جامعہ" کے جون نمبر میں پروفیسر براؤن مرحوم کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اسمیں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مرحوم کی زندگی، علمی خدمات، اور ذاتی خصوصیات پر حتی الامکان پوری طرح روشنی ڈالی جائیگی لیکن وقت کی تنگی کتابوں کی عدم موجودگی اور معلومات کی کمی کیوجہ سے، مرحوم کی زندگی کا خاکہ تک مکمل نہو سکا اور اسکا ایک حصہ تو اس قدر دھندلا رہ گیا کہ اس میں چند نقطوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا، لہذا اس نمبر میں کوشش کیجاتی ہے کہ اسی نقطہ سے دوبارہ صاف اور نمایاں خطوط کھینچے جائیں جہاں سے پہلے حصہ میں دھندلاپن شروع ہوا تھا۔

سنہ ۱۸۸۷ء میں جب براؤن، پیمبروک کالج کے فیلو منتخب کئے جانیکے بعد فارس گئے اور وہاں کے مختلف شہروں کی سیاحت، مختلف طبقے، مذاق، اور مذہب کے لوگوں سے ملنے جلنے اُنکے حالات زندگی خیالات ومذاق، اور ذہنیت کے غائر مطالعہ میں مشغول تھے تو یکایک قیام کرمان کے زمانہ میں، ۱۱ر جولائی کو انکو ایک تار ملا اسمیں کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرار مقرر کئے جانیکی اطلاع دی گئی تھی۔ اگست میں بذریعہ تار لاجبر انکو حکم دیا گیا تھا کہ ابتدا ماکتوبر میں کیمبرج پہونچ جائیں۔ اس تار نے اگر ایک طرف آپکی آئندہ زندگی کی نوعیت کی تعیین و تنصیب کردی تو دوسری طرف موجودہ سفر کے آئندہ حصے کے متعلق انکے خیالات کی کایا پلٹ دی۔ انکا خیال تھا کہ بندر عباس خلیج فارس، بغداد اور ایک دو شام کا ایک شہر ہے جہاں بابی فرقہ .... شیخ مرزا علی حسین بہار، سند مجموعہ سے ہوتے ہوئے انگلستان واپس جائینگے لیکن اس تار کے بعد نہ اسکا موقع باقی رہ .... مجبور ہو کر انہوں نے اپنے خیالات بدل دئے اور ۲۷ر ستمبر کو بادل ناخواستہ

... کو غیر آباد کیا۔

اس سفر نے براؤن کے خیالات میں زبردست تغیر پیدا کیا۔ ایرانیوں کے اخلاق و انداز نے براؤن کے دل سے ترکوں کی محبت نکال دی، اور خود ان پر ایسا مستحکم قبضہ جما لیا کہ وہ مرتے دم تک انکے دلدادہ رہے اس سفر میں انکو بہتیری تکلیفیں ہوئیں، لیکن علم کا شوق دیکھو تو اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ جو فوائد حاصل ہوئے انکے مقابلے میں اس سے بہت زیادہ تکلیفیں بھی قابل خیال نہیں۔

اکتوبر ۱۸۸۸ء میں براؤن کیمبرج گئے، اس دفعہ یہ کسی بزرگ کے کہنے سننے سے کیمبرج نہ گئے تھے، اب یہ کیمبرج یونیورسٹی اور پیمبروک کالج کے اندر گریجویٹ نہ تھے، اپنے ذاتی رجحان کے خلاف صرف "حکم حاکم" کے سبب سے کسی شعبے میں انکو اپنے عزیز وقت کا کثیر حصہ صرف کرنے کی ضرورت نہ تھی، اپنے چہیتے مضامین عربی و فارسی کی تحصیل کے لئے طلبہ کی خوشامد، گھنٹوں شکایت سننے، اور "تاروں کی ٹن ٹن" سننے کی حاجت نہ تھی، اب یہ کیمبرج یونیورسٹی کے لکچرر اور پیمبروک کالج کے فیلو تھے، اپنے وقت کے خود مختار مالک تھے، اپنے افعال و اعمال میں بالکل آزاد تھے، فارسی عربی ترکی زبانوں کے ماہر تھے، اور ادب فارسی کے متعلق ایک مستند فاضل کی حیثیت رکھتے تھے۔

کیمبرج کے علمی فضاء میں، براؤن کی سابق زندگی، انکے علوم مشرقیہ کے ذوق و شوق، اور آخری خلاف پیدا ادعیبی نے انکی ابتدائی دلشکن اور مایوس کن، ناکامیوں کا مہیب دیو، مقید و پابہ زنجیر انکے سامنے پیش کیا، قضا و قدر کا حامل انکا پیشوا تھا، اور علوم مشرقیہ کی دیوی اپنے ساتھ لایا تھا اس نے آگے بڑھ کر براؤن سے کہا، براؤن! تیری ہمت و عزیمت، استقلال و پامردی، محنت و فداکاری نے فتح پائی تیری ناکامیوں اور نامرادیوں کے مہیب دیو شکست کھا کر قید ہوئے، تیری دلی محبوبہ علوم مشرقیہ کی دیوی تیرے سامنے ہے تو اسے اپنے آغوش میں لے اس دلکش سادہ صورت موہنی مورت کے دلربا چہرہ سے جہل و لاعلمی کا تاریک پردہ اٹھا، اپنی طباعی و صناعی سے کام لے، اور تحقیق و تنقید کے مرصع زیوروں سے اسے آراستہ کر یہ کسی خاص قوم و ملک کی ملک نہیں ن عربوں اور فارسیوں نے کچھ مدت ہوئی اس پر ۔۔۔ سے بہترین لباس پہنائے، اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کیں لیکن جب ان لوگوں کی بدخصا

فرقہ بندیوں، خانہ جنگیوں اور خون خرابوں نے مجھے صدمہ پہنچایا تو میں نے اپنی سب سے پیاری شے علم کی دیوی ان سے چھین لی۔ اور کچھ دنوں تک اسے ایسا چھپا رکھا، کہ دنیا اسے گویا بھول گئی۔ یورپ والوں کے ذہنوں میں اس کے کچھ نقش و نگار باقی رہ گئے تھے انہیں نقش و نگار کے مطابق ان لوگوں نے میری رہنمائی مدد سے ایک نئی صورت بنا ڈالی۔

دنیا آج اس پر فریفتہ ہو رہی ہے۔ اس کی جدت طرازی، عشوہ و کرشمہ سازی، اور دلکشی پر مشرق و مغرب جان و دل سے قربان ہو رہے ہیں۔ اس نئی دیوی کو بھی تو نے اچھی طرح دیکھا ہے ایک مدت تک اس کی پوجا کی ہے لیکن تجھے اسکی صورت نہ بھائی، کیونکہ اسمیں انسانیت کے عنصر کی ایک بہت کمی ہے تو قدیم ہی دیوی کا دلدادہ رہ۔ اب وہ تیرے قبضہ میں ہے۔ اس نعمت غیر مترقبہ کی قدر کر، اسکی خدمت میں اپنی پوری زندگی صرف کر۔

نوجوان برون نے حامل قضا و قدر کا فرمان گوش دل سے سنا اس کے سامنے سر تسلیم خم کیا اس کی دعوت کو لبیک کہا، اپنی آئندہ زندگی اسی دیوی کی خدمت کے لئے وقف کر دی، اپنی دولت اپنا آرام و آسایش، اپنا وقت بلکہ اپنی زندگی تک اس پر نثار کر دی۔

تعمیل فرمان کے خیال سے برون ۱۰ فروری ۱۹۰۰ء کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہو گئے ۱۵ اپریل کو انہوں نے سوسائٹی کے جلسہ میں فرقہ بابیہ" کی تاریخ پر ایک مضمون پڑھا۔ اسی مضمون کا دوسرا حصہ انہوں نے ۱۲ جون کے جلسہ میں پڑھا۔ گرچہ یہ برون کا پہلا علمی کارنامہ تھا لیکن اس کی ہمہ گیری، جدت، محققانہ انداز، تنقیدی اور دلچسپ طرز ادا نے مستشرقین کی دنیا میں برون کی قابلیت کا لوہا منوا دیا۔ اس زمانہ سے ۱۹۲۶ء تک علی سبیل التسلسل علوم شرقیہ اور خاصکر علوم فارسیہ کی خدمت میں مشغول رہے دنیا میں زبردست تغیرات ہوئے۔ عالمگیر جنگ ہوئی بڑی بڑی سلطنتوں کے تخت الٹ گئے اس عدم آباد ہستی نما نے کئی کروٹیں لیں، خود برون کی زندگی میں اہم تغیرات ہوئے، خود شادی کی (انکی بیوی ایلس کیرولائن بلیک۔ مشہور مورخ آف اے۔ بلیکبرن کی صاحبزادی تھیں۔ برون نے ۱۹۰۷ء میں ان سے [illegible] ہوا (۱۹۱۱ء) مختلف قسم کا بار ان کی ذات پر پڑا لیکن علمی خدمت کے متعلق انکے

میں ... ان میں ملنا الغرض تک نہوئی۔ ایران فارس کی سیاسی حالت کے تغیرات کے ساتھ ساتھ ان کی دلچسپی کا موضوع بھی بدلتا رہا۔ لیکن جدول فارس کو دیکھتے تھے وہ اسی کے قبضہ میں رہے۔ ۱۹۲۶ء کے وسط میں جب وہ مرض الموت میں مبتلا بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے تو انہوں نے مثنوی جلال الدین رومی کی ایک حکایت پر فاضلانہ مضمون لکھا، جو اسلامیکا میں شائع ہو گیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے براؤن کا یہ آخری مضمون تھا۔

۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۶ء تک گذشتہ اوّل و آخر مضامین کے درمیان، براؤن نے تصنیفات، تالیفات، متن کتب فارسیہ، مضامین وغیرہ کے دریا بہا دئے انہیں سے اہم تصنیفات کی معمولی فہرست پروفیسر بابنگر نے در اسلام[2] میں مرزا محمد قزوینی نے، ایران شہر[3] میں اور مسٹر طاہر نے معارف[1] میں، براؤن کی زندگی پر معمولی تبصرہ کرتے ہوئے شائع کر دی ہے لیکن ان سبھوں میں ایک بھی مکمل نہیں، ان سب سے زیادہ مکمل تو وہ فہرست ہے جو مرحوم نے خود شائع کی تھی، پروفیسر نکلسن جو براؤن کی غیر شائع شدہ فہرست کتب ذاتی، کے تصحیح و ترتیب میں مشغول ہیں اس کے تمہید و تبصرہ میں مرحوم کی تصانیف کی فہرست بھی شائع کرنے والے ہیں[4]۔ ممکن ہے کہ یہ مکمل ہو لیکن متفرق مضامین کے لئے تو رسائل کی جلدوں ہی کی ورق گردانی پڑے گی۔ مرحوم کے مضامین اگر کل نہیں تو تقریباً کل رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ میں نے انکی تصفح کی ہے، اور لکھنؤ میں جہاں تک دوسرے یورپی رسائل مل سکتے ہیں انکی ورق گردانی میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ ممکن ہی نہیں بلکہ یہ بات یقینی ہے کہ اس تصفح و تجسس کے باوجود بہتیرے مضامین پر نظر نہ پڑی ہو۔ بہرحال اس تبصرہ کو مکمل بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

---

(۱) جلد ۲۔ فسک ۱

(۲) مئی ۱۹۲۷

(۳) اپریل ۱۹۲۶ء و بعد

(۴) مارچ ۱۹۲۶ء

برون کی تصانیف و مضامین جہانتک میری نظر سے گزری ہیں، انہیں حسب ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

(۱) تصانیف و مضامین متعلق فرق اسلامیہ۔

(۲) متن و تراجم کتب قدیمہ۔

(۳) رسائل سیاسیہ۔

(۴) تاریخ ادبیات و مضامین متعلقہ۔

(۵) فہرست کتب۔

(۶) متفرقات۔

(ا)

جہانتک مجھ کو علم ہے، برون نے فرق اسلامیہ میں سے صرف دو فرقوں کے متعلق قلم اٹھایا ہے (الف) فرقہ بابیہ (ب) فرقہ حروفیہ۔ فرقہ اسماعیلیہ کے خیالات، و تواریخ سے بھی انکو ابتدا ہی سے دلچسپی تھی لیکن اس فرقہ کے متعلق انہوں نے نہ کوئی کتاب لکھی نہ کوئی مضمون شائع کیا۔ ہاں اس فرقہ کے ایک اہم داعی، حکیم ناصر خسرو کے متعلق انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے، اور اس کی متعدد کتابیں اپنے ذاتی خرچ سے شائع کرائی ہیں۔ انکے متعلق آئندہ تبصرہ کیا جائیگا۔ اس نمبر میں صرف فرقہ بابیہ کے عقائد و تواریخ مختصراً بیان کئے جائیں گے اور انکے متعلق برون کی تصنیفات پر بحث کیجائیگی۔

(الف)

فرقہ بابیہ

گرچہ بابی فرقہ اور اس کے عقائد کے متعلق اردو زبان میں اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے لیکن ایک تو عام طور پر لوگ اس سے ناواقف ہیں دوسرے یہ سارا ذخیرہ یا تو خود بابی داعیوں کی دعوت و تبلیغ

---

(۵) یہ فہرست اب شائع ہوگئی ہے۔ (دیکھو (A Persian Anthology) لیکن ابتک میری نظر سے نہیں گزری۔

کے سلسلہ میں جمع ہوگیا ہے۔ یا اُس کے مخالفین کے قوت تردید اور زور تحریر کا نتیجہ ہے۔ اس فرقہ کے متعلق کوئی غیر جانبدارانہ منصفانہ تحریر، میرے علم میں، اردو زبان میں موجود نہیں ابتدا میں پہلے اس فرقہ کی تاریخ علی سبیل الاختصار بیان کرتا ہوں(۱)۔

گرچہ بابی فرقہ کے اولین راہنما مرزا محمد علی محمد باب تھے لیکن اگر ان سے کچھ قبل زمانہ کے ہیرالڈنیل اور ایرانی علماء کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے جراثیم ایران کی فضا میں پہلے سے موجود تھے۔ باب نے اپنے آخری دعوے مہدیت، و نبوت وغیرہ سے ان مردہ جراثیم میں روح پھونک دی، اور باب اور اُنکے متبعین کی علماء و مجتہدین نے جو زبردست مخالفت کی اور حکومت نے اس پر جبر ظلم انتہا کو پہنچا دی تو اس فرقہ کے صبر علی الظلم شکر علی الجبر، حق پرستی، ایثار نفسی اور جہاد فی سبیل اللہ کی شہرت تقریباً تمام عالم میں پھیل گئی

لیکن یہ ابتدائی جراثیم کیا تھے، اور کہاں تھے؟

اٹھارہویں صدی کے آخر میں شیخ احمد احسی(۲) ایک آزاد خیال ایرانی فاضل طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ انہوں نے بہتیرے قدیم متکلمین، اور ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ صدی کے آزاد خیالوں کی طرح عقل و نقل مذہب و فلسفہ، احکام اسلامی اور اقتضار عقلی میں تطبیق کی کوشش کی، انکا خیال تھا کہ کل علوم و فنون قرآن مجید میں موجود ہیں اور اسکے اصلی باطنی مفہوم کے سمجھنے کے لئے کل علوم کا جاننا ضروری ہے۔ ائمہ علیہم السلام کے متعلق انکو حد سے زیادہ غلو تھا۔ انکو مظہر اللہ اُس کے صفات میں شریک اور خالق سمجھتے تھے انکا عقیدہ تھا کہ ایاک نعبد و ایاک نستعین پڑھتے ہوے حضرت امام جعفر صادق کا تصور کرنا چاہیئے۔ اسی غلو کے ساتھ ساتھ انکو اس بات کا بھی یقین تھا کہ امام غائب علیہ السلام کے

---

(۱) یہ کل معلومات زیادہ تر خود براون کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں، بعض امور کے متعلق خود بابیوں کے تصانیف سے بھی مدد لی گئی ہے۔

(۲) شیخ احمد احسی کے حالات زندگی، اُنکے خیالات اور تصانیف کے متعلق اے ال ام نکولاس نے بہتر صفحوں کا ایک رسالہ (Essai Sur Cheikhisme) لکھا ہے۔ یہ رسالہ پیرس سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔ ابتک میری نظر سے نہیں گزرا

ساتھ انکو ایک خاص تعلق ہے انہیں یہ اکثر خواب میں دیکھتے ہیں، اور اسی حالت میں انکے پاس خاص احکام و ہدایات آیا کرتے ہیں ظاہری جسم انسانی کو فانی، اور ناقابل جزا و سزا آخرت سمجھتے تھے۔ معراج کے متعلق بھی انکا خیال تھا کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے جسم ظاہری کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا بلکہ ایک غیر فانی جسم کے قائل تھے، جسے جسم ہورکلیۃ کہا کرتے تھے، اسی کو قابل جزاء وسزا آخرت تھے۔

ان خیالات کی وجہ سے شیخ احمد احسائی پر عام راسخ الاعتقاد علماء نے کفر و الحاد کا فتویٰ دیدیا، اور ایک حد تک انکی مخالفت کی لیکن علم و فضل کیوجہ سے انکی قدر کیجاتی تھی، چنانچہ محمد شاہ قاچار، خود انکا قدردان تھا۔ انکے متبعین کی تعداد بھی گرچہ بہت بڑی نہ تھی لیکن پھر بھی اچھی خاصی تھی۔ یہ لوگ شیخی کہلاتے تھے۔

جب شیخ احمد احسائی کا انتقال ہوگیا تو انکے شاگرد حاجی سید کاظم انکے جانشین، اور فرقہ شیخیہ کے مقتدا مقرر ہوے۔ یہ بھی کربلا میں درس دیا کرتے تھے اور اپنے استاد کے خیالات کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ائمہ کے متعلق بھی اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے اور انمیں خاصکر امام غائب کے آمد آمد کی اکثر خبر دیا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں شیراز کے ایک معمولی تاجر سید محمد مرزا کا انتقال ہوگیا۔ یہ تاجر کون تھا؟ یہ مرزا علی محمد کے جو کچھ دنوں کے بعد باب کے لقب سے مشہور ہوئے اور بابی فرقہ کے بانی ہوئے، والد ماجد تھے۔ مرزا علی محمد اس زمانہ میں کمسن تھے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو آبائی پیشہ کے متعلق پھرتے پھراتے کربلا پہنچے۔ یہاں حاجی سید کاظم کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے طبیعت پیدائشی اور فطری طور پر گیان و دھیان اور مذہبی تخیل کیطرف مائل تھی۔ سونے پہ سہاگا انکے خمیر میں داخل تھا۔ انکے طریقے اور انداز اسی وقت سے دنیا سے نرالے تھے۔ حاجی سید کاظم کے لکچروں نے انکے خیالات میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ انہوں نے اپنے قوت متخیلہ سے اور بھی زیادہ کام لیا اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں حج بیت اللہ کے لئے چلے گئے۔ واپس آئے تو بھی اسی ادھیڑبن میں تھے ۱۲۶۰ھ میں انہوں نے اپنے

ہدایت کا اعلان کیا۔ اس نے اپنی کتاب زیارت نامہ مشائخ کی بابت سے انکے ابتدائی خیالات کا بخوبی ... پتہ چلتا ہے

"زیارت نامہ عربی زبان میں ہے۔ اسکی عربی نہایت معمولی ہے بلکہ اس میں نحوی صرفی غلطیاں تک پائی جاتی ہیں طرز تحریر بھی کچھ اچھا نہیں۔ خیالات کے اعتبار سے صرف شیخ احمد احسائی کا غلو فی الائمہ ان کی اس کتاب میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے، ائمہ کو شفیع مذنبین، اور خدا کا اوتار مانا ہے، امام غائب کیساتھ خاص تعلقات کا اظہار کیا ہے اور ان سے احکام و ہدایات پانیکی خبر دی ہے۔ باب کے خاص خیالات دعوے مہدیت وغیرہ کا اسمیں کوئی اثر نہیں پایا جاتا ہے۔

باب کے ذاتی خیالات انکی مابعد کی کتابوں تفسیر سورہ یوسف، ایقان، بیان (فارسی) اور بیان عربی (۱) میں پائے جاتے ہیں۔ ان کتابوں میں انہوں نے پہلے تو مہدیت کا دعویٰ کیا۔ اسکے بعد نبوت اختیار کی، دیگر انبیاء کے آنیکی خبر دی، انبیاء کو وجود ازلی حقیقی کا مظہر قرار دیا۔ بابی مذہبی سلطنت کا قریباً مکمل قانون شائع کیا۔ کل علوم و فنون کی ترقی ضروری ظاہر کی، فضول اور بیکار علوم کے (جس میں فقہ منطق مردہ زبانیں داخل ہیں) پڑھنے پڑھانے کی ممانعت کی، عورتوں کی آزادی کی طرفداری کی جس میں انسداد پردہ بھی داخل ہے، قمری مہینوں کی جگہ شمسی مہینے داخل کئے، نماز جماعت بالکل موقوف کردی صرف جنازہ کی جماعت کے ساتھ ضروری قرار دی۔ کرسیوں کا استعمال فرش سے بہتر قرار دیا۔

باب کے قتل کے بعد مرزا یحییٰ صبح ازل انکے جانشین منتخب کئے گئے۔ کچھ دنوں تک تو یہ لوگ بغداد میں مجبوس رہے، پھر قسطنطنیہ بھیجدیئے گئے، وہاں سے ایڈریانوپل بھیجے گئے۔ ایڈریانوپل میں مرزا یحییٰ کے سوتیلے بھائی مرزا حسین علی بہاء اللہ نے جو صبح ازل کے زمانہ خلافت میں بابی تحریک کے متعلق حل کلام کیا کرتے تھے، یہ دعوے کیا کہ جس شخصیت کے آنیکی خبر باب نے دی تھی وہ یہ خود ہیں اور بہاء اللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس دعوے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بابیوں میں زبردست اختلافات ہوگئے۔ انمیں دو فرقے بہائی اور ازلی پیدا ہوگئے اور انکے آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی۔ اسکے بعد بہاء اللہ ایڈریانوپل سے

---

(۱) بیان عربی کا فرانسیسی ترجمہ اے۔ ایل۔ ایم۔ نکولاس نے ۱۹۰۵ء میں پیرس سے شائع کیا ہے۔

[illegible]

شام بھیج دیے گئے۔ وہیں حالت قید میں انکا انتقال ہوگیا۔ انکے بعد انکے بیٹے عبدالبہاء انکے جانشین مقرر ہوئے۔ یہ بھی ۱۹۰۸ء تک شام میں محبوس رہے ۱۹۰۸ء میں انکو آزادی مل گئی اور مختلف ملکوں میں اپنے والد بزرگوار کے مذہب کی تبلیغ کے لئے پھرنے لگے۔

مرزا بہاء اللہ زبردست قابلیت کے آدمی تھے۔ انہوں نے جو کتابیں لکھی ہیں انکی تعداد اچھی خاصی ہے، ان کتابوں سے انکا فضل وکمال اور قوت تحریر پوری طرح ظاہر ہوتی ہے انہوں نے باب کے احکام میں بہت کچھ ترمیمیں کیں اور انکو بہت کچھ ترقی بھی دی انہوں نے اپنی کتاب 'لوح اقدس' میں بہائی مذہب کے احکام جمع کردئے ہیں۔ باب کے احکام میں جو اہم ترمیمیں انہوں نے کیں وہ حسب ذیل ہیں صلوۃ خمسہ کی جگہ صرف تین وقت کی نمازیں فرض کیں، ہر ایک وقت کی نماز میں صرف تین رکوع رکھے۔ سفر کی حالت میں یہ بھی ضروری نہیں بلکہ صرف سبحان اللہ کہدینا کافی ہے، اہم ترین عیدین صرف دو رکھیں اس میں بھی ایک پارسیوں کی نوروز کو لے لیا۔ روزے صرف انیس دن کے فرض رکھے کیونکہ بابیوں کا مہینہ انیس دن کا ہوتا ہے۔ اسلامی قانونی وراثت کو بالکل بدلدیا طلب خیرات بزرگوں کی دست بوسی نفس کشی، رہبانیت، انسان کے خیالات کیوجہ سے اس کی نجاست کو حرام وناجائز قرار دیا، جمعیت کا ذکر تو کیا ہے لیکن ایرانی بابیوں کے خیالات کے مطابق اس سے باب کا مکان مقصود ہے، میں د صرف 'باب' اور 'بہار' کا ہونا چاہئے اس کے علاوہ بہتیری اور باتیں ہیں جن کے متعلق لوح اقدس میں احکام موجود ہیں۔

بہار نے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کے خیال سے نپولین ثالث ملکہ وکٹوریا قیصر ولیم شاہ ایران پوپ وغیرہ کو خطوط لکھے اور ان سبھوں کو اپنے مذہب کیطرف دعوت دی۔

یہ تو بابی مذہب وعقائد کے تدریجی تکمیل وترقی کی حکایت تھی لیکن اس کے اشاعت وتبلیغ کیونکر ہوئی۔ اور انہیں بابیوں کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ انکو کن مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ انکے لئے کیسی کیسی قربانیاں کرنی پڑیں؟ ان لوگوں نے اس کے لئے کیسے ایثار سے کام لیا؟ بابی ادبیات کے متعلق بزوان کی خدمات کا اندازہ کرنیکے لئے اس مذہب کے تبلیغ واشاعت کی تاریخ کا علم بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

جن دنوں باب نے اپنے خیالات کا اعلان کیا تقریباً اسی زمانہ میں حاجی سید کاظم رشتی جو شیخیوں کے مقتدی تھے انتقال ہوا تھا۔ اور انکے جانشین کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا۔ باب کا نام بھی اس سلسلہ میں پیش ہوا اور شیخیوں کی ایک خاصی تعداد باب کے معتقدین میں آگئی۔ ان لوگوں نے غایت جوش و خروش کے ساتھ باب کے خیالات کی تبلیغ شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کے اندر اس جماعت کی تعداد بہت کچھ ترقی کر گئی۔ ایک طرف بابیوں کی اس زبردست ترقی اور باب کے خیالات کے عروج اور روزافزوں دعاوی نے متعصب مزاج قدیم الخیال علماء کے دماغ میں ایسا ہیجان پیدا کیا کہ یہ لوگ کفر و الحاد کے فتووں اور مناظرہ و مجادلہ پر قناعت نہ کر سکے، بلکہ قدیم اسلامی احکام کے استحفاظ کے خیال سے حکومت کے اثر سے کام لینے لگے۔ اسلامی سلطنتوں میں حکومت پر علماء کا جو اثر ہے اُسے کون نہیں جانتا؟ ۱۸۴۵ء کے آخر سے ان لوگوں نے اپنے اثر سے کام لینا شروع کر دیا اور بابیوں کے خلاف زبان و قلم کے ساتھ توپ و تفنگ تک استعمال کئے جانے لگے۔ پہلے تو بابی خیالات کی تبلیغ کی حکومت کی طرف سے ممانعت کی گئی۔ اس فرقہ کے اہم اراکین کی زد و کوب کی گئی، اور بعض شہر بدر کر دیئے گئے۔ لیکن جب یہ بھی بیکار ثابت ہوا تو ۱۸۴۷ء میں مرزا علی محمد قید کر لئے گئے یہ کچھ ہی دنوں قید میں رہے تھے کہ ایران میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ اس وبا کی گڑبڑ میں یہ حضرت کسی طرح قید سے نکل بھاگے اور منوچہر خاں عامل اصفہان کے زیر حکومت مقیم رہے۔ ۱۸۴۷ء میں منوچہر خاں کا انتقال ہو گیا۔ انکے جانشین نے حکومت پر اپنا اثر بڑھانے کے خیال سے مرزا علی محمد کو فوجوں کی حراست میں محمد شاہ کے پاس طہران بھیجدیا۔ بابیوں کی سرکشی، باب کے واسطے سر فروشی اور عام بغاوت کا حکومت کو اتنا خوف تھا کہ پایہ تخت میں مرزا علی محمد باب کا رہنا مناسب نہ سمجھا گیا اور یہ پایہ تخت سے باہر ماکو میں محبوس رکھے گئے

۱۸۴۸ء میں محمد شاہ کے انتقال کے بعد ایرانی حکومت کی فضا میں جو عام ضعف و افسردگی چھائی، اُس میں بابیوں کے جوش و خروش اور قدیم الخیال علماء کے زور و شور میں ایسا تصادم ہوا کہ پورے ایران میں زلزلہ پڑ گیا۔ زنجان، مازندران، تبریز وغیرہ میں زبردست بغاوتیں ہوئیں۔ اور ایسی بغاوتوں کو انکے فرو کرنے میں ہزاروں جانیں قربان کی گئیں اگر ایک طرف حکومت کے توپ و تفنگ تھے تو دوسری

جانب بابیوں کا جوش وخروش اور نہایت بہادری وسرفروشی۔ زنجان میں ۱۸۵۰ء میں دو ہزار بابیوں نے دس ہزار سرکاری فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور طبرستان میں چھ سو بابیوں کے مقابلہ میں ایرانی حکومت کی ساری فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ بالآخر فسادات بدقت فرو ہوئیں اور ۱۸۵۰ء میں مرزا علی محمد باب قتل کر دیئے گئے اس قتل سے بابیوں کا جوش بجائے فرو ہونے کے اور بھی بڑھ گیا مختلف شہروں میں لڑائیاں ہوئیں ہزاروں بابی سخت خوفناک ایذاؤں کے ساتھ قتل کر دیئے گئے کسی کو منہ میں لکڑیوں سے کپڑے ٹھونس ٹھونس کر مار دیا گیا کسی کو بدن میں زخم کر کے انہیں موم کی بتیاں جلا کر تمام شہر میں گشت کرایا گیا یہاں تک کہ بتیوں کی جگہ اسکے بدن کی چربی پگھل پگھل کر جلنے لگی اور آخر اس کی جان نکل گئی۔ کسی کو تلووں کی کھال اُدھیڑ کر انہیں گھوڑوں کی نالیں جڑنے اور اُن پر کھولتا ہوا تیل ڈالنے کے بعد چلتے ہوئے شاہراہوں پر دوڑایا گیا۔ بہتیرے ننگے جلتے ہوئے میخوں دہکتے ہوئے اینٹوں اور سرخ انگاروں سے داغ داغ کر جان لیگئی بیسیوں کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ گڑھوں میں ڈالکر آگ لگا دی گئی۔

اس ظلم وتشدد پر بھی بابیوں کے عزم واستقلال میں لغزش تک نہ آئی اور اُن کی تعداد، اُنکی قوت تبلیغ چھپے چھپے بڑھتی ہی گئی بلکہ انہیں سے اگر کوئی شخص پکڑا جاتا تو خوش ہوتا، اور ہنستا۔ جب حاجی سلیمان خاں کے بدن میں موم بتیاں جلا کر شہر کا گشت کرایا جا رہا تھا تو وہ ہنستا تھا ناچتا تھا اور یہ شعر پڑھتا تھا

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار رقصے چنیں میانہ میدانم آرزوست

اس قسم کے بیسیوں چشم دید واقعات یورپین مصنفین نے بیان کیے ہیں ان خوفناک مظالم کا اگر کوئی نمایاں اثر ہوا تو صرف یہ کہ عام لوگوں کے دلوں میں بابیوں کے خلوص وراسخ اعتقاد اور اُنکے جہاد فی سبیل اللہ اور شوق شہادت کی وقعت وعظمت جم گئی بعض بابیوں کے دماغ میں انتقام کا خیال بھی پیدا ہوا چنانچہ ایک بابی نے ۱۸۵۲ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل کے خیال سے اُن پر حملہ کیا اس حملہ سے ناصر الدین شاہ کی جان تو بچ گئی لیکن اس کی بدولت بیسیوں بابی مہیب مظالم کے ساتھ قتل کر دیئے گئے اور جو بچے کھچے تھے اُنکو ایران کی سرحد سے نکال دیا گیا۔ ان لوگوں میں سے اکثر نے اپنے امام مرزا محمد یحییٰ صبح ازل کے ساتھ بغداد میں ترکی حکومت کی قید میں بسر اختیار کیا۔

... سو مین ایران پر بابیوں کے قتل و غارت کے اس دور انگیز ناٹک کے دیکھنے والوں میں ایک فرانسیسی مستشرق موسیو کومت گوبینو بھی تھے جو اس زمانہ میں حکومت فرانس کے نمائندہ تھے ذہنوں نے اپنی مشہور آفاق کتاب "مذاہب فلسفہ در ایشائے وسطی" Les Religions et Philosophies dans l'Asie Centrale Paris کے تقریباً ۲۰۰ صفحات میں بابی مذہب اسکی تعلیم، تبلیغ، تاریخ، حکومت ایران کے روح فرسا مظالم، بابیوں کے استقلال و عزیمت، جوش و محبت، خلوص و رسوخ اعتقاد وغیرہ کو نہایت دلچسپ اور پُر اثر پیرایہ میں بیان کیا ہے اور تمام واقعات کی گویا زندہ تصویر کھینچ دی ہے۔ براؤن نے اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں تصوف کے شوق کیوجہ سے ۱۸۸۶ء کے قریب اس کتاب کو دیکھا اور بابیوں کے متعلق جو کچھ گوبینو نے لکھا تھا، اُسے پڑھکر بہت متاثر ہوئے (۱) خیال ہوا کہ اس فرقہ کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کئے جائیں لیکن اسکی کوئی صورت نہ تھی اُس وقت بابیوں کے متعلق کسی یورپین زبان میں کوئی ذخیرہ موجود نہ تھا جو کچھ تھا وہ خود گوبینو کی مذکورہ بالا کتاب، فون کریمر کی ہرشنڈن ایدے (Herrchenden Lip. 1866) کاظم بے کے رسالہ ژورنال ایشیاٹک (پیرس (Journal Asiatique Paris 1867) میں چند مضامین، ڈاکٹر ایتھر کے "مضامین و مطالعات (Essays & Studies Berlin 1872) میں محدود تھا۔ ان مضامین اور کتابوں کا براؤن کو غالباً پتہ نہ چلا اگر پتہ چل جاتا جب بھی براؤن کی پیاس اس سے نہیں بجھ سکتی تھی کیونکہ کریمر کا ماخذ زیادہ تر گوبینو ہی کی کتاب ہے۔ کاظم بے نے بھی گوبینو پر کچھ معتدبہ اضافہ نہیں کیا ہے، کیونکہ اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ناسخ التواریخ سے ماخوذ ہے، اور ناسخ التواریخ پر گوبینو کی نظر پڑ چکی تھی۔ ایتھر کی کتاب ان تینوں کے بعد شائع ہوئی اس لئے ممکن ہے کہ اس میں کچھ نئی باتیں مل سکیں، لیکن یہ کتاب کچھ ایسی نایاب ہوئی کہ اب اسکا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔

براؤن نے مجبور ہو کر اپنے شوق میں یہ ارادہ کر لیا کہ اگر کبھی زیارت ایران کا موقع ملیگا تو اس فرقہ کے حالات و خیالات کے متعلق مزید تلاش و تفتیش کرینگے چنانچہ جب یہ ایران گئے تو اُنہوں نے

(۱) مقدمہ نقطۃ الکاف صفحہ د

بابی فرقہ کے لوگوں سے ملنے کی پوری کوشش کی۔ ابتدا میں تو انکو بہت ناکامی ہوئی لیکن ایران میں تقریباً دو ماہ قیام کرنیکے بعد اتفاقاً ایک بابی سے ملاقات ہوگئی اُس کے ذریعہ سے بہتیرے بابیوں سے ملے اُن سے اُنکے متعلق بحث و مباحثے کئے، اُنکی تاریخ کے متعلق مزید معلومات حاصل کئے، اُنکی کتابیں خریدیں، اُن کے جلسوں میں شریک ہوئے اور اُن لوگوں سے ایسے شیر و شکر ہوئے کہ بہتیرے اُن کو بابی بالعقیدہ سمجھنے لگے۔

اکتوبر ۱۸۸۸ء تک جبکہ براؤن کیمبرج واپس آئے، یورپ کے اس خاص صنف ادبیات میں اچھا خاصہ اضافہ ہوگیا تھا، دورن، گلیمان ہوار، ڈکٹر روزن اور تومانسکی اس فرقہ اور اسکے ادبیات کے متعلق عالمانہ مضامین شائع کرچکے تھے۔ انکے علاوہ پولک واٹسن اور لیڈی شائل وغیرہ چند سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں بھی اس فرقہ کے حالات لکھے تھے۔

مقدمہ

کچھ اپنی بے پروائی، کچھ پرانی تعلیم کی وجہ سے ہم لوگوں نے کبھی سیاسی معاملات اور علم سیاست کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ اسکا نتیجہ ہوا کہ جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب ڈوب گیا تو ہم اپنی زندگی میں کسی قسم کی روشنی پیدا نہ کر سکے، اور انگریزوں نے جب ہمارے دیس پر قبضہ کر لیا تو سوائے ایک بیٹھے تکنے کے ہم نے اور نہ سوچا۔ ہم موقع پر خوشامد کرنا خطرہ کے وقت دروازے بند کر لینا ضرور جانتے تھے اپنی عزت آبرو کے لئے لڑنے والے بھی پرانے زمانہ میں بہت مل جاتے تھے مگر ہم کو اپنی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جب ہماری قوم نے سیاسی معاملات یا حکومت میں حصہ لینے کی کوشش کی ہو۔ یا مجموعی حیثیت سے اپنی عزت آبرو باقی رکھنے کا ثبوت دیا ہو۔ اپنے اور اپنے عزیزوں کے فائدہ کے علاوہ کسی کو کوئی فکر نہ تھی ہم میں نہیں قوم اور دیس کسی کے تصور میں نہ سمائے وہ زندگی کیا ہے جس میں ہم آفتوں سے بچنے کی دعائیں مانگا کریں وہ ملک کیا ہے جس میں ہم چوروں کی طرح رہیں، ڈرتے ہوئے اور سنبھل سنبھل کر اس طرح چلیں جیسے کوئی پرائے کھیت سے آنکھ بچا کر گزرتا ہے، تاکہ جسے یورپ کی قومیں سیاسی زندگی کہتی ہیں ہمارے یہاں ایک طرح کا جوا تھا جس کے کھیلنے کی جرات صرف چند لوگوں کو ہو سکتی تھی۔ شیر کے منہ میں کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا، نہ سمندر کا سفر کوئی تختے پر کرتا ہے۔ قوم کی خدمت بادشاہ کے ذریعہ ہی سے ہو سکتی تھی، اور اس تک پہونچنے کی جو لوگ کوشش کرتے تھے وہ عام طور سے دربار اور درباریوں کے پھندوں میں پھنس کر رہ جاتے۔ یا اگر خدمت شاہی میں پہنچ بھی گئے تو بادشاہ کا خوش رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جو چوکا اس کی عزت بھی گئی اور جان بھی پھر کیا تعجب ہے کہ سمجھدار لوگ سیاسی زندگی سے بھاگتے تھے، اور جوا کھیلنا صرف جواریوں پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اگر ہماری سیاسی زندگی ایک بھنور سی تھی تو اسکے ذمہ دار ہم ہی ہیں، بادشاہ اور انکی تنگ مزاجی کچھ ازل سے ہماری قسمت میں نہیں لکھی تھی اور اگر انہوں نے ہماری زندگی کو بے مزہ کر دیا تھا تو ہمارا فرض تھا کہ ہم اُن کو دور کرتے

یورپ کی قوموں کا ہم پر جو اعتراض ہے وہ واقعی صحیح ہے۔ ہم میں تنقید اور انکار کا مادہ بالکل نہیں۔ نہ ہماری طبیعت میں وہ خودمختاری ہے کہ زندگی کو اپنی آنکھوں دیکھیں اور اپنے تجربے اور فکر سے سمجھیں۔ نہ وہ ہٹ اور ضد کہ جو دل میں ٹھان لیں اُس پر قائم رہیں چاہے رگوں میں ایک قطرہ خون باقی نہ رہے۔ نہ وہ جرأت کہ اپنی کمزوریوں کا اقرار کریں اور صداقت کے لئے لڑنے کا بیڑا اٹھائیں جو کچھ ہوا ہے سو ہوگا، جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا، جو کچھ ہے اسے رہنے دو۔ یہی ہمارا فلسفہ ہے۔ اچھائی اور برائی کا سوال ہمارے سامنے آتا بھی ہے تو ہم کترا کر کسی نہ کسی طرح نکل جاتے ہیں۔ بجائے اپنے راستے سے پتھر ہٹانے کے ہم پتھر کو دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ ہم کو کبھی یہ نہ سوجھا کہ بادشاہت، حکومت کرنے کا ایک طریقہ ہے اور اگر اُس سے فائدہ کی بہ نسبت نقصان زیادہ ہے تو ہمت کر کے دوسرے طریقے بھی آزمانے چاہئیں ہم نے یہ طے کر لیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ بعض نے بادشاہوں کے سامنے گردن جھکا لی، چاہے اُس پر تلوار پڑے یا پھولوں کا ہار بعض نے "عقلمندی" کی اور اس جھگڑے سے الگ رہے۔ ہم ہر قسم کے لگان اور محصول دیتے چلے آئے ہیں، لیکن کبھی اس کی فکر نہ کی کہ ہمارا یہ روپیہ کیسے خرچ ہوتا ہے۔ اُس میں سے ہم کو کتنا واپس ملتا ہے اور کس صورت سے ہم صرف افسوس کرتے رہے اور دیتے رہے۔ زبان سے ہماری سوائے تعریف اور شکریہ کے کبھی کچھ نہ نکلا۔ کبھی ہم نے نہ اپنی رائے کسی بات پر ظاہر کی نہ کسی چیز پر اعتراض کیا "اپنی" حکومت تھی تب یہ حال تھا پرایا راج ہے تب بھی وہی کیفیت ہے۔

جس قوم کے لئے سیاسی آزادی حاصل کرنا ممکن تھا اُس کے مختلف افراد سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی زندگی پر اپنی طبیعت اور خیالات کی مہر لگائیں گے یا شخصی آزادی کے لئے لڑیں گے بالکل بے کار ہے۔ میدان جنگ میں شہید ہونا آسان ہے، وہاں ایک مرتبہ مرنا ہوتا ہے اور وہ بھی جلد ایک آدرش یا نصب العین کے پیچھے (؟) عزیزوں دوستوں اور پوری سماج سے مقابلہ کرنا بہت زیادہ دشوار ہے۔ اس میں ہر گھڑی لڑائی جاری رہتی ہے۔ اور مرتا نہیں بلکہ ہر حالت میں زندہ رہنا شرط ہے۔ مگر آزادیٔ افراد دینی اور دنیاوی بہبود کے لئے سیاسی آزادی سے بھی زیادہ ضروری ہے اسے زندگی کا

نمک سمجھئے جس کے بغیر سب کچھ بے مزہ ہو جاتا ہے اور ترقی کا ہونا یا نہ ہونا اسی پر مبنی ہے جیسے پودوں کا بڑھنا انکے سینچنے پر اس زمانہ میں سیاسی آزادی کی اہمیت کا اقرار عام طور سے لوگ کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ غلط فہمی بھی ہو رہی ہے کہ سیاسی آزادی کافی ہے اور سوراج ملنے پر ہماری سب امیدیں پوری ہو جائیں گی۔ مل نے اپنی کتاب اسی غلط فہمی کے دور کرنے کیلئے لکھی تھی، اور اس زمانہ میں مل کے خیالات پر غور کرنا خاص طور سے ضروری ہے۔

مل نے سیاسی آزادی پر بحث نہیں کی ہے۔ وہ یہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہر قوم کو اپنی حکومت خود کرنا چاہئے۔ اس نے یہ فرض کر لیا ہے کہ قوم آزاد اور خود مختار ہے۔ جیسے کہ انگلستان کی حکومت اس زمانہ میں تھی۔ اور اس کتاب میں وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ محض سیاسی آزادی کافی نہیں اور قومیں اسی وقت ترقی کر سکتی ہیں جب وہ آزادی فرد کا بھی پورا خیال کریں، اور اگر اس معاملہ میں انہوں نے کچھ کمی کی تو بادشاہت اور جمہوریت میں کوئی فرق نہیں، اور سیاسی آزادی ایک بالکل بے معنی شے ہے۔ تاریخ سے اگر ہم کوئی سبق سیکھتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ ترقی خود بخود نہیں ہوتی، بلکہ وہ چند باہمت شخصیتوں کی یادگار ہے، ایک تحفہ ہے جو انہوں نے اپنی قوم کی نذر کیا ہے، ایک پودا ہے جسے انہوں نے اپنے خون سے سینچ سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔ چنانچہ مورخوں کا ایک خاص فرقہ تو تاریخ کو صرف بڑی شخصیتوں کی سوانح عمری قرار دیتا ہے اور کچھ فلسفی بھی ایسے گزرے ہیں جو ساری زندگی کو انہیں شخصیتوں کی دین سمجھتے ہیں۔

ان مورخوں اور فلسفیوں نے اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی عظمت دکھانے کیلئے واقعات کو بیشک بہت کچھ توڑا مروڑا ہے لیکن ان کے اصل دعوے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں جو کچھ ہوا ہے وہ معمولی لوگوں یا عام رائے کے ذریعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر معمولی لوگوں کے باوجود اور انکی رائے کے خلاف ہوا ہے اور جہاں کارلائل اپنے ہیرو کو پوری شان و شوکت کیساتھ تعریف اور تعجب کے لئے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور نیٹشے زردشت کو عقل کل قرار دے کر ہم کو ہماری حماقتیں سمجھاتا ہے وہاں مل کی یہ کوشش ہے کہ ایسی شخصیتوں کے استقبال کے لئے ہم کو آمادہ کرے اور انکی آمد کے لئے راستہ صاف کرے۔ فرق ان تینوں میں صرف اتنا ہے کہ کارلائل بہ حیثیت مورخ کے جو شخصیتیں گزر چکی ہیں

انکی اہمیت دکھاتا ہے۔ نٹشے عام لوگوں کی بزدلی اور عیسائی مذہب کی بہیمیت سے عاجز آکر انسان کامل کا خواب دیکھتا ہے، اور مل بجائے ان دونوں کی طرح بلند پروازی کرنیکے سماج کو اسکا قائل کرانا چاہتا ہے کہ وہ ہر شخص کو آزادی دے جو اس کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

جو آزاد نہیں وہ انسان نہیں، جس کو ہم پوری آزادی دینے سے انکار کرتے ہیں اس کو ہم پورا انسان نہیں سمجھتے۔ یہی مل کے کتاب اور مل کے خیالات کا جوہر ہے۔ مل کے نزدیک آزادی انسان کی ان خاصیتوں میں سے ہے جن کے بغیر وہ انسان نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہی اور تمام خاصیتوں کو حرکت میں لاتی ہے۔ انسان کو خدا نے سمجھ دی ہے لیکن اگر وہ اپنی سمجھ سے کام نہ لے یا دوسرے اسے کام نہ لینے دیں تو اس میں اور دوسرے جانوروں میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ اگر لوگ اپنی سمجھ پر چھوڑ دئے جائیں تو ہزاروں غلطیاں اور حماقتیں کرینگے لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کو انکے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ زبردستی انکو راہ راست پر لانے کی کوشش نہ کریں۔ آدمی کو جانور بنا دینا دوسروں کے لئے ممکن ہے۔ انسان صرف اپنی ذاتی کوشش اور فطرت کی دی ہوئی قابلیت کے استعمال سے ہوسکتا ہے۔

جتنا اس مسئلہ پر ہم غور کرتے ہیں اتنا ہی ہم کو اس کی سچائی اور اہمیت کا اقرار کرنا ہوتا ہے۔ مسلمان عام طور سے اس کی شکایت کرتے ہیں کہ آج کل لوگوں میں وہ مذہبی جوش نہیں رہا جو ایک زمانہ میں تھا، اور جو ہر مسلمان میں ہونا چاہئے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ طالب علم اگر ایک روز ہاکی کھیلنے نہ جائے تو کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ نماز میں غیر حاضر ہو تو استاد خفا ہوتا ہے۔ لیکن ہاکی اور دوسرے ورزش کے کھیلوں کی سب تعریف کرتے ہیں، ان سے جو فائدہ ہے وہ اسے سمجھاتے ہیں، لیکن نماز کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا کافی خیال کیا جاتا ہے کہ خدا کا حکم ہے اور قرآن مجید میں اسکا ثبوت موجود ہے۔ کھیل اور ورزش کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے۔ لڑکے تجربہ سے معلوم کرتے ہیں کہ یہ ہر لحاظ سے انکے لئے فائدہ مند ہے لیکن مذہب کے معاملہ میں ان کو اپنے تجربہ پر چھوڑنا انکے لئے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ دین اگر

انسان کے لئے کوئی اہمیت، ایمان اگر کوئی معنی رکھتا ہے۔ تو اس میں کسی قسم کی زبردستی کرنا غلط ہے۔ مذہب کا مطلب ہے جو کچھ ہو۔ سچا وہ اسی وقت ہے جب انسان نے اپنے تجربے سے اسے سچا ثابت کیا ہو۔ اس سے انکار کرنا گویا اپنے دین اور ایمان سے اپنی انسانیت سے انکار کرنا ہے۔

جہاں تک کہ آزادی خیال اور بحث کا تعلق ہے مل ایسے اصول اور ایسی دلیلیں پیش کرتا ہے۔ اور ایسے صدق دل اور خلوص سے کہ اس کی مخالفت کرنا ناممکن ہے۔ ہمکو بجائے اس کی منطق میں کمزوریاں اور غلطیاں ڈھونڈھنے کے اس سے اپنی آزادی اور اپنی انسانیت کی وسعت کا سبق لینا چاہئے۔
تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہم کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ ترقی انہیں کا حصہ ہے جن کو اپنے اوپر اور اپنی عقل اور سمجھ پر کافی اعتبار ہوتا ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے آزادی لوگوں کو ہمیشہ ڈراونی شکلوں میں نظر آتی ہے۔ بچوں کو مذہب کے معاملہ میں آزادی دیدو گے تو انکے دلوں میں ذرہ برابر بھی دین و ایمان باقی نہ رہیگا۔ انکی اتنی سمجھ نہیں کہ راہ راست پر چل سکیں یا برے بھلے میں فرق کر سکیں۔ جو ایسی دلیلیں پیش کرتے ہیں ان سے اول تو پوچھنا چاہئے کہ یہ ایمان کیا ہے جس میں اتنا اثر بھی نہیں اور وہ ماننے والے کیسے ہیں کہ نہ خود دوسروں کو عبرت دلا سکتے ہیں اور نہ اتنا اعتبار اپنے مذہب پر رکھتے ہیں کہ اسے سچا ثابت ہونیکا موقع دیں۔ عورتوں کے آزاد ہونے سے بھی لوگ اسی طرح گھبراتے ہیں جو خامیاں انکے اخلاق اور انکی طبیعت میں ہیں وہ عورتوں پر تھوپ دیجاتی ہیں اور جہاں انکو اپنی اخلاقی صحت کا خیال کرنا چاہئے وہاں وہ دوسروں کے بیمار ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ عورتوں کی آزادی کے خلاف اس قسم کی دلیلیں پیش کرنا عین بداخلاقی ہے۔ اور کسی توجہ کے قابل نہیں۔

اگر ہم نے آزادی خیال کی ضرورت کا اقرار کیا تو ایک حد تک آزادی افعال سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے۔ دوسروں کو نقصان نہ پہونچے تو ہمیشہ ضرور رہے گی لیکن ایک خاص دائرے کے اندر ہر شخص کو پوری آزادی ملنی چاہئے۔
مل نے اس مسئلہ پر بحث کرتے وقت صرف حکومت ہی کے عمل کو مدنظر نہیں رکھا ہے بلکہ سماج

اور برادری جو ظلم اس معاملہ میں کرتی ہیں اُس پر بھی اس نے کافی زور دیا ہے۔ ڈرنے والے آزادی افعال ہی سے زیادہ ڈرتے ہیں اور یہیں پر آزادی پسند لوگوں کی زیادہ مخالفت ہوتی ہے۔ اگر محض گفتگو میں ایک مسلمان لڑکا عیسائی مذہب کی تعریف کرے تو باپ اُس سے اسقدر ناراض نہیں ہوگا لیکن اگر وہ عیسائی ہوجائے تو باپ بیٹے میں کسی قسم کا رشتہ قائم رہنا مشکل ہے۔ ایسے معاملہ میں ریاست یا حکومت عام طور سے دخل نہیں دیتی یہاں پر جو لڑائی ہوتی ہے وہ سماج اور فرد کے درمیان ہوتی ہے اور یہیں پر آزادی فرد کی حفاظت کرنا سب سے زیادہ مشکل اور ضروری کام ہو جاتا ہے۔

آزادی افعال کی تائید میں نئی دلیلیں پیش کرنا بیکار ہے، اور جب فرد اور سماج میں مخالفت ہوتی ہے تو معاملہ بحث کے ذریعہ سے نہیں بلکہ باغی افراد کی جرأت کے مطابق طے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مِل اسقدر جوش کے ساتھ سماج کو اطمینان دلاتا ہے کہ علاوہ تجربہ کے راہ راست تلاش کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں، اور لوگوں کو جستجو اور دریافت کی اجازت دینے سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا۔

اگر مِل خیالات اور افعال کی آزادی کی حمایت کرتا ہے تو اُسکا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگ اچھائی اور بُرائی میں فرق کرنا چھوڑ دیں، یا بد اخلاقی اختیار کرلیں اور نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ سماج لوگوں کے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہ لے، یا انکے اخلاق پر رائے زنی نہ کرے۔ اُس نے زندگی کا خاص مقصد بہم کی روحانی اور جسمانی، ذہنی اور دنیاوی ترقی کو مقرر کیا ہے، یہ ترقی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب سماج اپنے ارکان کو اسقدر آزادی دے کہ وہ تجربہ اور تخیل کے ذریعہ سے ترقی کا راستہ تلاش کرسکیں۔ سماج کو چاہئے کہ نرالے پن، کجروی، خود مختاری، بے قاعدگی کو بجائے اپنے قواعد و قوانین کے خلاف بغاوت خیال کرنیکے اپنی بھلائی کی کوشش سمجھے۔ اپنے ان ارکان کو جو یہ راستہ اختیار کریں، زندہ دلی اور جرأت کی داد دے۔ اُس کی التجا یہ ہے کہ اگر سماج کی عام رائے اور معمولی قواعد کے مطابق کوئی شخص نہیں چل رہا ہے تو سماج اپنے آپ کو سروگیانی یا ہمہ داں قرار دے کر اس شخص پر کسی قسم کی زبردستی نہ کرے کیونکہ سماج کے ہر رکن کو اپنے آپ کو انسان سمجھنا اور دوسروں کے انسان ہونے کا اعتراف

بھی کرنا چاہیے۔ تاریخ ہم کو دکھاتی ہے کہ لوگوں کے خیالات بدلتے ہیں۔ انکے علم اور تجربہ کا دائرہ بڑھتا رہتا ہے، اور انسان کی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لئے ہم کو اپنی ریت رسم اور خیالات وافعال کو لوہے کا ڈھانچا نہ بنالینا چاہیے جس میں سے سماج کے تمام افراد ایک طرح سے ڈھلے ہوئے نکلیں بلکہ تجربہ اور عقل سے امتحان لیتے رہنا اور ضرورت کے مطابق انہیں بدلتے رہنا چاہیے۔

علم سیاست پر بہت سے فلسفیوں، مدبروں اور سائنس دانوں نے بحث کی ہے لیکن اصل اہمیت اس علم کو صرف چند شخصیتوں نے دی ہے جنہیں نہ فلسفی کہا جا سکتا ہے نہ مدبر و سائنس داں انکے پاس نہ ایک پر درد دل کے سوا کوئی سرمایہ تھا نہ ایک پر جوش محبت کے علاوہ انکا کوئی سفارشی۔ اگرچہ سیاسیات میں اس قسم کے مصنفوں کا بہترین نمونہ روسو ہے، اور اگرچہ مل[1] ایک زبردست عالم اور فلسفی بھی تھا، پھر بھی جس اثر میں یہ کتاب لکھی گئی تھی وہ دل کا ہے دماغ کا نہیں جس شخص کو اپنے ہمجنسوں سے محبت ہو جس کو اپنی روحانی اور باطنی زندگی کی فکر ہے، جس کے دل میں اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی سچی خواہش ہے وہ اس کتاب کی عزت کریگا اور اُس کی خامیوں کے باوجود بھی اس سے محبت کرتا رہے گا۔

---

[1] ۲۰ رمئی ۱۸۰۶ء کو لندن میں پیدا ہوا، اور ۸ رمئی ۱۸۷۳ء میں جنوبی فرانس کے شہر آوی نیون میں اُس کا انتقال ہوا۔ اُس کی زندگی میں وہ سارا زمانہ آجاتا ہے جس کے علمی سیاسی اور ادبی کارنامے انیسویں صدی کو ایک خاص اہمیت دیتے ہیں، اور مل کی شخصیت ایسی تھی اور اُسکی تعلیم اس طور پر ہوئی تھی کہ وہ ہر قسم کی تحریکوں میں پورا حصہ لے سکا۔

جس زمانہ میں بچے کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں، مل نے یونانی اور روسی زبان سیکھلی تھی، لڑکپن میں اُس نے قدیم ادب سے پوری واقفیت حاصل کرلی، اور بیس برس کی عمر تک اُس کی معلومات جدید علوم میں بھی اس قدر ہو گئی تھی کہ وہ بخوبی ان مسائل میں بھی رائے دے سکتا تھا جو اُس زمانہ کے روشن خیال اور قوم پرست لوگوں میں زیر بحث تھے اس کی تعلیم اس کے باپ جیمز مل نے اپنے ذمہ لے لی تھی اور شروع سے مل کو علمی، سیاسی، اور معاشی نظریوں اور اُن کو عمل میں لانے کے طریقوں سے صرف

بھی دلچسپی ہی نہیں بلکہ انکو اپنی دریافت کے ذریعہ سے ترقی دینے کی قابلیت بھی اسمیں پیدا ہو گئی تھی۔ جیمز مل علاوہ عالم ہونیکے سیاسیات، اخلاقیات اور معاشیات میں اپنے ذاتی عقیدے بھی رکھتا تھا اور مل کی پرورش انہیں عقیدوں میں ہوئی باوجودیکہ جیمز مل کی یہ خواہش تھی کہ اُس کے خیالات کا پرچار اُسکے لڑکے کے ذریعہ سے ہو مگر وہ یہ کسی طرح سے نہیں چاہتا تھا کہ مل انہیں بغیر سوچے سمجھے یاد کرلے اُس کا ہر وقت اس پر اصرار رہتا تھا کہ مل اپنے عقیدوں کے نئے نئے ثبوت دریافت کرتا رہے، اور اپنی تعلیم کو تنگ نظری یا تعصب کی وجہ سے ناپسندیدہ یا بیکار نہ بنا دے۔

یہی وجہ ہے کہ بچپن اور جوانی میں اسکا تعلق جیمز مل، رکارڈو اور بنتھم سے تھا۔ مل کو وہ حیثیت مل گئی جو بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے زمانہ کے خیالات اور تحریکوں سے واقف ہی نہیں تھا بلکہ اپنے سے ایک قرن پہلے کے خیالات کا بھی خزانہ اپنے دماغ میں رکھتا تھا۔ ایڈم سمتھ اور رکارڈو کی معاشی تعلیم، بنتھم کی افادیت اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ کی دینیات، فلسفہ، منطق سب مل کے ہاتھوں میں تکمیل پاتی ہیں، اور وہ صورت اختیار کرتی ہیں جو اُس زمانہ کے تخیل کے لئے مخصوص ہے بیل ان تمام لوگوں کا جیسے بڑھاپے میں نمائندہ تھا، ویسے ہی اب بھی ہے۔ اگر ہمیں اُس زمانہ کے تخیل کی کسی شاخ سے واقفیت پیدا کرنی ہو تو ہمیں مل کی کتابیں پڑھنا ضروری ہوں گی، کیونکہ مل ہی نے اُس تخیل کو ترتیب دیا، اور پچاس برس کے تجربہ کے بعد کاٹ چھانٹ ضروری تھی وہ بھی اُسی کے ذریعہ سے ہوئی۔

مل نے اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کی صورت بدلتی دیکھی، نئی مشکلات، نئے سوالات پیش ہو رہے تھے، تجربہ ہر طرف سے نئے سبق سکھا رہا تھا۔ جب مل نے اپنی تعلیم مکمل کر کے نئی دنیا میں قدم رکھا۔ اُسوقت فرانسیسی انقلاب میدان جنگ میں شکست کھا کر یورپ کی سیاست پر رفتہ رفتہ اپنا اثر ڈالنے لگا تھا۔ یورپ کے تمام ملکوں میں آزادی پسند لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی جمہوری حکومت کی خواہش ہر جگہ پیدا ہو رہی تھی جس زمانہ میں مل نے سیاسی معاملات پر اپنی کتاب "آزادی" لکھی اس وقت بالکل دوسری حالت تھی۔ انگلستان میں ۱۸۳۲ء کے "قانون اصلاحات" نے سیاسی مسائل کو بالکل نئے ر

صورت دیدی تھی اور جہاں شروع میں لوگ پارلیمنٹ کو چند رؤسا اور زمینداران کے قبضہ سے نکال لینے کی فکر میں تھے اُن کو ۱۸۵۰ء میں یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں جمہوریت کے راج میں شخصیت تباہ ہو جائے۔ یورپ میں انقلابی جوش بہت پیدا ہو گیا تھا اور جہاں ۱۸۲۰ء کی ویانا کی کانگریس میں تمام ریاستوں نے انقلاب اور انقلابی اصولوں کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا وہاں ۱۸۴۸ء میں انقلاب کے طوفان نے قریب قریب ہر ریاست کی کشتی کو ڈبو دیا تھا۔

جس دنیا کی ضرورتوں کے لحاظ سے مل کو معاشیات کی تعلیم دی گئی تھی وہ بھی مل کے بڑھاپے میں بدل گئی تھی صنعت و حرفت کے انقلاب کے شروع میں تجارت اور تاجروں کو آزادی کی ضرورت تھی سرمایہ دار اور مزدور کے تعلقات، اگرچہ وہ اچھے کبھی نہیں تھے پھر بھی اس زمانہ میں وہ سماجی اور سیاسی اہمیت نہیں رکھتے تھے جو بعد کو انہیں حاصل ہوئی۔

اخلاقیات میں مل اپنی تعلیم کے لحاظ سے افادی تھا، بنتیم کے افادی اصول جب تک کہ انگلستان میں قانونی سدھار کی گنجائش رہی، اپنی سچائی اور فائدہ مندی کا ثبوت دیتے رہے جب مل نے افادیت پر اپنی کتاب لکھی قانونی سدھار کی تکمیل ہو چکی تھی۔ پارلیمنٹ نے بھی اپنے دروازے کھول دئے تھے۔ افادیت کو اب یا تو آثار قدیمہ میں شامل کرنا، یا اُسے ایک مستقل اخلاقی اصول ثابت کرنا تھا۔

مل میں نہ عقیدہ کی کمزوری تھی کہ وہ ایسے اصولوں کو جنہیں اُس نے زندگی بھر صحیح اور سچا سمجھا تھا لوگوں کے اعتراض کی وجہ سے چھوڑ دے اور نہ اتنا تنگ نظر یا متعصب تھا کہ جو خامیاں اسے اپنے عقیدہ میں نظر آئیں انکا اقرار نہ کرے یا انکو دور نہ کرے۔ لیکن وہ خیالات اور عقیدے جن میں اُس نے پرورش پائی تھی، اُسے ناکافی معلوم ہوتے رہے اور اگر ہم اُسکی تصانیف کا ان مضامین سے مقابلہ کریں جو اُس نے جوانی میں لکھے تھے تو ہم پر ظاہر ہو جائے گا کہ اُس کے خیالات میں کیسی تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن مجموعی حیثیت سے مل اُسی زمانہ کا نمائندہ رہا جس میں اُس کی پرورش ہوئی تھی، اور ہمارے لئے بھی اُس کی خاص اہمیت ہے۔ اُسکا تخیل ایک کڑی ہے جو زمانوں کے خیالات کو جوڑتی ہے ایک بلندی ہے جس پر سے ہمیں نئی اور پرانی دنیا دونوں نظر آتی ہیں۔ مل نے ایک عمر کے خیالات جذب

کرکے دوسری پشت کو سمجھائے، اور جو تبدیلیاں زمانہ نے پیدا کردی تھیں اُن کی پوری داد دی۔

اور یہ عرض کیا گیا ہے کہ بینتھم کی افادیت کے لئے جب "قانون کی معیار" کی تکمیل ہو چکی، اس وقت علمی دنیا میں کوئی خاص کام باقی نہیں رہ گیا، اور اُس پر ہر طرف سے اعتراض ہونے لگے کیونکہ اُس کے حامیوں نے اس کے ایک دائمی اخلاقی اور سیاسی اصول ہونے کا دعوٰے کیا، افادیت کو جو خالص بنیادی رنگ بینتھم اور اُس کے ہمخیال لوگوں نے دیا تھا اس کی وجہ سے وہ کسی طرح ایک اخلاقی اصول نہیں بن سکتا تھا[1]، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی "افادیت" میں، اور ایک دوسری جگہ "آزادی" میں بھی مل افادیت کو اس قدر مادی نہیں بناتا۔ "ایک غیر مطمئن سقراط ایک مطمئن بیوقوف سے اچھا ہے" اس ایک جملہ میں اس نے اُن تمام اعتراضات کو تسلیم کرلیا جو افادیت پر کئے گئے تھے، لیکن افادیت کا وہ پھر بھی قائل رہتا ہے جیسا کہ "آزادی" میں اُس نے لکھا ہے کہ "اخلاقیات کے تمام مسائل میں میں افادہ کو سب سے آخری معیار سمجھتا ہوں" یعنی "اخلاقی تعلیم میں میں ہمیشہ اس کا خیال رکھوں گا کہ لوگوں کو اُس سے فائدہ بھی پہنچتا ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کتنوں کو"۔ افادیت آج کل ایک پرانی خیالی عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے لیکن لوگ اُس کی تاریخی اہمیت اور اُسکی خدمات کا اقرار بھی کرتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ مل کی شخصیت ہے۔

اگر ایک اور مثال کے طور پر ایڈم اسمتھ کے چند نظریے لیں تو مل کا اثر اور اُس کی حیثیت علوم کی تاریخ میں ہمیں اور صاف نظر آنے لگے گی۔ ایڈم اسمتھ "آزاد تجارت" کا بڑا حامی تھا، اور اُس کے خیال میں ریاست کے لئے سب سے مناسب پالیسی یہ تھی کہ وہ معاشی معاملات میں دخل نہ دے، لیکن پارلیمنٹ نے ۱۸۱۵ء سے کوشش کی کہ قانون کے ذریعہ سے اناج کا بھاؤ اونچا رکھے، صرف اس وجہ سے کہ پارلیمنٹ پر زمینداروں کا بہت اثر تھا اور اس طرح سے ملک میں کئی سال تک ایک مصنوعی قحط رہا

---

[1] افادیت کی ساری تعلیم بینتھم کے اس مشہور جملہ میں موجود ہے "زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی" لیکن ہر شخص اپنی بھلائی کی تعریف اپنے طور پر کرتا ہے اور جس سے ایک کو فائدہ ہوتا ہے، دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے، مگر افادیت کے حامیوں کی رائے میں یہ معلوم کرنا ممکن تھا کہ کس چیز سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آسایش ہوتی ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں آسایشوں کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی جو

کے نام سے مشہور ہے۔

اس حرکت نے "آزاد تجارت" کے حامیوں کو اپنے عقیدے میں اور مضبوط کر دیا، اور بجائے حکومت کی چند حرکتوں کی مخالفت کرنے کے روشن خیال لوگ عام طور سے حکومت کی مداخلت ہی کے دشمن ہو گئے اور جو تحریک چند معاشی قوانین کی مخالفت کے لئے شروع ہوئی تھی اس نے ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت اختیار کر لی جو ۱۸۴۸ء سے کوئی پندرہ برس کے عرصہ میں ایک عام عقیدہ بن گئی اور جواب بھی ایک حد تک قائم ہے۔ اس تحریک کی بنیاد دراصل حکومت کی طرف سے بدگمانی تھی۔ پارلیمنٹ پر چند بااثر لوگوں کا قبضہ تھا جو اپنی اغراض اور اپنے فائدے کے مطابق قانون پاس کراتے تھے۔ انہی "خود غرضانہ مفاد" کی مخالفت بیتھم کو بھی کرنی پڑی تھی، یہی لوگ باوجود قوم کی کوششوں کے تجارت کی آزادی پر راضی نہیں ہوتے تھے، یہی لوگ مزدوروں کی خراب حالت دیکھ کر بھی انکو زبردستی اسی مزدوری کے نرخ پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ اور انہی لوگوں نے ٹریڈ یونین وغیرہ کو خلاف قانون قرار دیا تھا تاکہ مزدوروں کے پاس مزدوری بڑھانے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔ ان سب باتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن رفتہ رفتہ پارلیمنٹ ان لوگوں کے اثر سے نکل رہی تھی۔ حکومت کی بنیاد قوم کی رضامندی قرار پائی اور اسکا مقصد قوم کی فلاح و بہبود تھا۔ تجربہ نے یہ دکھا دیا تھا کہ بہت سے معاملات بغیر حکومت کی مداخلت کے نہیں طے ہو سکتے۔ سیاسی زندگی کے بہت سے فرائض تھے جو صرف حکومت پورے کر سکتی تھی اور اس لئے اس کی طرف سے بدگمانی رکھنا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا تھا۔

اس مسئلہ میں بھی مل گذشتہ موجودہ اور آئندہ کو پیوستہ رکھتا ہے اس کے زمانہ کا عام رجحان اگر ہم ہربرٹ اسپنسر کے نظریوں کو انفرادیت کی انتہا قرار دیں، جیسا کہ واقعہ ہے، انفرادیت کی طرف تھا اس سے پہلے یا تو سیاسی معاملات کی طرف سے بے توجہی تھی یا حکومت قوم کو بھلائی پہنچانے کا ایک کیلا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ ۱۸۷۰ء کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے اثر کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، قوم اور حکومت میں کسی قسم کی بدگمانی باقی نہیں رہتی، اور بجائے حکومت کی مداخلت پر اعتراض کرنے کے قوم اس کی اور مدد کرتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مل خود انفرادیت کا قائل تھا لیکن اس میں اور اس کے زمانہ کے

سیاسی فلسفیوں میں بڑا فرق ہے۔ اسپنسر ریاست کو محض قوم یا سماج کے جان و مال کی حفاظت کا کام سپرد کرتا ہے
اس کی رائے میں بڑی خدمت جو وہ سماج کی کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اُسے اپنے حال پر چھوڑ دے اور سماج
کو چاہئے کہ جہاں باہر کے چوروں اور ڈاکوؤں سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتی ہے وہاں اس گھر کے چور
پر بھی نظر رکھے یعنی ریاست کو اپنے معاملات میں دخل دینے سے اور اپنی آزادی کے محدود کرنے سے روکے
یہ سب کچھ کہنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسپنسر ریاست کو ضروری نہیں سمجھتا اور زندگی کا مرکز اور اس کی چلانے
والی طاقت اُس کے نزدیک مختلف افراد ہیں، انفرادیت اُسکا مذہب ہے، فرد کی عقل اور سمجھ کے علاوہ زندگی
میں اسے اور کوئی روشنی نظر آتی نہیں۔

انسان کی وقعت اور اہمیت پر زور دینا بہت قابل تعریف بات ہے۔ لیکن اسپنسر جس انسان کے
لئے میدان جنگ میں آتا ہے وہ انسانیت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں، اسپنسر کا فرضی انسان، جس کو وہ "میدان
آدمی" کہتا ہے، محض ایک تاجر ہے، جس کا نقطہ نظر خالص بیوپاریوں کا ہے، یعنی اُسے تمدن، تہذیب
اور اُن دلچسپیوں سے جن کو عام رائے نے اس زمانہ تک انسانیت کا خاص حصہ سمجھا ہے، کوئی مطلب نہیں
سماجی، سیاسی، ادبی زندگی کو وہ اگر حقارت نہیں تو بے قدری اور بے پروائی کی نظر سے ضرور دیکھتا ہے
ریاست اُس کے نزدیک ایک نظام ہے جو دشمنوں سے لڑنے اور چوروں اور ڈاکوؤں سے حفاظت
کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگرچہ وہ ان خدمات کا شکریہ ادا کرنے پر تیار ہے، پھر بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ ریاست
اُس کے معاملات میں کسی قسم کا دخل دے، کیونکہ ریاست اُس کے معاملات کو اس سے بہتر نہ سمجھ سکتی
ہے نہ انجام دے سکتی ہے۔

مل ان تمام غلطیوں سے بچا ہوا ہے۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ سماجی زندگی کو وہ اہمیت نہیں دیتا
جو دراصل دینا چاہیئے لیکن انسانیت کو وہ اس کے بدلہ میں بہت اعلیٰ مرتبہ دیتا ہے۔ اسپنسر کے تخیل پر
سائنس نے ایسا قبضہ کر رکھا ہے اور اُس میں اتنی بھاپ بڑھ گئی ہے کہ وہ پٹریوں پر چلنے پر بھی راضی
نہیں۔ مل سائنس کو انسان کے بہترین مشاغل میں شمار کرتا ہے، لیکن اُس کی نظر سائنس کے دھوئیں میں
گم نہیں ہو جاتی۔ اسپنسر نے ریاست اور حکومت کا فرق بھول کر دونوں کو اپنے "سیدھے" آدمی کا دشمن

دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مل اگر ریاست اور حکومت کی مداخلت کا قائل نہیں، پھر بھی اُس کی انفرادیت محض ایک اونے بیوپاری کی خود غرضی کا بنایا ہوا اصول نہیں اور نہ اُس کے نزدیک اسپنسر کا "سیدھا" آدمی انسانیت کا بہترین نمونہ ہے۔ انسان کی آزادی کا خیال اُس کے دل میں ایک سچا جوش پیدا کرتا ہے، اور آزادی کے اُس نے بہت وسیع معنی لئے ہیں۔

اپنے زمانہ میں اسپنسر کا اثر بے شک زیادہ تھا، کیونکہ اس نے اپنے نظریوں کو سائنس کے بھیس میں پیش کیا تھا، اور سائنس کا اُس وقت لوگوں کے دلوں پر بہت رعب چھایا ہوا تھا۔ آج کل سائنس کا جو سیاسیات میں دخل ہے اُسے لوگ بہتر سمجھتے ہیں، یا یہ کہئے کہ علاوہ نفسیات کے اور کسی سائنس کو سیاسیات میں دخل نہیں رہا، اور اسپنسر کے نظریوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ مگر مل کی قدر اتنی ہی ہوتی رہی۔ ریاست کے معاملہ میں لوگوں کی رائے بدل گئی ہے، لیکن انسان اور انسانیت کی وقعت نہیں گھٹی اور زندگی کے آدرش یا نصب العین جو مل نے قرار دئے تھے، اگرچہ اُن میں خامیاں بھی ہیں، لیکن وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

معاشی معاملات کے علاوہ ریاست کی مداخلت کے بارے میں مل کا جو خیال ہے وہ اس بحث میں بخوبی ظاہر ہوتا ہے جو وہ ریاست اور تعلیم پر کرتا ہے۔ مفت اور جبری تعلیم کا وہ حامی ہے۔ اسپنسر کی طرح وہ اسے ضروری نہیں سمجھتا کہ ریاست کو اس معاملہ سے بھی دور رکھنا چاہئے۔ ریاست کیطرف سے تعلیم دلانیکے خلاف اگر کچھ کہا جاتا ہے تو اسکا یہ مقصد نہیں کہ ریاست سے تعلیم لازمی نہ کرائی جانے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ریاست کو اپنے اغراض کے مطابق تعلیم دینے سے روکا جائے۔ بالکل دوسری شے ہے۔ بڑے پیمانہ پر تعلیم کا انتظام صرف ریاست ہی کے لئے ممکن ہے لیکن مل نہیں چاہتا کہ تمام تعلیمی نظام اور اسکول وغیرہ ریاست کے قبضہ میں آجائیں، کیونکہ اسکا اثر برا ہوگا۔ عام ریاست کیطرف سے تعلیم صرف ہر شخص کو دوسرے جیسا بنانے کی ایک ترکیب ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں کے ساتھ ریاست کیطرف سے اسکولوں وغیرہ کا ہونا یا ریاست کیطرف سے پرائیویٹ اسکولوں کو مالی امداد دینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ عام تعلیم افراد پر نہیں چھوڑی جاسکتی، اور اگر اس زمانہ میں ریاست اسقدر بے دخل نہیں ہے جتنا کہ مل چاہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسپنسر سے اس کی رائے واقعات کے نقطۂ نظر سے زیادہ صحیح ثابت ہوئی۔

اسپنسر کا یہ خیال تھا کہ سیاسی مسائل کو ہمیں نیچرل سائنس، خاص طور سے حیاتیات (بالولوجی) (دیکھو صفحہ ۲۸)

حکومت کی خرابیوں اور اُس فرقہ[1] کے خیالات نے جس میں اسپنسر کی پرورش ہوئی تھی اُسے ریاست کا دشمن اور انفرادیت کا حامی بنا دیا تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ جب سے حکومت پر جمہور کا اثر پڑنے لگا ہے حکومت کی طرف سے بدگمانی جاتی رہی اور اُس کے ساتھ اسپنسر کے نظریے بھی۔ اور اگرچہ اب بھی بہت سے ایسے اہل فکر موجود ہیں جو انفرادیت کو سیاسی اکسیر سمجھتے ہیں لیکن ریاست کی پالیسی، عام رائے اور وقت کا تقاضا بالکل دوسرا ہے اسپنسر ایک زمانہ کے خیالات کو ظاہر کرتا ہے، اگر ہم اسکا مقابلہ اس سے پہلے کے خیالات سے کریں تو مل کی انفرادیت ایک کڑی ہے جو دونو کو جوڑتی ہے، اور اگر ۱۸۷۰ء کے بعد کی اجتماعیت سے کریں تب بھی مل کی حیثیت وہی رہتی ہے اُس نے اپنے سے پہلے کے خیالات جذب کر لئے تھے، اور اس کے زمانہ کے جو خیالات تھے وہ بھی، لیکن اُس نے اپنے تخیل کو ایسی وسعت دی تھی کہ آئندہ تحریکوں سے بھی اُس گا گہرا تعلق رہا کیونکہ اگرچہ موجودہ زمانہ کی سخت گیر تنقید کے سامنے انفرادیت سیاسی پالیسی کی صورت میں نہیں ٹہر سکتی تاہم مل نے آزادی کے جو معنی قرار دئے ہیں، اور اصلی آزادی سے اُس نے انفرادیت کا جو تعلق دکھایا ہے وہ کبھی کسی تنقید کے ذریعہ سے غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) کے اصول اور قوانین کے مطابق حل کرنا چاہئے۔

[1] اسپنسر پیدائشی مذہب کے لحاظ سے اس فرقہ میں شامل تھا جو انگلستان کے ریاستی کلیسا کے عقائد کا قائل نہ تھا۔ یہ فرقہ کئی صدیوں سے ریاست اور کلیسا دونوں کی مخالفت کے باوجود ابھی تک قائم ہے، اگرچہ مصیبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مخالف کلیسا کے لئے ریاست کا دوسرا بنا تھا۔

ہوتا ہے جس کے ذریعہ روح اپنے اعلیٰ ترین نغموں کو سناتی ہے۔

حقیقت تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پر بیخودی طاری ہو۔ شاعری انسان میں سب سے زیادہ بیخودی پیدا کرتی ہے۔ کسی اخلاقی یا معاشرتی مصلح یا مدبر کے لئے اظہارِ خیال کے وقت بیخود ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کے فرائض اور دلچسپیوں کی نوعیت اسے ناگزیر طور پر خارجی دنیا سے وابستہ رکھتی ہے۔ ایسے کم اخلاقی یا معاشرتی مصلح ہونگے جو اپنے کو خارجی دنیا کے علائق سے متاثر نہ ہونے دیں لیکن شاعر کے لئے خارجی دنیا محض ایک محرک کا کام دیتی ہے۔ اسے قید نہیں کرتی یعنی اس کے علائق شاعر کی ساری توجہ کو اپنی طرف کھینچ نہیں لیتے۔ اگر ایسا نہ ہو اور یہ ایک معینہ حد سے زیادہ اثر اور اہمیت حاصل کرلے تو یہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ شاعری ختم ہو رہی ہے اور عملی قوتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ شاعر پھر ایک عملی انسان بن جاتا ہے۔

شاعری کا سچا کیف جو ماحول کے علائق سے شاعر کو متاثر نہیں ہونے دیتا، انسانی روح کی ارفع ترین تخشی ہے کے سامنے اپنی نذر پیش کرتا ہے۔ اسی نذر کو میں "روحانی کلام" کہتا ہوں۔ روحانی کلام ان تصورات ہیں بخشتا ہے جو شاعر کے دماغ میں گزرا کرتے ہیں۔

ٹیگور

دوسروں کو بھی ایسے تصورات نظر آسکتے ہیں لیکن وہ یا تو ان کو یونہی محو ہو جانے دیتے ہیں علوم ہو یا بہت کم اثر لیتے ہیں۔ اگر زیادہ اثر ہوتا بھی ہے تو اس قسم کا جو انہیں فوراً کچھ کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے لیکن شاعر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا۔ اس کی خدا داد قوت کا ایک دوسری طرح عمل ہوتا ہے۔ وہ تصورات کو اپنے فن کے سنہری جال میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پھنسا لیتا ہے۔ وہ انہیں غیر فانی بنا دیتا ہے تاکہ دوسرے بھی انہیں دیکھ سکیں اور حقیقت تک پہنچ سکیں۔ ذیل میں ایک شاعر کے چند سطور درج کئے جاتے ہیں جس سے روحانی کلام کی مثال واضح ہوگی۔

خیال کی ابتدائی تحریک خارجی دنیا کیطرف سے ہوتی ہے۔ غریبوں کی انتہائی مصیبت اور انکی دردناک بیکسی، انکا پر حسرت صبر و شکر، یہ باتیں شاعر کے حساس دماغ پر اثر ڈالکر حالت فکر طاری کرتی ہیں شاعر سوچ میں ڈوب جاتا ہے غریبوں کے مصائب کا خیال کرکے اسکا دل کڑھتا ہے اور وہ اپنے

دل سے یہ سوال کرتا ہے کہ آخر خدا کا انصاف کہاں ہے، خدا ان سے محبت کیوں نہیں کرتا، ان پر ترس کیوں نہیں کھاتا؟ پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ خدا وہی خدا جس پر اسکا کامل ایمان ہے، بذات خود دنیا کی ان فقیر ترین ہستیوں کے ساتھ رہتا ہے، انہیں کے لباس میں انکا دوست۔ انکا ساتھی، انکا رہنما بنکر۔ شاعر فرط انبساط سے اچھل پڑتا ہے اس کے دل سے اللہ اکبر کی صدا نکلتی ہے، اور وہ جذبہ پرستش سے بے اختیار ہو کر سربسجدہ ہو جاتا ہے۔ مگر محسوس کرتا ہے کہ اسکا سر جھک کر بھی اس ہستی تک نہیں پہنچ سکتا جہاں خدا کے قدم "مفلسوں، فقیروں، اور گم گشتگوں کے ساتھ رہتے ہیں!"۔

یہی تصور اسکو شاعر نے روحانی کلام کی صورت میں لا کر غیر فانی بنا دیا ہے۔ ہم جو اس روحانی کلام سے واقف ہیں، جب بھی چاہیں انہیں پڑھ پڑھ کر شاعر کی طرح سمجھیں اور جو کچھ اس نے دیکھا خود بھی دیکھیں۔

آئیے اب ایک ایسے آدمی کا خیال ذہن میں لائیں جو شاعری کی بجائے عمل کی خداداد قوت بھی رکھتا ہے۔ اسے بھی ایسا ہی تصور نظر آ سکتا ہے۔ وہ بھی ان غم زدوں کی حالت پر غمگین دل کیساتھ میں ڈوب سکتا ہے۔ اس غور و فکر کے وقت میں خارجی دنیا، جو اسکا موضوع فکر ہوتی ہے، اس سامنے غیر معمولی اہمیت حاصل کر کے اسے براہ راست عمل کیطرف لیجاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو مفلسوں، حقیروں، اور گم گشتگوں سے جا ملاتا ہے۔

ایک شاعر اور عملی انسان میں یہی فرق ہے۔ وہ خارجی دنیا جو عملی انسان کے سامنے ہوتی ہے اس سے اپنی خدمت اور اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے۔ عملی انسان اس مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے لیکن شاعر خارجی دنیا کے پنجے میں نہیں آتا۔ وہ اس کے مطالبہ کے جواب میں شعر کہدیتا ہے۔ شاعر کے جواب کو میں اپنی اصطلاح میں "روحانی کلام" کہتا ہوں اور عملی انسان کے جواب کو "روحانی عمل" دونوں روح ایک ہی کیفیت کی پیداوار ہیں۔ لیکن ایک ہی کیفیت کا دو طرح اظہار کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس لئے کہ شاعر کی دماغی ساخت عملی انسان کی دماغی ساخت سے مختلف ہوتی ہے

مضراب ایک ہی ہوتا ہے۔ ساز دو ہوتے ہیں۔ ایک کا نغمہ روحانی کلام ہے دوسرے کا نغمہ روحانی عمل

لیکن میرا دعوٰے ہے کہ شاعر اور عملی انسان میں فرق یہ نہیں ہے کہ وہ بے عمل ہے اور یہ باعمل

ایک شاعر، عارف، جو حقیقت کا دیدار و مشاہدہ کر سکتا ہے اور اپنے واردات قلب کو غیر فانی بنا کر ہر زمانہ کے لوگوں کو اپنا ہم آہنگ بنا سکتا ہے، اسکا شعر کہنا بھی اسی طرح عمل ہے جس طرح کسی عملی انسان کی ٹھوس محنت

فرق صرف یہ ہے کہ وہ عالم معقول میں ہوتا ہے اور یہ عالم محسوس میں۔

کچھ اور کہنے سے قبل میں مثلاً رابندر ناتھ ٹیگور کو ایک بڑے شاعر اور مہاتما گاندھی کو ایک بڑے عملی انسان کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں جن میں سے ہر ایک ان اوصاف سے متصف ہے جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔

اس سے میری یہ مراد نہیں کہ دونوں اپنے اپنے دائرہ عمل کے اسقدر پابند ہیں کہ دوسرے کے دائرہ عمل میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ فطرت نے دونوں کو جو غیر معمولی صلاحیتیں بخشی ہیں انہیں سے کسی ایک کا حقیقی مدعا دوسرے کے دائرہ عمل میں کام کرنے سے نہیں پورا ہو سکتا ٹیگور صرف شاعروں ہی کے سرتاج نہیں ہیں۔ وہ صرف بلندی تخیل اور ملکہ شعر گوئی ہی نہیں رکھتے بلکہ ایک عملی انسان کے اوصاف بھی رکھتے۔ اور بہت سے مفید خیالات کو عملی جامہ بھی پہنا چکے ہیں۔ انہوں نے بھی خدمت خلق کا بیڑا اٹھایا ہے اور دنیا کے سرگرم خادموں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مہاتما جی کی عظمت کا ثبوت صرف میدان عمل ہی میں نہیں ملتا۔ فکر و تخیل کی سلطنت میں بھی ان کے لئے جگہ ہے۔ انہوں نے بھی چشم تخیل سے محبت اور حسن و ہمدردی کے دلفریب پیکروں کا نظارہ کیا ہے۔ انہوں نے بھی حسن اور عظمت کے ایسے تخیلات کو وجود بخشا ہے جن سے روح ہتزاز کرتی ہے اور جو ہمیں اپنے تنگ گھروں سے نکال کر امید اور محنت کی وسیع دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کی ممتاز خصوصیت روحانی کلام اور دوسرے کی روحانی عمل ہے۔

جس وقت کلام کا بادشاہ عمل کی سلطنت میں قدم رکھتا ہے تو اپنے کو لازمی طور پر گزور پاتا ہے یہی حال عملی انسان کا ہے جب وہ کلام کی سلطنت میں گامزن ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں سے ہر ایک اپنے

کو ایک ایسے عالم میں پاتا ہے جس کی بیشتر چیزیں اسے نئی، عجیب اور بعض اوقات بے معنی نظر آتی ہیں جب وہ ٹیگور گاندھی کی دنیا میں آکر چرخوں اور دستکیوں کی سمع خراش آوازوں کو سنتے اور نفس کش، راہب نما کارکنوں، ان کے موٹے کپڑوں، گرد آلود پیروں، اور عرق آلود چہروں پر نظر ڈالتے ہیں تو خواہ ان کا دماغ یہ سمجھ سکے کہ ان مشقتوں کی تہ میں غریبوں سے محبت و ہمدردی کا جذبہ کام کر رہا ہے لیکن وہ گھبرا کر ضرور کہہ اٹھتے ہیں کہ بھلا یہ دنیا اپنی باضابطگیوں اور لامتناہی مشقتوں کے ساتھ میری منور، معطر اور پر نغمہ دنیا کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے، جہاں کا آسمان قدرت کے بوقلموں رنگوں سے رنگین و روشن ہے، جہاں کے گل بوٹوں سے محبت کی خوشبو نکلتی ہے، اور جہاں کے پرندے نغموں کی آتش سیال کا جام پیش کرتے ہیں اسی طرح مہاتما گاندھی، جنہوں نے اپنے حواس وجذبات پر قابو حاصل کر کے انہیں عقل اور قوت ارادی کے تابع کر لیا ہے۔ ٹیگور کی دنیا میں داخل ہو کر یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس عیش و نشاط کے کیا معنی جب دنیا کی وسیع بستی میں لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، جب افلاس سے مفلسوں کی جھونپڑیاں تاریک اور روحیں تاریک تر رہتی ہیں اور جب ہر شخص کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ غریبوں اور ضرورتمندوں کی حاجت روائی کرے۔ یہ ٹیگور اور گاندھی کے اختلاف طبع کا ہی نتیجہ ہے کہ ایک چرخہ کے امکانات کو نہیں سمجھ سکتا اور دوسرا فنون لطیفہ کے پیام کو۔

شاعر کا دماغ عموماً باتوں کی تحلیل نہیں کر سکتا۔ وہ فطرتی طور پر ترکیب کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے دوسری طرف اخلاقی حیثیت، جس کا اثر مہاتما گاندھی پر غالب ہے، جمالی حیات کو ابھرنے نہیں دیتی۔

جو شخص اپنی فطرت کے ایک ہی حصہ کی تکمیل چاہتا ہے، ممکن ہے اس کوشش میں کامیاب ہو۔ مگر وہ اس پوری تکمیل سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو ہر دو حصص کی متناسب تکمیل سے ممکن ہے

برگسان نے اپنی کتاب مابعد الطبیعات میں لکھا ہے کہ کسی بات کا مفہوم سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کی کوشش میں عقل کو اس کے گرد گھیر دیتا رہے بلکہ چاہئے کہ روحانی اتحاد کے ذریعہ جسے وہ وجدان کہتا ہے، اس چیز کی تہ تک پہنچ جائے، اور پھر آنکھ کھول کر دیکھے۔

حقیقت تک پہونچنے کا بہترین ذریعہ یہی وجدانی ذریعہ ہے عقل کیلئے بیش از بیش یہ ممکن ہے

کہ وہ مسئلہ کے کسی ایک رخ کو کسی خاص نقطۂ نظر سے دیکھے لیکن وجدان سے مسئلہ کی پوری نوعیت کا انکشاف ہو جاتا ہے۔

یہ وجدان شاعر میں بھی ہوتا ہے اور عملی انسان میں بھی۔ لیکن اسی وقت تک جب تک کہ وہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں ہوں۔ اس لئے کہ وجدان مجموعی شخصیت کی ایک صفت ہے۔ شاعر کی شخصیت کا رجحان عالم معقول میں تخلیق کی طرف ہوتا ہے۔ اور عملی انسان کی شخصیت کا رجحان عالم محسوس میں عمل کیطرف۔
ممکن ہے کبھی شاعر ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر عالم معقول میں سرگرم عمل ہونا چاہے۔ مگر چونکہ یہاں کام کرنا اس کی شخصیت کے رجحان کے خلاف ہوگا۔ وجدان اس کی رہنمائی نہیں کرے گا اور اسے صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرنا پڑے گا جو خام ہونیکی وجہ سے حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی۔ پس اسکے کام کی حالت بالکل ابتر رہے گی۔ یہ اسی سبب کا نتیجہ ہے کہ ٹیگور جب نثر میں کچھ لکھتے ہیں تو تشبیہوں اور استعاروں کے میدان میں بھٹک کر نفس مضمون سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک عملی انسان عالم معقول میں آکر وجدان کی رہنمائی سے محروم ہو جائیگا۔ اسکو بھی یہاں صرف عقل سے کام لینا پڑے گا جس سے حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکے گی۔ پس وہ عالم معقول کی باتیں سمجھنے سے قاصر رہیگا۔ خود مہاتما گاندھی اس درماندگی کی زندہ مثال ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا جرمنی پر ٹیگور کے اعتراضات کے جواب میں انکا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے صریحاً ٹیگور۔ یا اگر وہ نہیں تو فنون کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ دنیا میں اس ساحر کو بآسانی عزت کی جگہ مل جاتی ہے جو نئی اور چکیلی چیزیں پیدا کرنیوالی چیزیں پیش کرے۔ یہ بات اگرچہ مہاتما گاندھی کے قلم سے نکلی ہے مگر ہمیں اس کے ماننے میں قطعی تامل ہے۔ فنون کی دنیا میں جو نئی نئی تخلیقیں ہوتی رہتی ہیں ان میں صرف ظاہری چمک ہی نہیں ہوتی بلکہ قیمتی جوہر بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہر بڑی تخلیق روح کے لئے ایک ضروری پیغام رکھتی ہے ذرا آپ ٹیگور ہی کے گیتوں کو پڑھ دیکھئے۔

طلوع فجر کے وقت، جبکہ ستاروں کی روشنی ہنوز سایہ دار درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آتی رہتی ہے، لڑکیوں کا جھنڈ سکوت آشرم کی فضا کو نغموں سے معمور کرتا ہوا گزرتا ہے، تو میرا

وہ ان نغموں بعض نغموں کو سنکر اسی طرح مسرور ہوتا ہے، جس طرح مہاتما گاندھی کے کاموں میں کوئی نئی خوبی معلوم کر کے۔ یہ نغمے، یہ گلہائے چمن شاعری، زندگی کی عظمت مآب حقیقت کا اسی طرح جزو ہیں جس طرح ہمدردی کے کام، یا خدمت خلق، بلکہ یہ خود بھی کارہائے ہمدردی میں داخل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لطیف تر ہیں۔

مہاتما جی کا یہ کہنا بھی خلاف واقعہ ہے کہ دنیا ارباب فن کو آسانی سے عزت کی جگہ دیدیتی ہے اکثر مثالیں اس بیان کی تغلیط کرتی ہیں۔ رولینڈ کو سالہا سال کتنی مشقت اور جانفشانی سے کام کرنا پڑا لوگوں کے اختلاف سے اس کو کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ کیٹس دل شکستگی کے صدمے سے جانبر نہ ہو سکا خود رابندر ناتھ ٹیگور باوجود خدا داد لیاقت کچھ آسانی سے نامور نہ ہو سکے۔ انہیں کس کس طرح دل جلانا پڑا۔ تنگ نظر قدامت پسندوں کی کیا کیا نہ سننی پڑی۔ اور آج بھی جبکہ ساری دنیا میں انکی شہرت ہے، بنگال بلکہ سارے ہندوستان کے اندر کتنے لوگ ایسے موجود ہیں جو ان سے نفرت رکھتے ہیں۔

کسی بڑے آرٹسٹ کی جدت پسندی سے پرانی چیزوں کو کہیں نہ کہیں صدمہ ضرور پہونچتا ہے چونکہ انسان قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ اسے گوارا نہیں کرتا۔ پس آرٹسٹ کو لوگوں کی مخالفت کرنی اور اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ وہ بھی صلیب پر لٹکایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی صلیب لوہے اور کیلوں سے نہیں بلکہ ذہنی و روحانی کوفت سے بنتی ہے۔

پھر کہتا ہوں میرا یہ دعوے نہیں کہ مہاتما گاندھی کا دل جمالی حس نہیں رکھتا۔ کانٹ کی طرح انہیں بھی تاروں بھرے آسمان کو دیکھکر وجد آتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مہاتما گاندھی جیسا اعلیٰ انسان ایک شاعر کی طرح حسن کو خدا نہیں سمجھتا۔ وہ اسے ایک ثانوی چیز سمجھتے ہیں اور تقویٰ اور ضبط نفس پر زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فنون کو صرف ظاہری طمطراق کی چیز خیال کرتے اور انکو لوازمات زندگی سے بے سروکار سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "اڑیسہ کے فاقہ زدوں کا خیال مجھے خواب میں رہتا ہے اور بیداری میں بھی جو چیز انہیں بچائے وہی میری نگاہوں میں حسین ہے" یہ ہے انکی جمالیات

پس یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ٹیگور اور گاندھی جدا جدا سلطنتوں کے تاجدار ہیں۔ ایک کی سلطنت عالم

معقولات میں ہے۔ دوسرے کی سلطنت عالم محسوس میں۔ ایک کا منشا حیات دنیا کو اپنے روحانی کلام سے مستفیض کرنا ہے۔ دوسرے کا روحانی عمل سے۔

مگر یہی کہدینے سے قصہ ختم نہیں ہو جاتا کہ ٹیگور ٹیگور ہیں اور گاندھی گاندھی ہیں۔ یہ غور کرنا ہے کہ انسان کا نصب العین کیا ہونا چاہئے۔ میرے نزدیک تو کامل انسان وہی ہے جس میں دونوں کے خصائص جمع ہوں۔ زندگی بہت پیچیدہ ہے۔ اس کے اندر مختلف عناصر ہیں، جو کبھی تو متصادم ہوتے ہیں اور کبھی ہم آہنگ۔ ہمارا نصب العین انہیں عناصر کی کامل ہم آہنگی ہونا چاہئے، جس سے ہم اس درجہ پر پہونچ جائیں جہاں کا انسان گیتا کے الفاظ میں۔

"بحر زخار کے مانند ہے، جو دنیا کے سیلابوں کو اپنی آغوش میں لیتا ہے مگر ابل نہیں پڑتا جس میں دریاؤں سے پانی آتا ہے مگر سیلاب نہیں پیدا کرتا۔ اس کی روح کے سمندر میں دنیا مادی کے چشمے آ آکر ملتے ہیں مگر وہ جس کا تس رہتا ہے، ان سے پانی کا خراج لیتا ہے مگر سمندر ہی رہتا ہے۔ . . . ."

معلوم نہیں اس نصب العین تک کوئی پہنچ سکے گا یا نہیں۔ مگر ہمیں اس کے امکان یا عدم امکان سے کوئی بحث نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ نصب العین اسی بلند معیار کا نام ہے جو ہمارے خیال میں آسکتا ہے۔ خواہ وہ قابل عمل ہو یا نہ ہو۔

لیکن یہاں ایک نیا مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے۔ اس کامل ہم آہنگی تک پہونچنے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ مسلسل کوشش اور تدریجی ترقی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے اور ذہن کی نوری وجدانی حرکتوں سے بھی۔

یہاں پھر ہم گاندھی اور ٹیگور کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ گاندھی مسلسل کوشش کے راستہ پر چل رہے ہیں، ہر کوشش کا اثر ان کی شخصیت پر پڑکر کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کرتا اور انہیں تکمیل کی طرف لیجاتا ہے۔ لیکن ٹیگور کی شاعرانہ طبیعت اس سیدھے راستے پر نہیں چلتی ہے۔ وہ کچھ دور چلتے پھر بہک کر غائب ہو جاتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ بالکل گم ہو گئے۔ مگر دوسری بار پھر جب ان پر شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے

تو وہ بجلی کی طرح اڑتے اور ایک لمحے میں حقیقت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

عامۃ الناس کو گاندھی کا آہستہ مگر دیرپا ترقی کا راستہ زیادہ بھاتا ہے، کیونکہ یہ یقینی معلوم ہوتا ہے اگرچہ مشکل ہے لیکن شاعر کی پرواز بہت کم لوگوں کے لئے ممکن ہے۔ گاندھی کی ترقی میں ذہنی اور اخلاقی اثر غالب ہے۔ ٹیگور کی ترقی میں جمالی اور جذباتی۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون طریقہ بہتر ہے۔ ہم ان میں سے وہی اختیار کر لیتے ہیں جو ہماری طبیعت کے موافق ہو۔ اگر کوئی "وسانی" یا "بزاز" گاندھی کا طریقہ اختیار کرتا ہے، تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت اس طریقہ کے موافق ہے۔ دوسری طرف اگر کوئی جمالی ذوق رکھتا ہے تو اس کے لئے صرف ٹیگور ہی کا طریقہ ممکن ہے۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا غلطی ہے۔

عرب فرانسیسی ادبیات میں

رولان کا گیت

(۵)

مارسل کو جب ہوش آیا تو اسے اس کے خاص محراب دار کمرہ میں لے گئے، اس کمرہ میں رنگ برنگ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں[1]۔ ملکہ براِمیموندا اس کی حالت پر زار وقطار رو رہی تھی اور اپنے بال نوچے ڈالتی تھی کبھی زور زور سے چیخیں مار کر یوں کہتی تھی :-

"افسوس اسار اگوس کے نام پر کیسا انمٹ دھبہ لگے گا اگر بادشاہ مارسل آج دنیا سے اٹھ گیا ہمارے سب خدا دھوکے باز نکلے، آج صبح انہوں نے ہمارے بادشاہ کو دشمن کے ہاتھوں شکست دلوائی۔ اگر امیر فرانسیسیوں سے لڑنے نہ آیا جنہیں اپنی جانوں کی بالکل پروا نہیں، تو بڑی بزدلی کا ثبوت دیگا۔ اگر وہ ان سے لڑنے آیا تو انکا بادشاہ جس کی داڑھی پھولوں کی سی ہے بھاگے گا، تھوڑی، وہ بڑا گھمنڈی اور بہادر ہے، افسوس! ہمارے آدمیوں میں کوئی نہیں جو اسے قتل کر ڈالے۔

بادشاہ شارل پورے سات سال اسپین میں رہا، کوئی گڑھی اور قلعہ نہیں جو اسے فتح نہ کرلیا ہو، مارسیل نے مقابلہ کی پوری تیاریاں کیں، پھر بیں لگوا لگوا کر اپنی حکومت میں ہر جگہ حکمنامے بھجوائے اور بابل کے امیر بالیگان سے مدد کی درخواست کی، یہ امیر بڈھا اور زمانہ دیکھے ہوئے تھا، اس کی عمر ورجیل

---

(۱) اندلس کی مسلمانوں کی فنون لطیفہ کی ترقی مسلمہ ہے، اس گیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کی مسیحی دنیا میں مسلمانوں کی اس ترقی کا ہر جگہ چرچا تھا، یورپ کے موجودہ فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی اور تصویر کشی مسلمانوں کے بڑی حد تک رہین منت ہیں، نشاۃ الثانیہ کے اطالوی مصوروں کی تصویریں صاف بول اٹھتی ہیں کہ کس حد تک وہ ایرانیت سے متاثر ہیں، عہد رافائیل سے قبل کی تصویروں کو دیکھ کر نہ جاننے والا بڑی مشکل سے تمیز کر سکتا ہے کہ آیا انہیں کوئی چیز ہے جو مشرقی نہیں جس طرح فن تصویر کشی کی موجودہ تحقیقات اسی ایرانی اثر کو تسلیم کرتی ہے اسی طرح موسیقی میں عربی اثر مسلم ہے۔

اور ہومر کی عمروں سے بھی زیادہ تھی، ماریل نے اسے کہلا بھیجا کہ اگر وہ اس کی مدد کو آتا ہے تو آئے ورنہ وہ اس کے خداؤں سے انکار کر دے گا اور اس کے بتوں کو پوجنا چھوڑ دیگا اور مسیحی قانون اپنا اس قبول کر کے شارل سے صلح کر لے گا۔

امیر بالیگان بہت دور ہے، آتے آتے بھی اسے بہت دیر لگے گی، اس نے ماریل کا پیغام سنکر اپنی چالیس ولایتوں سے آدمی طلب کئے، اپنی ساری کشتیاں، ڈونگے اور جہاز تیار کرلئے سکندریہ کے قریب اسکا بندرگاہ[1] ہے اس نے اپنا سب بیڑا وہاں اکٹھا کیا۔ مئی کے مہینے میں گرمیوں کے موسم کے شروع میں، وہ اپنے بیڑے کو لیکر سمندر میں روانہ ہوا، ان کافروں (بتیاں) کی فوجیں بہت تھیں، وہ بادبانوں کی مدد سے بڑے زور شور سے اپنی کشتیاں کھیتے ہوئے چلے آرہے ہیں، مستول کے سرے پر اور جہازوں کے مہروں پر اور سب کشتیوں میں چراغ جل رہے تھے، ان چراغوں کی روشنی سے سارا سمندر جگمگا رہا تھا، جب وہ اسپین کی سرزمین کے قریب پہونچے تو کنارا روشنیوں سے جھل جھل ہونے لگا۔

ان کافروں کو آرام کرنیکی ذرا بھی پروا نہیں، سمندر چھوڑ کے فوراً وہ میٹھے پانی (یعنی دریا) میں داخل ہوگئے، ماربریز، درمار برو زسے گزرتے ہوئے دریائے ابرا میں انھوں نے اپنی کشتیاں ڈالدیں، رات بھر دریا کے کنارے روشنی سے جگمگاتے رہے اور سویرے ہی سویرے وہ سارا گوس پہونچ گئے۔

دن روشن تھا اور سورج خوب چمک رہا تھا، امیر اپنے آدمیوں کے ساتھ کشتیوں سے اترا

---

(۱) بادشاہ بابل کا سکندریہ کے قریب بندرگاہ بنانا یورپ کی ازمنہ وسطیٰ کی جغرافی معلومات کا بڑا پر لطف اظہار ہے اسلامی تاریخ میں اس قسم کا کوئی واقعہ درج نہیں کہ اندلس کی مسلمانوں کی مدد کے لئے کسی دوسرے ملک کے مسلمان آئے ہوں، ممکن ہے مراکش یا شمالی افریقہ سے کبھی کچھ مدد آئی ہو جسے بھاٹوں نے شاہ بابل کی مدد سمجھا، یا یہ کہ بابل اور اسکندریہ کے نام عوام میں خاص اہمیت رکھتے ہونگے اور اپنے مخصوص اغراض کے لئے ان ناموں کا استعمال اس بات پر دال ہے کہ وہ فسانہ گوئی کے گرو تھے اور عوام کی نفسیات سے خوب واقف تھے اور بہت اچھے پروپگنڈا کرنے والے تھے۔

اس کے سیدھے ہاتھ پر اپانیلر تھا، سترہ باجگزار بادشاہ اس کے پیچھے پیچھے تھے، ان نوابوں اور باجگزاروں کا شمار نہیں جو ان بادشاہوں کی اردلی میں تھے، ایک پیڑ کے تلے ہمیت کے بیچوں بیچ ہری گھاس پر سفید ریشم کی چادر بچھا کے اس پر ہاتھی دانت کا تخت رکھا گیا اور اس پر کافر بالیگان بیٹھا، دوسرے سب کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد بالیگان نے یوں تقریر شروع کی :۔

میرے بہادر دوستو! اگر میں حکم دوں کہ بادشاہ شارل پر کھانا پینا حرام کر دو تو ایسا ہی ہو۔ اس نے اسپین میں ہر طرف دنگا فساد مچا رکھا ہے۔ میں اسوقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ وہ ہار نہ مان لے یا قتل نہ ہو جائے۔" اس بات کی پوری تصدیق کرنے کے لئے اس نے اپنا سیدھا دستانہ گھٹنے پر مارا؛

بالیگان نے پوری طرح یہ بات اپنے دل میں ٹھان لی ہے کہ آسمان کے نیچے جتنا سونا ہے اس کے بدلے میں بھی ایکس جائے بغیر مانے گا نہیں، ایکس شارل کا دارالسلطنت ہے، وہ وہاں اپنی کچہری جماتا ہے، بالیگان کے سب مصاحبوں نے اس کی ان باتوں پر خوب تعریف کی، بالیگان نے اپنے دو مشہور سوار کلاریفان اور کلیریان کو طلب کیا اور ان سے کہا :۔

"تم دونوں بادشاہ مالیترین کے بیٹے ہو جو خوش خوش ہمارے پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجایا کرتا تھا، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم دونوں ابھی ساراگوس جاؤ، میری طرف سے ہم سب کے پہنچنے کی خبر بادشاہ مارسیل کو پہونچا دو اور اسے ہر طرح سے دم دلاسا دو کہ ہم لوگ فرانسیسیوں کے خلاف اس کی مدد کو آن پہونچے ہیں، پہلا موقع ملتے ہی ہم لڑائی شروع کر دینگے، ان باتوں کی ضمانت میں میرا سنہرا دستانہ تہہ کر کے اسے دو اور اسے سیدھے ہاتھ میں پہننے کو کہنا، یہ خالص سونے کی چھڑی بھی لے جاؤ، اسے اپنی باجگزاری کے اعتراف کے لئے بھی کہنا اور اسے یقین دلانا۔ کہ شارل سے جنگ کرنے کو ہم فرانس تک میں جانے کو تیار ہیں، اگر شارل اس بات پر تیار نہیں کہ مجھ سے معافی مانگے۔ رحم کی درخواست کرے، میرے پاؤں پڑے اور مسیحی قانون سے انکار کرے تو میں اس کے تاج اور ملک سب پر قبضہ کر لوں گا۔" سب مصاحب چلا اٹھے، واہ واہ حضور نے کیا بات کہی ہے؛

بالیگان۔ میرے سوار جاگیر دار تم میں سے ایک دستانہ لیجائے اور دوسرا چھری۔ دونوں نے کہا کہ وہ اسکی مرضی کے مطابق سب کارروائی کرینگے، انہوں نے گھوڑے سرپٹ چھوڑ دئے اور بہت جلد سارا گوس پہونچ گئے، دسوں پھاٹکوں سے گزر کر اور دریا کے چاروں پلوں کو پار کرکے وہ سیدھی سڑک پر ہوئے، اسی سڑک پر کھاتے پیتے لوگ رہتے تھے، جب وہ خاص شہر کے قریب پہونچے تو انہیں محل کی طرف سے شور و غل سنائی دیا، جب وہ محل کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کافروں کی پوری نسل ماتم کررہی ہے، جسے دیکھو رونے پیٹنے میں مشغول ہے، وہ اپنے خداؤں، ترا واگان، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اپولون پر تبرا بھیج رہے تھے، اور آپس میں یوں باتیں کررہے تھے:۔

"بد نصیبی! ہماری اب کیا حالت ہوگی؟ ہم پر یہ بلائیں کہاں سے نازل ہورہی ہیں؟ ہم اپنے بادشاہ مارسیل کو کھو بیٹھے، رولاں کی تلوار نے کل اسکا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا، سارا اسپین اب فرانسیسیو کے رحم پر ہے"۔

یہ باتیں سنکر دونوں ایلچی اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے اور انہیں ایک نزدیک زیتون کے پیڑ کے قریب چھوڑ دیا، دو عرب انکی لگام پکڑے کھڑے رہے، دونوں ایلچی مع اپنے لبادوں کے محل کی سب سے اونچی منزل پر چڑھ گئے، جب وہ محراب دار کمرے میں داخل ہونے لگے تو دوستانہ طریقہ پر انہوں نے یوں سلام کیا:۔

"کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ترا واگان اور اپولون ہمارے آقا بادشاہ مارسیل اور رانی کو ہمیشہ سلامت رکھیں"۔

برامیموند۔ میں یہ آج کیسی حماقت کی باتیں سن رہی ہوں، یہ سارے خدا جن کے تم نے ابھی نام لئے سب نکمے نکلے، سب نے ہمیں دھوکا دیا، رانسیوو مین انہوں نے جھوٹے معجزے دکھلائے، انہوں نے ہمارے سواروں کو وہیں خاک و خون میں پڑا مرنے دیا اور میرے میاں کی لڑائی میں کوئی مدد نہیں کی، فرانسیسیوں کے مشہور کونت رولاں نے اسکا سیدھا ہاتھ کاٹ ڈالا، اب سارا اسپین شارل کی نوابی میں چلا جائیگا، بتاؤ میں اب کیا کروں، میں غمزدہ ہوں، بیمار ہوں، ہائے افسوس کیا کوئی نہیں

جو میرا بھی خاتمہ کردے "

کلیرنان ۔ ایسی اٹکل پچو باتیں نہ کرو، ہم لوگ بالیگان کے ایلچی ہیں، وہ مارسیل کی حمایت کا دعویٰ کرتا ہے، اس نے ضمانت کے طور پر اپنا دستانہ اور اپنی چھڑی بھی ہے، دریائے ایبر کے کنارے ہمارے چار ہزار بہادر جہازوں، کشتیوں اور ڈونگوں میں پڑے ہیں، ہمارا بیڑا اتنا بڑا ہے کہ مجھے ٹھیک تعداد بھی یاد نہیں ۔ امیر قوت والا زبردست ہے، شارل کے پیچھے وہ فرانس تک جئے بغیر ماننے والا نہیں ۔ وہ یا تو اُسے قتل کر یگا یا اپنے رحم سے اسے معاف کر دیگا "

براممونڈ ۔ بھلا فرانسیسیوں کا پیچھا کرنے کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کی کونسی ضرورت ہے وہ یہاں سے بہت فاصلہ پر نہیں، آج سات برس سے بادشاہ شارل اس ملک میں ہے، وہ ایسا مضبوط اور زبردست ہے کہ کبھی لڑائی کے میدان سے منہ موڑنا نہیں جانتا، آسمان کے نیچے کوئی بادشاہ نہیں جس سے اسے ڈر ہو، شارل دنیا میں کسی کا ڈر نہیں مانتا "

بادشاہ مارسیل ۔ اچھا، اب یہ قصہ چھوڑو (ایلچیوں سے مخاطب ہوکر) تمہیں مجھ سے بات چیت کرنا چاہئے تم دیکھتے ہو میں موت کے منہ میں ہوں، میرا کوئی وارث نہیں، ایک بیٹا تھا وہ قتل ہوا، اپنے آقا سے کہو کہ آخری وقت میں مجھے دیکھ جائیں میں امیر بالیگان کو اسپین کی زمین کے سارے حقوق دیتا ہوں میں اسے سیاہ سفید کا اختیار دیتا ہوں لیکن اسے فرانسیسیوں کے خلاف ملک کی مدافعت کرنی پڑیگی میری ایک آرزو ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر تم شارل کو قید کر لو ۔ امیر بالیگان سے کہو کہ وہ بغیر کنجیوں کے سار اگوس فتح نہیں کر سکے گا، کنجیاں میرے پاس ہیں، انہیں لیجاؤ "

دونوں ایلچی ۔ جی حضور آپ بالکل درست فرماتے ہیں،

مارسیل ۔ شارل نے مجھے، میرے آدمیوں کو اور میرے سارے ملک کو تباہ کر ڈالا شہروں کو مجبور کر کر کے اس نے لوٹا، اس رات وہ دریائے ایبر کے کنارے خیمہ ڈالے پڑا ہے، مجھے معلوم ہے یہ جگہ یہاں سے سات کوس سے زیادہ نہیں ہوگی، امیر سے اُس طرف اپنی فوجیں لیجانے کو کہو میرا پیغام یہ ہے کہ شارل سے فوراً لڑائی شروع کر دو ۔

یہ کہکر مارسیل نے ساراگوس کی کنجیاں ایلچیوں کے حوالے کیں، دونوں ایلچی کورنش بجالائے اور رخصت ہوئے۔

دونوں نے گھوڑے سرپٹ دوڑانا شروع کئے اور بہت جلد امیر بالیگان کے پاس پریشان پہونچے اور شہر ساراگوس کی کنجیاں اسکے حوالہ کیں، کنجیاں لیکر بالیگان نے کہا:-

"تم کیا کرآئے؟ مارسل کہاں ہے؟ تم نے میرا پیغام پہنچادیا؟"

کلیریان۔ مارسیل کو بڑے مہلک زخم لگے ہیں، بادشاہ شارل بڑے پھاٹکوں کے قریب سے گزر کے فرانس واپس جانا چاہتا تھا، اس نے اپنے عقب میں اپنے بھتیجے رولان اور اولیوے اور بارہ نوابوں کو مع بیس ہزار فرانسیسی فوج کے چھوڑ دیا تھا، بادشاہ مارسل نے اس عقب کی فوج سے لڑائی کی، رولان اور اسکا مقابلہ ہوا اور رولان نے اپنی دردندال سے ایسا وار کیا کہ مارسل کا سیدھا ہاتھ دھڑ سے الگ ہوگیا۔ مارسیل کا بیٹا بھی جس سے اسے بہت محبت تھی، رولان کے ہاتھ سے قتل ہوا، سب بڑے بڑے نواب بھی مارے گئے، مارسیل جان بچاکر بھاگ آیا، شارل اسکا پیچھا کر رہا ہے، اب مارسیل کی ساری امیدیں آپ کی امداد پر ہیں، وہ اسپین کی ریاست پر آپ کے حقوق تسلیم کرتا ہے۔

بالیگان نے یہ سب باتیں سنیں اور کچھ سوچنے لگا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ غم سے پاگل ہو جائے گا۔

کلیریان۔ حضور والا! انسیو کے مقام پر کل بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، رولان اور اولیوے اور بارہوں نواب قتل ہوئے، لیکن مارسل کا بھی کوئی سپاہی باقی نہیں رہا جو فرانسیسیوں کے ہاتھوں قتل نہوا ہو یا دریائے ایبر میں ڈوب کر نمرا ہو۔ فرانسیسی دریا کے کنارے خیمہ زن ہیں، وہ ہم سے بہت نزدیک ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو انہیں فرانس واپس جانا دشوار ہوجائے۔

کلیریان کی باتیں سنکر بالیگان کی نظروں سے خوشی، جوش اور غرور ٹپکنے لگا، اپنے تخت پر سیدھے کھڑے ہوکر اس نے یوں تقریر شروع کی:-

"میرے نوابو! اب کیا دیر ہے؟ اپنی کشتیوں اور ڈونگوں سے باہر نکلو اور گھوڑوں پر زینیں

کس لو، مارسل کے ہاتھ کٹنے کا بدلا لینا ہے، ہاتھ کے بدلے میں ہمیں چاہیئے شارل کا سر کاٹ لیں"

عرب کے کفار بالیگان کی یہ تقریر سن کر اپنی اپنی کشتیوں سے باہر نکل آئے اور اپنے گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہو گئے، انہوں نے اپنے گھوڑے، شارل کی فوج کی طرف بڑھائے، امیر بالیگان نے اپنے خواص میں سے گیمالفین کو طلب کیا اور اپنی فوج کی سرداری اس کے سپرد کی :

بالیگان اپنے کمید گھوڑے پر سوار تھا، اسکے ہمرکاب چار باجگزار نواب تھے، گھوڑے بڑھاتے ہوئے وہ ساراگوسس پر آن دھمکے، بالیگان کے گھوڑے کی رکابیں چاروں نوابوں نے تھام لیں اور وہ سنگ مرمر کی سیڑھی پر پیر رکھ کر اپنے گھوڑے سے اترا، بادشاہ مارسیل کی بیوی براسیموند اس سے ملنے کے لئے آئی اور یوں کہنے لگی :-

"حضور والا! میں بیمار اور منحوس گھڑی کی پیدائش اپنے آقا کو کھو بیٹھی وہ بھی کس ذلت کیساتھ"

یہ کہکر وہ غش سے گری جاتی تھی کہ امیر نے بڑھ کر پکڑ لیا اور لوگ اسے ایک کمرہ کی طرف لے گئے

بادشاہ مارسیل نے امیر بالیگان کو دیکھکر دو اپنے خدمتگاروں سے کہا" مجھے اپنے بازوؤں میں لیکر بٹھا دو" جب بالیگان اس کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے الٹے ہاتھ سے دستانہ اٹھا کر یوں کہا :-

حضور والا! میں اپنی ساری ریاست اور ساراگوس کا شہر تمہیں دیتا ہوں، میں تباہ ہو گیا اور میرے سب لوگ بھی تباہ ہو گئے!

بالیگان - مجھے بڑا صدمہ ہے، اب اس وقت تفصیل سے گفتگو کرنے کا وقت نہیں، میں جانتا ہوں شارل میرا بالکل منتظر نہ ہوگا، اس لئے اس حالت میں فوراً اس پر حملہ کر دینا چاہیئے، میں آپ کے اس دستانہ کو لئے لیتا ہوں"

وہ رنجیدہ محل کی سیڑھیوں سے اترا، گھوڑے پر سوار ہو، ہمیز لگاتا آن کی آن میں اپنی سپاہ میں واپس آگیا۔

شارل کی آنکھ سویرے تڑکے کھل گئی، دیکھا دیکھتا ہے کہ حضرت جبریل ہاتھ سے اسے رانسیو کی

طرف اشارہ کر رہے ہیں، وہ سمجھ گیا کہ حضرت جبریل فرانسیسی شہیدوں کی لاشوں کیطرف اشارہ کر رہے ہیں، وہ معہ اپنی سپاہ کے تیار ہو کر اسیو روانہ ہوگیا۔ وہاں اپنے آدمیوں کی لاشیں دیکھکر اس سے ضبط نہ ہو سکا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اور اپنے آدمیوں سے یوں مخاطب ہوا :۔

"ساتھیو! میں اپنے بھتیجے رولان کی لاش کو ڈھونڈنے تمہارے ساتھ چلتا ہوں، مجھے یاد ہے، جب ایک دفعہ ایکس میں میرے سب سردار اپنی مہموں کے قصے بڑے گھمنڈ سے بیان کر رہے تھے، میں نے رولان کو کہتے سنا ہے کہ جب کبھی وہ دشمنوں کے نرغے میں مرا تو اس کی لاش اپنے ساتھیوں میں دشمن کیطرف سب سے آگے پڑی ہی پائی جائیگی اور اسکا چہرہ دشمن کے ملک کی طرف ہوگا۔

آگے بڑھ کر ایک مٹی کے ڈھیر کے قریب اس نے دیکھا کہ جھاڑیوں کے سارے پھول فرانسیسی شہیدوں کے خون سے رنگین ہو رہے تھے، انہیں جھاڑیوں میں اس نے رولان کی لاش پہچانی، کچھ تعجب نہیں اگر شارل یہ منظر دیکھکر رنج سے کپکپا اٹھا، وہ لاش کے قریب گیا اسے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ لیا اور صدمہ کی وجہ سے غش کھا کر گر پڑا۔

جب شارل کو ہوش آیا تو ڈیوک نائم اور کونٹ اسیلون، جافری دانجو اور اسکا بھائی ہنری اسے ایک چیڑ کے درخت کے نزدیک لے گئے، اس نے آنکھیں کھولیں اور رولان کی لاش کو خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھا، رولان کی لاش سے حسن و مردانگی ٹپک رہی تھی، اسکی آنکھیں پلٹ گئی تھیں اور ان پر سیاہی آگئی تھی، شارل لاش کو دیکھکر یوں مخاطب ہوا،

"پیارے رولان! خدا تیری روح کو بہشت کے پھولوں میں جگہ دے، اب تیرے بعد کوئی دنیا نہیں جو دور دراز ممالک کی لڑائیاں جیتے، میری ساری عزت ذلت سے بدل گئی، تو اسپین کیوں آیا؟ کوئی ایسا دن نہ ہوگا کہ میں تیرے مرنے کا ماتم نہ کروں، میری ساری قوت اور جوش اب ختم ہوگیا آسمان کے تلے اب میرا ایک دوست نہیں۔"

پیارے رولان! جب میں لاؤن پہونچوں گا تو دوسرے ملکوں سے میرے باجگذار آئیں گے

وہ تیرا حال پوچھیں گے، کوئی دن ایسا نہ ہوگا کہ میں تیرے لئے روؤں نہ اور ماتم نہ کروں"

"ارے میرے سورما! میرے حسین جوان! میں اکیس پہونچکر جب اپنے باجگذاروں کو تیرے مرنے کی ناقابل یقین خبر سناؤنگا تو انہیں تعجب ہوگا، میں کہوں گا کہ میرا بھتیجا مرگیا، وہ جس نے میرے لئے ساری زمینیں فتح کیں، باغی سکسنوں، ہنگروا اور بلگاریوں کا سر کچلا، وہ مرگیا۔ وہ جس نے رومن کوئی والوں، پالرن والوں اور افریقہ والوں کو نیچا دکھایا وہ مرگیا۔ اب ان باغیوں کے خلاف کون شرارتی کریگا۔ ہائے فرانس! تو کس ماتم میں مبتلا ہوگیا، میرا رنج ایسا ہے کہ میں اپنی زندگی کا خاتمہ کردوں تو اچھا ہے"، شارل کی یہ حالت دیکھکر ایک لاکھ فرانسیسیوں کو غش آگیا۔

پیارے رولان! تیری روح کو خدا بہشت کے پھولوں میں جگہ دے، جس نے تجھے قتل کیا اس نے سارے فرانس کو ماتم اور مصیبت میں مبتلا کیا، ہائے میرے سوار جنہوں نے میرے لئے اپنی جانیں دیں، خدا اور مریم کا بیٹا میری حالت پر رحم کرے، پیشتر اسکے کہ میں سنیر کے بڑے پھاٹکوں تک پہونچوں، میری روح تن سے جدا ہوکر ان پاک روحوں میں ملجائے تو بہت اچھا ہو"

یہ حالت دیکھکر ڈیوک نائم بولا، "شارل کو بہت صدمہ ہے"

جافری والئ انجو۔ حضور والا! اس رنج سے اس قدر متاثر نہ ہوجئے، ہمیں چاہئے کہ یہاں کھیتوں میں ہمارے جتنے آدمی پڑے ہوئے ہیں انہیں ایک خندق میں پہلے دفن کرلیں"

شارل۔ اچھا، سپاہیوں کو حکم دو کہ ایسا ہی کریں"

جافری والئ انجو کے حکم سے سب سپاہی گھوڑوں سے اتر پڑے اور اپنے شہیدوں کی لاشوں کو اٹھا اٹھا کر ایک خندق میں رکھنے لگے، فوج میں جتنے پادری، راہب اور سر منڈے زاہد تھے وہ ان سب کی مغفرت کی دعائیں مانگنے اور خوشبوئیں لگا کر دفن کرنے میں مشغول ہوگئے۔

شارل نے کہا کہ رولان، اور اولیور اور جہاں پادری تریان کو ایک ہی کفن میں لپیٹ کر دفن کیا جائے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ اپنے بھتیجے کی لاش کو دیکھا اور ریشم کے کفن میں رکھوا کر دفن کرایا، ان تینوں کی قبر پر سنگ مرمر کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

اس کے بعد تینوں نوابوں کی لاشوں کو خوشبو لگا کر اور شراب[1] سے نہلا کر بارہ سنگھے کی کھال میں رکھوایا اور حکم دیا کہ تیباآں، گیبوآن اور کونت ملون ان تینوں جنازوں کو گاڑیوں پر رکھوا کر، ریشم کی چادروں میں لپیٹ کر ساتھ لے چلیں[2]۔

---

(۱) لاش کو شراب سے نہلانے کی رسم آج کل فرانس میں کہیں نہیں پائی جاتی، ممکن ہے دسویں گیارہویں صدی عیسوی کے جرمنوں میں جب وہ فرانس میں آکر آباد ہوئے ہیں اس قسم کی کوئی رسم فرانس کی انگوری شراب کی قدردانی اور بعد میں احترام کے لئے موجود ہو، یہ تو آج بھی ہے کہ فرانسیسی شراب کی قدردانی خود فرانسیسیوں سے زیادہ امریکن، جرمن اور انگریز کرتے ہیں، اسکا ثبوت یہ ہے کہ پیرس کی سڑکوں پر بدمست آوردہ گردی کرنیوالوں کے اعداد و شمار میں معتدبہ حصہ فرانسیسیوں کا نہیں بلکہ غیر ملکیوں کا ہے جن میں انگریز، امریکن اور جرمن اکثریت کا فخر رکھتے ہیں۔

(۲) معلوم نہیں اسکی کیا وجہ ہے کہ شارل نے رولاں، اولیوئے اور ترپان کو دہیں دفن کیا اور ان تین نوابوں کی لاشوں کو ہمراہ فرانس لے گیا۔

آئیون میطوی اِچ

مصنفہ انیطن چیخوف

مترجمہ ملک محمد اسلم خاں، بی۔ اے کیمبرج، سابق متعلم جامعہ

شام کا وقت ہے، پانچ اور چھ بجے کے درمیان، اور ایک مشہور علامہ۔ جو اس کہانی میں محض علامہ ہی کہلائے گا۔ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا بے چین ہو ہو کر اپنے ناخن دانتوں سے کاٹ رہا ہے۔

اور اپنی گھڑی پر بار بار نظر کر کے کہتا ہے "سخت کمینہ حرکت ہے یہ! اور دوسرے شخص کے وقت اور کام کیطرف سے بے انتہا لاپروائی اس سے ظاہر ہوتی ہے، انگلستان میں ایسا شخص ایک دمڑی نہ کمائے، بھوکا مر جائے، تم آتو لو، میں سمجھ لوں گا تم سے"

اپنی بے صبری اور غصہ کی پیاس وہ کسی نہ کسی پر بجھانا چاہتا ہے، اور اپنی بیوی کے کمرے کے دروازہ پر دستک دے کر اُس کو بلاتا ہے، اور غیظ و غضب میں کہتا ہے۔

"کیٹیا، دیکھو، ڈان پیچ سے ملو تو اُس سے کہدو کہ یہ دستور شریف لوگوں کا نہیں، یہ بے حد قابل نفرت ہے۔ وہ مجھ سے سفارش کرتا ہے کہ اس لڑکے کو اپنا منشی بنالوں، اور یہ دیکھتا تک نہیں کہ کیسے شخص کی سفارش کر رہا ہے، بلاناغہ یہ لڑکا روزانہ تین گھنٹے دیر کر کے آتا ہے، ایسے شخص کو کیا تم منشی کہتی ہو! میرے لئے وہ دو تین گھنٹے اوروں کے دو تین سالوں کے برابر ہیں، آج آئے تو کتوں کی طرح اُس سے بات کروں گا، ایک دمڑی اُسے نہیں دوں گا، رخصت کر دوں گا اُسے،

بیوی۔ "تم روز یوں ہی کہتے ہو، اور وہ روز ہی ویسے کا ویسا آتا رہتا ہے"

علامہ: "آج میں نے پورا پورا ارادہ کر لیا ہے، میں کافی نقصان اٹھا چکا ہوں اُسکی بدولت، میں بھٹیاروں کی طرح اُسے گالیاں دونگا آج"

گھنٹی بجتی ہے، علامہ کا چہرہ متانت کی تصویر بن جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو سمیٹ سماٹ ڈیوڑھی کی طرف جاتا ہے، وہاں اُس کا منشی آئیون میلوی اچ ایک اٹھارہ سالہ نوجوان، بیضاوی چہرہ مونچھ داڑھی چٹ، ایک گدلا سا کوٹ پہنے کھڑا ہے، بہت سٹینڈرڈ ہمک پہنچ چکا ہے، گولاش؎ اُس کے جوتوں پر نہیں ہیں، جلدی کی وجہ سے وہ بیدم ہو رہا ہے، اور بہت احتیاط سے وہ ڈور میٹ پر اپنے بوٹ پونچھتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنے بوٹ کے ایک سوراخ کو جس میں سے ایک سفید جراب دکھلائی دے رہی ہے ماما سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے علامہ کو دیکھکر ایک دیرپا مگر احمقانہ سا تبسم اس کے ہونٹوں پر آجاتا ہے، ایک ایسا تبسم جو کہ محض بچوں یا بیحد خوش مزاج لوگوں کے چہروں ہی پر دکھلائی دیا کرتا ہے،

سلام کہتا ہوا، اور اپنا مینہ سے تر ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتا ہوا آئیون پوچھتا ہے،

"آپ کے گلے کی خرابی تو رفع ہوگئی؟"

غصہ سے کانپتا ہوا، اور ایک دو قدم پیچھے ہٹتا ہوا علامہ ہاتھ ہل ہل کے پکارتا ہے "آئیون آئیون" پھر جلدی سے اُس کے شانے پکڑ کے اور آہستہ سے اُسے جھنجھوڑ کے یاس بھری آواز میں کہتا ہے،

"آئیون، تم یہ کیا کرتے ہو بے سمجھ شخص، تم نے یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے، کیا تم مجھ پر ہنس رہے ہو؟ ہیں؟"

تبسم کے اُن آثار سے جو ابھی تک آئیون کے چہرہ میں باقی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو اور قسم کے استقبال کی توقع تھی، اور علامہ کے چہرہ کو دیکھ کر جو غم و غصہ کی اس وقت بولتی تصویر ہے، آئیون معمول سے زیادہ بیضاوی چہرہ سے جواب دیتا ہے۔

"آپ ک، کیا فرماتے ہیں"

علامہ پھر ہاتھ ہل ہل کے جواب دیتا ہے "اچھا تم یہ بھی پوچھتے ہو؟ تم جانتے ہو کہ وقت بہر

؎ گولاش جوتوں کے اوپر پہنے جاتے ہیں، تاکہ جوتے کیچڑ وغیرہ سے آلودہ نہ ہوں۔

لئے کتنا قیمتی ہے اور تم اتنی دیر کرکے آئے ہو، تم دو گھنٹے لیٹ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے"

آیون اپنا گلوبند کھولتا ہوا دھیمی دھیمی آواز میں جواب دیتا ہے "جناب، میں سیدھا گھر سے نہیں آ رہا، میری چچی کے روزِ تسمیہ کا جلسہ تھا، ۔ ۔ ۔ ۔ اور میری چچی کا گھر یہاں سے پانچ میل ہے البتہ اگر میں سیدھا گھر سے آتا تو دوسری بات تھی"

علامہ:۔ "آیون، ذرا سوچو، تمہاری باتوں میں عقل کس حد تک ہے، تمہیں یہاں کام کرنا ہوتا ہے، اور کام بھی وقت معینہ پر، اور تم ہو کہ تسمیہ کی تقریبوں اور چچیوں کی طرف بھاگتے پھرتے ہو، جلدی کرو اب اور اپنا گلوبند کھولو، میری قوت برداشت انتہا کو پہنچ رہی ہے"

علامہ بھاگ کے اس کی طرف جاتا ہے اور اُسے گلوبند کھولنے میں مدد دیتا ہے

علامہ:۔ "تم لوگ کسان عورتوں کی طرح لپٹے ہوئے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ اب ۔ ۔ ۔ جلدی کرو"

ایک گندے اور جیب میں بے ترتیبی سے رکھے جانے کے باعث بہت جگہ سے تہہ ہوئے ہوئے رومال میں ناک صاف کرکے اور اپنا خاکی رنگ کا دوہرے سینے والا کوٹ نیچے کھینچتا اور ڈیوڑھی اور گول کمرے سے ہوتا ہوا، آیون کمرۂ مطالعہ میں جاتا ہے۔ وہاں پر جگہ، کاغذ، اور سگرٹ اُس کے لئے پہلے ہی سے تیار ہیں:۔

علامہ بے صبری میں ہاتھ ملتا ہوا، اُسے جلدی سے بیٹھ جانے کو کہتا ہے "تم ناقابل برداشت ہو، تم جانتے ہو کہ وقت معینہ پہ کام ختم کرنا ہے، اور پھر بھی تم دیر سے آتے ہو، مجبوری سے تم پر ناراض ہونا پڑتا ہے، ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ اب لکھو۔ ۔ ۔ ہم نے ختم کہاں کیا تھا؟"

آیون اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو جو کھڑے ہو رہے ہیں ہاتھ سے سنوارتا ہے، اور قلم اٹھا لیتا ہے، علامہ کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلتا ہے، توجہ سی سوچنے لگتا ہے، اور لکھوانا شروع کر دیتا ہے،

"حقیقت یہ ہے ۔ ۔ ۔ کاما ۔ ۔ ۔ کہ بنیادی ۔ ۔ ۔ صورتوں ۔ ۔ ۔ لکھ چکے ہو ۔ ۔ ۔ کا انحصار

ـــــ

ھ۱ جس دن بچہ کا نام رکھا جائے، اس دن کی تقریب بھی روس میں سال بسال منائی جاتی ہے، اس کو روز تسمیہ کہتے ہیں۔

. . . ان ہیولوں کی ہیئت پر ہوتا ہے . . . . کاما . . . جو کہ . . . ان صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں
. . اور عملی جامہ پہنتے ہیں . . . نئی سطر . . . یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی صورتوں کی قومیت کا اُن پر
اثر ہوتا ہے . . پچھلے الفاظ آتے کاموں میں . . . ہیں ؟ ہیں ؟ وہ ہائی سکول کی بابت تم کیا
کہنا چاہتے تھے ؟ "

آئیون :" یہی کہ میرے وقت میں سکول کا مروجہ لباس اور تھا "

علامہ :" ہوں . . . تمہیں سکول چھوڑے کتنا عرصہ ہوا ہے ؟ "

آئیون :" یہ تو میں نے کل بھی آپ کو بتلایا تھا ، . . . مجھے سکول چھوڑے تین سال ہوئے ہیں ، میں
اُس وقت ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں تھا "

علامہ آئیون کی تحریر کی طرف دیکھتا ہوا پوچھتا ہے "تم نے ہائی سکول کیوں چھوڑا ؟"

آئیون :" خانگی معاملات کچھ ایسے ہو گئے تھے "

علامہ :" آئیون ، میں تمہیں کتنی مرتبہ کہوں ، تم کب سطروں کو اس قدر پھیلا دینے کی عادت سے باز آؤ گے
کسی سطر میں بھی چالیس سے کم حروف نہیں ہونے چاہئیں "

آئیون - (غصہ میں) "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں جان بوجھ کر ایسا کرتا ہوں ، دوسری بعض سطروں میں
چالیس سے زیادہ حروف بھی ہیں ، گن کے دیکھ لیجئے . . . اور اگر آپ سمجھتے ہوں کہ میں سطروں میں کافی
الفاظ نہیں لکھتا ، تو میری تنخواہ سے کچھ کاٹ لیجئے ،

علامہ :" نہیں نہیں ، میرا یہ مطلب نہیں تھا . . . تم میں نفاست بالکل ہے نہیں . . . ذرا تمہیں موقع
ملے اور تم روپیہ کا سوال کھینچ لاتے ہو ، ضروری چیز تو صحت ہے ، آئیون صحت ، تحریر کی صحت "

ماما چائے کا خوان لاتی ہے جس پر دو چائے کے گلاس دھرے ہیں ، اور ایک مٹھائی کی تھالی

آئیون بہت بھدے انداز سے اپنا گلاس اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے اور فوراً اُسے پینا شروع کر دیتا
ہے ، چائے سخت گرم ہے اپنے منہ کو جل جانے سے بچانے کے خیال سے آئیون چھوٹا سا گھونٹ لیتا
ہے ، پھر مٹھائی کا ایک ٹکڑا کھاتا ہے ، پھر دوسرا ، پھر تیسرا ، پھر ذرا شرمندہ ہو کر ، علامہ کی طرف

دیکھتا ہوا چوتے ٹکڑے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے، . . . نگلتے وقت جو آواز اس کے منہ سے نکلتی ہے جس لطف سے وہ اپنے ہونٹ چاٹتا ہے، اور بھوکا اور لالچی ہونیکے جو آثار اُس کے چہرے سے ظاہر ہیں علامہ کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ :" جلدی جلدی ختم کرو، وقت بہت قیمتی ہے،

آئیون :" آپ لکھواتے جائیے، میں دونوں کام ساتھ ساتھ کر سکتا ہوں، . . . مجھے ذرا بھوک زیادہ لگ رہی ہے

علامہ :" تمہارے اتنا پیدل چلنے کے بعد بھوک نہ لگتی تو اور کیا ہوتا "

آئیون :" جی ہاں، اور دیکھئے موسم بھی تو کتنا بُرا ہے، . . . ہمارے صوبہ میں تو اب تک بہار بھی آچکی ہوگی اور برف پگھل پگھل کر چھوٹے چھوٹے نالے بنے ہوئے ہونگے "

علامہ :" تم جنوبی علاقہ کے رہنے والے ہو؟ "

آئیون :" میں ڈان کے خطہ کا رہنے والا ہوں۔ . . . ہمارے ہاں تو مارچ ہوتے تک پورا بہار کا موسم ہوتا ہے، یہاں یہ اس قدر کہر ہے، ہر وقت دھندلا سماں رہتا ہے . . . وہاں تو اب تک گھاس اُگ آتی ہے . . . تقریباً تقریباً ہر جگہ خشک ہوتی ہے اور چاہئے تو پکڑنے کو مکڑیاں بھی ہوتی ہیں "

علامہ :" مکڑیاں تم کیوں پکڑتے ہو؟ "

آئیون ۔(آہ بھر کر) " یونہیں، ایک مشغلہ سمجھ کے . . . اُنکے پکڑنے میں مزا آتا ہے، ایک تاگے کے ایک طرف لاسا لگا لیتے ہیں، اس سے مکڑی کو پشت پر آہستہ آہستہ مارتے ہیں، مکڑی غصہ میں آکر اپنے پنجوں سے اُسے پکڑ لیتی ہے، اور اُس سے چمٹ جاتی ہے، . . . ہم تو ٹوکرا بھر مکڑیاں پکڑ کے اُن میں ایک بھونرا ڈال دیتے تھے "

علامہ :" بھونرا کیا چیز ہوتی ہے؟ "

آئیون :" وہ ایک قسم کی مکڑی ہوتی ہے، جو عام مکڑیوں سے قدرے ملتی جلتی بھی ہے "

علامہ بیس سے کچھ کم سطریں لکھواتا ہے اور پھر خیال میں غرق کچھ دیر بیٹھا رہتا ہے۔ جب تک علامہ خیال میں مستغرق ہے، آیئون اپنی گردن اونچی اُٹھاتا ہے اور اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کرنیکی کوشش کرتا ہے، اُس کی نکٹائی ٹھیک طور سے بیٹھی نہیں، سَرا باہر نکل آیا ہے، اور کالر بار بار اُٹھنے لگتا ہے،

علامہ:۔ ہوں تو آیئون، کیا تمہیں ابھی تک کوئی ملازمت نہیں ملی۔

آیئون:۔ نہیں صاحب ملے کیسے، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ فوج میں والنٹیر ہو جاؤں، البتہ میرے ابا کا یہ منشا ہے کہ میں کسی پنساری کے یہاں ملازم ہو جاؤں"

علامہ:۔ ہوں . . . لیکن تمہارے لئے تو کالج میں داخل ہونا بہتر ہوگا۔ امتحان تو مشکل ہے لیکن محنت اور استقلال سے کام کرو تو کامیاب ہو جاؤ، مطالعہ کیا کرو اور پڑھا کرو، . . . تم کافی کتب بینی کرتے ہو یا نہیں؟"

آیئون۔ (سگرٹ جلاتے ہوئے) نہیں صاحب، یہ تو مجھے افسوس سے ماننا پڑتا ہے"

علامہ:۔ تم نے ٹورگنیف TURGENEV پڑھا ہے"

آیئون:۔ ن، نہیں

علامہ:۔ اور گوگول GOGOL ؟"

آیئون:۔ گوگول، ہاں . . . گوگول . . . نہیں میں نے اُسے بھی نہیں پڑھا"

علامہ:۔ ہیں آیئون؟ تمہیں شرم نہیں آتی، تم ایسے اچھے آدمی ہو تم میں استعداد بھی ہے . . . اور تم نے گوگول نہیں پڑھا، تمہیں گوگول ضرور پڑھنا چاہئے۔ اُس کی کتابیں تم مجھ سے لو، اُسکا پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ . . . اگر تم نے نہ پڑھا تو ہماری تمہاری لڑائی ہوگی"

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہتی ہے علامہ غور کرنے لگتا ہے۔ اور ایک نرم نرم سوفے پر آدھا لیٹا آدھا بیٹھا ہوا ہے، آیئون لمحہ بھر کے لئے اپنے کالر سے توجہ ہٹا کے اُسے بالکل اپنے بوٹوں کی طرف مبذول کر لیتا ہے، اُس نے ابھی تک نہیں دیکھا کہ برف نے جو اُس کے پاؤں کے تلووں سے گھلتی رہی ہے قالین پر دو بڑے بڑے داغ بنا دئے ہیں۔ اُس کو شرم آنے لگتی ہے،

علامہ - (دھیمی دھیمی آواز میں) بھائی آئیون آج تو مجھ سے کام نہیں ہونیکا۔ کل صبح آجائیو۔ لیکن پورے نو بجے، خدا تمہیں دیر سے آنے سے محفوظ رکھے۔"

آئیون اپنا قلم رکھ دیتا ہے، میز کے پاس سے اُٹھ جاتا ہے، اور ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے، پانچ منٹ خاموشی میں گزرتے ہیں، اور آئیون کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اُس کے جانے کا وقت آگیا لیکن علامہ کا کمرہ ایسا پرلطف اور گرم ہے، اور چائے اور مٹھائی کے مزے کی یاد اُسکے دل میں اسقدر تازہ کہ گھر کا خیال آنے سے بھی اُسکے دل میں ایک درد سا اُٹھنے لگتا ہے۔ گھر میں افلاس بھوک، سردی، ایک دائمی ناراض باپ، اور اُس کی جھڑکیوں کے سوا کچھ بھی نہیں، یہاں وقت ایسے مزے میں گزرتا ہے اور اُس کے پرندوں اور اُس کی مکڑیوں تک میں بھی دلچسپی لیجاتی ہے۔"

علامہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور ایک کتاب اٹھالیتا ہے۔"

آئیون - (اُٹھتے ہوئے) تو پھر آپ مجھے گوگول دیں گے؟"

علامہ - ہاں ہاں آئیون لیکن عزیزی تم اتنی جلدی میں کیوں ہو، آؤ اور مجھے اور کچھ باتیں سناؤ

آئیون بیٹھ جاتا ہے، اس کے ہونٹوں پر ایک تبسم نمودار ہو جاتا ہے۔ تقریباً ہر شام وہ اس کمرۂ مطالعہ میں بیٹھتا ہے، اور اُسکو اس کمرہ کا ساں کچھ عجیب طور پر نرم معلوم ہوتا ہے جو اس کے لئے ایک خاص کشش سے بھرا ہے اور علامہ کی نگاہوں اور اُسکی آواز سے مشابہ ہے۔ بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں کہ اُس کو خیال ہونے لگتا ہے کہ علامہ اُس سے مانوس ہو رہا ہے اور اُسکا بہت مشتاق ہے، اور اُس کے دیر سے آنے پر جو اُس پر ڈانٹ پڑتی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ علامہ کرڑیوں اور ڈان کی مچھلیوں کی بابت اس کی سرگزشتوں کا منتظر ہوتا ہے۔

ٹالسٹائے کے عشقیہ خطوط
بنام ویلیریا آرسینیف
(۱۸۵۶ء - ۱۸۵۷ء)

مترجمہ ملک محمد اسلم خاں، بی، اے کیمبرج سابق متعلم جامعہ

خط نمبر ۱

۲۳ راگست ۱۸۵۶ء

خاتون سُوڈا کودف

تمہارا نامہ شیریں مجھے ابھی ملا ہے، پہلے خط میں میں واضح کرچکا ہوں کہ میں کیوں تمہارے ساتھ خط وکتابت کرنے پر آمادہ ہوا اب میں لکھ تو رہا ہوں، لیکن اُس سے بالکل مختلف دلی کیفیت میں جس میں میں نے پہلا خط لکھا تھا، اُس وقت میں حد سے زیادہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ اُس محبت کو روکنے کی کوشش کروں جو رہ رہ کے میرے دل میں آتی تھی، اب میں اُس نفرت کو روکنے کی کوشش کر رہا ہوں جو اُس خط نے میرے دل میں پیدا کردی ہے جو تم نے میری چچی کو لکھا، اور نفرت ہی نہیں بلکہ رنج اور مایوسی بھی، یہ قاعدہ ہے "فطرت کو کھڑکی سے باہر پھینکو، وہ دروازہ سے موجود ہوگا"، کیا سنج کشتی نمونوں کی خوبصورت پوشاکیں، اور ایڈی کا ننگ بیشہ کے لئے تمہارا انتہائے مسرت رہ سکتے ہیں یہ سخت ظلم اور بے انصافی ہے، تم نے کیوں یہ بات لکھی؟ تمہیں مجھ سے پوری پوری واقفیت تھی، یہ بھی علم تھا کہ مجھے یہ بات کس قدر ناگوار گذرے گی، کیا یہ میری چچی کو مرعوب کرنے کے لئے لکھا گیا ہے؟ یقین مانو کسی شخص کو یہ جتلانے کا کہ میں کیا ہوں سب سے برا طریقہ یہ ہے کہ اُس سے یہ کہہ دیا جائے کہ "میں یہ ہوں"، اوّل تو اگر تم اُن چیزوں کا ذکر نہ کرو جو تمہارے دل میں فخر وناز پیدا کرتی ہیں، تو لوگ

پنے دلوں میں اُس سے زیادہ تمہاری عزت کرینگے جتنی تمہارے اپنی تعریف آپ کرنے سے، اور دلوں میں تمہارا خیال بھی زیادہ رکھیں گے، دوسرے اگر کوئی اور شخص تمہارا ذکر کرے تو لوگوں کی نظروں میں تم میں ایک نئی خوبی پیدا ہو جاتی ہے یعنی حیا۔ انسان کا شاعر یا فلسفہ داں ہونا لوگوں کے دلوں میں اس کی اتنی وقعت نہیں پیدا کرتا جتنی کہ معاملات میں سوجھ بوجھ۔ بچارا تم کشمشی نمونے کی بیحد خوبصورت پوشاک میں حد سے زیادہ بُری معلوم ہوتی ہو گی، اور یقین مانو کہ اپنے سفری لباس میں کروڑوں درجہ بہتر۔

یہ بات دیانت سے دور ہے کہ انسان اعلیٰ سوسائٹی سے محبت رکھے اور انسان سے نہ رکھے اس میں خطرے بھی بہت ہیں۔ کیونکہ ناکارہ لوگ اعلےٰ سوسائٹی میں دوسری سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ پائے جائیں گے اور تمہارے لئے اس میں کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ تم خود اعلیٰ سوسائٹی کی نہیں ہو، اور تمہارے تعلقات جس کی بنا ایک خوبصورت چہرہ اور سرخ کشمشی نمونے کی ایک پوشاک ہو گی، نہ تو خوشگوار ہی ہو سکتے ہیں، اور نہ ان سے تم اپنی شان قائم رکھ سکتی ہو، رہا سوال ایڈی کانگوں کا۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی پوری پوری تعداد چالیس کے قریب ہے، اور میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اُن میں سے صرف دو ایسے ہیں جو پرلے درجے کے بدمعاش نہیں، اس لئے اس بات سے بھی کوئی اتنی بڑی مسرت نہیں ہو سکتی مجھے کس قدر خوشی ہے کہ تمہارے کشمشی نمونے کے لباس میں پریڈ پر شکنیں پڑ گئیں، وہ گمنام نواب جس نے تمہیں بچایا کس قدر بیوقوف ہو گا۔ اگر میں اسکی بجائے ہوتا، تو میں بڑی خوشی سے ہجوم میں شامل ہو جاتا، اور کشمش کو سفید لباس کے اوپر کچلتا، میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ تم یقیناً کسی سخت خطرہ کی حالت میں نہیں تھیں، یہ بات محض ہی میں تھی جس کی کہانی تم نے نہیں پڑھی ہے کہ وہ ایک پریڈ پر تقریباً کچل ڈالا گیا، لیکن یہ کہ ایک نوجوان خاتون جو کہ تاجپوشی کے موقعہ پر موسیقی کا لطف اٹھانے آئی ہے پریڈ کی ایسی خوشگوار اور معصومانہ دل لگی میں کچلی جائے۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں سنا اور اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ ہوا ہو۔ ہمارے علاقہ میں اب موسم بہت اچھا ہے، اور آج میں چھ بجے صبح سے آٹھ بجے شام تک شکار میں پھرتا رہا اور مجھے اس میں ایسی مسرت حاصل

ہوئی جیسی نہ کسی وزیر اعظم کو حاصل ہو سکتی ہے، نہ کسی نوجوان خاتون کو جو کہ گلکاری کی پوشاک پہنے ہو، اس لئے گو میں اسکو آنے کے لئے بیتاب ہوں کہ تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر اپنی طبیعت کو غصہ کی وجہ سے بےقابو کروں، لیکن میں نہ آؤنگا۔ اور تمہیں ہر قسم کی بلند پرواز خوشیوں اور اُنکے عام تلخ نتیجوں کی دعا دیتا ہوا میں ہوں تمہارا سب سے ناچیز اور سب سے ناخوشگوار خادم

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائے

"نیازمندانہ جذبات کے ساتھ" مجھے افسوس ہے کہ میں یہ اعلیٰ درجہ کی اصطلاح جس میں اس قدر ندرت اور لطافت ہے لکھنا بھول گیا نہیں، مذاق پس پشت، اگر تم اس خط لکھنے کے باوجود درگزر کرو تو تم بہت اچھی ہو، مس ورجانی، میری سفارش کرو

غزل

از لسان القوم مولانا علی نقی صاحب صفیؔ مدظلہ العالی

گردِ غم بر دل نشست آوازِ پائے برنخاست — کاروانِ عمرِ ما رفت و صدائے برنخاست
از لبِ شوریدگانِ غم نوائے برنخاست، — شیشۂ دلہا شکست اما صدائے برنخاست
خلق را زیرِ فلک درد آشنائے برنخاست، — نالہا کردم وزیں گنبد صدائے برنخاست
عرصۂ میخانہ را نازم کہ پُر شور و شر است — فتنہ نبود کہ در صحنش ز جائے برنخاست
کے تواں زد گام در راہِ محبت بے خطر — کاندریں رہ از خضر آوازِ پائے برنخاست
اندرونِ سینہ صد پیکاں نشست و نالۂ — از شہیدِ نازِ چشمِ سرمہ سائے برنخاست
پے ریاضِ طبع را قصریست کز بام و درش — جز ہوائے معصیت موجِ ہوائے برنخاست
طفلِ اشک آں نورِ چشمِ دل بخاک افتاد و باز — ناتوانے خستہ بے دست و پائے برنخاست
نے سرے دارد نہ بر دوش و نے تنے در پیرہن — چوں منِ مسکین ز کویش بے نوائے برنخاست
آں سیہ بختم کہ شمعے بر مزارِ من نسوخت — در برائے مغفرت دستِ دعائے برنخاست

قلبِ محزوں در فراقِ ہمرہاں خوں شد صفیؔ
کاروانے رفتہ و بانگِ درائے برنخاست

غزل

از مصور جذبات جانشین میر و غالب مرزا ثاقب لکھنوی

کیوں کوئی آئے اس طرف سایہ نہیں ثمر نہیں
میرا نہال آرزو خشک ہے بار ور نہیں

درد تو میرے دل میں ہے نالوں میں ہاں اثر نہیں
بیخبری جو ہے اُدھر اس لئے کچھ خبر نہیں

مجرم عشق ہوں تو خیر قلب حزیں نہ چھوڑنا
آئے ہو اب تو جاؤ کیوں دل ہی یہ رہگزر نہیں

طور کا سوز ختم ہے اب تو کوئی اثر نہیں
تو یونہی جل کہ شمع دل تیرے لئے سحر نہیں

صبح ازل سے جذب ہی حسن میں عشق سے سوا
میں تو اُدھر کا ہو گیا آپ ہیں جو اِدھر نہیں

منکر ہمت دلی کاش کہیں سے دیکھ لے
راہ ہے اور مرے قدم ایک بھی ہم سفر نہیں

غنچہ گل کو دیکھکر ہاتھ بڑھا کے رہ گئے
خانۂ غیر ہے یہ دہر کوئی ہمارا گھر نہیں

طول شب فراق بس میں تو وداع ہو چلا
نالوں نے اُٹھ کے دور دور دیکھ لیا سحر نہیں

تیرہ سرائے دہر میں خانہ زیست لٹ گیا
ایک طرف تو دل نہیں ایک طرف جگر نہیں

زردی رخ سے کیا غرض جلنے پہ اعتراض ہو
قابل دید ہے جو شے اُسپہ کوئی نظر نہیں

وہ جو گلوں پہ ہر گھڑی رکھتے تھے سایہ دھوپ میں
اُڑ گئے یوں کہ باغ میں ایک بھی انکا پر نہیں

بزم میں ہے مری طلب وہ بھی سرور عیش کی
ڈھونڈ رہی ہو تم جہاں خیف کہ میں ادھر نہیں

درد کا نام مٹ گیا دل جو مرا فنا ہوا
نالے کو موت آ گئی اور کوئی نوحہ گر نہیں

زندگی جفا و ظلم تھی مری زندگی کے ساتھ
مرنے کے بعد کیا ہوا پھر مجھے کچھ خبر نہیں

وہ نہیں خیر میں تو ہوں نذر مصائب فراق
نالۂ د دہر میں بے اثر نہیں

میں نہ سہی نگہ سہی جانے دے پاسبان اسے
بزم میں ہے زمانہ بھر ایک مری نظر نہیں

چھٹ گئے ساکن لحد محنت و انبساط سے
روئے کوئی اثر نہیں کوئی ہنسے خبر نہیں

خانۂ قبر میں ترا دل سے رہین لطف ہوں
میرے لئے کھلا ہو جو ایسا تو کوئی در نہیں

اب کہاں وقت ناز حسن آؤ لحد سے اٹھ چلیں
حشر اسی کا نام ہے میرا تمہارا گھر نہیں

ایک ہی کارواں ہے قافلہ سرشک غم
دل کا سوائے عشق دوست کوئی بھی راہبر نہیں

بازوئے آسماں نور و قلب حزیں پہ بار ہیں
قید میں ہوں تو کاٹ دو حاجت بال و پر نہیں

رعب جلال ہے فقط وجہ سکوت اہل دہر
ورنہ جہاں میں کون ہے جسکو مری خبر نہیں

ثاقب اس انجمن میں تو ہرزہ سرا ہوا تو کیوں
جبکہ بجز کمال عیب تجھ میں کوئی ہنر نہیں

غزل

از تراوش کلک حافظ محمد علی صاحب قاری وکیل غازی پور

اے خوش آں شبہا کہ سر بر آستانے داشتم
کار با فریاد و با آہ و فغانے داشتم

اے خوش آں شبہا کہ در بر جان جانے داشتم
طالع فرخندہ و بخت جوانے داشتم

یاد آراں عہد کاں بستی بمہر بندہ
من ہماں ہستم کہ چشم خوں فشانے داشتم

او ز ناز از سر گرانیہا بمن میداشت من
در نیاز بے نہایت نیک شانے داشتم

بود از وقد غن کہ تا نایم بہ بزم خاص او
مصلحت داں دانش زاں خوش گمانی داشتم

مسکنم صحرائے سودا و جنوں آمد کنوں
پیش ازیں در کوچۂ اش مکانے داشتم

ور جفا و جور یار من اگر ممتاز بود
من بہ تسلیم و رضا صد گونہ آسانے داشتم

جان و دل دادم لبش را در بہائے بوسۂ
بہ ازاں امید از شیریں دہانے داشتم

سرو تو اے فاختہ دیدی کہ گشتہ پا بگل
در چمن چوں باخود آں سرو چمانے داشتم

چوں خدنگش در دل آمد جان ز دل گشتہ بدر
تیر او اندر دل خود ہمچو جانے داشتم

خاطرم گوید دو عالم چوں نگشتے زان من
تیر از مژگان و از ابرو کمانے داشتم

حرف حرت از یاد من شد چوں رسیدم پیش او
ورنہ از ایام ہجراں داستانے داشتم

لال شد از رعب و داب شہر یار ملک حسن
آنکہ من اندر دہان خود زبانے داشتم

بخت بد بیروں کشید انداخت در ویرانۂ
در فضائے قدس ورنہ آشیانے داشتم

قاری از چشم ترم برخاست طوفان عظیم
غرق گردید آنکہ من باخود جہانے داشتم

ولہ

رخ سوئے کعبہ آمدہ زاہد پاکباز را
در خم ابروئے کسے قبلۂ ما نماز را

کیست کہ پے برد بکنہ راز نیاز و ناز را
شد بسر سبکتگیں بندۂ ناز ایاز را

سوخت دلم ز شعلۂ شمع جمال رخساد
جز دل سوختہ کہ یافت لذت ایں گداز را

دولت خویش از زکوۃ پاک کنند اغنیا
بوسۂ لب زکوۃ ہست دولت حسن و ناز را

ملک دلم بامن بود رخ چو نمود شاہ حسن
لشکر غم گرفتہ عشق آمدہ ترکتاز را

حوصلہ لے نگمس بکن ورنہ کنند تارسی
دست چو شاہ خود بداد جا شدہ شاہباز را

ہر دو جہاں نہادہ است سر بزمیں عاجزی
پایہ بلند آمدہ حسن کرشمہ ساز را

بربط و عود و چنگ و نے نیست مگر بہانہ
مستی عارفاں کجا حاجت نوائے ساز را

قاری بے نوا ترا بار کجا بہ بزم ناز
ہاں چو کنی دلیل راہ از پے خود نیاز را

اقتباسات

ہندوستان کی معاشی حالت: کچھ عرصہ ہوا جنوا میں تمام دنیا کی ایک معاشی کانفرنس ہوئی تھی جس میں تقریباً ۵۲ ریاستوں کے نمائندہ اور ماہرین فن معاشیات دنیا کی موجودہ معاشی حالت پر غور کرنے اور اصلاحی تجاویز سوچنے کے لئے مجتمع ہوئے تھے۔ اس میں ہندوستان کیطرف سے بھی ایک وفد شریک ہوا تھا جس کے اراکین ڈاکٹر کریم حیدر لودی کیمبل رودس اور ایک پارسی صاحب تھے، اس وفد نے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے جو رپورٹ ہندوستان کی معاشی حالت پر کانفرنس کے سامنے پیش کی اسکے چند اقتباسات ذیل سے ہندوستان کی تجارتی حالت اور تجارت کے متعلق حکومت کا جو رویہ ہے اس کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی معاشی حالت اور بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات بہت ہی اجمال کے ساتھ بیان کیے جاسکتے ہیں، ہندوستان اس لحاظ سے ایک مقروض ملک ہے کہ برطانوی اور دیگر بیرونی سرمایہ یہاں کی ریلوں، نہروں اور بعض صنعتوں میں اس سے زیادہ لگا ہے جتنا کہ ہندوستان کا سرمایہ غیر ممالک میں لگا ہے، اس سرمایہ پر ہر سال بڑی بڑی رقوم بطور سود کے براہ راست یا سرکاری طور پر مطالبات وطن کے نام سے ادا کیجاتی ہیں اسمیں پنشن اور دوسرے قسم کے وہ مطالبات شامل ہیں جن کی ادائیگی انگریزی سکوں میں ہونا چاہئے، اس مد کی مجموعی رقم تقریباً ۴۵ کروڑ روپیہ سالانہ ہوتی ہے۔ ان مطالبات کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہر سال کل برآمد اس کی کل درآمد سے زیادہ قیمت کی ہو بالفاظ دیگر سامان تجارت کی درآمد و برآمد کے توازن ہندوستان کے موافق قائم رکھا جائے، یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہندوستان کے اندر پیدائش دولت "صرف دولت" سے زیادہ ہو۔ ہندوستان کا رقبہ روس کو نکالکر براعظم یورپ کے مساوی ہے کل بنی نوع انسان کا پانچواں حصہ یہاں آباد ہے، باشندگان کی ضروریات بہت معمولی ہیں جو ملکی پیداوار سے پوری ہوجاتی

ہیں اور مقامی ضروریات کی تمام اشیاء قرب وجوار سے دستیاب ہوجاتی ہیں۔

اس وقت پیدائش دولت کے لئے ہندوستان کی تمام تر سعی کوشش بیرونی منڈیوں سے زیادہ ملکی منڈیوں پر مرکوز ہے۔ ہندوستان کی زرعی برآمد اس کی کل برآمد کے دسویں حصہ کے برابر ہے حالانکہ یہ عشر کل زرعی پیداوار کا صرف گیارہواں حصہ ہوتا ہے۔ ہندوستان اپنی اس خصوصیت کیوجہ سے اور کثیر آبادی، وسیع رقبہ، اور بیش بہا قدرتی خزانہ اور وسائل کی وجہ سے نیز اس وجہ سے کہ ملک کے اندر مختلف صوبوں کے درمیان کسی قسم کی تجارتی دقتیں اور رکاوٹیں نہیں ہیں، یورپ کی ریاستوں سے اتنی مناسبت نہیں رکھتا جتنی کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے۔

”جہانتک ملکی تجارت کا تعلق ہے حکومت کیطرف سے ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں جو مواقع ملکی تجارت کو فروغ دینے کے ملے تھے ان سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا جائے، وہ مصنوعات جو مقامی محنت اور مقامی سرمایہ سے اور مقامی مواد سے مقامی ضروریات کو فراہم کرنے کے لئے تیار ہونے لگی تھیں انکو اس بیرونی سامان کے مقابلہ میں نہ مرنے دیا جائے جو ارزاں قیمت پر ہندوستان کی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا ہے جو فائدہ ارزانی قیمت کی وجہ سے ہندوستان کو ہوتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ ملکی مصنوعات کو زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم کیا جائے اور انکو ترقی دیجائے۔ ہندوستان کی تامینی پالیسی کا بھی یہی مقصد ہے کہ صرف ان مصنوعات کی حفاظت کیجائے جو ایک روز بلا کسی تامین اور امداد کے دنیا کی منڈیوں میں مقابلہ کرسکیں اسی وجہ سے سرکاری امداد خواہ درآمدی محصول کے ذریعہ سے خواہ دوسری صورت سے ہو صرف ایک مقررہ زمانہ کے لئے چند خاص خاص مصنوعات کے لئے دیجاتی ہے“

”کچھ تو جنگ اور کچھ مابعد جنگ حالات کی وجہ سے ۱۹۱۸-۱۹ء سے لیکر ۱۹۲۱-۲۲ء تک ہر سال حکومت ہند کے میزانیہ میں آمدنی و خرچ کی مقدار مساوی نہ ہوسکی اور برابر خسارہ ہوتا رہا جس کی کل میزان تقریباً ایک ارب روپیہ ہوتی ہے۔ مختلف محصولات کے اضافہ اور مصارف میں تخفیف کرکے حکومت ہند کی مالیات میں آمد و خرچ کا توازن اب دوبارہ قائم کیا گیا ہے، ہمارا قومی قرضہ ۱۹۲۳ء میں

۱۰ ارب ۹۶ کروڑ روپیہ اور ۲۴ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ تھا، یہ قرضہ اب بڑھکر ۵۲ ارب ۳۱ کروڑ روپیہ اور ۲۴ کروڑ ۹۰ لاکھ پاؤنڈ ہوگیا ہے"

ہندوستان کو آزادی کب ملنا چاہئے؟ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کو نافذ ہوئے اب آٹھ سال سے زائد ہوگئے ہیں، حکومت خود اختیاری" کی ابتدائی منزل میں جو تجربات ہوئے ہیں اور جنکی بنا پر آئندہ آزادی کی دوسری قسط ملنا چاہئے یا نہ ملنا چاہئے اسکا فیصلہ کرنے کے لئے زیر دفعہ ۸۴ الف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" کم از کم دس سال کی مدت ختم ہونیکے بعد" اب ایک شاہی کمیشن تفتیش حالات کے لئے آنیوالا ہے۔ اس آنیوالے امتحان کے لئے تیاریاں ابھی سے شروع ہوگئی ہیں ایک گروہ ہے جو ہندوستانی ہے یا ہندوستان کا بہی خواہ ہے اور برطانوی مواعید پر پورا اعتماد رکھتا ہے، یہ گروہ تقریر تحریر اور ذاتی اثرات کو کام میں لاکر حکومت خود اختیاری کے لئے ہندوستان کی اہلیت کو ثابت کرنا چاہتا ہے دوسرا گروہ دفتری حکومت کے ارکان کا ہے یہ جماعت اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستانیوں کو ہر طرح حکومت خود اختیاری کے لئے نااہل ثابت کرنیکی ہر ممکن کوشش کررہی ہے۔

ڈاکٹر جے۔ ٹی سنڈرلینڈ امریکہ کے ایک فاضل مصنف ہیں اور چونکہ ہندوستان کی آزادی کے حامی ہیں اس لئے انکا شمار اول الذکر گروہ میں کیا جاسکتا ہے، آپ کی ایک تصنیف" ہندوستان، امریکہ اور عالمگیر اخوت" کے نام سے شائع ہوئی تھی جو بہت مقبول ہوئی، اب ایک تازہ تصنیف "آزادی کے لئے ہندوستان کا مطالبہ" عنقریب شائع ہونیوالی ہے، اس کتاب کے چند ابواب ماڈرن ریویو میں نکل رہے ہیں جس میں مصنف نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ "ہندوستان کو آزادی کب ملنا چاہئے" مصنف کی رائے ہے کہ حکومت خود اختیاری کی قابلیت اور اہلیت تعلیم اور تدریس سکھانے سے نہیں پیدا ہوتی ہے، اگر امریکہ کے قوم پروروں نے ۱۷۷۶ء میں برطانوی جوے کو اپنے کاندھوں سے نہ اتار پھینکا ہوتا اور منتظر رہتے کہ برطانوی قوم انہیں حکومت خود اختیاری کے لئے تیار کردے تو قیامت تک امریکہ والے حکومت خود اختیاری کا انتظار کرتے رہ

جاپان نے حکومت خود اختیاری کی تعلیم اجنبی قوم سے نہیں حاصل کی، نہ سیام نے، پھر بھی آج یہ دونوں قومیں ترقی کی جس منزل پر ہیں وہ اظہر من الشمس ہے، ترکی نے اجنبی اثر و اقتدار سے آزادی حاصل کر لی اور اب وہ ترقی کی شاہ راہ پر ہے یہی حال جنوبی امریکہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ہے لیکن ان سب سے زیادہ قابل ذکر امریکہ کے حبشیوں کی وہ ترقی ہے جو انہوں نے ۱۸۶۳ء میں آزاد ہونے کے بعد سے کی ہے۔ اگر ہم لوگوں نے بھی ان سے وہی کیا ہوتا جو آج انگریز ہندوستانیوں سے کہتے ہیں کہ "جلدی نہ کرو، رفتہ رفتہ قدم اٹھانا چاہیئے۔ جب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوجاؤ گے تو تم کو آزادی دینگے"، تو کیا حبشی آج آزاد ہوتے یا ہزار سال میں بھی وہ آزادی حاصل کر سکتے تھے۔

"دنیا کی ہر آزاد قوم نے محض اپنے تجربہ سے اپنے اوپر حکومت کرنا سیکھا ہے نہ کہ ایک اجنبی حکومت کے سامنے زانو تہ کر کے، سبھوں نے پیرنا سیکھا ہے، لیکن ہمیشہ پانی میں اتر کر آج ہندوستان بھی صرف پانی کے اندر اترنے کا مطالبہ کر رہا ہے، ایک سال تک اپنے اوپر واقعتاً حکومت کر کے غلطیاں کر کے اور انکی اصلاح کر کے ہندوستانی قوم سوراج کی وہ تعلیم حاصل کر سکتی ہے جو ہزار برس تک برطانوی آقا و استاد اسکو نہ سکھلا سکیں گے، کیا آج کوئی شخص گلیڈاسٹون کے اس قول کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ ہر سال اور ہر مہینہ جو کوئی محکوم قوم ایک استبدادی نظام حکومت کے ماتحت گزارتی ہے وہ اس قوم کو حکومت خود اختیاری کے لئے اور زیادہ ناقابل اور نااہل بنا دیتا ہے۔"

"میں نے جو کچھ اب تک عرض کیا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ کسی قوم کو غلامی کی زنجیروں میں رکھکر "اجنبیوں" اور آقاؤں کے ذریعے اسکو" آزادی کے لئے تیار کرنے کا خواب دیکھنا محض ایک دھوکا ہے، بنی نوع انسان کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے اور اس مضمون کا مطالعہ کرنے والے اور صاحب رائے لوگوں نے اس خیال کی تردید کی ہے جدید تعلیم اور جدید علم النفس نے اس کی غلطی ظاہر کر دی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کہیں بھی یہ تجربہ کامیابی کیساتھ نہیں ہوا اور ایسا ہونا قدرتاً بھی ممکن نہیں ہے، "اقوام خود سے بنتی ہیں" اجنبی لوگ انکو تراش کر بتوں کی طرح کھڑا نہیں کر سکتے۔ اگر برطانوی قوم ہندوستان کو سکھلا بھی سکے کہ انگلستان کی طرح ایک نظام حکومت تیار کرے اور جہانتک ممکن ہو انگریزی نمونہ پر اس کو چلائے

تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ محض "مصنوعی" اور "غیر فطری" ہوگا۔ اور بہت جلد تباہ ہو جائیگا برطانوی اور ہندوستانی طور طریقے ایک نہیں ہیں، نہ برطانوی ضروریات اور ہندوستانی ضروریات یکساں ہیں، برطانیہ کی دست برداری کے بعد بھی ہندوستانیوں کو اپنے تمام نظام حکومت میں ایسی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی جو انکے نصب العین کے لحاظ سے موزوں اور مناسب ہوں اور ان کی ضروریات کو پورا کر سکیں، برطانوی قوم آخر اس کو محسوس کیوں نہیں کرتی اور بلا مزید احمقانہ اور نقصان دہ تاخیر کے وہ ملک اس کے جائز وارثوں کو کیوں نہیں واپس کر دیتی ہے کہ وہ ایک ایسا نظام حکومت بنائیں جو انکے تمدن ان کی معاشرت اور انکی ضروریات کے مطابق ہو اور اسی وجہ سے زیادہ مفید اور زیادہ پائدار ہو۔

ہندوستان کے لئے ایک پبلک اسکول کچھ عرصہ ہوا جب حکومت ہند کے مشیر قانونی مسٹر اس آر داس نے ایک پبلک اسکول کے قیام کی تجویز پیش کی تھی جس کی تائید با اثر حلقوں سے کی گئی تھی اور اب کئی لاکھ روپیہ کا اس کے لئے چندہ بھی جمع ہو گیا۔ عنقریب اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے انتظامات بھی شروع ہونے والے ہیں۔ پبلک اسکول کی اس تجویز پر رسالہ جامعہ میں رائے زنی کی جا چکی ہے آج ہم ایک مشہور ماہر تعلیم پروفیسر ششیا دری کی رائے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

"بڑے غلغلہ اور جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان میں ایک "خاص" پبلک اسکول کے قیام کی تجویز حال میں پیش کی گئی ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس تجویز نے کم از کم مجھے تو افسردہ کر دیا ہے اس لئے کہ اولاً یہ مدرسہ اپنے کثیر مصارف کی وجہ سے ہندوستان ایسے غریب ملک کے لئے بالکل ناموزوں ہے اور محض امراء کے بچوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ جائے گا جن کے لئے یہ کسی طرح بھی مفید نہ ہوگا کہ ایک ایسی علیحدگی کی فضا میں تربیت حاصل کریں۔ اسکی وجہ سے انہیں بیجا تکبر، خود بینی اور خود نمائی کی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جس کو آج کل کی جمہوری نظام زندگی میں کوئی نہیں برداشت کر سکتا، جن لوگوں کو پبلک اسکول نظام تعلیم پر پورا اعتماد ہے انہیں برٹرڈرسل کی جدید تصنیف تعلیم کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں

اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے. بیشک ایک زمانہ تھا جب پبلک اسکول سے اس قسم کے لوگ پیدا ہوتے تھے جو سلطنت کی توسیع اور حکومت میں بہت حصہ لیتے تھے اور مفتوحوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے لیکن اس جدید زمانہ میں اس قسم کی روح طلبہ میں پیدا کرنا مضر ہے علاوہ ازیں اس طرح کا انا رطی طریق تعلیم ہندوستان کی روایات کے بالکل خلاف ہے جہاں قدیم زمانہ میں شاہی خاندان کے شہزادے برہم چاریوں کے پہلو بہ پہلو سادھوؤں اور رشیوں کی جھونپڑی میں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے سب سے زیادہ یادگار واقعہ سری کرشنا جی کا ہے جو باوجود اس کے کہ خود شاہی خاندان سے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا دوست اور مدرسہ کا رفیق سوداما تھا جو ایک غریب برہمن کا لڑکا تھا۔ اس دوستی اور مساوات کی تہہ میں جو بات ہے اس کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے، سرسوتی دیوی نے اپنے مندر میں اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان کوئی تفریق اور امتیاز نہیں قائم کیا پھر ایک درسگاہ جو صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو جو بڑی فیسیں ادا کر سکتے ہوں اور جہاں کی تعلیم یہ ہو کہ ہمیشہ یورپ والوں کے قدم چومنا فخر سمجھا جائے ایسی درسگاہ نہ تو ہندوستان کے موجودہ تعلیمی نظام میں کوئی مفید انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور نہ ہندوستانیوں کو وسیع النظر بنا سکتی ہے. بہتر یہ ہے کہ ملک کا ایک ایک پیسہ جو مل سکتا ہو موجودہ ہائی اسکولوں کی اصلاح اور بہتری پر صرف کیا جائے اور ہر ہندوستانی چاہے وہ کسی قدر معزز اور اعلیٰ مرتبہ پر کیوں نہ ہو اس کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھے کہ اسکا لڑکا ہائی اسکولوں کے دیگر معمولی طلبہ کے ساتھ تعلیم حاصل کرے۔"

تاریخ الامّت کا ایک ورق

آخری فاطمی خلیفہ عاضد لدین اللہ

سنہ ۵۵۵ھ سے ۵۶۷ھ تک

جب سے جامعہ علیگڑھ سے دلی میں منتقل ہوئی اسوقت سے بعض وجوہات سے تاریخ الامت کا سلسلہ بند رہا۔ اس سال اسکی چھٹی جلد لکھی گئی ہے اور کاتب صاحب اسکی کتابت کر رہے ہیں انشاء اللہ رمضان شریف تک یہ حصہ چھپکر تیار ہو جائیگا۔ اسمیں طوفان نوح کے بعد سے سنہ ۹۲۳ھ تک کی جس میں خلافت مصر سے آل عثمان کے ہاتھ میں منتقل ہوگئی مصر کی ایک اجمالی تاریخ آگئی ہے جو ابتک اردو زبان میں نہ تھی۔ اسی حصہ کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اسلم

خلیفہ فائز بنصر اللہ کی وفات کے بعد وزیر صالح نے فاطمی خاندان کے ایک سن رسیدہ شخص کو خلافت کے قابل سمجھکر بیعت لینے کا ارادہ کیا مگر کسی خیر خواہ نے اس کے کان میں کہا کہ پہلے وزرا تم سے زیادہ عاقل تھے جو بچوں کو خلیفہ بناکر خود امور سلطنت کے متولی بن جاتے تھے۔ یہ سنکر اس نے حافظ لدین اللہ کے ایک نابالغ پوتے عبداللہ کو عاضد کا لقب دیکر خلیفہ بنا دیا اور مہمات سلطنت پر بلا شرکت غیرے قابض ہوگیا۔ مزید تقرب کے لئے اپنی بیٹی بھی اس کے ساتھ بیاہ دی اور بیش قیمت جہیز رخصتی کے وقت اس کے ساتھ بھیجا۔

قتل صالح | صالح کے استبداد سے لوگ تنگ آگئے۔ خاصکر خلیفہ کی پھوپھی۔ اس لئے اس نے اپنے چند غلاموں کو بھیجا جو قصر کی دہلیز میں چھپ رہے۔ جب وہ نکلنے لگا تو خنجر سے اسکا شکم چاک کر دیا۔ لوگ اسکو اٹھاکر گھر لیگئے۔ اور وہ ۱۹ ار رمضان سنہ ۵۵۶ھ کو مرگیا۔ مگر موت سے پہلے خود خلیفہ کے حکم سے اس کی پھوپھی سے اپنا انتقام لے لیا۔

صالح پرشکوہ۔ فاضل۔ شجاع۔ سخی اور مدبر تھا فرائض شرع کا پابند۔ لیکن شیعیت میں غلو رکھتا تھا حضرت علی کی خلافت بلافصل پر علماء و فقہاء سے مناظرے کئے۔ اور ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام رکھا

"الاعتماد فی الرد علی اہل العناد" شعر بھی کہتا تھا۔

مشہد حسینؓ | اسی کے زمانہ میں مصر میں مشہد حسین تعمیر کیا گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ امیر الجیوش جب زمانہ شام کی مہم پر تھا اس کو معلوم ہوا کہ عسقلان میں امام حسین کا سر مدفون ہے۔ اس نے وہاں ایک قبہ تعمیر کرا دیا۔ صالح نے اپنے عہد میں چاہا کہ اسکو مصر میں لائے۔ اسی غرض کے لئے قاہرہ کی فصیل کے باہر ایک مدفن بنایا اور جامع تعمیر کرائی۔ لیکن خلیفہ نے اس اثر شریف کو شہر کے باہر رکھنا گوارا نہ کیا اور اپنے تصرف محل میں اس کے لئے ایک جگہ مخصوص کی۔ وہیں مشہد بنایا گیا جسمیں عسقلان سے خاک منتقل کی گئی۔

شاور۔ | صالح کے بعد اسکا بیٹا محی الدین وزیر ہوا جس کو خلیفہ نے ملک عادل کا خطاب دیا۔ مگر وہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا اور اسکی جگہ شاور نے لے لی۔

صالح کے آوردوں اور پروردوں کی ایک جماعت تھی جسکا سرغنہ ضرغام تھا۔ اس نے اپنی ساتھیوں کو متفق کر کے چاہا کہ شاور کو نکالکر خود وزیر ہو جاؤں۔ رمضان ۵۵۸ھ میں اس کے محل پر حملہ کیا۔ شاور کا بڑا بیٹا مارا گیا مگر وہ خود بچکر نکل بھاگا اور شام کیطرف چلا گیا۔ ضرغام مسند وزارت پر متمکن ہو گیا۔

ضرغام | اسمیں عقل۔ شجاعت۔ کرم۔ شیریں زبانی اور حسن صورت جملہ صفتیں تھیں۔ لیکن ایک عیب یہ تھا کہ جو شکایت کسی کی سنتا اسپر فوراً یقین کر لیتا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد کسی ذریعہ سے اسکو اطلاع ملی کہ امراء پھر شاور کو بلانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اس بنیاد پر ان سب کو جن کی تعداد ۷۰۰ تھی دعوت کے بہانے سے بلا کر اپنے گھر میں قتل کرا دیا۔ ان رجال دولت کے خاتمہ سے ملک میں بین اضمحلال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ صلیبیوں نے مصر پر چڑھائی کر دی۔ ضرغام نے اپنے بھائی ہمام کو مقابلہ میں بھیجا مگر وہ شکست کھا کر بحال تباہ قاہرہ واپس آیا اور صلیبی بلبیس کے قلعہ میں داخل ہو گئے۔

اسد الدین شیرکوہ | شاور مصر سے بھاگ کر سلطان نور الدین کے پاس پہونچا جو اسوقت صلیبیوں کے مقابلہ میں سرگرم جہاد تھا اور تمام سلاطین و ملوک اسلام میں قوت و شوکت میں سربلند۔ اور اس سے مدد کا طالب ہوا۔ اس نے مصر کو زیر بار احسان رکھنے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے رفیقوں میں

سے ایک خاص معتمد اسد الدین شیرکوہ کو فوج دیکر شاور کے ساتھ روانہ کردیا۔

شیرکوہ کرد کے قبیلہ زادیہ سے تھا جس کی سکونت مقام دربن ناحیۂ آذربیجان میں تھی۔ اس نے اور اس کے بھائی نجم الدین ایوب نے سلطان نورالدین کے ہمراہ صلیبیوں کے ساتھ جہاد میں ایسی شجاعت اور لیاقت کا اظہار کیا تھا جس سے سلطان کی نگاہ میں اُنکی خاص وقعت تھی

صلاح الدین | نجم الدین ایوب کا بیٹا یوسف صلاح الدین بھی اس سفر میں اپنے چچا کے ہمرکاب مصر کو چلا۔ اسکا باپ بوجہ اس کی کم سنی کے راضی نہ تھا لیکن تقدیر اسکو یوسف صدیق علیہ السلام کی طرح کھینچکر مصر لیگئی کہ وزیر بنا دے۔

یوسف صلاح الدین کی ولادت قلعہ تکریت میں ۵۳۲ھ میں ہوئی تھی۔ یہی وہ نوجوان ہے جو آگے چلکر سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح جنگ صلیبی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور جس کے کارنامے اسلامی تاریخ کے اوراق کے زیب وزینت بنے۔

سلطان نورالدین صلیبیوں کے حملہ کے خوف سے خود اس فوج کو حدود مصر تک پہنچا کر واپس واپس گیا۔ ۲۹ رجادی الاول ۵۵۹ھ کو یہ لوگ مصر میں داخل ہوئے۔ ضرغام مقابلہ کے لئے آیا اور مارا گیا۔ شاور پھر وزیر ہوا۔ اور ایک ثلث مصر کا خراج سلطان مذکور کے پاس اس کے اس احسان کے معاوضہ میں بھیجنے لگا۔

لیکن سلطان کی غرض یہ نہ تھی۔ بلکہ وہ چاہتا تھا کہ فاطمی سلطنت پر جو انتہائی ضعف کو پہنچ چکی ہے خود قابض ہو جائے۔ اس بارہ میں شیرکوہ کو لکھا۔ اس نے شاور سے مشورہ کیا۔ دونوں مخفی طور پر باہم متفق ہوئے کہ سلطانی قبضہ کا اعلان کردیں۔ مگر شاور کے دل میں شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ شیرکوہ اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کو وہ مصر سے نکال سکتا ہے، اور نورالدین یہاں پہنچ نہیں سکتا۔ پھر کیوں ملک اس کے حوالہ کیا جائے۔ یہ سوچ کر صلیبیوں کو لکھا کہ تم فوجیں لیکر آؤ اور شیرکوہ کو مصر سے نکالنے میں میری مدد کرو۔ ورنہ اگر مصر نورالدین کے قبضہ میں چلا گیا تو تمہاری خیر نہیں ہے اس کے علاوہ ان کو بہت کچھ مال ومتاع دینے کا بھی وعدہ کیا۔

صلیبیوں نے اپنی جمعیت لیکر دھاوا کیا۔ نورالدین کو جب اسکا علم ہوا تو وہ فوجیں لیکر انکی طرف بڑھا کہ نہ جانے پائیں لیکن وہ نہ رک سکے کیونکہ انکے لئے یہ خطرہ عظیم الشان تھا۔ علاوہ بریں امید بھی رکھتے تھے کہ شاید اس نادر موقع پر مصر کو فتح کرلیں۔

شاور کو جب انکی آمد کا حال ملگیا تو اس نے شیرکوہ کو لکھا کہ مصر سے چلے جاؤ۔ وہ ایفائے عہد پر مصر رہا۔ اور اپنی فوج کو لئے ہوئے بلبیس میں جہاں سے صلیبی بھاگ چکے تھے جاکر قلعہ گیر ہوگیا۔ شاور نے صلیبیوں کو ساتھ لیکر محاصرہ کیا۔ باوجودیکہ اسکی فصیلیں بلند نہ تھیں اور روزانہ صبح و شام کو نکل کر وہ مقابلہ بھی کرتا تھا لیکن تین مہینے پورے گزر گئے اور یہ لوگ اسکا کچھ نہ کرسکے۔

اس درمیان میں نورالدین نے شام میں صلیبیوں کو جابجا شکستیں دیں۔ اور قلعہ حارم بھی قبضہ کرلیا جو انکا بہت بڑا مرکز تھا۔ جب یہ خبریں مصر میں پہونچیں تو صلیبیوں نے گھبراکر اپنے گھر کی حفاظت کے لئے مصر سے واپسی کا ارادہ کیا۔ شیرکوہ کو لکھا کہ اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو ہم محاصرہ اٹھالیں۔ وہ واقعات سے بے خبر اور قلت ذخیرہ سے تنگ تھا راضی ہوگیا۔ اور مصر چھوڑ کر نورالدین کے پاس چلا گیا۔

وہاں ۵۶۲ھ تک رہا مگر مصر کا خیال اس کے دل کو چین نہ لینے دیتا تھا۔ آخرکار اس نے منتخب بہادروں کی فوج مرتب کی اور سلطان سے مصر کی اجازت چاہی۔ وہ راضی نہ تھا لیکن اس کے وفور شوق سے مجبور ہوکر اجازت دی اور اپنے چند امیروں کو بھی ساتھ کردیا۔ اس کل جماعت کی تعداد دو ہزار تھی۔

شاور کو جب اسکی اطلاع ملی تو اس نے پھر صلیبیوں کو بلایا۔ وہ یلغار کرتے ہوئے پہونچے۔ شیرکوہ دریا نیل کو پار کرکے بالائی مصر میں پہنچ چکا تھا۔ اسکے پیچھے مصری اور صلیبی لشکر دریا کیطرح موجیں مارتے ہوئے چلے شیرکوہ نے دیکھا کہ میری فوج قلیل اور غریب الدیار ہے۔ ایسا نہ ہو کہ انکے دل چھوٹ جائیں اس لئے سب کو جمع کرکے مشورہ لیا۔ بعضوں نے کہا کہ یہاں اگر ہم شکست کھاگئے اور گمان غالب یہی ہے تو ہمارے لئے کوئی پناہ کی جگہ نہیں اور اس ملک کے عامی و لشکری اور بازاری و فلاح سب کے سب چن چنکر ہم کو قتل کر ڈالیں گے۔ اور کوئی بھی بچکر نہ جائیگا۔

یہ سنکر نورالدین کے ممالیک میں سے ایک شخص شرف الدین برغش نامی کھڑا ہوا۔ اور بولا کہ جو قتل یا قید سے ڈرتا ہے وہ فوج میں کیوں شامل ہوتا ہے۔ چاہئے کہ اپنی بیوی کے ساتھ گھر میں بیٹھے اگر یہاں سے

بلا جنگ یا غلبہ حاصل کئے ہوئے ہم گئے تو نورالدین ہماری تنخواہیں بند اور جاگیریں ضبط کرلیگا۔ اور کہے گا کہ تم مسلمانوں کا مال کھاتے ہو اور انکے دشمنوں سے بھاگتے ہو مصر کو کیوں کفار کے سپرد کر آئے۔ اسکا ہمارے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔

صلاح الدین نے بھی اسی کی تائید کی۔ اور کہا کہ سوائے جنگ کے اور کوئی سبیل نہیں۔ شیرکوہ نے کہا کہ یہی رائے صحیح ہے اور اسی پر میں عمل کرونگا۔ چنانچہ مقابلہ میں صف آرائی کی اور ایسی جنگی تدابیر اور بے جگری کے ساتھ لڑا کہ دونوں فوجوں کو شکست دی اور کشتوں کے پشتے لگا دئیے۔

مورخین شیرکوہ کے اس عجیب وغریب کارنامہ پر انگشت بدنداں ہیں کہ صرف دو ہزار سوار لیکر اس نے ساری مصری اور فرنگی طاقت کو چند گھنٹوں میں کیسے توڑ دیا۔

اس فتح سے وہ صعید سے اسکندریہ تک قابض ہوگیا۔ اور اسکندریہ میں اپنے بھتیجے صلاح الدین کو متعین کرکے خود سارے بالائی مصر کا خراج تحصیل کرنے میں مشغول ہوا۔

ہزیمت خوردہ جماعت نے پھر اپنا ساز وسامان درست کرکے اسکندریہ پر چڑھائی کی اور صلاح الدین کو محصور کرلیا۔ شدت محاصرہ سے اس پر سختی گزر گئی۔ جب شیرکوہ صعید کیطرف سے مقابلہ کے لئے پہونچا اس وقت فریقین میں مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔

طے یہ پایا کہ اس نے جو کچھ وصول کرلیا ہے اس کے علاوہ پچاس ہزار دینار مصری حکومت اسکو اور دے۔ اور وہ اپنی فوج لیکر چلا جائے۔ شیرکوہ نے اسکو منظور کیا بشرطیکہ صلیبی بھی خالی ہاتھ شام کو واپس چلے جائیں اور مصر کے ایک گاؤں پر بھی قبضہ نہ کریں"

شیرکوہ اسکندریہ مصریوں کے حوالے کرکے ذیقعد کے مہینے میں واپس چلا گیا۔ لیکن صلیبیوں نے قاہرہ میں اپنا ایک شحنہ اور سواروں کا دستہ چھوڑا کہ اگر نورالدین کوئی فوج بھیجے تو شہر کی حفاظت کریں۔ اس فوج نے مصریوں پر سخت ظلم وستم ڈھائے اور دو سال کے بعد جب دیکھا کہ یہاں کوئی طاقت نہیں ہے شام میں اپنے بادشاہ اموری کو دعوت دی کہ آکر مصر پر قبضہ کرے۔

صلیبی امرا نے نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ اموری اگرچہ خونریز تھا لیکن مدبر بھی تھا۔ اس نے

کہا کہ ہمارا مصر کی طرف چلنا مناسب نہیں۔ کیونکہ وہاں کے لوگ ملک کو ہمارے حوالہ نہ کرینگے اور جنگ کے لئے آمادہ ہوجائیں گے۔ بلکہ یقین ہے کہ نورالدین کو بلائیں گے۔ اس صورت میں اگر شیرکوہ کو اس نے مصر میں بھیجدیا اور خود شام پر چڑھائی کردی تو سوائے جلاوطنی کے اور کوئی صورت ہمارے لئے نہیں رہجائے گی۔ لیکن صلیبی امرا نے اس کی بات نہیں مانی اور کہا کہ جبتک نورالدین تیاری کریگا اسوقت تک ہم مصر پر قبضہ بھی کر چکیں گے۔

اسی اثنا میں مصر کے بعض اعیان وارکان دولت کے بھی جو شاور کے مخالف تھے اس کے پاس خطوط پہونچے کہ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اسوجہ سے وہ قوی دل ہوکر روانہ ہوا۔ اور مصر پہنچکر صفر ۵۶۴ھ میں بلبیس کو قتل وغارت سے تباہ کر ڈالا۔ پھر قاہرہ کی طرف بڑھا۔ وہاں کے لوگوں نے اس خوف سے کہ بلبیس کی طرح یہاں بھی یہ قتل عام کریگا دروازے بند کرلئے اور پوری قوت سے مدافعت کرنے لگے۔

خلیفہ عاضد نے سلطان نورالدین کے پاس خط بھیجا کہ اس مصیبت سے مصریوں کو نجات دلائے۔ اور خط کے اندر اپنے حرم کے بال بھی رکھدیئے تاکہ اسکو ترس آئے۔ اس نے فوراً شیرکوہ کو چھ ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ اس کے پہونچتے ہی صلیبی خائب وخاسر شام کیطرف پلٹ گئے۔ لیکن اس جنگ میں فسطاط جیسا عظیم الشان شہر بالکل ویران ہوگیا جس میں مورخین کے بیان کے مطابق تین ہزار سے زائد مسجدیں تھیں۔

شیرکوہ کے آجانے سے مصریوں کو اطمینان ہوگیا۔ انہوں نے اس کی فوج کی ضیافتیں کیں خلیفہ نے بھی اس کو خلعت اور اس کے سپاہیوں کو انعامات دیے۔ البتہ شاور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا تھا اور کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

ایکبار اس نے چاہا کہ دعوت کے بہانے بلاکر شیرکوہ کو قتل کردے۔ مگر اس کے بیٹے کامل نے مخالفت کی۔ اور کہا کہ اگر تم نے ایسا ارادہ کیا تو میں خود اسکو مطلع کردونگا۔ شاور نے کہا کہ اگر ہم اسکو نہ ماریں گے تو یہ یقینی ہے کہ وہ ہم کو مار ڈالے گا۔ بیٹے نے جواب دیا کہ بلا سے ہم قتل ہوجائیں

ملک تو مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے گا۔ یہ یاد رکھئے کہ جس دن شیرکوہ مارا گیا اسی دن صلیبی آکر مصر پر قبضہ کرلیں گے۔ اس وقت اگر خود عاضد بھی نورالدین کے پاس جائے گا تب بھی وہ ایک سپاہی بدد کے لئے نہ دیگا۔ چنانچہ وہ اپنے ارادے سے باز رہا۔

اسی اثنا میں صلاح الدین نے اطلاع پائی کہ شاور صلیبیوں کے ساتھ سازباز کر رہا ہے۔ اس لئے اس کو گرفتار کرلیا۔ خلیفہ نے جب سنا تو اس نے بھی اس کے قتل کا حکم دیا۔ لوگوں نے اسکا گھر بھی لوٹ لیا۔ اسی میں اس کا بیٹا کامل مارا گیا۔ شیرکوہ کو اس کے مارے جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ کہا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو میں اس کو اس کے اس احسان کا کہ اپنے باپ کو میرے قتل سے روکا تھا اچھا بدلہ دیتا۔

اس کے بعد خلیفہ نے شیرکوہ کو بلا کر شاور کی جگہ پر وزارت کا خلعت اور فرمان عطا فرمایا لیکن صرف دو مہینے پانچ دن وہ اس منصب پر رہنے پایا تھا کہ ۲۲ جمادی الثانی ۵۶۴ھ کو انتقال کر گیا عاضد نے صلاح الدین کو اس منصب پر مامور فرمایا۔

موتمن الخلافہ

صلاح الدین کے صفات اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے اہل مصر اس کے گرویدہ ہوگئے۔ یہ دیکھکر اس کے حاسدوں کو رشک آیا جس میں سب سے مقدم موتمن الخلافہ تھا۔ یہ خصی غلام قصر خلافت کے جملہ امور کا منصرم اور خدم وحشم کا سردار تھا۔ اس نے چند مصری امرا کے ساتھ اتفاق کرکے صلیبیوں کے پاس خط لکھا کہ صلاح الدین کو مصر سے نکالنے میں ہماری مدد کرو۔ یہ خط جوتے کے تلے میں سلوا کر ایک غلام کو دیا گیا کہ وہ مخفی طور پر پہنچائے۔ وہ راستہ میں جوتہ ہاتھ میں لئے ہوئے چلا جاتا تھا۔ صلاح الدین کے کسی آدمی کو شبہ ہوا اس نے پکڑ لیا۔ خط برآمد ہوا۔ اور تحقیقات سے ساری کیفیت معلوم ہوگئی۔ موتمن الخلافہ نے خوف کی وجہ سے قصر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ صلاح الدین خاموش رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ مطمئن ہوگیا اور باہر آنے جانے لگا تو اسکو قتل کرادیا۔ شیدیوں نے غضبناک ہوکر شورش کی۔ اور تقریباً پچاس ہزار کی جمعیت فراہم کرکے صلاح الدین پر حملہ آور ہوئے۔ خلیفہ بھی ایک جھروکہ پر بیٹھکر انکی حمایت کر رہا تھا۔

صلاح الدین نے نفطاندازوں کو حکم دیا کہ اس جھروکہ کو جلا دیں۔ جب خلیفہ وہاں سے بھاگا اس وقت شیدیوں کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ صلاح الدین کے بھائی شمس الدولہ نے ان سب کو شکست دیکر تعذیب و تحریق سے فنا کر دیا۔ اس وقت سے انکا نام و نشان مٹ گیا اور عاضد بھی بے کس و مخمول ہوگیا۔ انکا ذکر بھی لوگوں نے چھوڑ دیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مصر کو فاطمیوں کے لئے جس غلام نے فتح کیا تھا اسکا نام بھی جوہر تھا اور جس کی بدولت انکا قبضہ جاتا رہا یعنی موتمن الخلافہ اسکا نام بھی جوہر تھا۔

صلاح الدین نے اب اطمینان کے ساتھ ملکی انتظامات شروع کئے۔ اور سلطان نورالدین کے حکم سے محرم ۵۶۷ھ کے پہلے جمعہ میں مصر میں عباسی خلیفہ مستضی باللہ کا خطبہ رائج کیا۔ اس وقت سے فاطمی خطبہ منقطع ہوگیا۔ عاضد مرض الموت میں تھا۔ صلاح الدین نے مناسب نہ سمجھا کہ ایسی حالت میں اسکو اس خبر کی اطلاع دے۔ جو اس کے لئے رنج کا موجب ہوگی۔ چنانچہ وہ بلا اس علم کے عاشورا کے دن گزر گیا۔ اسکی موت سے فاطمی خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ عاضد کے معنی بھی لغت میں قاطع کے ہیں۔

عاضد نہایت غالی شیعہ تھا اور سنیوں کے خون کو حلال سمجھتا تھا۔

شذرات

سال ختم ہو رہا ہے اور اس موقع پر ہمیں اپنے سال بھر کے کام کا تبصرہ کرنا ہے۔ رسالہ عموماً وقت پر نکلتا رہا۔ البتہ اکتوبر کے پرچے میں اتنی دیر ہوئی کہ اُسے نومبر کے پرچے کیساتھ نکالنا پڑا۔ اسکا سبب جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ ٹائپ میں چھاپنے کا تجربہ تھا جو چند وجوہ سے ناکامیاب ہوا۔ اب انشاءاللہ رسالہ ہمیشہ وقت پر نکلے گا۔ مضامین اس سال مجموعی حیثیت سے سال گذشتہ سے بہتر تھے۔ کوشش کیجارہی ہے کہ آئندہ سال اس سے زیادہ دلچسپ اور بلند مضامین پیش کئے جائیں۔ ظاہری خوبیوں کے اعتبار سے بھی ترقی ہوئی اور انشاءاللہ اور ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام آئندہ سال بھی اسی قدر دلچسپی کا اظہار کرتے رہیں گے جتنی انہوں نے اس سال ظاہر فرمائی ہے۔ اُن سے یہ بھی التجا ہے کہ اس رسالے کے پہونچتے ہی اپنا سالانہ چندہ یا بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں یا دی پی بھیجنے کی اجازت دیں۔ جو حضرات جنوری کے بعد خریدار ہوئے ہیں، انہیں ابھی چندہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

ہم کسی گذشتہ اشاعت میں عرض کر چکے ہیں کہ جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کا از سرِ نو انتظام کیا گیا ہے اور اسکا نام اُردو اکادمی رکھا گیا ہے۔ اس اکادمی کی نگرانی میں امسال تین کتابیں چھپیں اور چھ سات کتابیں چھپنے کے لئے تیار ہیں۔ تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے ایک سال میں چھ سے زیادہ کتابوں کا چھپنا دشوار ہے۔ مالی اعتبار سے اکادمی کے کام میں آسانی پیدا کرنیکے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اکادمی علم دوست حضرات کو اپنا ممبر بنائے جو اُس کی تمام مطبوعات کے خریدار بن کر اُس کی عملی مدد فرمائیں۔ اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ جو حضرات اکادمی کو کم سے کم دو روپیہ ماہوار چندہ دیں وہ اُس کے ممبر قرار دئے جائیں اور انہیں رسالہ جامعہ، پیامِ تعلیم اور اکادمی کی مطبوعات جن کی تعداد سال میں چھ ہو چھپنے کے بعد فوراً بھیجی جائیں۔ چندہ سہ ماہی یا ششماہی پیشگی

وصول کیا جائے گا۔ دسمبر کی تعطیل میں ایک وفد جس میں ڈاکٹر سید عابد حسین ناظم اکادمی اور عبدالعلیم احراری صاحب رفیق اکادمی شامل ہیں صوبہ متحدہ کے بعض شہروں کا دورہ کریگا۔ تاکہ علم دوست حضرات کو اکادمی کا ممبر بنائے۔

رسالہ جامعہ اب اکادمی کا آرگن قرار دیا جائے گا۔ اور اسمیں اُس کے کام کی تفصیل چھپتی رہاکرے گی ہمیں قارئین کرام سے امید ہے کہ وہ خود اکادمی کے ممبر بنیں گے اور اپنے دوستوں کو بنائیں گے تاکہ اُنکے پاس دو مفید رسالے اور چھ اعلیٰ درجہ کی کتابیں ہر سال پہونچتی رہیں۔

فرمانروائے افغانستان شاہ امان اللہ خاں ادام اللہ ملکہٗ واقبالہٗ کی ہندوستان میں تشریف آوری بھی موجودہ عہد کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ جس وقت سے کہ حضور ممدوح نے ہماری سرحد میں قدم رکھا یہ معلوم ہونے لگا کہ ہندوستان کے کل باشندوں کے جسم میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک برقی لہر سی دوڑ گئی خصوصاً کراچی اور بمبئی کے لوگوں نے تو اپنے معزز مہمان کے استقبال میں ایسے جوش کا اظہار کیا کہ یقیناً آج تک کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان غلام ہے لیکن دل میں آزادی کی تمنا رکھتا ہے۔ منتشر ہے لیکن اتحاد کا آرزومند ہے، سیاست میں طفل مکتب ہے۔ لیکن دوست دشمن میں تمیز کر سکتا ہے۔ اس لئے جب اُسے ایک ایسے اولوالعزم بادشاہ کی مہمانداری کا فخر حاصل ہوا جس نے اپنے ملک کو بزور شمشیر آزاد کیا ہے جس نے اپنی رعایا کے مختلف فرقوں کو بہ لطف وکرم متحد کر لیا ہے اور جس نے ہمیشہ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ محبت واخلاص کا ثبوت دیا ہو تو اُس کے مردہ جسموں میں جان پڑ گئی اور اُس نے آپس کے مناقشوں کو پس پشت ڈالکر متحدہ آواز سے وہ نعرہ ہائے مسرت بلند کئے جو حاسدوں کے دل میں تیر بن کر پیوست ہو گئے۔ خدا کرے یہ جوش محض عارضی چیز نہ ثابت ہو بلکہ ہمارے دلوں میں اسکا اثر ہمیشہ باقی رہے

حضور ممدوح نے جامعہ ملیہ کے سپاسنامے کے جواب میں جو قابل قدر الفاظ فرمائے ہیں وہ

ہمارے لئے نازش و افتخار کا سرمایہ ہیں۔ خدا ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اس تعریف کے مستحق ثابت ہوں اور ملت اسلامیہ کو یہ توفیق دے کہ وہ ہماری درسگاہ کی بنیادوں کو اپنی شفقت مدد سے مضبوط اور مستحکم بنا دے۔ آمین۔

ہمارے ملک میں ایک اور مہمان بھی آیا ہوا ہے جو تاج و تخت کا مالک تو نہیں لیکن ملک علم و دانش کا فرمانروا ضرور ہے۔ پروفیسر ہائنرش لوڈرس جو معہ اپنی زوجہ محترمہ کے کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر ہندوستان تشریف لا رہے ہیں۔ جرمنی کے فضلا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب سنسکرت اور ہند قدیم کے آداب کے متبحر عالم ہیں اور برلن کی یونیورسٹی میں انڈالوجی (ہندیات) کے استاد خصوصی ہیں۔ آپ ۱۸۹۵ء میں کوٹنگن یونیورسٹی میں سنسکرت کے لکچرار مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں راسٹاک میں اسی زبان کے پروفیسر ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں وہاں سے کیل یونیورسٹی چلے گئے۔ ۱۹۰۹ء سے آپ برلن کی یونیورسٹی میں ہیں۔ اسی سال پروشیا کی اکادمی نے آپ کو اپنا رکن مقرر کیا اور ۱۹۲۰ء میں سکرٹری منتخب کیا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو جرمنی میں نہایت قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔

پروفیسر لوڈرس پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں ذیل کے موضوع پر چھ لکچر دیں گے۔

"وسط ایشیا میں آثار قدیمہ کا اکتشاف اور اسکا تعلق ہندوستان کے آداب و تمدن کی تاریخ سے"

کلکتہ سے روانہ ہو کر پروفیسر صاحب تمام ہندوستان کا دورہ کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ہر شہر میں جہاں آپ تشریف لیجائیں گے ارباب علم آپ کا تہ دل سے خیر مقدم کریں گے اور ثابت کردینگے کہ ہندوستان سچے عالموں کی سچی قدر کرتا ہے۔

رسالہ پورا لکھا جا چکا تھا کہ ۲۹ دسمبر کو اس سانحۂ عظیم کو خبر ملی کہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب نے رات کو رامپور میں اچانک انتقال فرمایا نعش دہلی میں لاکر دفن کی گئی۔ حکیم صاحب کے انتقال سے ملک اور قوم کا ایک عاقل اور مخلص رہنما اٹھ گیا اور جامعہ ملیہ تو بالکل یتیم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ انکی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل۔

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے، اُن کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلا نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے۔ چنانچہ پروفیسر انڈرٹیڈ ڈی۔ ایس سی، پی، ایچ ڈی، پروفیسر فرائنڈلش پروفیسر برلن یونیورسٹی اور پروفیسر سر آرتھر کیتھ کے مضامین وصول ہو چکے ہیں جن کے ترجمے اس رسالے میں شائع ہوں گے۔ متعدد بلاک بھی ہوں گے۔

رسالہ ماہ جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوگا۔ تقطیع بڑی رسالہ اُردو کی ہوگی۔ (۲۰×۳۰/۸) سالانہ چندہ آٹھ روپے سکۂ انگریزی۔

امید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے۔

انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد دکن

علی گڑھ میگزین کا نوکیشن نمبر

ہندوستان کے مشہور اور ممتاز علمی رسالہ علی گڑھ میگزین کا کانوکیشن نمبر خاص اہتمام اور نہایت آب و تاب کے ساتھ جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوگا اس پرچہ میں تصاویر کے علاوہ ملک کے ممتاز انشا پردازوں کے مضامین اور بلند پایہ شعرا کے افکار عالیہ شائع ہونگے۔ اس پرچہ کی ضخامت بھی غیر معمولی ہوگی اور اردو کتابت و طباعت کا بہترین نظر فریب نمونہ ہوگا۔ تمام اہل علم و ادب اور خصوصًا ان ارباب علم سے جن کا تعلق مسلم یونیورسٹی سے بحیثیت اولڈ بوائز رہا ہے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنے مادر علمی کے اس رسالہ کے خاص نمبر کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں مضامین و حصہ نظم اڈیٹر صاحب علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے پتہ پر جلد از جلد پہونچ جانا چاہئیں۔

خریداری رسالہ و اجرت اشتہارات کے واسطے منیجر صاحب مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے خط و کتابت کیجئے۔

منیجر علی گڑھ میگزین